ہماری ویب ڈیجیٹل بک

ایم اے تبسم

M.A.TABASSUM

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

SOCIETY & CULTURE

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "M.A.Tabassum"
at Hamariweb.com

کالمسٹ کونسل آف پاکستان کا قیام ۔۔۔۔کالم نگاروں کے حقوق کا تحفظ

گزشتہ دنوں دار لحکومت اسلام آباد میں صحافیوں کے حقوق کا تحفظ اور خاص طور پر نئے لکھنے والے کالم رائیٹرز کے بنیادی مسائل کا حل ڈھونڈنے کیلئے ایک خصوصی اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔اس اجلاس میں ملک کے معروف اور غیر معروف صحافیوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی ۔اجلاس میں جس مسئلہ کے حل کے لیے سب سے زیادہ زور دیا گیا وہ یہ تھا کہ بہت سے نئے لکھنے والوں کے کالم بعض اخبارات و رسائل میں کسی دوسرے شخص کے نام سے شائع کردیے جاتے ہیں جس سے نئے لکھنے والے کا نہ صرف کام مشکوک کردیا جاتا ہے بلکہ صریحاً اس طرح ایک چوری کا ارتکاب بھی ہوتا ہے۔ اس کرائم میں بہت سے نام نہاد صحافیوں کے ساتھ ساتھ بعض اشاعتی ادارے بھی ملوث ہوتے ہیں۔ اجلاس میں اجتماعی رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس غیر قانونی عمل کی ہر ممکن روک تھام کی جائے گی اورچوری کے اس عمل میں ملوث پائے جانے والے شخص اور ادارے کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کی جائیگی ۔دوسرا بڑا مسئلہ جو سب سے زیادہ زیر بحث لایا گیا وہ خاص طور پر نئے لکھنے والے کالم رائیٹرز کی مالی معاونت کا تھا۔ اس مسئلہ کے متعلق اکثریتی رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ نئے لکھنے والوں کی معاشرتی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی مالی معاونت کے لیے ایک مخصوص فنڈ کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ وہ

خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں اور جن اخبارات و رسائل میں ان کے کالم شائع ہوتے ہیں ان کے مالکان سے بھی کہا جائے کہ ایسے نئے لکھنے والوں کی خصوصی مالی معاونت کی جائے ۔اس کے علاوہ اجلاس میں ایسے صحافیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی کہ جو چند ٹکوں کی خاطر حقیقت کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور سرکار کے آلہ کار ہونے کا بھرپور ثبوت دیتے ہیں۔اس موقع پر باہمی رضامندی سے سینئر صحافی غازی شاہد رضا کی قیادت میں "کالمسٹ کونسل آف پاکستان" کے پہلے پینل کا انتخاب کیا گیا۔جس میں بانی، چیئرمین غازی شاہد رضا (اسلام آباد) ،صدر ایم اے تبسم لاہور)، سینئر نائب صدر عقیل خان (پتوکی)،نائب صدر امتیاز علی شاکر (لاہور)) جنرل سیکرٹری فیصل اظفر علوی (اسلام آباد)،ایڈیشنل جنرل سیکرٹری تیمور خان (اسلام، آباد)،جوائنٹ سیکرٹری پروفیسر رفعت مظہر (لاہور)،فنانس سیکرٹری ساحر قریشی شیخوپورہ)،انفارمیشن سیکرٹری ذیشان انصاری (سیالکوٹ) کو باہمی مشاورت سے) عہدے تفویض کئے گئے اس موقع پر چیئرمین غازی شاہد رضا نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہر ممکن صحافیوں کے حقوق کا تحفظ کریں گے خاص طور پر کالم رائیٹرز کی شکایات کا فوری ازالہ کیا جائیگا۔صدر ایم اے تبسم نے کہا کہ ہم پہلے بھی صحافیوں کے حقوق کی خاطر ہر پلیٹ فارم پر آواز بلند کر رہے تھے اور اب مزید بہتر طریقے سے اپنی آواز اوپر تک پہنچائیں گے تاکہ ہمارے تمام مطالبات کا فوری حل تلاش کیا جاسکے۔جنرل سیکرٹری فیصل اظفر علوی نے کہا کہ ہم نے صحافیوں

کی فلاح و بہبود کا جو بیڑا اُٹھایا ہے اس کو منزل مقصود تک ضرور پہنچائیں گے چاہے ہمیں اس کے لیے کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔اجلاس کے آخر میں اجتماعی دعائے خیر کی گئی۔جو کالم نگار حضرات ہمارے شانہ بشانہ چلنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہوں، وہ کالمسٹ کونسل آف پاکستان کی ویب سائٹ www.1ccp.blogspot.com سے فارم ڈاؤن لوڈ کرکے ممبرشپ حاصل کر سکتے ہیں،مزید معلومات ان نمبرز

03005148064,03004709102,031425158,03154174470

(سے بھی لی جاسکتی ہے۔ (پی ایل آئی

دل میں ہو لا الہ تو کیا خوف، تعلیم ہو گو فرنگیانہ

کبھی کبھار اخبارات میں ایسی خبریں آتی ہیں کہ کسی باپ نے شراب کے نشہ میں اپنے بیٹے کو قتل کردیا یا مفلسی سے تنگ آ کر زہر دے کر مار دیا۔ اس طرح کی خبریں سامنے آنے کے بعد ہر طرف سے قاتل باپ کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن قتل اولاد کی ایک صورت اور بھی ہے اور یہ وہ صورت ہے جس میں قاتل کو نفرت کی بجائے بنظر تحسین دیکھا جاتا ہے اور خود قاتل بھی فخر کا احساس کرتا ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے جب کہا تھا کہ :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

تو ان کے پیش نظر قتل کی یہی صورت تھی۔ یہ جسمانی قتل نہیں ہے بلکہ روحانی قتل ہے ، یہ ایمان و عقیدہ کا قتل ہے۔ اکبر کے زمانہ میں قتل کی اس شکل نے رواج تو پالیا تھا لیکن اس کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں ہوا تھا جتنا آج ہے۔ مسلمانوں نے کچھ اپنی غفلت و سستی اور کچھ حالات کے جبر کے نتیجہ میں تعلیم پر وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ مستحق تھی۔ لہٰذا وہ کوئی ایسا ڈھانچہ تیار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے جس میں ان کی نسلیں دین سے وابستگی کے ساتھ

عصری علوم میں مہارت حاصل کر سکیں۔ دینی اور عصری علوم کی تفریق نے صورت حال کو مزید پیچیدہ بنادیا۔ ایک طبقہ دینی تعلیم کے حصول کو بے معنی اور مخصوص لوگوں کا وظیفہ سمجھتا رہا تو دوسرے طبقہ نے عصری علوم کو شجر ممنوعہ بنادیا۔ اس متضاد فکری رویہ نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ وہ طبقہ جس نے دینی علوم کو عزیز جانا اور خود کو اسی دائرہ میں محدود رکھا، عصری علوم حاصل کرنے والوں اور عصری تعلیمی اداروں سے اس کا رشتہ استوار نہ رہ پایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ادارے اوران سے وابستہ افراد مذہب کی گرفت سے آزاد ہوگئے اور اگر دل سے مسلمان رہے بھی تو ان کا دماغ غیر اسلامی فکر کا حامل بن گیا۔ اس طبقہ کی بڑی تعداد ان عصری اداروں سے الحاد و دہریت اور آزاد خیالی کے جراثیم لے کر نکلی اور سیکولر و مغربی نظریات کو ہی اعلیٰ و ارفع اور قابل وقعت سمجھنے لگی۔ اس کے جو مہلک اثرات مسلم معاشرہ پر پڑے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اس کے تدارک کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے 1857 اور پھر آزادی کے بعد کے مخصوص حالات میں صورت حال کی سنگینی کو محسوس کیا اور متعدد اقدامات کیے۔ لیکن یہ اقدامات اپنا تسلسل برقرار نہ رکھ سکے اور جس مربوط اور منظم انداز میں اس کے لیے جد و جہد جاری رہنی چاہیے تھی وہ نہ رہ سکی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب پورے ملک میں ، خواہ شہر ہوں یا دیہات، ابتدائی تعلیم کے لیے چھوٹے چھوٹے مدارس اور مکاتب کا جال بچھا ہوا تھا اور وہاں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی طلبہ عصری

تعلیمی اداروں کا رخ کرتے تھے۔ ان مکاتب کا کمال یہ تھا کہ یہ بہت کم عرصہ میں طلبہ کو اسلام کی بنیادی فکر سے روشناس کراکے ان کے دلوں میں اسلامی عقائد و اخلاق کی جڑیں اتنی مستحکم کر دیتے تھے کہ آگے چل کر کسی بھی ماحول میں رہتے ہوئے ان سے دین بیزاری کا خطرہ بڑی حد تک ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن آج صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب ہر طرف انگلش میڈیم اسکولوں کا جال پھیلا ہوا ہے اور بچوں کو ابتدا سے ہی ان اسکولوں میں بھیجا جانے لگا ہے جہاں کے ماحول میں اللہ اور رسول کا نام بھی نہیں سنا جاتا۔ مگر پھر بھی لوگ بڑی بڑی رقمیں دے کر اپنے بچوں کو ان اداروں میں داخل کرانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادارے عیسائی مشنریز کے زیر انتظام چلتے ہیں جہاں بچے مسیح کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کرتے ہیں، جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہوتا ہے اور لڑکیوں کے لیے ایسے یونیفارم کا انتخاب کیا جاتا ہے جس میں ٹانگیں کھلی ہوتی ہیں اور اسے ہی تہذیب و شائستگی کی علامت قرار دیا جاتا ہے، جہاں فحاشی و عریانی کا نام تہذیب ہے اور جہاں پردہ اور نقاب کی تضحیک کی جاتی ہے اور ان کا استعمال کرنے والوں کو رجعت پسند قرار دیا جاتا ہے، جہاں اسلامی تہذیب و تاریخ کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور جہاں مسلم بچوں کو اپنے مذہب کے تئیں احساس کمتری کا شکار بنایا جاتا ہے۔ اب اگر کسی بچہ کو عمر کے تیسرے چوتھے سال میں ہی ایسے اسکولوں میں داخل کرا دیا جائے تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ اس پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ آج صورت حال

یہ ہے کہ اس طرح کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جسے دسویں اور بارہویں کلاس پاس کرلینے کے باوجود قرآن مجید پڑھنا نہیں آتا اسے دعائیں بھی یاد نہیں ہوتیں اور اسلامی اخلاق و آداب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان تعلیمی اداروں سے جو بچے تعلیم پاکر باہر نکلتے ہیں ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ان کی ہوتی ہے جو نسلی مسلمان تو ہوتے ہیں لیکن شعوری مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ صورت حال اس نسل کی ہے جس کے والدین اللہ کے فضل سے مذہبی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ذرا تصور کیجئے کہ مذہبی ماحول کے پروردہ والدین کے بچوں کی یہ صورت حال ہے تو اس کے بعد آنے والی نسل کا کیا حال ہوگا۔ وہ ان اداروں سے فارغ ہوکر منفعت بخش ملازمتیں تو حاصل کر سکتے ہیں کہ یہی اس کا منتہائے مقصود ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے وہ اپنے اور اپنے معاشرے کے لیے نہ صرف غیر مفید ثابت ہوں گے بلکہ سنگین خطرات کا باعث بھی بنیں گے۔ یہ اتنا سنگین مسئلہ ہے کہ اگر فوراً اس کے سد باب کی کوشش نہ کی گئی تو آنے والی نسل کا رشتہ مذہب سے بالکل منقطع ہوجائے گا اور وہ رسمی مسلمان بھی باقی نہیں رہے گی۔ پھر نہ جانے کتنے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جنم لیں گے اور مذہب کا مذاق اڑائیں گے۔ ان سطور کا راقم نہ صرف یہ کہ عصری تعلیم کا مخالف نہیں ہے بلکہ اس کے ناقص خیال میں مسلمانوں پر اس کا حصول واجب ہے۔ موجودہ دور میں اس سے بے نیازی خود کشی کے مترادف ہوگی۔ ان سطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے

بچوں کے لیے عصری علوم کے ساتھ ایسی تعلیم کا بھی لازماً بندوبست کریں جو انہیں مسلمان باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بعد انہیں جو بھی تعلیم دی جائے انشاء اللہ اس کے اثرات مفید ہی ہوں گے۔ شاعر مشرق کہہ گئے ہیں:

دل میں ہو لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

اپنے بچوں کو مسلمان باقی رکھنے اور انہیں احساس کمتری اور مرعوبیت کے حصار سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان خود بڑی تعداد میں معیاری اسکول قائم کریں۔ پہلے سے موجود اداروں کی اصلاح کریں کیونکہ عام طور پر مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی ادارے اپنی بد نظمی، ناقص تعلیم وتدریس اور انتظامیہ کے درمیان باہمی چپقلش کے لیے ممتاز ہیں۔ یہ صورت حال بھی کم تشویش ناک نہیں ہے اور عام مسلمانوں کی ان اداروں سے دوری کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔ لہٰذا اس پر توجہ بے حد ضروری ہے۔ ان میں سے بہت سے ادارے ایسے ہیں کہ ان میں اور عیسائی اداروں میں بس اتنا فرق ہے کہ ان کے چلانے والے مسلمان ہیں، ورنہ وہاں بھی کلچرل پروگراموں کے نام پر وہ طوفان بد تمیزیاں ہوتی ہیں کہ کسی غیرت مند مسلمان کے لیے اس کا تصور بھی دہلا دینے والا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ اس لیے کہ اسے مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا ہے اور اس لیے بھی

کہ اس زبان میں ہمارا دینی و تہذیبی سرمایہ موجود ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کا انتظام ہمارے لیے ناگزیر ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری نئی نسل اسلام کے اس عظیم الشان ورثہ سے محروم رہ جائے گی۔ سطور بالا میں جن مکاتب کا ذکر کیا گیا ہے انہیں دوبارہ بحال کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ طلبہ کم از کم ناظرہ قرآن پڑھنے کے قابل ہو جائیں، کچھ دعائیں یاد کرلیں اور اسلامی سیرت و اخلاق سے آغاز میں ہی روشناس ہو جائیں۔ اس طرح کے مکاتب مساجد میں بھی چلائے جا سکتے ہیں یا یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ مساجد میں ہی چلائے جائیں۔ اسی طرح تعطیلات میں طلبہ کے لیے دینی تعلیم کی کلاسیز کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ بہت سی جگہوں پر اس طرح کے انتظامات کیے گئے ہیں، انہیں اور بہتر شکل دی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی مفید طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ ان اقدامات سے بھی وہ مقصد مکمل طور پر حاصل نہ ہوگا صورت حال جس کی متقاضی ہے۔ تاہم اس سے ہم اپنی جدوجہد کا آغاز کر سکیں گے۔ اگر ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو ارتداد سے محفوظ رکھنا ہے تو ترجیحی بنیاد پر اس جانب توجہ کرنی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت حالات جس قدر سنگین ہیں اور جس طرح کے چیلنجوں کا سامنا ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ یہ وقت عملی اقدام کا متقاضی ہے۔ دور بیٹھ کر کڑھنے، کوسنے اور تنقید کرتے رہنے سے نہ پہلے کوئی چیز بدلی ہے اور نہ ہی آج اس کی توقع کی جانی چاہیے۔

امریکی صدارتی انتخابات میں مسلم ووٹرز کی اہمیت

نومبر2012 میں صدر باراک حسین اوبامہ کی مدت ختم ہورہی ہے اور امریکہ کے نئے صدر کا انتخاب ہونا ہے۔ اس انتخاب کے لئے باراک اوبامہ نے ابھی سے ہی انتخابی مہم شروع کردی ہے۔ وہ دوبارہ صدر منتخب ہوتے ہیں یا نہیں یہ تو نتائج کے بعد ہی پتہ چلے گا مگر سیاسی مبصرےن اور ریسرچ اسکالر ابھی سے یہ اندازہ لگارہے ہیں کہ اگر امریکہ کے مسلمانوں کا جھکاؤ اوبامہ کی طرف رہا تو وہ دوبارہ امریکہ کے صدر بنائے جاسکتے ہےں کیونکہ گزشتہ کئی انتخابوں میں یہی دیکھا گیا ہے کہ مسلمانوں کا جھکاؤ جدھر رہا ہے، ادھر ہی جیت ہوتی ہے۔ سال2000 میں جب جارج بش کا مقابلہ امریکی یہودی لابی سے جڑے الگور سے تھا۔ اس وقت عام امریکی مسلمانوں کا جھکاؤ جارج بش کی طرف تھا۔ اگرچہ بعد کے دنوں میں پوری دنیا کے مسلمانوں کو خاص طور پر امریکہ کے مسلمانوں کو جارج کی مسلم دشمنی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ صدر بننے کے بعد بش نے مسلم دشمنی کا پورا ثبوت دیا اور فلسطین سمیت پورے عرب میں مسلمانوں کو زبردست جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ 2004 میں دوبارہ الیکشن ہوا تو اس الیکشن میں مسلمانوں نے بش کے خلاف ووٹنگ کی مگر قدرت کو اس کی ہار منظور نہیں تھی چنانچہ دوبارہ فتح بش کی ہی ہوئی۔ دراصل اس الیکشن میں امریکہ کے مسلمان یک جان ہوکر 'جان کے ری

کی حمایت میں کھڑے نہیں ہوسکے۔ مسلمانوں کے بکھراؤ کا فائدہ بش کو ہوا اور وہ؛
امریکہ کے دوبارہ صدر چن لئے گئے۔ مسلمان اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتے تھے چنانچہ
انہوں نے متحد ہو کر 2008 کے الیکشن میں اوبامہ کا ساتھ دیا اور اوبامہ کی جیت
ہوئی۔ دراصل امریکہ کے مسلمان جب متحد ہو کر کسی ایک کو ووٹ دیتے ہیں تو اس
امیدوار کی جیت یقینی ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے ووٹ کو فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ ہر امیدوار الیکشن سے پہلے مسلم تنظیموں سے قریب ہونے کی کوشش تیز کر دیتا
ہے۔ امریکہ میں رواں سال کے آخر میں (نومبر میں) صدارتی انتخاب ہونے جا رہا ہے۔
سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ 2012 کے الیکشن میں بھی مسلمان وہی رول ادا کر سکتے
ہیں جو انہوں نے گزشتہ الیکشن میں کیا ہے یعنی وہ اس مرتبہ بھی اوبامہ کے حق
کہتے ہیں Brian Gaines کے پروفیسر Illinois یں ووٹ ڈالیں گے۔ چنانچہ یونیورسٹی
کہ " امریکہ میں مسلمانوں کی صورت حال دیگر مذاہب سے الگ ہے۔ مسلمان کسی بھی
ایسے صدر کو قبول نہیں کرتے، جو ان کے مذہبی امور میں رکاوٹ پیدا کرے۔ بش کے
دور اقتدار میں مسلمانوں نے امریکہ میں مشکلوں کا سامنا کیا ہے خاص طور پر نائن الیون
کے بعد ان کی زندگی پر غم کے سیاہ بادل منڈلاتے رہے ہیں ایسے میں تقریباً 55 فیصد
ایسے مسلمان ہیں جو نائن الیون کے بعد امریکہ میں رہنے سے بیزار ہو گئے تھے۔ ان کی یہ
بیزاری اوبامہ کے دور میں کم ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب الیکشن کا دور آیا تو تقریباً 76
فیصد مسلمانوں نے کھلے عام اوبامہ کو ووٹ

کیا اور آنے والے الیکشن میں بھی ایسا ہی لگ رہا ہے کہ وہ اوبامہ کو ہی اپنا ووٹ دیں گے "۔ حالانکہ اوبامہ نے جامع ازہر مصر میں مشرق وسطی اور مسلمانوں کے تئیں جو کچھ بھی کہا تھا، اس پر عمل نہیں ہو سکا اور نہ ہی فلسطین کے سلسلے میں ان کا کردار قابل ستائش رہا ہے، پھر بھی امریکی مسلمانوں کا رجحان اوبامہ کی طرف زیادہ ہے۔ کیونکہ اوبامہ کے اقتدار میں ایک بھلا یہ ہوا ہے کہ امریکی عوام میں اسلام کے تئیں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی تھیں اس میں بہت حد تک کمی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اوبامہ سے پہلے امریکہ کے 47 فیصد لوگ مسلمانوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے تھے مگر اوبامہ کے دور اقتدار میں اس رجحان میں کمی ہوئی ہے۔ ان کے دور اقتدار میں ایک پاکستانی مسلم سہیل محمد کو امریکہ میں جج کا عہدہ بھی دیا گیا ہے بلکہ اب تو عیسائی مذہبی پیشواؤں نے بھی عیسائیوں کو مسلمانوں کے ساتھ میل جول بڑھانے کی ترغیب دینا شروع کر دی ہے چنانچہ ایک انگریز پادری Rick Warren نے ابھی کچھ دنوں پہلے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے یہ پیغام دیا کہ " مسلمانوں اور مسیحوں کو دنیا میں درگزر اور امید کی کرن پیدا کرنے کے لئے اتحاد باہمی سے جینے کا ہنر سیکھنا چاہئے "۔ ایک امریکی سیاسیات کے ماہر 'بروکنز' کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت اس لئے بھی ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگ جو مذہبی خیال کے ہیں وہ سیاسی امور میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ کون ہارا، کون جیتا، اس سے انہیں سروکار نہیں ہوتا جبکہ اسلام سیاست اور مذہب کو ساتھ

لے کر چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ امریکی مسلمان جو اپنے مذہب کا سخت پابند ہوتا ہے۔ وہ بھی انتخاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ووٹر متحد ہوجاتے ہیں اور جس کو بھی ووٹ دیتے ہیں وہ امیدوار کامیاب ہوجاتا ہے۔اسی لئے ان کے ووٹ کو فیصلہ کن کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ووٹ کو فیصلہ کن ہونے کا اعتراف متعدد امریکی ماہرین کرچکے ہیں چنانچہ امریکی سیاست کے ماہر Farid Senzaiان کا تعلق Institute for Social Policy and Understanding سے ہے۔اس کا ہیڈ آفس واشنگٹن میں ہے، نے امریکہ میں مسلمانوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے کہ "مسلمانوں کا ووٹ امریکی صدر کے تعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے" امریکہ میں مسلمانوں کی ووٹ ویلو (الکٹرولر بیں) تقریباً 23 ہزار ہے یعنی ان کے ووٹ کی ویلو مجموعی تعداد کی 0.6 فیصد ہے۔یہ تو اے کٹ رپورٹ میں کہا گیا ہے مگر دوسری رپورٹوں میں مسلم ووٹ کی ویلو اس سے کہیں زیادہ ہے۔ واشنگٹن میں قائم Brookings Institution کے سروے کے مطابق امریکہ کے مسلمانوں میں 60 فیصد کی عمریں 18 سال سے زیادہ ہیں"۔اس طرح دیکھا جائے تو کل ووٹرز کا ایک فیصد مسلم ووٹر ہے۔بظاہر یہ فیصد کم ہے جس کا صدارتی انتخاب میں فیصلہ کن ہونا حیرت انگیز لگتا ہے مگر سچائی تو یہ ہے کہ امریکہ میں جیت ہار کا اوسط تھوڑے ووٹوں سے ہی ہوتا ہے۔ 2000 کے الیکشن میں جارج بش کی جیت اپنے حریف پر محض 537 ووٹوں سے ہوئی تھی۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ اوسط نتائج پر کتنا اثر انداز ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کا ایک فیصد ووٹ صدر کے انتخاب میں فیصلہ کن حیثیت اس لئے رکھتا ہے کہ ان کا ووٹ سمٹ کر کسی ایک کے حق میں جاتا ہے۔ حالانکہ کئی مرتبہ کسی کسی شہر میں مسلمان اجتماعیت سے ہٹ کر دوسرے کو بھی اپنا ووٹ دے دیتے ہیں مگر اس کا خمیازہ وہ سن دوہزار چار میں بش کو دے کر بھگت چکے ہیں لہٰذا اب وہ اپنے ووٹ کو بکھرنے سے گریز کریں گے ،ساتھ ہی وہاں جو اسلامی تنظیمیں کام کررہی ہیں وہ ان کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔امریکہ میں مسلمانوں کے تقریباً 843 اسلامک سینٹر،165 اسلامک اسکول اور 426 ایسو سی ایشن ہیں۔جب الیکشن کا وقت قریب آتا ہے تو تمام ادارے متحرک ہوجاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذہن سازی شروع کردیتے ہیں۔ چنانچہ ان تنظیموں کے بارے میں " روبرٹ مکاؤق جو 'کیر' میں مسلم آرگنائزیشن کے منتظم ہیں کہتے ہیں کہ ہم نے ہمیشہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ" وہ صدر کے انتخاب میں اپنا رول ادا کریں۔یہی نہیں، انہیں ووٹ کا استعمال کرنے کے لئے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ ووٹ ڈالنا ایک سیاسی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔اس کے علاوہ لوگوں میں بیداری لانے کے لئے فلمیں دکھائی جاتی ہیں تاکہ وہ ووٹنگ کو اچھی طرح سمجھ سکیں"۔ مسلمانوں کے ووٹ کو فیصلہ کن ہونے کی بات امریکہ کی کئی تنظیمیں کرچکی ہیں چنانچہ واشنگٹن میں Zogby International اور Pew Research Center نے بھی مسلمانوں کے ووٹوں کے تعلق سے تقریباً اسی سے ملتا جلتا تجزیہ پیش کیا ہے۔امریکی تنظیموں نے جو سروے کیا ہے، مسلم ووٹرز کا فیصد اس سے کہیں

زیادہ ہو سکتا ہے۔دراصل امریکہ میں مسلمانوں کی صحیح تعداد کے بارے میں حتمی اعدا دو شمار پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ کوئی 5 ملین کہتا ہے تو کوئی 8 ملین۔ہر سروے میں الگ الگ باتیں کہی جاتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں تین طرح کے مسلمان پائے جاتے ہیں۔ایک تو وہ ہیں جو مہاجر ہیں۔ کسی دوسرے ملک سے یہاں آکر بس گئے ہیں اور گرین کارڈ حاصل کرلیا ہے۔ایسے لوگوں کا ریکارڈ امیگریشن سے مل جاتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جنہوں نے اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوکر مذہب اسلام کو قبول کیا ہے۔ایسے لوگوں کا صرف تخمینہ ہی لگایا جاسکتا ہے، باضابطہ ان کا اندراج نہیں ہے جبکہ ان کی تعداد بھی خاصی ہے اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو یہیں پیدا ہوئے اور یہیں رہ رہے ہیں۔ایسے لوگوں کے ہر شہر میں صحیح اعداد و شمار کا اندازہ حتمی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی تنظیم یا انسٹی ٹیوٹ سروے کرتی ہے تو ان کے سروے میں تینوں زمروں کے لوگوں کو ایک زمرے میں رکھ کر اعداد و شمار بیان نہیں کیا جاتا ہے لہٰذا ان کی صحیح تعداد کی مکمل معلومات نہیں ہو پاتی۔ہر ادارہ اپنے اپنے طور پر ان کی تعداد بتاتا ہے۔ بہر کیف ان کی تعداد اتنی ضرور ہے جو صدر کے انتخاب پر اثر انداز ہوسکے۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی انتخاب کا وقت آتا ہے تو امیدوار صدر مسلم تنظیموں سے ملنا جلنا زیادہ کردیتے ہیں۔امریکہ کے ہر شہر میں کچھ نہ کچھ مسلم موجود ہیں مگر اس کے کچھ مشہور شہروں میں ان کی تعداد کا اوسط کچھ یوں ہے: کیلیفورنیا میں

مسلمان 20.0 فیصد، نیویارک میں 16.0، ایلی نوائے میں 8.4، نیو جرسی میں 4.0، انڈیانا میں 3.6، میشی گن میں 3.4، ورجینیا میں 3.0، ٹیکساس میں 2.8، اوہائیو میں میری لینڈ میں 1.4 فیصد مسلمان ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ میں 843 اسلامک، 2.6 سینٹر کے علاوہ 400 ایسے مدرسے ہیں جو چھٹیوں کے زمانے میں بچوں کو اسلامی تعلیم دیتے ہیں اس کے علاوہ فل ٹائم 165 اسکول اور 426 ایسوسی ایشن ہیں۔ 200 ایسے مدرسے ہیں جہاں بچوں کو تعلیم کے علاوہ عملی طور پر اسلامی طور طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ یہ تمام سینٹر مسلمان کو الیکشن کے زمانے میں ان کے ووٹ کی اہمیت کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کا ووٹ امریکہ کے صدارتی انتخاب میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

علم حاصل کرو اگرچہ چین جانا پڑے

ہمارے دانشور طبقے کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ نونہالانِ قوم کو عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دینی چاہیے ۔ اس کے برعکس وہ اس نہج پر ضرور سوچتے ہیں کہ طلبہ مدارس کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب اخبارات میں صرف اسی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ، عصری تعلیم گاہوں کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ بلاشبہ دینی تعلیم کے ساتھ اگر کچھ ضروری تعلیم عصریات کی بھی ہو جائے تو ہمارے دینی مدارس دین ودنیا کے اس امتزاج کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں خدمت کر سکتے ہیں ، لیکن مدارس کی اصلاح کے چکر میں پڑ کر ہمیں ان بچوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جو محض دنیوی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں یا ان کے سرپرستوں ، یا ان کے ٹیچروں کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہمارے بچوں کو دین کا اتنا علم ضرور ہونا چاہیے جو انہیں اچھے تعلیم یافتہ انسان کے ساتھ ساتھ اچھا مسلمان بھی بنا سکے۔ ہر سال اخبارات ہیں ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے سالانہ نتائج پر کافی کچھ لکھا جاتا ہے۔ جو بچے اپنے شہروں میں یا قصبوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں ان کے فوٹو چھپ رہے ہوتے ہیں ، انٹرویو شائع کیے جاتے ہیں ، ہر طرف خوشی کا ماحول ہوتا ہے۔ جن اسکولوں اور کالجوں

کا رزلٹ اچھا ہوتا ہے ان کی کوششوں کو خوب سراہا جاتا ہے، اور جن اسکولوں کا رزلٹ مایوس کن ہوتا ہے ان پر تنقید کے نشتر بھی چل رہے ہوتے ہیں۔ پوری قوم عصری تعلیم کے نشے میں سرشار ہے، جو کچھ ہو رہا ہے، بہت اچھا ہو رہا ہے، لگتا ہے عصری تعلیم کے تئیں قوم بیدار ہو چلی ہے۔ یقینی طور پر قوم کو انجینئروں کی، ڈاکٹروں کی اور دوسرے ماہرین کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت عصری تعلیم گاہوں سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ ملّت میں عصری تعلیم کے تئیں زبردست بیداری آئی ہے، یہ بڑی خوش آئند بات ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے، مگر یہاں کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عصری تعلیم کے شور میں دین کا پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے، یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ آج ڈاکٹروں، انجینئروں اور دوسرے پیشہ وروں کی ایسی ٹیم تیار ہو رہی ہے جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ یہ ان کا قصور نہیں ہے، قصور اس نظامِ تعلیم کا ہے جس نے ان کا راستہ غیر محسوس طریقے سے الگ کر دیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد سے ہی ماں باپ کو یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ ان کا بچہ اس نظام تعلیم میں کہاں اور کس طرح فٹ ہوگا، کیوں کہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر اس کے لیے ابھی سے جدوجہد نہ کی گئی تو وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس فکر نے ماں باپ کو ان کے اس فرض سے غافل کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ایک اچھا مسلمان بنانے کی سعی پیہم بھی کریں۔ بچہ ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالتا کہ اسے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کر

دیا جاتا ہے، اس اسکول سے وہ بہترین انگریزی بولتا ہوا نکلتا ہے۔ عیسائی مذہب کے متعلق اسے بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لیکن وہ اپنے مذہب سے قطعی بے گانہ رہتا ہے، ماں باپ یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ ہمارے بچے نے ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھا دیے ہیں، ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ ترقی کا یہ صرف ایک رخ ہے، یقیناً ان کا بچہ بڑا ہو کر اچھا پیشہ ور انسان ضرور بنے گا اور لاکھوں کما کر گھر بھر دے گا، لیکن اس کے دل کی دنیا دین جیسی بیش قیمت متاعِ زندگی سے خالی رہ گئی ہے اسے کون پر کرے گا؟ مسلمان اور دین دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ دین کا ایک علم تو وہ ہے جو مکمل نظام کے ساتھ اسلامی مدارس میں جاری ہے، جہاں مفسر، محدث، اور فقھیہ پیدا کیے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ بڑا کام ہے اور امت کو دینی رہنمائی کے لیے ماہر علماء کی سخت ضرورت ہے، مگر یہ ضرورت ایک محدود تعداد پر ختم بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قوم کو میڈیسن، انجینئرنگ اور لاء وغیرہ کے شعبوں میں ماہرین کی ضرورت ہے، مگر یہ ضرورت اس وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک معقول تعداد ان ماہرین کی پیدا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح قوم کے ہر فرد کا ڈاکٹر یا انجینئر بننا ضروری نہیں ہے اسی طرح قوم کے ہر فرد کا محدث، فقیہ، اور مفسر بننا بھی ضروری نہیں ہے، لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو ہر شخص کے لیے ضروری ہیں، مثال کے طور پر ایک اچھا شہری بننے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملک کا قانون کن امور کو صحیح اور کن امور کو

غلط

کہتا ہے، نہ صرف جاننا ضروری ہے بلکہ صحیح امور پر چلنا اور غلط امور سے بچنا بھی ضروری ہے۔ ملک کا قانون ہمیں فتنہ وفساد اور شر انگیزی سے روکتا ہے، اور پر امن بقائے باہم کے اصول پر زندگی گزرانے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس صورت میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ملکی قوانین پر عمل کرتے ہوئے ہر ایسے کام سے بچیں جس سے معاشرے میں فتنہ وفساد پھیلتا ہو اور ہر وہ کام کریں جس سے امن وامان کو فروغ ملتا ہو۔ اسی طرح ہمیں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ ایک اچھا مسلمان بننے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، کن چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے اور کن چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے، یہ وہ ضرورت ہے جس کا اظہار اس حدیث شریف میں کیا گیا ہے۔ " علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے " اس علم کو جس کا اس حدیث میں ذکر ہے۔ اگر ہم ان علوم پر محمول کریں جو مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جا رہے ہیں تو یہ بات نا قابل فہم ہے کہ ان علوم کا حصول تمام مسلمانوں پر فرض کر دیا جائے اور اگر دنیوی علوم مراد لیں جیسا کہ بعض لوگ 'اطلبوا العلم ولو کان بالصین'، " علم حاصل کرو اگرچہ چین جانا پڑے " جیسی ضعیف احادیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جدید علوم کا حصول بھی فرض کے درجے میں ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں چین جانے کی ہدایت بھی کی گئی ہے اور چین نہ پہلے علوم دینیہ کا مرکز تھا اور نہ آج ہے، وہ اس زمانے میں بھی ٹکنالوجی کا مرکز تھا اور آج بھی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اسلام میں جدید علوم کے حصول کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے، یہ دعویٰ بھی غلط ہے اور

استدلال بھی ، دعویٰ تو اس لیے غلط ہے کہ جدید علوم کا حصول سب کے لیے یکساں طور پر ضروری نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ سب لوگ ایک ہی راستے کے مسافر بن جائیں ، اس طرح تو زندگی کا سفر رک سکتا ہے۔ استدلال اس لیے غلط ہے کہ اگر حدیث کے ضعف کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی چین اصل میں دوری کی علامت ہے ، منشائِ حدیث یہ ہے کہ علم حاصل کرو اگرچہ اس کے لیے کتنی ہی دور کیوں نہ جانا پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض علوم وہ بھی ہیں جو بلا استثناء سب پر فرض ہیں اور ان کے حصول کے لیے جد وجہد کرنا بھی فرض کے درجے میں ہے ، ہم ان علوم کو دین کی بنیادی تعلیمات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قوم کے نوجوان ترقی کی شاہراہ پر تو آگے بڑھ رہے ہیں مگر دین کے راستے سے دور ہوتے جا رہے ہیں ، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارے بچے اس طرح آگے بڑھیں کہ وہ پکے سچے مسلمان بھی ہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری بھی ، اس کے لیے والدین کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے جو تعلیم کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ بچہ پیدا ہو تو جس طرح آپ کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ کس مشہور ومعروف اور اعلیٰ معیار کے حامل اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا ؟ اسی کے ساتھ آپ کو یہ فکر بھی ہونی چاہیے کہ آپ کا بچہ دین دار کیسے بنے گا ؟ یاد رکھئے اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بننے میں اور دین دار بننے میں کوئی تضاد نہیں ہے ،ایک بچہ دین داری کے ساتھ دنیا داری کے تقاضے بھی پورے کر سکتا ہے ،اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ، لیکن وہ

اتنی کم ہیں کہ ہم انہیں قابل تقلید نمونہ تو کہہ سکتے ہیں مگر ان پر قناعت نہیں کر سکتے ان مثالوں کو عام کرنے کے لیے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔اس وقت ملت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ مسلمان نرسری اسکولوں سے لے کر کالج کی سطح تک تمام ادارے اپنے قائم کریں، پھر ان اداروں میں دینیات کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اختیار کریں۔اگر بچے کو نرسری سے لے کر کالج کی سطح تک دینی تعلیم دی جاتی رہی تو جس وقت وہ عملی زندگی میں قدم رکھے گا ہر اعتبار سے مکمل انسان ہو گا، ایک ایسا انسان جس کے اندر تعلیمی صلاحیت بھی ہو گی، تہذیبی شعور بھی ہو گا، اور دین کی سمجھ بھی، یہ نوجوان نہ صرف اپنے والدین کے لیے دنیا وآخرت میں متاعِ گراں مایہ ثابت ہو گا بلکہ قوم وملت کے لیے بھی باعث افتخار بنے گا۔عصری علوم کے مدارس میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اگر ان میں مذہبی تعلیم دی جائے گی تو حکومت ان کو جو مالی تعاون دیتی ہے وہ بند ہو جائے گا، اور ہو سکتا ہے ان اداروں کی منظوری بھی ختم ہو جائے، یہ بڑی غلط فہمی ہے، یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اقلیتوں کو اپنے اداروں میں مخلوط تعلیم سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ مخلوط تعلیم اس دور کا وہ فتنہ ہے جس نے معاشرے کو اخلاقی اعتبار سے تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا ہے۔آج جدید تعلیم یافتہ معاشرے میں جس قدر برائیاں عام ہیں وہ ان ہی دو چیزوں کی وجہ سے ہیں، ایک دینی تعلیم سے دوری اور دوسرے طلبہ وطالبات کا آزادانہ اختلاط ومیل وجول۔

ہم دینی

تعلیم کو اپنے اداروں کے نصاب تعلیم کا لازمی جز بنا کر اور مخلوط تعلیم سے دور رہ کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک طرف جدید تعلیم یافتہ بھی ہو اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا بھی ۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے بچے ایسے ماحول میں تعلیم حاصل کریں جو دین کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہو۔ اگر کسی جگہ اسکولوں اور کالجوں میں یہ ماحول میسر نہیں آتا تو گھر کی فضاؤں میں یہ ماحول بنانا ضروری ہے۔ اگر بچے اس ماحول سے محروم رہ گئے تو وہ آپ کی خواہش کے مطابق اچھا ڈاکٹر یا انجینئر یا قانون داں یا اکاؤنٹنٹ تو بن جائے گا مگر ایک اچھا مسلمان نہ بن سکے گا ۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہو گی ۔ والدین کی حیثیت سے آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور نہ آخرت کی جواب دہی سے دامن بچا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے ۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ عصری تعلیم کے اداروں کے نصاب تعلیم کو بھی دینی تقاضوں سے مربوط کیا جائے ۔ دونوں ہی مسئلے اہم ہیں دونوں پر بہ یک وقت توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔ اگر مدارس میں عصری علوم کی شمولیت پر علماء اور ذمہ داران مدارس کو غور کرنا چاہیے تو عصری تعلیم گاہوں میں دینی علوم کے اضافے کے موضوع پر دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو بھی توجہ دینی چاہیے ۔

جل جائے گا جب یہ دیس تو کس کام کا پانی

جل جائے گا جب یہ دیس تو کس کام کا پانی
مل جل کر یہ آگ بجھا کیوں نہیں لیتے

وطن عزیز کو معرض وجود میں آئے 65 سال کا عرصہ گزر چکا ہے "یوم آزادی" ایک طرف تاریخ کے لہو رنگ اوراق کی یاد تازہ کرتی ہے، تو دوسری طرف وہ آزادی کے حسین خواب پر قربان ہوئی قیمتی جانوں، لٹی عصمتوں سے تجدید عہد وفا کا ایک اور موقع بھی فراہم کرتی ہے تاکہ ہم اپنے ماضی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حال کا محاسبہ کریں اور مستقبل کے لئے ان راہوں کا انتخاب کریں جو ہماری قوم کو زندہ ضمیر لئے حقیقی معنوں میں آزاد قوموں کی فہرست میں لا کھڑا کریں۔ ہم آج تک قومی محاسبہ سے نگاہیں چراتے ہوئے ہر سال چودہ اگست کے دن کو بھرپور جوش وخروش سے منانا قومی روایت تو سمجھتے آرہے ہیں۔ جشن آزادی کا مقصد بحثیت قوم ہمارا قومی محاسبہ ہونا چاہیے جو گزشتہ ماہ و سال کے آئینے میں ہمیں ہماری ناکامیاں اور کامیابیاں صاف صاف دکھائے تاکہ ہم دوسری قوموں سے مقابلہ کرنے کا ظرف پیدا کر سکیں۔اگر آزادی کا صحیح مفہوم سمجھنا ہے تو ایک نظر جرمنی اور جاپان پر ڈال لیجئے جو دوسری جنگ عظیم 1945 کی بھیانک تباہی کے بعد دوبارہ نئے سرے سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں جٹ گئے تھے اور

ہم نے بھی تقریباً اسی وقت 1947 میں ایک نوزائیدہ آزاد مملکت کے طور پر اپنا سفر اختیار کیا تھا اگر آج ان سے موازنہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ 65 برس کا عرصہ آگے کی بجائے ہمیں مزید صدیوں پیچھے لے گیا ہے۔ جرمن قوم کے اتحاد و یکجہتی نے دیوار برلن تک گرادی ...مگر ہماری قومی ناؤ فرقہ وارانہ چھیدوں نے قومی سلامتی منافرت کے سیلاب میں بہادی۔ جاپانی قوم کے حوصلے اور قوت ارادی نے انہیں ایک بار پھر سے دنیا کی عظیم ترقی یافتہ قوموں میں سر فہرست لا کھڑا کیا.... مگر جہالت اور ضمیر فروشی نے ہمیں آسمان کی بلندیوں سے ذلت کی گہرائیوں میں لا پٹخا...کہ آج ہمیں آزادی کا دن تو یاد رہا مگر آزادی کا حقیقی مفہوم کیا ہے یہ بھول گئے.. آج تک ہم جس نام و نہاد آزادی کی مالا جپتے چلے آرہے ہیں وہ تو ہمیں کبھی نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی اگر ہمیں اپنی قومی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آزادی کا جشن منانا ہے تو پھر شوق سے منایئے مگر ساتھ ساتھ غربت میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... ، بے روزگاری میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... خودکشیوں میں آزادی کا جشن بھی منایئے... اخلاقی اقدار سے آزادی اور قانون سے آزادی کا جشن بھی منایئے...، دہشت گردی اور جرائم میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... انسانی حقوق سے آزادی کا جشن بھی منایئے .... اور پھر اپنی قومی جہالت کی آزادی کا جشن بھی منایئے۔آج ہم بحیثیت قوم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں چاروں طرف سینکڑوں بحران جبڑے کھولے ہماری ذرا سی لغزش کے منتظر ہیں۔ ایک طرف ہمارا

سب سے بڑا بحران نظریاتی یکجہتی ، فکری وحدت اور اتحاد و اتفاق سے محروم ہے تو دوسری طرف امن و امان کی دگرگوں صورتحال کا بحران ہے ، ایک طرف ہمارا حال ہے جو روز بروز لا قانونیت کی دلدل میں دھنسا چلا جا رہا ہے تو دوسری طرف ہمارا مستقبل وہ نوجوان نسل ہے جسے علم کو اپنا آلہ کار بنانا ہے، مگر وہ خود دہشت گردی کا آلہ کار بن چکی ہے۔ جن کے ہاتھوں کو کل قوم کے مستقبل کی باگ ڈور سنبھالنی ہے ان میں آج کتابیں نہیں بلکہ قوم کی تباہی کے سامان ہیں۔ دماغ علم کی روشنی سے منور نہیں بلکہ اسلحہ اور ہتھیاروں سے لیس ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ طبقاتی تفریق ، استحصالی نظام ، ہنر کی ناقدری ، تعلیمی ڈھانچے کا کھوکھلا پن ، اختیارات کا ناجائز استعمال اور اخلاقی اقدار کا فقدان جیسی خوفناک آندھیاں ہیں جن سے ہمارا حال بری طرح لرز رہا ہے۔ جمہوری روایات کے فقدان کا المیہ جس نے ماضی تباہ حال سے بے حال اور اب مستقبل کو رسوا کرنے کا بیڑہ اپنی قوم کو ہر پل گرتی معیشت کے ساتھ ہاتھوں میں کشکول کا تحفہ دے کر ایک شان سے اٹھا رکھا ہے۔ غریب کا چولہا بجھ گیا ہے تو اشیائے خورد و نوش کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں۔ 60 فیصد ہم وطن پہلے ہی خط غربت تلے زندگیاں گزارنے پر مجبور تھے تو رہی سہی کسر قدرتی آفات سے بے گھر ہوئے ہم وطنوں نے پوری کر دی۔ پینے کے صاف پانی سے محروم اور بجلی کی نعمت چھینی جا چکی ہے۔

نظام صحت کے اخراجات نا قابل برداشت اور ایک عام انسان کے بس سے باہر ہیں۔ یہی قیامتیں کیا کم تھیں کہ کراچی اور

لاہور کی دہشت گردی سے اور ملک بھر میں ہوتے ہوئے بم دھماکوں نے لاشوں کے انبار لگا دئے۔

میرے ہم وطنو ! ...ابابیلوں کے لشکر ہم جیسی بے ایمان ، بے یقین اور بے حس قوموں کی طرف نہیں اترا کرتے۔ ہم ایک ضمیر فروش وطن فروش اور ایمان فروش قوم ہیں۔ ہم وہ قوم ہیں کہ جن کے مولوی حلوے کی چند پلیٹوں کی خاطر تو کافر میں مومن میں مسلمان تو مرتد کا ورد کرتے ہیں اور ہم اس پر آمین کرتے چلے آرہے ہیں ...ہم خود وہ غربت کی ماری قوم ہیں جو یوں تو جمہوریت کا رونا روتے ہیں مگر چودھری وڈیرے اور جاگیردارانہ نظام کے تناور درخت کو اپنے لہو سے سینچتے چلے آرہے ہیں . ... ہم وہ بے غیرت قوم ہیں جو" امریکی کتے ہائے ہائے" کے نعرے تو بہت غیر تمندی سے لگاتے ہیں مگر جب بھی مصیبت پڑے کشکول تھامے بے غیرتی سے اسی کی طرف دوڑتے ہیں ....
ہم وہ بے ضمیر قوم ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اپنے مسلمان بھائیوں کا لہوتک بیچتے ہیں ...کہ آؤ ہم پر سے اقتصادی پابندیاں اٹھانے کا وعدہ کرو ہم افغانستان کو قبرستان بنانے کے لئے تمہاری راہیں ہموار کرتے ہیں ... آؤ اور مال وزر سے ہماری تجوریاں بھر دو ہم اپنے مادر وطن کے کسی بھی حصے پر بمباری کرنے کی پوری اجازت دیتے ہیں ... آؤ اور ہمیں جنت کے ٹکٹ دو ہم ملک کو جہنم بناکے تمہارے ازلی سپنے پورے کرتے ہیں ....آؤ اور صرف ہمیں مسلمانیت کا سرٹیفکیٹ دے دو اور ہم اپنی سر زمین پاک

پر کافروں کے لہو کی ندیاں بہا کر تمہاری خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں ....۔ یہ ہے ہمارا اسلامی جمہوریہ پاکستان، جہاں عدالتوں میں انصاف، درسگاہوں میں ڈگریاں، اسمبلیوں میں ضمیر، اسپتالوں میں جعلی دوائیاں اور مسجدوں میں ایمان تک بکتے ہیں۔ جہاں کلمہ پڑھنے، سلام کرنے اور بسم اللہ کہنے پر تو ایک غیر مسلم کو پھانسی پر بھی چڑھایا جا سکتا ہے مگر مزار قائد پر دختر ملت کی آبرو ریزی کرنے والے کو کٹہرے تک نہیں لایا جا سکتا۔ اگر مسجدوں سے نفرت کی منادی اور مدرسوں سے خود کش بمبار جہادی بن کر نکلتے ہیں تو نکلنے دو ہم اپنے گھروں میں بیٹھے اسلام کے نام کی مالا جپتے رہیں گے۔ اگر امریکی فوج اور طالبان نامی ظالمان ہماری ہی سرزمیں پر ایک دوسرے کا لہو پی کر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو کرنے دو، ہم منرل واٹر سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ اگر ماؤں بہنوں کی عصمتیں نیلام ہوتی ہیں تو ہونے دو ہم جوش و خروش سے مدر ڈے منا لیا کریں گے ..... اگر حکمران ملکی خزانہ لوٹتے ہیں تو لوٹنے دو، تو ہم بسنت کی چڑھتی پتنگیں لوٹتے رہیں گے .... اگر ہم وطنوں کی تمناؤں کے پھول مرجھاتے ہیں تو مرجھانے دو ہم ویلن ٹائن ڈے دھوم سے منا لیا کریں گے ...اگر غریب کا چولہا بجھتا ہے فاقوں سے بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بلبلاتے ہیں، صاف پانی نہ پینے سے ہزاروں، اموات ہوتی ہیں، بے روزگاری کے ستائے مینار پاکستان سے چھلانگیں لگا کر جان دینے والوں کی آرزوئیں لٹتی ہوں یا پھر مزار قائد پر قوم کی بیٹیوں کی عصمتیں ... ہمیں سوچنے کی بھلا کیا ضرورت ہے

ہمارے لئے تو اتنا ہی بہت ہے کہ ہمارا پاکستان آزاد ہے۔ پاکستان زندہ باد...پاکستان زندہ باد...پاکستان زندہ باد.....

میرے عزیز ہم وطنو !...کب تک خون بہے گا اپنے اس گلستان میں ؟...کب تک وقت کی آندھیاں ہماری شاخیں قلم کرتی رہیں گی ؟..کب تک ہم اپنے ہاتھ اپنے ہی ہم وطنو کے لہو سے رنگتے رہیں گے ؟...کب تک ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی اس نام و نہاد آزادی کا جشن دھوم دھام سے مناتے رہیں گے ؟... کب تک اس 65 سالہ بوسیدہ آزادی کے تصور کو لئے خود کو دھوکہ دیتے رہیں گے ؟...احساس کی کونپلیں اب بھی نہ پھوٹیں تو پھر کب پھوٹیں گی ؟ ہمارا سویا ہوا ضمیر اب بھی نہ جاگا تو پھر کب جاگے گا ؟آخر کب تک ہم اپنی ناکامیوں پر آزادی کے جشن کا پردہ ڈال کر ناچتے رہیں گے ؟... آخر کب تک ؟ ایک نہ ایک دن تو ہمیں بھی وقت کے کٹھرے اور ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہو کر اس سوال کا جواب دینا ہی ہو گا کہ " کیا ہم آزاد ہیں ؟راقم کالمسٹ کونسل آف پاکستان کے صدر کے طور پر ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔

غریب غریب تر۔ امیر امیر تر

بدامنی کی وجہ سے عوام ذہنی مریض بن گئے ہیں ۔ غیر جانبدارانہ ، منصفانہ انتخابات ہی تمام مسائل کا حل ہیں۔کارکن عام انتخابات کی تیاریاں کریں ۔آپ کو کیا لگا یہ ساری باتیں میں کررہاہوں ارے نہیں بھائی یہ کہنا ہے جے یو آئی کے مرکزی امیر مولانا فضل الرحمٰن کا۔انھوں نے گزشتہ روز اپنی پارٹی کے رہنماؤں سے خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ سیاست دان گزشتہ نعروں پر عمل نہیں کرسکے جس کی وجہ سے عوام نعروں کی سیاست سے بیزار ہوچکے ہیں ۔حکومت نے سب اچھا کی رٹ لگا رکھی ہے لیکن مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھتے ہی جارہے ہیں ۔ مولانا صاحب نے مزید کہا کہ مہنگائی نے عوام کا جینا محال کردیاہے اور بدامنی کی وجہ سے عوام ذہنی مریض بن گئے ہیں'' میں مولانا کی بات کے ساتھ 100 فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ مسلسل بدامنی نے عوام کو ذہنی مریض بنا دیا ،اور مہنگائی کی وجہ سے غریب عوام کا جیناہی نہیں مرنا بھی مشکل کردیاہے ۔وہ اس لیے کہ کفن دفن پر بھی لواحقین کا خرچہ ہوتا ہے اور پھر افسوس کرنے کیلئے آنے والوں کو چائے پانی پلانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔جہاں تک بات ہے صاف شفاف اور منصفانہ انتخابات کی وہ بھی مولانا صاحب نے درست کہا کہ غیر جانبدارانہ انتخابات کے ذریعے ہی ایسے لوگ منتخب کئے جاسکتے ہیں جو تمام مسائل کو حل کرنے کی مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ عوام

کے ساتھ مخلص بھی رہیں۔ مولانا کی تمام باتوں سے میرا اتفاق ہے لیکن پھر بھی ذہن میں کچھ سوالات اُٹھتے ہیں جن کے جوابات تلاش کرنا بہت ضروری ہیں۔اگر ملک میں پھیلی بدامنی نے صرف عوام کو ذہنی مریض بنایا اور حکمرانوں سمیت تمام سیاست دان جن میں مولانا بھی شامل ہیں کو کچھ فرق نہیں پڑا تو کیا عوام یہ سوچنے پر مجبور نہیں کہ سیاست دان ملک و قوم کے ساتھ مخلص نہیں ؟اگر پاکستان کے عوام اس قدر غریب ہیں کہ ان کا جینا محال ہے تو پھر پاکستان کے سیاستدان اس قدر امیر کس طرح بن گئے جبکہ ملک تو ایک ہی میں رہتے ہیں؟ سیاست دان امیر ترین ہیں اور عوام غریب تر پھر بھی سیاست دان کہتے ہیں کہ وہ عوام کی امنگوں کے ترجمان ہیں، عوام کے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں، عوام کے ساتھ ہمارا رشتہ بہت گہرا ہے، عوام ہمارا ساتھ دے تو عوام کی تقدیر بدل دیں گے۔اقتدار میں آ کر عوام کو ایک نیا پاکستان دیں گے۔ قائداعظم نے پاکستان بنایا تھا ہم پاکستان بچائیں گے اور پتا نہیں کیا کیا کہتے ہیں سیاست دان۔ سوال یہ کہ عوام کس طرح سچ مان لیں ان باتوں کو؟ایک بات تو بالکل ہی سمجھ میں 8 نہیں آتی جب سے ہوش سنبھالا ہے سیاست دانوں کو یہی کہتے سنا ہے کہ ہم پاکستان کو بچائیں گے۔کیا پاکستان کسی کبوتر کا نام ہے جسے یہ لوگ بلی سے بچائیں گے ؟کیا پاکستان کسی مرغی کے بچے کا نام ہے جس کو ایا چیل یا پھر بلی شکار کرلے گی ؟اگر ان تمام سوالات کے جوابات منفی ہیں تو پھر عوام کا یہ سوچنا کہ جمہوریت سے تو آمریت ہی اچھی زیادہ غلط تو نہیں ہے۔ جیسا کے لوگ اب ضیاء الحق اور

پرویز مشرف کو یاد کرتے ہیں۔کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار عبدالستار ایدھی نے بھی کیا ہے۔جس اخبار میں مولانا کا بیان شائع ہوا اسی میں عبدالستار ایدھی کا بیان بھی شائع ہوا جس میں ایدھی صاحب نے کہا کہ ''جمہوریت اچھی چیز ہے لیکن ملک کو مارشل لاء کی ضرورت ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ وڈیروں ،جاگیر داروں اور سرمایہ داروں نے ملک کا بیڑا غرق کر دیا ہے،دولت کی منصفانہ تقسیم کے بغیر غربت ختم نہیں ہو سکتی۔قارئین محترم ذاتی طور پر میں تو جمہوریت کا ہی حامی ہوں مجھے لگتا ہے کہ بری سے بری جمہوریت بھی آمریت سے سو درجہ بہتر ہے لیکن ہو جمہوریت اجارہ داری نہیں ۔میں مایوس تو نہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ موجودہ سیاست دانوں میں کوئی اس قابل ہے کہ ملک و قوم کے مسائل کا بہتر حل نکال سکے ۔کیونکہ یہ سارے کے سارے وہ وڈیرے ہیں جو اپنے جانوروں کو جان بوجھ کر غریب کے کھیت میں چھوڑ دیتے ہیں اور اوپر غریب کسان کو ڈانٹتے بھی ہیں ۔ان کے لیے پاکستان بھی غریب کا کھیت ہی تو ہے۔جب چاہیں غریب کی کھیتی کاٹ لیں ،جب چاہئیں جلا دیں اور جب چاہیں سیلاب کے پانی میں بہا دیں ۔آج غریب عوام کو جتنی بھی مشکلات درپیش ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی حکمران طبقے کے لیے پریشانی کی وجہ نہیں ہے ۔اسی لیے ملک میں پچھلی مسلسل بدترین بدامنی نے صرف غریب عوام کو ہی ذہنی مریض بنایا ہے حکمرانوں کو نہیں

-

حکمرانوں عوام کے صبر سے مت کھیلو

پاکستان میں بجلی کے بحران کو کئی سال گزر گئے مگر کسی حکومت نے اس پر سنجیدگی سے کام نہیں کیا۔جب بھی کسی پارٹی نے اپنی سیاست کو چمکانے کے لیے احتجاج کیا یا کسی تاجر برادری نے احتجاجی دھرنے دیئے، حکومت نے سوائے اس کے کہ فوری طور پر ہنگامی اجلاس بلایا، میڈیا میں دو چار باتیں کیں اور بس اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا، لاکھوں روپے لگا کر ہنگامی اجلاس بلایا جاتا ہے اور نتیجہ میں دو چار دن بجلی ٹھیک ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر وہی روٹین۔ بجلی کی کمی کو پوری کرنے کے لیے کوشش کی بھی گئی تو وہ بھی بے سود، عوام کے دیئے ہوئے مینڈیٹ کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، یہ سب اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ عوام آئندہ سے کسی کو بھی اعتماد کا ووٹ نہ دے سکے، عوام کے اعتماد کیساتھ اس طرح سے کھیلا جائے کہ عوام اس قدر بے حال ہو جائے کہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی منع کر دے کہ کبھی بھی پیپلز پارٹی کو ہمدردی اور اعتماد کا ووٹ نہ دینا، حکمرانوں عوام کے صبر سے مت کھیلو۔ایسا نہ ہو کہ عوام کے صبر کا پیانہ لبریز ہو جائے اور عوام تمہارے محلوں پر قبضہ کر لیں، حضرت عمر فاروقؓ کی بیوی (عاتکہ) کہتی ہیں کہ عمرؓ بستر پر سونے کے لیٹتے تھے تو نیند ہی اڑ جاتی تھی، بیٹھ کر رونا شروع کر دیتے تھے، میں پوچھتی تھی، اے امیر المومنین، کیا ہوا؟ وہ کہتے تھے مجھے محمد ﷺ کی

امت کی خلافت ملی ہوئی ہے،اور ان میں مسکین بھی ہیں، ضعیف بھی ہیں، یتیم بھی ہیں، مظلوم بھی ہیں، مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ان سب کے بارے میں سوال کرینگے، مجھ سے جو کوتاہی ہوئی تو میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کیا جواب دونگا، سیدنا عمرؓ کہتے تھے اللہ کی قسم اگر دجلہ کے دور دراز علاقے میں بھی کسی خچر کو راہ چلتے ٹھوکر لگ گئی تو مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہ کر دیں،اے عمرؓ تونے وہ راستہ ٹھیک کیوں نہیں کروایا تھا، یہ تھے خلیفہ حجرت عمر فاروقؓ جنہیں اپنی رعایا کا اس قدر خیال تھا اور ایک ہیں ہمارے حکمران جن پر نہ تو عوام کی بدعائیں اثر کرتی ہیں،اور نہ ہی ان حکمرانوں کو اللہ کے غیث وغضب کا ڈر ہے، عوام حکمرانوں کو جھولیاں اٹھا اٹھا کر بدعائیں دیتے ہیں لیکن سب بے اثر،ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، کیا کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرے تو وہ چھپ جاتا ہے؟ ہماری حکومت بس یہی کر رہی ہے مگر کبوتر چھپا نہیں بلکہ اس نے اپنے لیے بہت سے خطرات پیدا کئے ہوئے ہیں ۔کاروباری لحاظ سے جو نقصان ہو رہا ہے ۔وہ تو ہو ہی رہا ہے جو کہ سب کو نظر بھی آتا ہے۔ مگر معزز قارئین آپکی توجہ ایسی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں جو ہماری قوم کو دیمک کی طرح کھا رہی ہے اور ہمارے حکمران خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں ۔بجلی کے اس بحران میں مہنگائی کا جن بوتل سے باہر آ کر کھلم کھلا لوگوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہو رہا ہے، بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کاروباری حلقوں میں جہاں دس لوگ کام کرتے تھے وہاں پانچ لوگ کام کر رہے ہیں، جو پانچ

لوگ کام سے فارغ ہو گئے انہوں نے اخراجات کہاں سے پورے کرنے ہیں۔بچوں کی فیسیں کہاں سے ادا کرنی ہیں، بجلی جو آتی نہیں اس کے بھاری بھر بل کہاں سے ادا کرنے ہیں،ڈاکٹر کی دواؤں کے پیسے کہاں سے دینے ہیں، اس قدر بے روزگاری ہو چکی ہے کہ اب نوکری تو جلدی ملے گی نہیں کیوں کہ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے فیکٹریاں،کارخانے تو بندپڑے ہیں، ۔اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیئے انسان غلط کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔دن دیہاڑے ڈاکے ڈالتا ہے،چوریاں کرتا ہے،ناجانے پیٹ کی آگ کو بجھانے کی غرض سے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اور معاشرے میں بگاڑ اور شر جیسی لعنتیں جنم لیتی ہیں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ہمیں بتایا کرتے تھے کہ اچھی ورکنگ پرفارمنس کیلیئے ورکنگ ایریا کا ماحول اچھا ہونا چاہئے، مثلاً درجہ حرارت، دیواروں کے کلر، اور لائٹوں کی روشنی، وغیرہ۔ مگر یہاں تو لائٹ ہی نہیں ہوتی اندھیرے اور گرمی میں کام کرنا پڑھتا ہے۔اس صورت حال میں لوگوں کی کام کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے اور ذہنی پریشانی کا سبب بنتی ہے ،اسی ذہنی پریشانی میں ورکر گھر پہنچتے ہیں تو ان کی برداشت کی طاقت تقریبا ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ چھوٹی سی بات پر غصہ آتا ہے۔ دوسری طرف گھر والے بھی بجلی کے بار بار بند ہونے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ ایک ماں بچوں کی پرورش بھی کر رہی ہوتی ہے اور گھر کے کام کاج بھی، بجلی کی لوڈشیڈنگ نے زندگی میں سکون حرام کر رکھا ہے۔خاوند اپنی پریشانی میں گھر جاتا ہے اور بیوی پہلے سے پریشان ہوتی ہے اگر کوئی بات

بیوی کے منہ سے نکل گئی تو اس کی خیر نہیں اور اگر خاوند نے کوئی غلط کر دیا تو اس کی خیر نہیں نتیجہ میں گھریلو پریشانیاں اور ناچاقیاں جنم لیتی ہیں ۔ میاں بیوی تو دونوں لڑتے ہیں یہاں مگر نقصان بچوں کا ہوتا ہے ۔ وہ بچے جنھوں نے کل ہماری اس ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالنی ہے ۔ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہو گی تو ان کی ذہنی نشوونما پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ جو نسل ان دس سالوں میں جوان ہوئی اس کو اپنا مستقبل نظر نہیں آتا ۔ ضروریات بڑھ گئی ہیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے ہے۔ نوجوان غلط طریقہ کار اختیار کرتے ہیں اور نتیجہ میں قتل ،چوری ڈکیتی کی وارداتیں جنم لے رہی ہیں ۔ اور ان سب وارداتوں کے ذمہ دار حکمران ہیں ۔ اور یہ ہے وہ پلان جو بیرونی طاقتیں کیے بیٹھی ہیں ۔ ہماری موجودہ قوم تو اور بھی 10 سال گزار سکتی ہے مگر آنے والی نسل تباہ ہو چکی ہے ۔ یہودی اور بھارتی اور امریکی ہماری ذہانت اور بہادری پر خوفزدہ ہیں جب وہ لڑ کر کچھ نہیں کر سکے تو اب یہ سازشیں شروع کیں ہیں اور ہمارے حکمران پچھلے 10 سال سے ان سازشی لوگوں کو تحفظ دے رہی ہے۔ ہٹلر کہتا ہے کے مجھے پڑھی لکھی مائیں دے دو میں سلجھا ہوا معاشرہ دے دیتا ہوں۔ اور آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں بجلی دے دو ہم آپکو پرسکون معاشرہ کی گارنٹی دیتے ہیں۔ خدا کے لیے اے حکمرانوں اپنی قوم کا بھی سوچو کیوں تمہیں دولت اور دنیا کی ہوس نے اندھا کر رکھا ہے ۔ راقم کالمسٹ کونسل آف پاکستان کے مرکزی صدر کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں ۔

آئندہ الیکشن اور عام آدمی

میں ایک عام آدمی ہوں۔ پرانے شہر کی ایک تنگ گلی کے ایک تاریک مکان میں رہنے والا ایک عام آدمی۔ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ بڑے سے بڑا آدمی آپ کو چھوٹے سے چھوٹا فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بڑے سے بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک دائرے میں پھنسی ہوئی ہے اور اس دائرے نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا ہے۔ آج مجھے 500 روپے چاہئیں، صبح سے لے کر شام تک کاوشوں کے بعد نقد ادھار کرکے 500 روپے حاصل کیے۔ پورا دن اس سوچ فکر میں برباد کیا۔ رات ہوتے 500 روپے کا انتظام ہوا۔ اب دوسرے دن پھر 300 روپے کی ضرورت ہے۔ دوسرا دن ان 300 روپے کے انتظام میں گزرا۔ کوئی اور سوچ فکر نہیں بس ان 300 روپے حاصل کرنے کی دھن۔ شام تک 300 روپے کا انتظام ہوا، پھر اگلے دن 450 روپے چاہئیں، غرضیکہ پوری زندگی ان چند کوڑیوں کو حاصل کرنے میں گزر رہی ہے۔ کوئی بڑی سوچ و فکر ہو ہی نہیں سکتی، کیوں کہ ان دو چار سو روپے کی ضرورت اتنی شدت سے ہوتی ہے کہ سوچ اس دائرے سے باہر نکل ہی نہیں پاتی۔ کبھی دودھ، آٹا، گھی، مصالحے کبھی بچے کے اسکول کے خرچے، کبھی بچے کی اسکول کی فیس جو اگر داخل نہیں کی تو بچے کا نام کٹ جائے گا۔ کبھی بجلی کا بل غرضیکہ یہ دو چار سو روپے زندگی کا محور ہو کر رہ گئے ہیں۔ بیوی کے پاس زیور تھے ہی کتنے، لیکن

جو بھی تھوڑے بہت تھے سب فروخت ہو چکے ہیں، اب کوئی ایسی چیز گھر میں نہیں ہے۔ یہ سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی کتنا مشکل ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سفید پوشی کا بھرم بھی ہم جیسے لوگوں کی دماغی کی سوچ ہے، ورنہ معاشرے میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم جیسے لوگ صرف اپنے ذہنی سکون کے لیے سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہیں۔ چند خدا ترس لوگ ہم سے ہنس کر سلام دعا کر لیتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سفید پوش ہیں اور معاشرے میں ہمارا مقام ہے، جب کہ معاشرے میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس سوچ کی پستی نے ہی شاید ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو یہ بڑی فکر ہوتی ہے کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے، جب کہ لوگوں کے پاس ہمارے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ ہم جیسے عام آدمی ایک حد سے زیادہ دوسرے کے سامنے جھکتے بھی نہیں ہیں۔ امیر طبقے کے لوگ اپنا کام نکالنے کے لیے دوسرے کے پیر بھی پکڑ لیتے ہیں۔ دوسرے کے سامنے گڑگڑا لیتے ہیں اور اپنا کام نکال لیتے ہیں، وہ یہ نہیں سوچتے کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ شاید عام آدمی اسی لیے عام آدمی ہوتا ہے، کیوں کہ وہ لوگوں کے اپنے بارے میں سوچنے کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ شاید ہم جیسے عام آدمی صرف اپنے ہی بارے میں سوچتے ہیں اور جب ہم جیسے عام آدمی کو موقع ملتا ہے، تب بھی ہماری سوچ نہیں بدلتی اور ہم اپنے ہی بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ شروع کی چند روپے کی دوڑ دھوپ اپنے بارے میں سوچنے کی عادت اتنی مضبوط کر دیتی ہے کہ عام آدمی کتنے ہی بڑے مقام پر پہنچ جائے

صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا رہ جاتا ہے۔ قوم وملت، ملک، رشتہ دار خاندان، پڑوسی، مسافر وغیرہ کسی کے بارے میں کوئی سوچ نہیں ہوتی۔ عام آدمی میں اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرنے کی عادت بھی پہنچتی ہے، کیوں کہ میں ایک عام آدمی ہوں اس لیے یہ عادت مجھ میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔آج کے دور کی قسمت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ نااہل آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور اہل انسان دروازے کے بارے کھڑا ہے۔ نااہل آدمی رشوت اور سفارش کے زور پر کرسی تک پہنچ جاتا ہے، کیوں کہ یہ نااہل ہوتا ہے، اسی لیے سفارش یا رشوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اہل انسان عام طور پر رشوت دینے یا سفارش لگوانے کے قابل نہیں ہوتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیت میں کمی آتی جاتی ہے اور مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے مزاج میں شکوہ کرنے کی عادت اور تلخی آجاتی ہے۔ ہمارے سماج میں بہت ساری خرابیاں جمہوریت کی دین ہیں۔ جمہوریت کی یہ ایک بہت بڑی خرابی ہے۔ دولت اور سیاسی طاقت کے زور پر جاہل آدمی بھی اپنی بات اتنے وثوق سے کہتا ہے گویا کہ صحیح بات کہہ رہا ہو۔

جمہوریت میں سیاسی طاقت کا منبع پیسے اور غنڈہ گردی کی طاقت ہے۔ رہی سہی کسر جمہوریت کے دوسرے ادارے پوری کردیتے ہیں۔ مثال کے طور پر الیکشن کمیشن نے الیکشن پر خرچ کرنے پر ایک حد قائم کردی۔ اس سے پہلے سیاسی لوگ الیکشن لڑتے تھے۔ خرچ، پوسٹر، بینرز، اشتہار بازی، بلے، جھنڈے وغیرہ میں ہوتا تھا، اس سے لوگوں کو روزگار ملتا تھا۔ اب سیاسی لوگ ان چیزوں پر خرچ نہ کرکے ووٹ خریدنے پر خرچ کرتے ہیں اور ان

سیاسی لوگوں کو ووٹ خریدنے میں آسانی بھی ہو گئی ہے، گویا کہ الیکشن کمیشن نے سیاسی لوگوں کا کام اور آسان بنا دیا ہے۔ اب تو جو امیدوار ووٹ کی جتنی زیادہ قیمت لگائے گا وہی جیتے گا۔ ان امیدواروں کے پیچھے مختلف قسم کے مافیا ہوتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ امیدوار کا تعین کرتے ہی مافیا ہیں جب امیدوار مافیا کی مدد سے جیت کر آئے گا تو ظاہر ہے کس کا کام کرے گا؟ ان امیدواروں کا تعلق اب عوام سے نہیں ہے، بلکہ جس کی سپورٹ پر جتنا بڑا مافیا وہی الیکشن جیتے گا۔ عوام تو صرف ووٹ بیچتے ہیں۔ اس ووٹ کی خریداری میں بھی دلال ہوتے ہیں جو اپنا معقول کمیشن رکھتے ہیں۔ الیکشن کمیشن اپنی کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے الیکشن پر زیادہ خرچ کرنے پر پابندی لگا دی ہے، کوئی بھی امیدوار حد سے زیادہ خرچ کرتے ہوئے پایا گیا تو اس کے خلاف کارروائی ہوگی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اب الیکشن کا خرچ پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ امیدوار جو فی ووٹ پچاس روپے کا خرچ کرتا تھا، اب پانچ سو سے زیادہ خرچ کرتا ہے اور ووٹر کی حیثیت بھی اب بہت کم رہ گئی ہے، کیوں کہ امیدوار کو معلوم ہے کہ ووٹر سیاسی دلالوں کے ذریعے خریدے جاتے ہیں۔ گویا کہ الیکشن اب وہ جیتے گا جس کا تعلق اچھے اور بڑے قسم کے سیاسی دلالوں سے ہوگا اور زیادہ بڑا اور زیادہ پیسے والا مافیا جس کی سپورٹ پر ہوگا۔ ہم نے آج تک کوئی ایسا پارلیمنٹ، اسمبلی ممبر نہیں دیکھا جو اپنے کردار، اعلیٰ اخلاقی معیار یا کسی نظریے کی بنیاد پر جیت کر آیا ہو۔ سارا کھیل پیسے اور

طاقت کا ہے۔ آج کی جمہوریت میں کسی کا کوئی نظریہ، نظام حکومت، عوامی فلاح یا اور کوئی تعمیری کام کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی سیاسی لوگوں کا عوام سے کوئی تعلق ہے۔ بس خانہ پری کے لیے سیاسی لوگ عوام کے بیچ میں آتے ہیں ورنہ الیکشن کے فیصلے تو بند کمروں میں ہوتے ہیں۔ یہ تو بات ہوئی ملک کے اندر کی۔ اب سوال یہ ہے کہ مرکز میں یا صوبے میں حکومت کون بنائے گا تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس کا فیصلہ ہمارے ملک کے اندر نہیں ہوتا۔ خاص طور سے مرکزی حکومت بنانے کے لیے کسی پارٹی کو اپنا قبلہ متعین کرنا ہوتا ہے۔ اس قبلے کا رخ امریکہ، یورپ وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس قبلے کے رخ کا تعین کھلے عام بھی ہو سکتا ہے اور کئی اور دیگر ممالک کی طرح چوری چھپے سے بھی ہو سکتا ہے۔ مقصد تو قبلے کے رخ کو طے کرنا ہے۔اب یہ جمہوریت کا کھیل بین الاقوامی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ دکھاوے کے لیے یہ قبلے کا رخ مختلف ہو سکتا ہے، لیکن دراصل یہ رخ ایک ہی ہے جو امریکہ بہادر طے کرے گا،اور عوام پر مسلط کردیا جائے گا۔

شناخت کون کرے گا؟

جب آزاد اور طاقتور الیکشن کمیشن جعلی ڈگری والوں کے خلاف ایکشن لینے سے قاصر ہے توحکومت پھر بجلی چوروں کو کس طرح پکڑ سکتی ہے ؟ یہ بجلی چور تو وہی ہیں جو جعلی ڈگری والے ہیں ، سنا ہے کہ حکومت بجلی چوروں کے خلاف کریک ڈاؤن کرنے جا رہی ہے۔بڑی ہی عجیب بات ہے جو خود چور یا چور کا ساتھی وہ کیا چور کو سزا دے گا؟ کتنی احمقانہ بات ہے کہ بجلی چوروں کو پکڑیں گے ۔ کوئی آپ سے پوچھے کہ پہلے بجلی چوری کرواتے کیوں ہو؟ آج یہ بات سب جانتے ہیں کہ واپڈا ملازمین کی مرضی بغیر کوئی مائی کا لال بجلی چوری نہیں کر سکتا اس بات سے بھی سب واقف ہیں کہ ملازمین اپنے آفیسر کا حکم مانتے اور اگر کرپٹ آفیسر ملے تو چھوٹے ملازمین بھی اپنے حصے یا اُس سے زیادہ بھی لوٹ مار کرتے ہیں اور اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ آفیسر کون ہیں اور اُن کو تعینات کون کرتا ہے۔مثال کے طور پر کاہنہ نو واپڈا سب ڈویژن میں تقریباً پچھلے 4 سالوں سے جو ایس ڈی او تعینات ہے وہ مقامی ایم این اے کا قریبی رشتہ دار ہے اور مجال ہے کہ کسی کی کہ اُسے کرپشن ، رشوت، سفارش یا بجلی چوری سے روکا ہو، وہ اپنی مرضی سے دفتر آتا اور جاتا ہے ۔ ملک بھر میں بجلی چوری عام ہے لیکن ایک بات قابل غور ہے کہ حکومت نے یہ نہیں کہا کہ نامعلوم بجلی چوروں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا جائے گا۔ یہ خبر پڑھ کر میں نے

اپنے واپڈا ملازم دوست سے پوچھا کہ جب آپ بجلی بند کرتے ہیں تو عوام آپ کو گالیاں اور بد عائیں دیتے ہیں۔ابھی میری بات پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ جلدی سے بولا جناب ہمیں پتا ہوتا ہے اب ایسا ہونے والا ہے اس لیے ہم بجلی بند کرنے سے پہلے ہی وہ ساری گالیاں اور بد عائیں عوام کو دے دیتے ہیں جو عوام ہمیں بعد میں دیتے ہیں۔یہ لئے کہا یار آپ کو تکلیف نہیں ہوتی جب لوگ کہتے ہیں کہ بجلی والوں کی ماں مر گئی
یا مر جائے؟اُس نے زور دار قہقہ لگایا اور ہنستے ہوئے بولا تبسم صاحب آپ جانے کس دنیا میں رہتے ہیں۔صرف واپڈا والوں کی ہی نہیں بلکہ کسی بھی سرکاری آفیسر کی ماں نہیں مر سکتی اور رہی بات چھوٹے ملازمین کی تو وہ تو آفیسروں کا حکم مانتے ہیں اس لیے عوامی گالیوں اور بد عاؤں سے اُن کا کوئی تعلق نہیں بنتا کیونکہ وہ بے چارے اگر اپنے آفیسر کا حکم نہیں مانیں گے تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔اُس نوکری سے جسے حاصل کرنے کے لیے اُنہیں اپنی ماں کا زیور بیچنا پڑا تھا۔میں نے سوال کیا یہ آج کل جو حکومت نے بجلی چوروں کے خلاف کریک ڈون کا اعلان کر رکھا ہے اس پر کہاں تک عمل ہوگا اور کتنی حد تک کامیابی مل سکتی ہے؟اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بہت چھوٹا جواب دیا کہنے لگا مجھے نہیں لگتا کہ کچھ ہوگا۔قارئین محترم جب جعلی ڈگری ثابت ہونے پر بھی یہ بات واضع ہونے کے باوجود کہ سیاست دانوں نے عوام کے ساتھ دھوکہ کیا تھا تو بھی آزاد،خود مختار اور مضبوط الیکشن کمیشن کچھ نہیں کر سکتا تو نامعلوم بجلی چوروں اور نامعلوم قاتلوں کو کون پکڑ سکتا ہے؟ویسے

بھی عوام کے لیے اب ایسی خبریں کچھ معنی نہیں رکھتیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کچھ نہیں ہونے والا یونہی بجلی و گیس ہی نہیں پاکستان کے تمام تر وسائل چوری ہوتے رہیں گے ۔حکمران یونہی قوم کی خدمت کرتے رہیں گے اور قوم بے فکر ہو کر سوتی رہے گی، ملک میں جمہوریت بھی موجود ہے ، فوج ،اعلیٰ عدلیہ اور تمام سیاسی جماعتیں بھی جمہوریت کی بھرپور حامی ہیں، قوم کے منتخب نمائندے ملکی خوشحالی و ترقی کی کوشش میں دن رات مصروف ہیں۔ نامعلوم قاتل قتل عام کرنے میں میں مصروف ہیں ،نا معلوم کرپٹ لوگ ملکی وسائل لوٹ رہے ہیں ،نامعلوم دہشتگرد روزانہ دہشتگردی کی وارداتیں کرنے میں مصروف ہیں اور نامعلوم ووٹر ملک دشمن لوگوں کو ووٹ ڈالنے میں مصروف ہیں۔ اتنی مصروفیت میں نامعلوم حکمران نامعلوم بجلی چوروں اور نامعلوم جعلی ڈگری والوں کی شناخت کون کرے گا ؟

قومی حلقہ این اے 129 میں سیاسی ہلچل زوروں پر

حلقہ این اے 129 میں الیکشن کا بگل بجتے ہی سیاسی جوڑ توڑ عروج پر پہنچ گیا۔ رانا، سندھو، گھرکی، سردار گروپوں نے صف بندی شروع کر دی۔ لاہور کا حلقہ NA-129 جس میں زیادہ تر دیہات کا علاقہ شامل ہے۔ یہاں سالوں سے مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی میں مقابلہ ہوتا آ رہا ہے، اب نئے الیکشن کے بگل بجنے کی آوازیں سنائی دیتے ہی رانا، سندھو، سردار گروپ نے اس حلقہ میں جوڑ توڑ اور صف بندی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ رانا گروپ جس کی قیادت رانا مبشر اقبال کرتے ہیں ان کا تعلق مسلم لیگ (ن) سے ہے۔ جبکہ سندھو گروپ جس کی قیادت چوہدری محمد منشاء سندھو کرتے ہیں ان کا تعلق پہلے مسلم لیگ (ن)، (ق) سے تھا اب پاکستان تحریک انصاف سے ہے۔ حلقہ این اے 129 کے دیہاتی علاقہ میں زیادہ تر پیپلز پارٹی کا ووٹ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پر مذہبی ووٹ کے ساتھ ساتھ برادریوں کے ووٹ کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ حلقے میں رحمانی، انصاری، جٹ، بھٹی، آرائیں اور میو برادریاں موجود ہیں جو اس آنے والے الیکشن میں اپنی اپنی طاقت شو کرنے کے لیے اب تک کئی اجلاس منعقد کر چکی ہیں، اس حلقہ میں وہی پرانی دھڑہ بندی چلی آ رہی ہے۔ اگر ایک دھڑہ پیپلز پارٹی کے ساتھ لگتا ہے۔ تو دوسرا مسلم لیگ ن سے جا ملتا ہے۔ لیکن اس حلقہ این اے 129 میں اس وقت جو بڑے مسائل سامنے آ رہے ہیں ان

میں انڈسٹری کا تباہ ہو جانا ہزاروں کا بے روزگار ہو جانا، یہاں پر کسی نئی انڈسٹری / صنعت کا نہ لگنا ہے۔ سوئی گیس اور بجلی کی بندش نے یہاں پر لوگوں کے کاروبار اور انڈسٹری کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔ لیکن گزشتہ انتخابات کے دوران منتخب ہونے والے مقامی ممبران اسمبلی کی جانب سے اس ضمن میں آواز نہ اٹھائے جانے کی وجہ سے ووٹرز شاکی دیکھائی دیتے ہیں لیکن ان تمام مسائل اور عوام کے شکوؤں کے باوجود حلقے کی دونوں پرانی سیاسی حریف جماعتوں نے آئندہ الیکشن میں جیت کیلئے اپنے اپنے گھوڑے دوڑانے شروع کردیئے ہیں۔ قومی حلقہ 129 لاہور مضافات کے علاقوں پر مشتمل ہے اس حلقے میں لاکھوں نفوس پر مشتمل آبادی رہائش پزیر ہے۔اس حلقے میں الیکشن 2008 ء میں پیپلزپارٹی کے امیدوار طارق شبیر میوٗ نے ق لیگ کے حبیب اللہ وڑائچ ،اور ن لیگ کے سردار عادل عمر کو شکست سے دوچار کیا تھا۔اس حلقے میں عیسائی برادری اور میوٗ برادری کا ووٹ بینک متاثرکن حالات پیدا کرتا ہے۔اور جس امیدوار کو عیسائی برادری اور میوٗ برادری اپنا ووٹ کاسٹ کرتی ہے۔اس امیدوار کے جیتنے کے امکانات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ حلقے میں اس مرتبہ الیکشن 2013ء میں سیاسی جماعتوں نے اپنے امیدوار ابھی تک شو نہیں کئے۔تاہم ذرائع کے مطابق مسلم لیگ ن نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ پچھلے الیکشن میں پٹے ہوئے امیدواروں سے کنارہ کشی کی جائیگی اور ان کی جگہ اہل اور نئے چہروں کو میدان میں اتارا جائیگا۔ایک حلقے کے مطابق اس قومی حلقے سے مسلم لیگ ن خواجہ سعد رفیق، مریم نواز یا پھر میاں

نصیر احمد کو میدان میں اتار سکتی ہے ،کیونکہ اس حلقے سے سردار عادل عمر اور رانا مبشر اقبال بھی قومی اسمبلی کے ٹکٹ کے لئے کوششوں میں مصروف ہیں، سردار عادل عمر کو پچھلے الیکشن میں بری طرح ہارنے کی بنا پر اور رانا مبشر اقبال کو جعلی ڈگری کے الزام لگنے کی صورت میں مسلم لیگ ن کے ٹکٹ سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے،اس قومی حلقے سے پیپلز پارٹی نے ابھی تک اپنے پتے شو نہیں کئے اور بعض حلقوں کے مطابق پیپلز پارٹی کے گزشتہ الیکشن میں جیتنے والے امیدوار طارق شبیر میو کو ہی ٹکٹ دیا جائیگا، لیکن اس کا فیصلہ نہیں ہوسکا۔ تحریک انصاف بھی ابھی تک گو نا گو کی صورتحال سے دوچار دکھائی دیتی ہے۔ تحریک انصاف نے بھی ابھی تک اپنے مہرے شو نہیں کئے حالانکہ قومی حلقہ 129 میں تحریک انصاف کے پاس مضبوط امیدوار چودھری محمد منشاء سندھو ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی پانسہ پلٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ تحریک انصاف کو اسی حلقے سے ملک نواز اعوان کی صورت میں امیدوار میسر ہے ،اب فیصلہ تحریک انصاف کی قیادت کو کرنا ہے کہ وہ ٹکٹ کا اہل کسے تصور کرتی ہے۔اس قومی حلقے میں صوبائی حلقہ 159 بھی شامل ہے جس میں زیادہ تر دیہاتی آبادی شامل ہے۔اس حلقے سے ہر قومی جماعت کے درجنوں امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کروا رکھے ہیں۔ جن میں مسلم لیگ ن سے راؤ شہاب الدین خان میو، رانا خالد قادری، میاں مقصود عالم، ملک خالد فاروق کھوکھر، شاہد شبیر میو، رمضان مستانہ ودیگر کے نام نمایاں ہیں، مسلم لیگ ن کی قیادت گزشتہ الیکشن میں بری طرح

ہارنے والے امیدوار رانا خالد قادری پر رسک نہیں لے گی اور اس بار الیکشن میں راؤ شہاب الدین میو اور میاں مقصود عالم مضبوط امیدوار کے طور پر سامنے آئے ہیں، مسلم لیگی قیادت راؤ شہاب الدین میو یا میاں مقصود عالم میں سے کسی ایک کو میدان میں اتار سکتی ہے، پاکستان پیپلز پارٹی نے بھی پس پردہ اپنا امیدوار سابق ایم این اے ارشد گھرکی کے صاحبزادے ابوبکر گھرکی کو بنانے کا عندیہ دیا ہے۔ گھرکی خامدان اس حلقے میں خاصہ مقبول ہے۔ تحریک انصاف کو بھی درجنوں امیدواروں نے پی پی 159 کی ٹکٹ کے لئے درخواستیں دی ہیں جن میں علی امتیاز وڑائچ، ملک اصغر علی اعوان ودیگر کے نام سامنے آئے ہیں اب دیکھنا ہے کہ تحریک انصاف کسے اکھاڑے میں اتارتی ہے۔ایک حلقے کے مطابق اسی قومی حلقے 129 سے سابق صدر پرویز مشرف کے بھی الیکشن لڑنے کا امکان ہے، اگر پرویز مشرف اس حلقے سے میدان میں اترتا ہے تو اسے میو اور عیسائی برادری کا بہت بڑا ووٹ بینک ملنے کا امکان ہے، اس صورت میں پرویز مشرف اور تحریک انصاف کے مضبوط امیدوار چودھری منشاء سندھو کے درمیان NA-129 سے کانٹے کا مقابلہ دیکھنے کو ملے گا، سننے میں یہ بھی آ رہا ہے کہ مسلم لیگ ن میں گلوکارہ NA- خواجہ سعد رفیق کو لا رہی ہے اور خواجہ سعد رفیق کے ذاتی حلقے 125 حمیرا ارشد کے الیکشن لڑنے کے امکانات بڑھ چکے ہیں، جب تک تمام جماعتوں کی طرف سے اُمیدواروں کی نامزدگی کرکے ابہام دور نہیں کیا جاتا اُسوقت تک یہاں کے سیاسی افق کا مطلع صاف نہیں ہوگا۔ تحریک انصاف کو بھی صوبائی حلقہ 159 سے

کوئی مضبوط امیدوار دنگل میں اتارنا ہوگا، ورنہ روائتی سیاستدان پھر براجمان ہونگے اور پھر پانچ سال تک عوام کی تقدیر سے کھیلیں گے۔اس بات کا فیصلہ تو سیاسی جماعتوں نے ہی کرنا ہے کہ وہ اپنے کن کن امیدواروں کو الیکشن میں اتارتی ہیں۔اس اہم الیکشن میں عوام پر بھی بڑی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا ووٹ ضرور کاسٹ کریں اور اپنے ضمیر کے مطابق اس شخص کو اپنے ووٹ کا اہل بنائیں جو واقع ہی عوام کے اعتماد، پر پورا اترتا ہو۔ایسا نہ ہو کہ پھر عوام کو دھوکہ دہی اور سبز باغوں کے بہکاوے میں لا کر ووٹ حاصل کرلیا جائے اور عوام ہاتھ ملتی رہ جائے۔ووٹ قومی فریضہ ہے اسے اہل لوگوں کو ضرور کاسٹ کریں۔اب فیصلہ عوام کو ہی کرنا ہے کہ وہ کن سیاسدانوں کے ہاتھوں اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کی باگ ڈور دیتی ہے۔فیصلہ انتہائی سوچ بچار کے بعد ہی کرنا ہوگا جذبات سے کئے گئے فیصلے شرمندگی کا باعث ہوا کرتے ہیں۔

عمران خان تجھے سلام

میں حسب عادت اپنے شاگرد کالم نگار امتیاز علی شاکر سے ملنے اس کے پاس گیا، تو موجودہ سیاسی سیٹ اپ سمیت مختلف ایشوز پر سیر حاصل گفتگو ہوئی، مختلف سیاسی جماعتوں کے پارٹی الیکشن کے حوالے سے بھی تفصیلی بات ہوئی، مجھے امتیاز علی شاکر نے کہا کہ سر بلاشبہ عمران خان نے وہ کر دکھایا جس کا شائد پاکستان کی باقی تمام جماعتیں صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہیں کہ ایک کٹھن اور ناممکن کام کر دیا کہ اپنی جماعت کے پارٹی الیکشن کروا کر پارٹی کو سیاسی ورکرز کے ہاتھوں میں دیدیا، یہ کام آج تک کسی دوسری سیاسی جماعت کیوں نا کر سکی ،ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ پاکستان مسلم لیگ ن کے مقامی ,بزرگ رہنماء راؤناصر علی خان میوؔ بھی تشریف فرما ہوئے، میں بتاتا چلوں کہ راؤناصر علی خان میوؔ مسلم لیگ ن کے ان رہنماؤں میں سے ایک رہنماء ہیں جنہوں نے مشکل ترین وقت میں اپنی جماعت کا ساتھ دیا ،جب پارٹی قائدین پاکستان سے جلاوطن ہو کر جدہ میں عیش وآرام کی زندگی جی رہے تھے اس وقت راؤناصر علی خان میوؔ سمیت بہت سے ورکرز جن میں جاوید ہاشمی، ناصر اقبال خان ودیگر سڑکوں پر ڈکٹیٹر مشرف کی آمریت کیخلاف سینہ سپر تھے، سلام دعا کے بعد راؤناصر علی خان میوؔ بھی شریک گفتگو ہوئے اور کہا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عمران خان نے اپنی جماعت میں الیکشن کروا کر ورکروں

کو ان کا حق دیا ہے، جس کے لئے میں خاص طور پر عمران خان کو سلام پیش کرتا ہوں کہ جس کی جمہوری سوچ نے اپنے ورکروں کو اہم عہدے تفویض کرکے ہمیشہ کے لئے ان کے دلوں میں گھر کرلیا، انہوں نے کہا کہ تبسم صاحب برسوں سے کوئی بھی سیاسی ورکر کبھی بھی کسی جماعت کا سربراہ نہیں بن سکا، ورکر کو کبھی بھی وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جو مقام عمران خان نے اپنے ورکرز کو دیا ہے، انہوں نے کہا کہ ورکرز تو صرف پارٹی جلسوں میں بسیں بھر کرلیجانے اور سچ پوچھیں تو تالیاں بجانے کے کام ہی آتے ہیں اور جب ٹکٹ دینے کی باری آتی ہے تو ہم جیسے ورکرز کو نظر انداز کرکے ان لوگوں کو ٹکٹیں گفٹ کردی جاتی ہیں جنھوں نے مشکل وقت میں میاں نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر مشرف پارٹی کا ساتھ دیا اور جب میاں برادران ملک واپس آئے تو حقیقی ورکر پس پشت چلے گئے اور وہی لوٹے پارٹی ٹکٹ کے حق دار ٹھہرے جنھوں نے پارٹی میں دراڑیں ڈالیں، وہ یہ باتیں کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے اور اپنے آنسو نہ روک سکے، اور کہا کہ کچھ بھی ہوجائے ہمارا تو اب جینا مرنا پاکستان مسلم لیگ ن کے ساتھ ہی ہے، ہماری طرف سے پارٹی ان سب لوٹوں کو ساتھ ملالے جنھوں نے سوائے بدنامی کے پارٹی کو کچھ نہیں دیا، جب سے الیکشن کمیشن آف پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ وہ پارٹی الیکشن میں حاصل نہیں لے سکے گی جو پارٹی الیکشن نہیں کروائے گی، تو گزشتہ دنوں ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے پارٹی انتخابات میں ایک حیرت انگیز کارنامہ کارہائے انجام دیا، کہ ایک پارٹی اجلاس

بلایا تو مخدوم امین فہیم کو پارٹی کا صدر اور برسوں سے پیپلز پارٹی کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر براجمان رہنے والے جہانگیر بدر کو جنرل سیکرٹری شپ سے ہٹا کر سابق گورنر پنجاب لطیف کھوسہ کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا،اور ساتھ ہی ساتھ پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو کو بھی چیئرمین شپ سے ہاتھ دھونا پڑا حالانکہ پارٹی ورکرز نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے اگلے وزیر اعظم بلاول بھٹو ہی ہونگے ۔لیکن پارٹی ہائی کمان کو یہ بات نہیں بھا سکی،پاکستان میں برسوں سے چند خاندان ہی حکمرانی کا تاج پہنتے ہیں اور ان کی جانشینی انہی کی اولادوں کے حصے میں آتی ہیں،جیسے کہ پاکستان پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو سے نصرت بھٹو،بے نظیر سے بلاول بھٹو تک اور اس کے بعد آصفہ بھی جانشینی کی امیدوار ہیں،پاکستان کی دوسری بڑی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ نواز جس نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت تلے آنکھ کھولی اور اسی کی جانشینی کرتے ہوئے انتخابات میں حصہ لیا اور بعد ازاں یہ جماعت بھی پیپلز پارٹی کی طرح گھر کی جماعت ہی بن سکی ،جس کی قیادت میاں نواز شریف،شہباز شریف ،حمزہ شریف ،مریم نواز انہی کی فیملی کے گرد ہی گھومتی ہے ،اور کبھی بھی کسی غریب ورکر کو قیادت کا مزہ نہیں چکھایا گیا۔اور ورکر صرف ان قائدین کے جلسے جلوسوں میں تالیاں ہی مارنے کی حد تک رہ گئے،پاکستان کے صوبے خیبر پی کے میں بھی کچھ ایسا ہی ہے ،کہ عوامی نیشنل پارٹی کو باچا خان سے ،ولی خان ،پھر اسفند ولی خان یعنی کے خاندان میں ہی رکھا گیا،پاکستان کی سیاسی تاریخ میں

پہلی بار دیکھنے کو ملا کہ 16 سال سے سیاسی کی وادی پرخار میں رہنے والے عمران خان کو جب عوام نے تیسری سیاسی قوت بنایا تو عمران خان نے بھی عوام پر اپنا حق ادا کیا اور پارٹی میں الیکشن کروا دیئے حالانکہ اس فیصلے سے پارٹی کی پاپولیرٹی پر بھی کچھ اثر پڑا لیکن عمران خان نے وہ کر دکھایا جو آج تک باقی سیاسی پارٹیوں نے ورکرز کے ڈر سے نہ کیا کہ کہیں کوئی ورکر ہی پارٹی کا سربراہ نہ بن جائے لیکن کپتان نے ایسا کیا اور پارٹی کو ورکرز کے ہاتھوں میں دے دیا، پاکستان میں موروثی جانشینی کا مسئلہ یہ ہے کہ ہر پیڑھی میں تعداد بڑھتی جاتی ہے لیکن دستیاب عہدوں کی تعداد وہی برقرار رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے پوتے پڑپوتوں میں اقتدار کی جنگ بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ خاندان کی شاخیں دور دور تک مختلف سمتوں میں پھیلی ہوتی ہیں اس لیے جانشینی کی قطار بھی لمبی ہوتی جاتی ہے۔ جیسے جیسے کنبہ وسیع ہوتا جاتا ہے پیدائش کی ترتیب کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور سیاسی طاقت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جس سے جھگڑا اور رسہ کشی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ پاکستان آکیلا ہی موروثی سیاست کا ڈسہ ہوا نہیں پاکستان کیساتھ ساتھ پڑوسی ملک بھارت اور سعودی عرب کی مثالیں سامنے ہیں جو قیادت کی نئی پیڑھی میں منتقلی کی صورت حال سے دوچار ہیں جہاں اس قسم کے منتقلی اقتدار کو درپیش چیلنج سامنے آرہے ہیں۔ مملکت سعودی عربیہ میں اگلے دس بارہ سال کے دوران لیڈروں کی تیسری یا چوتھی نسل کے لیڈروں کو اقتدار منتقل ہو جائے گا۔ کیونکہ سعودی عرب میں

فرمانروائے

وقت کی زندگی میں نہیں بلکہ اس کی موت کے بعد ہی اقتدار منتقل ہوتا ہے۔ مملکت کے بانی کے بیٹے 1953 سے اب تک بر سر اقتدار ہیں۔ سعودی عرب میں شاہی خاندان ہی مملکت ہے۔ کسی پارٹی کے ذریعہ اسے حکومت سے الگ نہیں کیا جاتا لیکن پھر بھی وہاں الگ الگ دھڑے اور گروہ بندی ہے۔ شاہی خاندان کے افراد چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹے ہیں۔ جس سے سعودی عرب میں نئی نسل کو اقتدار کی منتقلی کا عمل انتہائی دھندلا اور مبہم ہو جاتا ہے۔ لازمی طور پر یہ ایک خاندانی معاملہ ہے، جس میں شاہی خاندان کے اراکین کسی بادشاہ یا ولی عہد شہزادے کی موت کے بعد جانشین کے نام پر اتفاق رائے ہونے تک باہم تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ جانشینی کی ایک رسمی پالیسی موجود ہے لیکن اس پر کبھی عمل ہی نہیں کیا گیا۔ سعودی عرب داخلی استحکام کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے عام طور پر اپنی تیل کی دولت کا استعمال کرتا ہے لیکن یہ پالیسی آئندہ آنے والی دہائیوں میں اپنی حدیں چھو سکتی ہے کیونکہ تیسری اور چوتھی پشتیں قیادت سنبھال رہی ہیں۔ تیل کی دولت سعودی عرب کی نمایاں پہچان رہی ہے اور اس پر نئی نسل یقیناً انحصار کر سکتی ہے لیکن اس امر کی کوئی توقع نہیں ہے کہ وہ اس تیل طاقت کو اپنے پیشرؤوں کی طرح موثر ہتھیار بنا سکیں گے۔ دنیا بھر میں تیل کی پیداوار میں کافی اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے عالمی تیل ذخیرے میں سعودی عرب کے حصہ میں کمی واقع ہو رہی ہے اور اب تیل کی دولت اس کے اقتدار کا ذریعہ بھی نہیں رہ گئی۔ اختیارات اور طاقت حاصل کرنے والے تیل جیسے

کھلے آلہ کی کمزوری تیسری اور چوتھی نسل کے لیے سعودی عرب کے شاہی خاندان کی داخلی سیاست کو اور بھی پیچیدہ کر دے گی۔ کسی بھی سیاسی نظام میں دوسری پیڑھی کو منتقلی یا ادلا بدلی ایک انتہائی حساس عمل ہو سکتا ہے۔ آخر میں اپنے قارئین سے ایک بات کہنا چاہوں گا کہ ووٹ قومی فریضہ ہے اسے ضرور کاسٹ کیں اور جسے آپ ووٹ کا حقدار سمجھتے ہیں اسے ضرور دیں۔

نوجوان کس کے ساتھ؟

جیسے جیسے انتخابات کے دن قریب آ رہے ہیں، سیاسی جماعتوں کی انتخابی مہم بھی زور و شور سے جاری ہے۔ دہشت گرد تنظیموں کی طرف سے 3اہم سیاسی جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی ،ایم کیوایم، عوامی نیشنل پارٹی کو ملنے والی دھمکیوں کے بعد ان سیاسی جماعتوں کے لئے انتخابات میں حصہ لینا بلا شعبہ ایک اچھا فیصلہ ہے جس پر عوامی حلقوں میں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے دوسری طرف پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کی ایک بڑی جماعت پاکستان مسلم لیگ ن اور ابھرتی ہوئی جماعت پاکستان تحریک انصاف کی انتخابی مہم زوروں پر ہے جس میں دونوں طرف سے قائدین ایک دوسرے کےخلاف متعدد الزامات کی بوچھاڑ کرنے میں مصروف عمل ہیں ،جس کی قطعاً کئی ضرورت نہیں ہے۔ الیکشن میں الزامات کی بجائے عوام کو اپنے اپنے انتخابی منشور کے بارے میں آگاہی دی جائے تاکہ عوام فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں کہ کس پارٹی کا منشور عوامی خواہشات کی عکاسی کرتا ہے۔ پاکستان میں ہونے والے انتخابات میں نوجوان طبقہ بہت ہی اہم کردار ادا کرنے جارہا ہے وہ نوجوان جو ہمیشہ انتخابات سے دور رہا اور کبھی بھی ووٹ ڈالنا گوارا نہ سمجھا اب ووٹ ڈالنے کے لئے آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ مجھے مری سے میڈیکل کی طالبہ طوبہ

عباسی نے گزشتہ دنوں ای میل کی۔ جس میں طوبہ عباسی کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے کی
.برائیاں گنوانے والے قائدین صرف اپنا منشور ہی عوام سے شئیر کریں۔ طوبہ عباسی ای
میل میں لکھتی ہیں کہ کیا ہم نوجوان نسل اپنا مستقبل ان سیاستدانوں کے ہاتھوں پھر سے
یرغمال بنالیں جنھوں نے مختلف ادوار میں 25 سال تک عوام کے جذبات سے
کھیلا،اور اب بھی اقتدار کی ہوس ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی، پچھلے کچھ دن
پہلے پنجاب کی ایک بڑی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ ن کے صوبائی صدر میاں شہباز
شریف نے ایک جلسہ عام میں جوش خطابت میں یہ فرمایا کہ پاکستان تحریک انصاف
کے قائد عمران خان صدر زرداری کی زبان بول رہے ہیں اور پاکستان تحریک انصاف
زرداری کی بی ٹیم کا کردار ادا کر رہی ہے، میں سوچنے پر مجبور ہوئی کہ کیا میاں شہباز
شریف ان جھوٹی اور من گھڑت باتوں سے عوام کا دل بہلا کر عوام سے ووٹ لینے میں
کامیاب ہوجائیں گے، کیونکہ ساری عوام جانتی ہے کہ تقریبًا ساڑھے 3 سال تک پاکستان
مسلم لیگ نواز پاکستان پیپلزپارٹی کے ساتھ اقتدار کے مزے لوٹتی رہی اور ان کے
درجن بھر وزراء تمام سرکاری مراعات سے بھی مستفید ہوتے رہے، جس پر میاں نواز
شریف نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ "زرداری صاحب تیری پارٹی کے لوگ تجھے چھوڑ
سکتے ہیں، لیکن نواز شریف کبھی نہیں چھوڑے گا"،اور پورے 5 سال تک زرداری ہی کا
ساتھ دیتے ہوئے میاں صاحب نے پنجاب حکومت کے مزے لئے اب عوام جاننا چاہتی
ہے کہ ایسا کون سا جادو کردیا ہے صدر زرداری نے کہ آپ نے ان کا

ساتھ چھوڑ دیا ہے اور عمران خان ان کی بی ٹیم بن گئے ہیں،خدارا عوام سے جھوٹ مت بول کر ووٹ مانگیں،کیا عوام بھول گئی ہے کہ میاں نواز شریف اپنے ہر خطاب میں یہ کریڈٹ لینا نہیں بھولتے کہ زرداری کی حکومت کی مدت پوری کروانے کا سہرا ہمارے سر ہے ،اگر ایسا ہی ہے تو اس بات سے عیاں ہوتا ہے کہ عوام کو مہنگائی، بے روزگاری، دہشت گردی، لوڈشیڈنگ جیسے عذاب،فرقہ واریت کے سمندر میں دھکا دینے کے لئے آپ وفاقی حکومت کے شانہ بشانہ رہ کر عوام کو سسکتے، خودکشیاں کرتے ،اپنے بچے بیچتے،اندھیروں میں ڈوبتے،کاروبار تباہ،برباد ہونے کا تماشا دیکھتے رہے اور حد تو یہ ہے کہ اب بھی یہ بات کرتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، کہ اگر ہمیں اقتدار کا موقع ملا تو ہمیں آصف زرداری کی صدارت قبول ہو گی،اور بڑی بہادری سے اپنے گناہوں کا قصور عمران خان کو ٹھہرا دینا کہ وہ آصف زرداری کی بی ٹیم کا کردار ادا کر رہا ہے، سمجھ سے بالاتر ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ مینار پاکستان کے سائے تلے ہونے والے پاکستان تحریک انصاف کے فقید المثال جلسے نے آپ کی آنکھیں کھول دیں،جب لاکھوں عوام کے سامنے عمران خان نے کہا کہ نوجوان ہی میرا اثاثہ ہیں،اور نوجوان ہی ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں،یہ دیکھنا تھا کہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد عمران خان کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے تو جناب نے بھی نوجوانوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے لیپ ٹاپ متعارف کروائے اور دھڑا دھڑ بانٹے تاکہ نوجوان آپ کی طرف راغب ہوں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ نوجوان بخوبی جانتے

ہیں کہ پہلے کہاں تھے آپ ،پہلے تو آپ کو نوجوان یاد ہی نہیں تھے،صرف اپنے مفادات کے لئے نوجوانوں میں لیپ ٹاپ ، سولر سسٹم تقسیم کرنے سے نوجوانوں کا ووٹ آپ کو نہیں ملنے والا،ن لیگ شائد بھول چکی ہے کہ نوجوان بھی اب ان کی طرح ہی سوچتے ہیں ،کہ "دکھاؤ کچھ،مارو کچھ"طوبہ عباسی مزید لکھتی ہیں کہ تبسم صاحب دیکھنا 11 مئی کا سورج نئے پاکستان کی نوید لئے طلوع ہوگا،جس میں تمام اختیارات کا محور صرف عوام ہوگی،اس نئے پاکستان میں کرپٹسیاستدان،اربوں کے قرضے معاف کروانے والے سیاستدان،ایفی ڈرین کی اسمگلنگ میں ملوث لوگ اور اس طرح کے لوگ شامل نہیں ہونگے،نئے پاکستان میں وہی سیاستدان ہونگے جنہیں عوام کے دکھ درد کا احساس ہوگا،وہ نہیں ہونگے جنھوں نے اپنوں میں وزارتیں بانٹی ،کرپشن سے تجوریاں بھریں ، تبسم صاحب ایک اور اہم بات ن لیگ ایک طرف عمران خان کو زرداری کی بی ٹیم کہتی ہے دوسری طرف سننے میں آرہا ہے کہ گجرات اور پشاور میں ن لیگ اور پی پی کی سیٹ ایڈجسٹمنٹ ہوچکی ہے تو بتایا جائے عوام کو کہ بی ٹیم کون ہے۔میں اس ای میل کو پڑھ کر سوچنے لگا کہ ہماری نوجوان نسل کس قدر باشعور ہوچکی ہے جو ہر پہلو پر نظر رکھے ہوئے ہے،اور یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ 66 سالوں میں ان سیاستدانوں نے جو حال عوام کا کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو یہ اس قابل نہیں کہ ان کو اپنا قیمتی ووٹ کاسٹ کیا جائے۔مجھے ایسا لگا کہ نوجوان نسل کو کوئی چاہے کس قدر بھی سہانے سپنے دکھائے ،لیپ ٹاپ بانٹے، سولر سسٹم دے ، لیکن

نوجوان نسل نے جس کو اپنا ووٹ کاسٹ کرنا ہے وہ اس کا فیصلہ کر چکی ہے اب مزید وہ اس بارے سوچتی ہی نہیں کہ کون سا سیاستدان کیا بیچنے کی کوشش کر رہا ہے۔اور اڑھائی کروڑ نیا بننے والا نوجوان کا ووٹ کس سمت کا تعین کرتا ہے یہ تو 11 مئی کا دن ہی ثابت کریگا،اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوجوان نسل کا ووٹ جس سیاسی پارٹی کو بھی ملا وہی پاکستان میں اگلی حکومت بنائے گی۔

لوڈشیڈنگ کا بے قابو ہوتا ہوا جن

پاکستان میں بجلی کے بحران کو کئی سال گزر گئے مگر کسی حکومت نے اس پر سنجیدگی سے کام نہیں کیا۔جب بھی کسی پارٹی نے اپنی سیاست کو چمکانے کے لیے احتجاج کیا یا کسی تاجر برادری نے احتجاجی دھرنے دیئے، حکومت نے سوائے اس کے کہ فوری طور پر ہنگامی اجلاس بلایا، میڈیا میں دو چار باتیں کیں اور بس اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا، لاکھوں روپے لگا کر ہنگامی اجلاس بلایا جاتا ہے اور نتیجہ میں دو چار دن بجلی ٹھیک ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر وہی روٹین۔ بجلی کی کمی کو پوری کرنے کے لیے کوشش کی بھی گئی تو وہ بھی بے سود ، عوام کے دیئے ہوئے مینڈیٹ کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں ، یہ سب اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ عوام آئندہ سے کسی کو بھی اعتماد کا ووٹ نہ دے سکے، عوام کے اعتماد کیساتھ اس طرح سے کھیلا جائے کہ عوام اس قدر بے حال ہوجائے کہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی منع کردے کہ کبھی بھی کسی کو ہمدردی اور اعتماد کا ووٹ نہ دینا، حکمرانوں عوام کے صبر سے مت کھیلو۔ایسا نہ ہو کہ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجائے اور عوام تمہارے محلوں پر قبضہ کرلیں، حضرت عمر فاروقؓ کی بیوی (عاتکہ) کہتی ہیں کہ عمرؓ بستر پر سونے کے لیٹتے تھے تو نیند ہی اڑ جاتی تھی ،بیٹھ کر رونا شروع کردیتے تھے، میں پوچھتی تھی ،اے امیرالمومنین ،کیا

ہوا؟ وہ کہتے تھے مجھے محمد ﷺ کی امت کی خلافت ملی ہوئی ہے، اور ان میں مسکین بھی ہیں، ضعیف بھی ہیں، یتیم بھی ہیں، مظلوم بھی ہیں، مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ان سب کے بارے میں سوال کرینگے، مجھ سے جو کوتاہی ہوئی تو میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کیا جواب دونگا، سیدنا عمرؓ کہتے تھے اللہ کی قسم اگر دجلہ کے دور دراز علاقے میں بھی کسی خچر کو راہ چلتے ٹھوکر لگ گئی تو مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہ کر دیں، اے عمرؓ تو نے وہ راستہ ٹھیک کیوں نہیں کروایا تھا، یہ تھے خلیفہ حجرت عمر فاروقؓ جنہیں اپنی رعایا کا اس قدر خیال تھا اور ایک ہیں ہمارے حکمران جن پر نہ تو عوام کی بد عائیں اثر کرتی ہیں، اور نہ ہی ان حکمرانوں کو اللہ کے غیظ وغضب کا ڈر ہے، عوام حکمرانوں کو جھولیاں اٹھا اٹھا کر بد عائیں دیتے ہیں لیکن سب بے اثر، ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، کیا کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرے تو وہ چھپ جاتا ہے؟ ہماری حکومت بس یہی کر رہی ہے مگر کبوتر چھپا نہیں بلکہ اس نے اپنے لیے بہت سے خطرات پیدا کئے ہوئے ہیں ۔کاروباری لحاظ سے جو نقصان ہو رہا ہے ۔وہ تو ہو ہی رہا ہے جو کہ سب کو نظر بھی آتا ہے۔ مگر معزز قارئین آپکی توجہ ایسی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں جو ہماری قوم کو دیمک کی طرح کھا رہی ہے اور ہمارے حکمران خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں ۔ بجلی کے اس بحران میں مہنگائی کا جن بوتل سے باہر آ کر کھلم کھلا لوگوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہو رہا ہے، بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کاروباری حلقوں میں جہاں دس لوگ کام کرتے

تھے وہاں پانچ لوگ کام کر رہے ہیں، جو پانچ لوگ کام سے فارغ ہو گئے انہوں نے اخراجات کہاں سے پورے کرنے ہیں۔ بچوں کی فیسیں کہاں سے ادا کرنی ہیں، بجلی جو آتی نہیں اس کے بھاری بھر بل کہاں سے ادا کرنے ہیں،ڈاکٹر کی دواؤں کے پیسے کہاں سے دینے ہیں، اس قدر بے روزگاری ہوچکی ہے کہ اب نوکری تو جلدی ملے گی نہیں کیوں کہ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے فیکٹریاں،کارخانے تو بند پڑے ہیں،۔ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیئے انسان غلط کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔دن دیہاڑے ڈاکے ڈالتا ہے،چوریاں کرتا ہے،ناجانے پیٹ کی آگ کو بجھانے کی غرض سے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اور معاشرے میں بگاڑ اور شر جیسی لعنتیں جنم لیتی ہیں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ہمیں بتایا کرتے تھے کہ اچھی ورکنگ پرفارمنس کیلیئے ورکنگ ایریا کا ماحول اچھا ہونا چاہئے، مثلاً درجہ حرارت، دیواروں کے کلر، اور لائٹوں کی روشنی، وغیرہ۔ مگر یہاں تو لائٹ ہی نہیں ہوتی اندھیرے اور گرمی میں کام کرنا پڑھتا ہے۔اس صورت حال میں لوگوں کی کام کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے اور ذہنی پریشانی کا سبب بنتی ہے اسی ذہنی پریشانی میں ورکر گھر پہنچتے ہیں تو ان کی برداشت کی طاقت تقریبا ختم ہو چکی، ہوتی ہے۔ چھوٹی سی بات پر غصہ آتا ہے۔ دوسری طرف گھر والے بھی بجلی کے بار بار بند ہونے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ ایک ماں بچوں کی پرورش بھی کر رہی ہوتی ہے اور گھر کے کام کاج بھی، بجلی کی لوڈشیڈنگ نے زندگی میں سکون حرام کر رکھا ہے۔خاوند اپنی پریشانی میں گھر جاتا ہے اور بیوی

پہلے سے پریشان ہوتی ہے اگر کوئی بات بیوی کے منہ سے نکل گئی تو اس کی خیر نہیں اور اگر خاوند نے کوئی غلط کر دیا تو اس کی خیر نہیں نتیجہ میں گھریلو پریشانیاں اور ناچاقیاں جنم لیتی ہیں۔میاں بیوی تو دونوں لڑتے ہیں یہاں مگر نقصان بچوں کا ہوتا ہے۔ وہ بچے جنہوں نے کل ہماری اس ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالنی ہے۔ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوگی تو ان کی ذہنی نشوونما پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔جو نسل ان دس سالوں میں جوان ہوئی اس کو اپنا مستقبل نظر نہیں آتا۔ ضروریات بڑھ گئی ہیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے ہے۔نوجوان غلط طریقہ کار اختیار کرتے ہیں اور نتیجہ میں قتل ،چوری ڈکیتی کی وارداتیں جنم لے رہی ہیں۔اور ان سب وارداتوں کے ذمہ دار حکمران ہیں۔اور یہ ہے وہ پلان جو بیرونی طاقتیں کیے بیٹھی ہیں۔ہماری موجودہ قوم تو اور بھی 10 سال گزار سکتی ہے مگر آنے والی نسل تباہ ہو چکی ہے۔یہودی اور بھارتی اور امریکی ہماری ذہانت اور بہادری پر خوفزدہ ہیں جب وہ لڑ کر کچھ نہیں کر سکے تو اب یہ سازشیں شروع کیں ہیں اور ہمارے حکمران پچھلے 10 سال سے ان سازشی لوگوں کو تحفظ دے رہی ہے۔ہٹلر کہتا ہے کے مجھے پڑھی لکھی مائیں دے دو میں سلجھا ہوا معاشرہ دے دیتا ہوں۔اور آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں بجلی دے دو ہم آپکو پرسکون معاشرہ کی گارنٹی دیتے ہیں۔خدا کے لیے اے حکمرانوں اپنی قوم کا بھی سوچو کیوں تمہیں دولت اور دنیا کی ہوس نے اندھا کر رکھا ہے۔

کراچی کو بچایا جائے

کچھ عرصہ سے رینجرز،افواج پاکستان کی کارروائی کے نتیجے میں کراچی کے حالات کچھ قدرے بہتری کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔کیا کراچی کی قسمت میں ہمیشہ سے ایسا ہی رہے گا کہ کوئی بھی اپنی مرضی کو مسلط کرنے کے لئے وہاں کی عوام سے خون کی ہولی کھیلے گا۔اور بعد میں قرآن پاک کے سامنے بے ہودہ قسم کے گانے گا کر قرآن پاک کی بے حرمتی کریگا اور عوام اس بے حرمتی کو پونے چار گھنٹے تک دیکھیں گے۔اور ذرا سی بھی ہلچل نہیں ہوگی۔اگر ایسا ہی مداریوں جیسا کھیل کھیلنا مقصود ہے تو خدارا قرآن پاک کو تو درمیان میں نہ لاؤ آپ کی نظر میں عوام تو گاجر مولی کی طرح ہیں ہی جسے آپ اپنی مرضی سے کاٹ رہے ہو مگر اتنا تو خیال رہے کہ قرآن پاک کوئی مذاق نہیں جس کو پاس رکھ کر ہاتھ میں اٹھا کر آپ مزے میں جھوم جھوم کر گاؤ،،پردے میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ،،ہمیں شرم آنی چاہیے یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہوا اور ہم بے بسی کی تصویر بنے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔اور تو اور جس نے پونے چار گھنٹے عوام کے ضائع کئے اور ساتھ میں قرآن پاک کی بےُ حرمتی کا مرتکب ہوا۔اسے ہمارے ٹی وی مالکان بڑے تحمل سے دیکھتے رہے اور کسی کمرشل کو بھی درمیان میں آنے کی جرات نہ ہوئی۔ ہمارے میڈیا والے اور ہماری حکومت کے کرتا دھرتا جو صرف ایم کیو ایم سے ڈرتے ہیں بلکہ ان کا کہا تسلیم سر خم

کرتے ہیں۔اب کچھ تذکرہ ہو جائے پچھلے 64 سال میں پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور اس کی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز کراچی کیا سے کیا ہوگیا۔ جاگتی جگمگاتی سڑکوں والا شہر جس کی راتیں بھی بڑی حسین ہوتی تھیں اب اندھیرے کی چادر لپیٹ کر مایوسیوں کی تصویر بنا ہوا ہے۔ نسلی، مسلکی اور گروہی لڑائی جھگڑوں اور بنیادی شہری ضروریات کے فقدان کے باعث اس شہر کی تصویر بدل چکی ہے۔ ہر طرح کے مافیا اور عادی مجرموں نے اسے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا رکھا ہے اور حکومت وقت مفلوج نظر آتی ہے۔اس مضمون کے لکھے جانے کے وقت کراچی میں ایک بے چین قسم کا امن بحال ہوا ہے۔اس سے قبل نسلی فساد اور ''ٹارگیٹ شوٹنگ'' میں 100 سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس قتل وغارت گری کو یہاں کے دل گرفتہ شہریوں نے خانہ جنگی کا نام دیا۔ پچھلے کئی برسوں سے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں، ایک دوسرے کے حریف غنڈہ گروپوں اور بزنس مین کی ''ٹارگیٹ کلنگ'' کا سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح کی ''ٹارگیٹ کلنگ'' روزمرہ کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی بھی سویلین انتظامیہ، حتیٰ کہ فوجی حکومت بھی پاکستان کی اقتصادی لائف لائن کہے جانے والے اس شہر کو نجات نہ دلا سکی، کیونکہ اس کی وجوہات بڑی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں۔ اس سیاق میں تین نسلی سیاسی گروپ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔یعنی پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) جو بنیادی طور پر سندھیوں کی پارٹی ہے، دوسری ہے متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) جو اُن مہاجروں کی نمائندگی کرتی ہے جو اردو بولتے ہیں اور جو

میں ہندوستان سے ترک وطن کرکے آئے تھے اور تیسرا گروپ ہے پشتون 1947 بولنے والوں کا۔ کراچی میں اس کی آمد کا سلسلہ 1980 کی دہائی میں ہونے والی افغان جنگ کے دوران شروع ہوا۔ لیکن اس وقت بڑی تعداد میں انہوں نے کراچی کا رخ کیا جب 11/9 کے واقعہ کے بعد امریکہ کی قیادت میں عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع ہوئی اور پاکستان کے قبائلی علاقے اور صوبہ خیبر پختونخوا فوجی آپریشن کی زد میں آئے۔ پختون اور مہاجرین کے درمیان پہلی بار نسلی ٹکراؤ 1985 میں ہوا۔ اس لڑائی میں مہاجر نے اپنی طاقت کے سہارے پختون نسل کے لوگوں کو پچھاڑ دیا۔ اس وقت پشتون بولنے والوں کو کسی طرح کی سیاسی حمایت حاصل نہ تھی۔ اس وقت وہ احساس کمتری میں مبتلا تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو کراچی میں مہمان یا کرایہ دار سمجھ رہے تھے لیکن دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع ہونے کے بعد انہوں نے ایک سیاسی شناخت کے ساتھ کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ شناخت تھی عوامی نیشنل پارٹی کی۔ انہوں نے کراچی کو پختونوں کا شہر کہنے پر بھی اصرار کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ 1947 میں مہاجر ہندوستان سے یہاں آئے اور سندھیوں کو بے دخل کردیا اور اب ان کی باری ہے کہ مہاجروں کو بے دخل کرکے کراچی پر اپنا دبدبہ قائم کریں۔ کم از کم اس حد تک سندھی اور پاکستان پیپلز پارٹی پختونوں کے ساتھ کھڑی ہو سکتی ہے۔ مہاجر کراچی پر اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے پورے زور وشور کے ساتھ اپنی لڑائی جاری رکھیں گے کیونکہ پاکستان میں ان کے لیے دوسری اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ایک چوتھا نسلی گروپ

بلوچیوں کا بھی ہے۔ وہ کراچی اس لیے وارد ہوئے کہ بلوچستان میں لوگوں کا جینا دوبھر کردیا ہے۔ ان میں زیادہ تر لوگ غریب ہیں اور لیاری کی کچی آبادی میں بڑی زبوں حالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ووٹ بینک ہیں۔ ایم کیو ایم کے لوگ انہیں مجرم اور دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ جب بھی کراچی میں ''گینگ وار'' ہوئی ہے تو لیاری کا ذکر خبروں میں ضرور آتا ہے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح نے کراچی کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اردو بولنے والے مہاجر، جو پاکستان پر حکومت کررہے تھے، اس وقت شدید صدمہ سے دوچار ہوئے جب جنرل ایوب خان نے دارالحکومت کو نوتعمیر شدہ شہر اسلام آباد منتقل کردیا۔ مہاجروں کے ہاتھ سے سیاسی طاقت نکلی جارہی تھی۔ لیکن دارالحکومت کی حیثیت ختم ہونے کے باوجود کراچی، روشنی اور روشن دماغی، تہذیب ،آزادی اور گہوارہ علم کی علامت کے شہر کے طور پر جانا جاتا رہا۔ لیکن کراچی کو دوسرا دھچکا اپریل 1977 میں اس وقت لگا جب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کو خوش کرنے کے لیے ہفتہ وار چھٹی کا دن اتوار کی بجائے جمعہ کو قرار دیا اور شراب بندی نافذ کرکے نائٹ کلب بند کرادیے۔ اس سے کراچی کی سیاحت کی صنعت تباہ ہوکر رہ گئی۔ وہ شہر جو زندگی کی ہماہمی سے لبریز تھا اچانک بنجر زمین جیسا بن گیا۔ تہذیبی قدریں دم توڑنے کا شکار ہوئیں اور زنانوں کے کلچر کو فروغ حاصل ہوا، جو نیپیئر اسٹریٹ کی طوائفوں کامقابلہ کرنے لگے، نیپیئر اسٹریٹ بھی سیاحوں کی

کشش کا ایک مرکز ہوا کرتا تھا۔اس کے بعد جنرل ضیاء الحق کا دور آیا۔ 1980 کی دہائی میں جب وہ امریکہ کے محبوب نظر بنے تو اپنے اس اقتدار کو جس پر انہوں نے غاصبانہ قبضہ کیا تھا، مضبوط بنانے کے لیے وہ اسلام کے نام پر پاکستانی عوام کے ساتھ کھیل، کھیلنے لگے۔انہوں نے پاکستان کو کئی تحفے دیے۔ان میں سے خاص تحفے یہ تھے:- سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو کمزور کرنے کے لیے انہوں نے ایک نئی سیاسی پارٹی ایم کیو ایم بنوائی، سپاہ صحابہ قائم کرائی جس کا مقصد شیعہ مسلمانوں کو ختم کرنا تھا۔ان تمام اقدامات کا کراچی پر سب سے زیادہ ناخوشگوار اثر پڑا۔سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان کشیدہ ہوتے ہوئے تعلقات کے باعث نسلی بنیاد پر خون خرابہ ہونے لگا۔مہاجر نئی پارٹی مہاجر قومی موومنٹ کے پرچم تلے اکٹھا ہوئے جس کی قیادت سابق اسٹوڈنٹ لیڈر الطاف حسین نے کی، مبینہ طور پر اسے خفیہ اداروں نے مسلح کیا تھا۔ان ہی کی بدولت ہی اس نے اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھنا شروع کر دیا کہ بالآخر1988 میں جنرل ضیاء کی موت کے بعد یہ خود ان کے لیے سبکی کا باعث بنی۔جب سندھ میں امن و قانون کی صورتحال بگڑنے لگی تو فوج نے آپریشن کلین اپ شروع کیا، جس سے ایم کیو ایم میں پھوٹ پڑ گئی۔ نئی پارٹی کا نام ایم کیو ایم (حقیقی) پڑا۔اسے خفیہ ادروں نے مسلح کیا اور اس طرح خود مہاجروں میں آپس میں خونریز جھڑپیں ہونے لگیں۔ 1992 میں ایم کیوایم کے بانی الطاف حسین لندن چلے گئے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ انہیں مار ڈالا جائیگا۔تب سے اب تک وہ پاکستان

واپس نہیں آئے۔ 1995 میں آپسی جھگڑوں میں 2000 مہاجر ہلاک ہوئے۔ فوج کا دعویٰ ہے کہ اس نے ایسی دستاویز برآمد کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایم کیو ایم الطاف) نے جناح آباد کے نام سے پاکستان کو توڑ کر ایک نیا ملک بنانے کی سازش کی) تھی۔ کراچی کے تاجروں کو اپنا کاروبار چلانے میں بھی دشواری پیش آرہی ہے، خاص طور سے اس صورت میں جب کہ حکومت حالات پر قابو پانے میں ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کار کراچی میں سرمایہ کاری کرنے میں پس وپیش کرتے ہیں۔ یہ بھی خبر ہے کہ پاکستانی صنعت کار اپنا سرمایہ نکال کر خلیجی ممالک اور ملیشیامیں سرمایہ کاری کرنے کا پلان بنارہے ہیں۔ اس رجحان سے یقینی طور پر بیروزگاری، غریبی اور جرائم میں اضافہ ہوگا۔ اگر سیاسی طاقتیں قدرے ذمہ داری سے کام کریں تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ کراچی کی صورتحال بہتر ہو سکتی ہے لیکن موجودہ صورتحال میں تو دور تک ایسی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ پاکستان پیپلزپارٹی اور اے این پی نے کراچی میں ایم کیو ایم کے پر کترنے کے لیے گویا ایک دوسرے سے ہاتھ ملالیا ہے۔ اے این پی سے وابستہ پختونوں کی تعداد اور طاقت بڑھ رہی ہے۔ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی کراچی پر اپنا حق جتارہے ہیں۔

قائد کا گھر تباہ کرنے والے کون؟

اسلامی ممالک کی فہرست میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جو نظریہ اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا۔اس کے قیام میں مسلمانوں کو لاکھوں قربانیاں دینا پڑیں ۔پاکستان کے حصول کا مقصد اسلامی اقدار کے سایے میں زندگی بسر کرنا تھا مگر بد قسمتی سے یہ ملک.بڑی منصوبہ بندی اور سوچی سمجھی سازش کے ساتھ اپنے اعلیٰ اہداف سے ہٹا کر قتل و غارت اور انسانیت سوز مظالم کی آماجگاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔آج ملک کے اندر بد عنوانی اور لاقانونیت کا راج ہے ۔خوف وہراس کی ایک عجیب فضا پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے ۔گزشتہ دنوں حضرت قائد اعظم کی رہائشگاہ کو تباہ کر دیا گیا،اور ہمارے حکمران سوتے رہے ،ہماری ایجنسیز اتنے.بڑے سانحے سے بے خبر کیسے رہیں،یہ سب کچھ سمجھ سے بالاتر ہے،اس قائد کے گھر کو بموں سے نیست ونابود کر دیا گیا،جس قائد نے ہمیں الگ پہچان دی،ہمیں آزادی کا مقصد بتایا مگر ناجانے وہ کون سی نادیدہ قوتیں ہیں ،جنھیں ہماری آزادی ج بھی کھٹک رہی ہے،وہ قوتیں ہم پر پے در پے وار کر رہی ہیں اور ہم.برسوں کی طرح آج بھی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں،ہمیں بحیثیت قوم شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے کہ جن کی قربانیوں سے یہ ملک وجود میں آیا آج وہی اس ملک کے اندر در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں ۔ان کا خون ہر چیز سے سستا ہے آج نہ ان کی جان محفوظ ہے نہ عزت

ان کا وجود اس ملک کے اندر غیر محفوظ ہے۔ نااہل اور کرپٹ حکمرانوں کے ہاتھ میں اس ملک کی تقدیر تھما دی گئی ہے۔ایک طرف مافیائی نظام اپنی درندگی کے خنجر سے اس قوم کو زخم لگا رہا ہے تو دوسری طرف نام نہاد اور مفاد پرست این جی اوز بھٹکی ہوئی لاچار قوم کے ذہنوں میں اپنی شاطر سوچ پیوست کر رہی ہیں۔پاکستان میں دہشت گردی، قتل و غارت عام ہے یہاں انسانیت کشی کبھی ثواب کا ذریعہ سمجھی گئی تو کبھی جھوٹی انا کی تسکین کا ذریعہ۔دہشت گردی مذہبی طبقے کی جہالت ونادانی، حکمران طبقے کی مغرب نوازی اور امریکہ کی گھناؤنی، مکارانہ سوچ کا نتیجہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پاکستان اس وقت دہشت گردی کے لیے ایک زرخیز میدان ہے جو دشمنان وطن کے پیسے اور امریکہ کی مکاریوں سے وجود میں آئی۔اس طرح قتل و غارت اس ملک کے انسان نما درندوں کے لیے ذریعہ معاش بنی ہوئی ہے۔ قتل و غارت اس قدر عام ہے کہ اگر کہیں پندرہ بیس لاشیں گر جائیں تو میڈیا اس کو معمولی خبر سمجھ کے شائع نہیں کرتا اور عوام اس کو خاطر میں نہیں لاتے۔لہٰذا اس طرح کی صورت حال میں ایک پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ حالات کا درست جائزہ لیکر اس مایوسی، نفسا نفسی کے ماحول میں زندگی گزارنے کے آداب سے آگاہ ہو اور وقت کی آواز پر لبیک کہے۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے ؟اس وقت قوم کے سامنے ہجرت کے نام پر فرار، ذاتی مفادات کے حصول وبقاء کیلئے ملکی مفاد کی غلط تفسیر کا سہارا،اقدار کواوزار کے طور پراستعمال کرنے عوام کو پست، بھکاری، چپاتی،

پرست، بیرونی امداد کا دلدادہ،آرام طلبی کو راہ حل کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔بد عنوان اور نااہل حکمرانوں کی ایک نفسیاتی خامی یہ ہوتی ہے وہ ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کوئی ان کی پگڑی نہ اچھال دے، کہیں ان کی شان میں کمی نہ ہو، لہٰذا اپنے لئے ایک جھوٹی فضاء قائم کرتے ہیں،طاقت اور اسلحہ کے زور پر ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے خلاف اٹھے یہ ہر اس شخص سے ہراساں رہتے ہیں جو اپنے وجود کا اظہار کھل کر کرے،اگر ہم ایک قوم بن کر ان بھیڑیوں، مگرمچھوں کا مقابلہ کریں، تو یہ جرائم پیشہ قاتل بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر بن سکتی ہے آج ہمیں اپنے وجود کا اظہار اس طرح سے کرنا ہے کہ اگر دشمن ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھے تو اسے اس کی قیمت چکانا پڑے۔آج در حقیقت ہم دشمن کے ہاتھوں نہیں بلکہ حالات کے تقاضوں پر کان نہ دھرنے کی وجہ سے رسواء ہیں جو قومیں حالات کے تقاضے پورے نہ کریں تو بے رحم اور سفاک ان پر مسلط ہوجاتے ہیں حالات کے تقاضوں کو سمجھنے کیلئے بصیرت کی ضرورت ہے اس لئے لوگوں کے اندر شعور وآگاہی پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ مافیائی نظام کو سمجھیں اور اس سے لا تعلّقی کا اظہار کریں۔ہم بحیثیت پاکستانی شہری اپنے وجود کو محسوس کروائیں، ہماری ناکامی کی ایک وجہ ہمارا جرم اور مجرم کا تعاقب نہ کرنا ہے پورے ملک کا یہ حال ہے کہ کہیں بھی جرم ہو کوئی تعاقب کرنے والا نہیں۔اگر کوئی مجرم اپنے ہاتھ خون ناحق سے رنگ بھی لیتا ہے تو اس کے خلاف ایف آئی آر تک نہیں کاٹی جاتی۔لہٰذا قاتل کو کوئی

قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی حتیٰ کہ اسے ایک دفعہ بھی تھانے نہیں جانا پڑتا۔آج پاکستان میں مختلف طبقات کے اندر خوداعتمادی کا فقدان ہے لہٰذا اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کریں، ہمیں یہ کسی احمق نے باور کرادیا ہے کہ ہمارے مسائل کوئی باہر سے حل کریگا۔آج ہمیں بحیثیت قوم اپنی مشکلات کا خود حل نکالنا ہوگا، کسی دوسری قوم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں کہ کوئی باہر سے مسیحا بن کر آئے گا اور ہماری مشکلات کو حل کریگا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم تمام فرائض کو چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں اور سارا کام اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں،اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہمارا کام ہے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔اگر مندرجہ بالا نکات کی طرف پوری قوم توجہ دے تو انشاء اللہ پاکستان کے اوپر بدبختی کے منڈلاتے بادل چھٹ جائیں گے اور یہ قوم سکھ کا سانس لے گی۔ گزشتہ دنوں راقم کو مری سے میڈیکل کی طالبہ طوبہ عباسی نے میل کی جس میں انہوں نے ایک نہائت ہی اہم مسئلے کی جانب توجہ مبذول کروائی ،وہ لکھتی ہیں کہ وہ چند روز قبل بازار میں شاپنگ کے لئے گئی اور اپنے لئے اور بھائی کے لئے شوز خریدنے کے لئے ایک دکان میں گئی تو دیکھ کر سخت حیرانی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی کہ جو جوتے ہم نے پسند کئے تھے وہ جوتے عادل شوز والوں کے بنائے ہوئے تھے، کیونکہ عادل نام میرے استاد محترم کا نام تھا لہٰذا بہت خوش بھی ہوئی اور مجھے شاک اس وقت لگا جب جوتوں کے تلوؤں کے نیچے عادل نام لکھا ہوا تھا جو کہ پہننے کے بعد پاؤں کے نیچے آتا، طوبہ

عباسی مزید لکھتی ہیں کہ میرے لیے میرے استاد کا نام بہت ذیادہ قابل احترام اور محترم ہے کہ میں نے فوراً وہ جوتے واپس کردئے اور جوتے خریدے بنا ہی گھر واپس آگئی، محترم قارئین اس ای میل کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کس قدر بے حس ہوچکے ہیں کہ اب اپنے کاروبار کو چمکانے کے لئے مختلف اسلامی ناموں کے ناموں پر اپنے جوتوں کا نام رکھتے ہیں اور ایک پل کے لئے بھی نہیں سوچتے کہ یہ جو نام ہم جوتوں کے رکھ رہے ہیں یہ نام پہننے والوں کے تلوؤں کے نیچے آئیں گے جس سے اسلامی ناموں کی بے حرمتی کیساتھ ساتھ ہمارے والدین کی بھی دل آزاری کا سبب بنے گی کیونکہ انہوں نے توہمارے نام بہت ہی محبت سے اسلامی نام رکھے اور ہم انہی کی دی ہوئی محبت کو پیروں تلے روندکر ان کی بے حرمتی کررہے ہیں لہٰذا سوچئے گا ضرور۔

شب برات بے شمار فضیلت و عظمت کی رات

اللہ تعالٰی نے اپنی کسی مصلحت اور حکمت کے تحت بعض اوقات میں تقدس اور عظمت کا پہلو رکھ کر بندوں کے دلوں میں ان اوقات کی طرف رغبت اور محبت پیدا کر دی ہے۔ جیسے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک کا مہینہ ہے کہ اپنے کلام کے نزول اور روزوں وتراویح کے لئے مخصوص کرکے بندوں کے دلوں میں اس مہینے کی اس قدر محبت پیدا کر دی کہ حتی المقدور وہ اس مقدس مہینہ کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں اور اس کے تقدس و عظمت کو یوں رائیگاں نہ جانے دیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ عبادت کرکے اللہ کے نیک بندوں میں اپنے کو شامل کریں۔ ہفتے کے ساتوں دن اللہ کے یہاں برابر ہیں لیکن ان میں ایک دن جمعہ کے لئے مخصوص کر دیا اور اس نماز جمعہ کی وجہ سے اس دن کو باقی دنوں سے افضل بنا دیا۔ اللہ تعالٰی کے نیک بندے اس دن کا آغاز بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ضروری سے ضروری دنیاوی مشاغل چھوڑ کر نہادھو کر اچھا لباس پہن کر اللہ کے گھر (مسجد) پہنچ کر باجماعت جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ یہی حال شب برات کا ہے۔ جو شعبان المعظم کی پندرھویں شب کہلاتی ہے اور جو بے شمار فضیلت و عظمت کی حامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماہ شعبان المعظم کی آمد سے ہی اہل ایمان کے دلوں میں ہلچل پیدا ہونے لگتی ہے۔ اہل اسلام کے مرجھائے دل

کھلنے لگتے ہیں۔ انکے دلوں میں خوف خدا پیدا اور آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہنے لگتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس کے بعد نزول قرآن والا مہینہ ' خیر و برکت اور عظمت و رفعت والا مہینہ رمضان المبارک پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ فگن ہونے والا ہوتا ہے۔ گویا کہ ماہ رمضان کے قریب ہونے کی وجہ سے شعبان کا مہینہ پورے طور پر نہایت ہی عظمت کا حامل ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شعبان المعظم میں ہی رمضان المبارک کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ کا مہینہ ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان میں آپ کی عبادات میں اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ رمضان کے بعد سب سے زیادہ شعبان میں ہی آپ ﷺ روزے رکھتے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان سے زیادہ کسی اور مہینہ میں روزے نہیں رکھتے تھے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ماہ میں زیادہ روزے رکھنے کی چند وجوہات بتائی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس مہینے میں مرنے والوں کی موت لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اگرچہ ہر روز رات کے اعمال نماز فجر کے بعد اور دن کے اعمال نماز عصر کے بعد اور ہفتہ کے اعمال دو شنبہ یعنی سوموار کو اور جمعرات کو بارگاہ خدا وندی میں پیش ہوتے ہیں لیکن پورے سال کے اعمال شب برات میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آنحضور ﷺ ہر مہینہ میں تین روزے رکھا کرتے تھے۔ بسا اوقات کسی وجہ سے وہ روزے چھوٹ جاتے تو سب کو اکٹھا کرکے شعبان

میں رکھ لیتے تھے۔ حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کا مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان ہے۔ لوگ اس ماہ کی فضیلت سے غافل ہیں جب کہ اس ماہ میں بندوں کے اعمال بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال پیش ہوں اس حال میں کہ میں روزہ دار رہوں۔ اسی ماہ شعبان المعظم کی پندرہویں شب۔ شب برات کہلاتی ہے۔ (یعنی چھٹکارہ کی رات) شب برات کی حقیقت کیا ہے، شب برات صرف اور صرف عبادت کی رات ہے۔ اللہ کے حضور اپنے گناہوں پر نادم ہو کر سچے دل سے توبہ واستغفار کرنے کی رات ہے۔ شب برات سے متعلق احادیث مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں جن سے شب برات کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنے بستر پر) نہ پایا تو میں تلاش میں نکلی۔ آپ ﷺ جنت البقیع (قبرستان) میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میرے پاس حضرت جبرئیل تشریف لائے اور فرمایا کہ آج نصف شعبان کی رات ہے اس رات میں اللہ تعالٰی لوگوں کی مغفرت کرے گا مگر چند لوگ اس مغفرت سے محروم رہیں گے۔ مشرک، کنبہ پرور، قطع رحمی کرنے والا اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ شراب پینے والا، روایت ہے کہ اللہ تعالٰی چار راتوں میں ہر قسم کے احسانات کے دروازے کھول دیتا ہے اور یہ دروازے اذان فجر تک کھلے رہتے ہیں۔ وہ چار راتیں ہیں۔ (1) عید کی رات۔ (2) بقر عید کی رات۔ (3) شب برات۔ جس میں سب کی عمر یں اور سب کے رزق نیز جن کو حج نصیب ہوگا

ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ (4) شب عرفہ یعنی نویں ذوالحجہ کی رات۔ شب براءت بہت ہی بابرکت رات ہے۔ اس رات میں خوشنودی الٰہی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عبادات۔ خوب خوب توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس رات میں باری تعالٰی کے انعامات اور اس کی رحمتوں کی بے پناہ بارش ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی رحمتوں سے فیضیاب ہونے کے لئے پوری مستعدی، حضور قلب اور اخلاص کی سخت ضرورت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کی پندرھویں شب میں قیام کرو یعنی عبادت میں مصروف رہو اس کے دن میں روزہ رکھو۔ اس رات میں جس سے جو ہو سکے وہ کرے۔ ذکر واذکار کرے۔ قرآن شریف کی تلاوت کرے۔ یا نوافل وغیرہ پڑھے۔ فتاویٰ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ شب براءت میں جاگنا اور عبادت میں یہ رات گزارنا مستحب ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی نہیں جاگتا ہے بلکہ سو جاتا ہے تو اس کو برا نہیں کہنا چاہئے اور اس کی عظمت وشان کے خلاف نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ مستحب ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی حالت ایسی ہو کہ رات کو جاگ کر مستحب پر عمل کرنے کی صورت میں فرض چھوٹنے کا اندیشہ ہو یا خشوع و خضوع جانے کا ڈر ہو تو واقعی ایسے شخص کے لئے جاگنے سے بہتر سونا ہے۔ اس رات کا حق تو یہ ہے کہ جس سے جتنا ہو سکے مسجد میں گھر پر یا جہاں بھی مناسب سمجھے تنہا ذکر و نوافل میں مشغول ہو۔ جتنا ہو سکے نیک اعمال کرے۔ اگر پوری رات نہیں جاگ سکتا تو جتنا ہو سکے اتنا ہی جاگے۔ ایسا نہ ہو کہ

پوری رات تو جاگ کر نوافل و مستحبات میں گزار لیا اور نماز فجر جو کہ فرض ہے وہ سونے کی نذر ہو گئی۔ بلکہ یہ راتیں اس لئے ہیں کہ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر تم اللہ کے ساتھ تعلقات استوار کر لو اور تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی حائل نہ ہو۔ بشکریہ

کسی بے گناہ کا قتل، انسانیت کا قتل ہے

آج بڑے پیمانہ پر انسانی جانوں کے ضیاع کا معاملہ سامنے آرہا ہے۔ ذرا ذرا سے فائدے کے لئے لوگوں کا قتل عام بات بن کر رہ گئی ہے۔ اگر معمولی جھگڑا ہوتا ہے تو نوبت قتل تک پہنچ جاتی ہے، اگر دولت کی بات ہوتی ہے تو معاملہ قتل تک پہنچ جاتا ہے۔آئے دن کتنے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ چند لاکھ یا چند ہزار روپوں کے لئے کسی بے قصور کی جان لے لی گئی۔ کسی نے کسی معمولی بات پر غصہ میں آکر قتل کردیا، کسی شوہر نے آپسی جھگڑے یا شک کی بنیاد پر اپنی بیوی کا گلا گھونٹ ڈالا، کسی بیوی نے اپنے شوہر سے بے وفائی کرتے ہوئے کسی اجنبی سے قربت پیدا کرلی، پھر راستہ سے اپنے شوہر کو ہٹانے کے لئے اپنے آشنا سے مل کر اس کا بے دردی کے ساتھ قتل کرڈالا۔ مفادات اور خواہشات کی تکمیل کے لئے قتل وغارت گری کا یہ عمل روز بروز بہت سی جگہوں پر پیش آتا ہے۔ بات صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ گروہوں، خاندانوں اور برادریوں کے درمیان تصادم میں بھی آن کی آن میں متعدد لوگوں کے مارے جانے کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال اس وقت رونما ہوتی ہے جب ممالک اپنے مفادات کے لئے کسی دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں یا وہاں سازشیں کرکے خانہ جنگی جیسی صورت حال پیدا کردیتے

ہیں۔ اس کے بعد انسانوں کا خون ندی نالوں اور راستوں میں پانی کی طرح بہتا ہے۔ موجودہ دور میں اس بڑے پیمانہ پر انسانی قتل عام کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گویا کہ آج انسانی جان کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔جب کہ سچائی یہ ہے کہ ایک ایک انسان بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام نے ایک ایک انسانی جان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک کسی ایک شخص کا بھی ناحق قتل گویا کہ پوری انسانیت کا قتل ہے۔ اسلام نے انسانی جان کی حفاظت کی پوری کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ قانون بنادیا گیا کہ اگر حکومت مسلمانوں کی ہے تو اس بات کا پورا نظم ونسق کیا جائے گا کہ انسانی جان برباد نہ ہو پائے۔ چاہے وہ مسلم کی جان ہو یا کافر کی جان۔ اسلامی تعلیم ہے کہ انسانی جان کی حفاظت کی جائے اور کسی کو قتل نہ کیا جائے۔ ارشاد باری ہے " انسانی جان کو ہلاک نہ کرو، جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے"۔ علماء کرام نے بھی اس مسئلے کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "ہر امن پسند غیر مسلم کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کے برابر ہے،اس لیے اگر کوئی مسلمان کسی پر امن غیر مسلم کو قتل کر دیتا ہے تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا، جس طرح ایک مسلمان کے قتل کا لیا جاتا ہے" گویا کہ جان کے تحفظ کے معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان دونوں برابر ہیں ، جس طرح ایک مسلمان کی حفاظت ضروری ہے، اسی طرح ایک غیر مسلم کی جان کی حفاظت بھی ضروری ہے۔اسلام نے قتل وقتال کو ہر حال میں روکنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ بدامنی اور خوں ریزی کا سلسلہ

طویل ہو جاتا ہے۔ عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص قتل کر دیا جاتا ہے تو مقتول کے خاندان والے بھی اسی طرح کے انتقام کے لئے آمادہ دکھائی دیتے ہیں ، یہاں تک کہ کبھی کبھی کچھ وقت کے بعد سننے کو ملتا ہے کہ قاتل کو مقتول کے خاندان والوں نے قتل کر ڈالا۔ اس پر دوسرے مقتول کے ورثا بھی سکون سے نہیں بیٹھتے ، وہ بھی اسی طرح کا معاملہ کرنے کے لئے عام طور سے تیار رہتے ہیں ، نیتجہ یہ نکلتا ہے کہ لمبے وقت تک خاندانوں کے مابین خوں ریزی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس خوں ریزی سے نہ صرف جانوں کا ضیاع ہوتا ہے، بلکہ سکون بھی غارت ہو جاتا ہے ، دونوں خاندان کے لوگوں کو خدشہ لگا رہتا ہے کہ جانے کب کس کو ہلاک کر دیا جائے۔ اس کشمکش اور خوف کے ساتھ ان کی زندگی بسر ہوتی رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ قتل کا انجام تباہ کن ہوتا ہے اور اسلام نہیں چاہتا کہ کوئی اس طرح کے حالات کا سامنا کرے۔ اس لیے وہ قتل وقتال سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ہی کی بڑی اہمیت ہے۔ دونوں ہی کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔ وہ حقوق جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے،ان کے پورا نہ کیے جانے پر روز قیامت سخت باز پرس ہوگی۔جس نے حقوق اللہ کو پورا کیا ہوگا، اسے بہترین اجر سے نوازا جائے گا، اس کے برعکس جس نے حقوق اللہ کی تکمیل میں غفلت برتی ہوگی، اس کا ٹھکانہ برا ہوگا، البتہ جو لوگ صاحب ایمان ہونگے، ان کے لیے اللہ کی ذات سے معافی کی امید کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات بڑی کریم ورحیم ہے، وہ معاف کرنے

والا اور رحم کرنے والا ہے۔ جہاں تک حقوق العباد کی بات ہے تو یہ اسی وقت معاف ہونگے، جب کہ وہ شخص جس کے حقوق مارے گئے ہونگے ، وہ معاف کردے، اس اعتبار سے حقوق العباد کی تکمیل کا معاملہ بھی انتہائی اہم ہے۔ حقوق العباد سے مراد انسانوں کے حقوق ہیں۔ چاہے وہ والدین کے حقوق ہوں، پڑوسی کے حقوق ہوں یا عزیزو اقارب اور دوست واحباب کے حقوق یا محلے والوں کے حقوق ہوں یا عام انسانوں کے حقوق ہوں۔ حقوق العباد کا دائرہ انتہائی وسیع ہے اور اس دائرہ میں اپنے اور پرائے ، مسلمان اور غیر مسلمان سبھی آتے ہیں، یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض کے حقوق زیادہ ہیں اور بعض کے کم، البتہ جو حقوق جس کے لیے متعین کیے گئے ، ان کی تکمیل لازمی ہے اور ان سے غفلت پر سخت پکڑ ہے۔ دین اسلام کے پیش نظر کیونکہ پوری انسانیت ہے، اس لیے وہ اپنے پیروکاروں کو صرف رشتہ داروں یا مسلمانوں کے حقوق تک محدود نہیں رکھتا ، بلکہ تمام انسانوں تک اس دائرے کو وسیع کرتا ہے۔ ایسے عام حقوق میں جان کی حفاظت اہم ہے۔ یعنی جان چاہے مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی حتی الواسع اس کا تحفظ لازم ہے ، پھر انسان کی تخلیق محض اللہ تعالی نے کی ہے، اس لیے کسی دوسرے شخص کو ہر گز اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کسی انسان کی جان لے۔ یہاں تک کہ خود انسان کی جان کی قدر وقیمت کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے لگایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا" جو شخص کسی ایسی جان کو قتل کرے، جس نے کسی کو قتل نہ کیا اور نہ اس نے فساد برپا کیا تو گویا اس

نے تمام لوگوں کا خون کیا، غور کیجئے کہ آیت مذکورہ میں ایک جان کے قتل کو تمام جانوں کے قتل سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی انسان کا قتل کرنا گویا پوری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ کسی انسان کی جان لینا اسلام کے نزدیک کتنا قابل گرفت عمل ہے، اس کا اندازہ نبی پاک حضرت محمد ﷺ کی اس حدیث سے ہوتا ہے آپ نے فرمایا" قیامت کے دن سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا، وہ نماز ہے جس کے بارے میں باز پرس کی جائے گی اور حقوق العباد میں سب سے پہلے قتل کے دعوؤں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ کسی انسانی جان کی ہلاکت کو عظیم گناہ کے ساتھ ایک اور حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا کہ " بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا، پھر کسی انسان کو ہلاک کرنا ہے، پھر ماں باپ کی نافرمانی کرنا ہے، پھر جھوٹ بولنا ہے"۔ اس حدیث میں قتل کے گناہ کو شرک کے بعد بیان کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ عظیم گناہ ہیں، ان میں کسی انسانی جان کو ہلاک کرنا سر فہرست ہے۔انسانی جان کی حفاظت کے لیے اسلام فقط اخلاقی طریقہ ہی اختیار نہیں کرتا، بلکہ سزا کے ذریعہ بھی اس کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کے قتل کی سخت سزا متعین کی گئی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق قاتل کی سزا قتل ہے، بشرطیکہ مقتول کے ورثا کچھ لے کر معاف نہ کردیں۔ یعنی اگر کسی نے انسان کو قتل کیا تو بدلہ میں اسے بھی قتل کردیا جائے گا۔ بظاہر یہ انتہائی سخت سزا ہے جس پر بعض اسلام سے عصبیت رکھنے والے لوگ اعتراض بھی

کرتے ہیں، مگر نتیجہ کے لحاظ سے یہ سزا درا صل نوع انسان کے لیے مفید ہے اور ان کی جانوں کے تحفظ اور امن وسکون کی بقا کی ضامن ہے۔ دیکھنے میں آرہا ہے کہ وہ مقام و ممالک جہاں پر قتل کی سزا قتل نہیں ہے، وہاں قتل کی وارداتوں میں آئے دن اضافہ ہورہا ہے،اس کے برعکس جن مقامات پر قاتل کے واقعات کی تعداد نہ کے برابر ہے۔ گویا کہ اس سخت سزا میں انسان کے تحفظ کا راز مضمر ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے اس قدر کوششوں کے باوجود بھی فی زمانہ اسلام کو تاریک اور شدت پسند کہا جارہا ہے، جب کہ اس کی تعلیمات امن کے قیام کا موثر ترین ذریعہ ہیں۔

اللہ کے نام پر دے جا سکھیا

رمضان المبارک کا مقدس و بابرکت مہینہ جیسے جیسے قریب آرہا ہے، ویسے ویسے بھکاریوں نے ٹولیوں کی شکل میں شہر کی اہم شاہراہوں ،چوراہوں پر ڈیرے جمانے شروع کردئیے ہیں، شہر کی تمام چھوٹی بڑی مارکیٹوں ، مساجد، ودیگر مقامات ان کی آماجگاہوں کا روپ دھار چکی ہیں،اس وقت ایک اندازے کے مطابق مری میں ہی ان بھکاریوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے، جن میں عورتیں،بزرگ، حتیٰ کے نوعمر بچے بھی " اللہ کے نام پر دے جا سکھیا"کی آوازیں لگاتے ہوئے نظر آئیں گے.ان گداگروں نے باقاعدہ مافیا کا روپ دھار رکھا ہے،اوران کی سرپرستی مقامی انتظامیہ اور ان بھکاریوں کے مالک کرتے ہیں، جو ان کو باقاعدہ ہر صبح شہر کے مین چوراہوں اور شاہراہوں پر چھوڑ جاتے ہیں،اور سر شام ہی ان کو مطلوبہ جگھوں سے لے لیا جاتا ہے، پاکستانی معاشرے میں مردوں کے ساتھ ساتھ نوعمر بچوں اور خاص طور پر خواتین کا سڑکوں پر نکل کر بھیک مانگنا پیشہ بن چکا ہے۔بازار ہسپتال ٹیکسی سٹاپ پر کھڑے ہوں کوئی نہ کوئی بھکاری عورت آپ کے ارد گرد منڈلاتی دکھائی دے گی،لاہور،اسلام آباد، مری سمیت پاکستان بھر میں خواتین شہر کی اہم شاہراہوں پر بھیک مانگتی عورتوں کی وجہ سے شدید پریشانی کا شکار ہیں۔یہ خواتین چھوٹے بڑے گلی کوچوں سے لیکر شہر کی بڑی شاہراہوں اور اہم سٹاپوں پر کھڑی دکھائی دیتی ہیں، جن

میں سے اکثر جسمانی طور پر بالکل ٹھیک اور صحتمند ہوتی ہیں، مری سے میڈیکل کی طالبہ طوبہ عباسی کا کہنا ہے کہ یہ بھکاری عورتیں مسافر خواتین سے لپٹ لپٹ کر بھیک کا تقاضا کرتی ہیں۔حیران کن بات یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک پانچ یا دس روپے مانگنے والی یہ عورتیں اب سو سو روپے کی بھیک مانگتی نظر آتی ہیں،اور بڑی ڈھٹائی سے مانگتی ہی چلی جاتی ہیں ، طوبہ عباسی کا مزید کہنا تھا کہ کبھی اتفاق سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ بازار میں آنے والی گھریلو خواتین کے پاس سو روپے نہیں ہوتے جس کی وجہ سے وہ ان بھکاری عورتوں کو پانچ یا دس روپے دیکر اپنی جان چھڑانا چاہتی ہیں ، لیکن یہ بھکاری عورتیں انہیں اچھا خاصا ذلیل کر دیتی ہیں اور بار بار بھیک کا تقاضا کرتی رہتی ہیں، جس کی وجہ سے گھریلو خواتین شرمندگی کی وجہ سے وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھتی ہیں، مختلف خواتین قصے کہانیاں سنا کر سادہ لوح خواتین کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتی ہیں، جس میں سے ایک طریقہ تو یہ عام ہو چکا ہے کہ وہ بس سٹاپ پر کھڑی عورتوں یا لڑکیوں کے پاس جا کر کہتی ہیں کہ وہ کسی دوسرے شہر سے آئی ہیں،اور انہیں شام سے پہلے اپنے گھر یا گاؤں لوٹنا ہے،اور ہمارے پاس واپسی کے لئے کرایہ نہیں ہے، کیونکہ ہمارا بیگ جیب کترے نے چرا لیا ہے،اور ہماری تمام رقم اس بیگ میں ہی تھی،اور ہم کوئی پیشہ ور بھکاری نہیں بلکہ حالات ہی اس طرح کے ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی مدد کرنے کو تیار نہیں،اسی لئے مجبوراً آپ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا، بھولی بھالی اور سیدھی خواتین ان بھکاری عورتوں کی

باتوں میں آ کر انہیں منہ مانگی رقم ادا کر دیتی ہیں، اور یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ انہوں نے نے کسی ضرورت مند کی مدد کرکے بہت نیکی کا کام کیا ہے، لیکن جب وہ دیکھتی ہیں کہ چند قدم آگے جا کر وہی خاتون کسی اور کو یہ قصہ سنا رہی ہے۔ تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی، کچھ خواتین شہر کے بڑے بڑے مزاروں کے سامنے یا حاجی کیمپ جیسے اہم مقامات کے آس پاس پھولوں کے ہار تھامے منڈلاتی نظر آتی ہیں، یہ خواتین موقع ملتے ہی ایک ہار کسی بھی خاتون کے گلے میں پہنا کر اسے اللہ اور رسول کے واسطے دیتے ہوئے بھیک کا تقاضا کرتی ہے، اس دوران اگر کوئی خاتون ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے تو وہ بھاکری خواتین انہیں بددعائیں دے کر جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہیں ، پاکستان میں حالانکہ کچھ سال پہلے ان بھاکریوں پر بھیک مانگنے کی پابندی لگائی گئی تھی، اور کہا گیا تھا کہ جس علاقے میں یہ بھکاری لوگ بھیک مانگتے نظر آئے تو اس علاقے کا ایس ایچ او ذمہ دار ہوگا اور اس کو معطل کر دیا جائے گا، لیکن اس قانون پر آج تک عملدرآمد نہیں ہوسکا کیونکہ ان بھکاریوں کی سرپرستی کرنے والوں میں خود علاقے کی پولیس ملوث ہوتی ہے اور ان کو باقاعدگی سے منتقلی پہنچتی ہے جس کی وجہ سے یہ گھناؤنا دھندہ یا کہہ لیں کہ کاروبار آج تک بند نہ ہوسکا اور آج بھی مرد، خواتین، بزرگ اور نوعمر بچے بھیک مانگنا اپنا کاروبار تصور کرتے۔ ہیں، اب جب کہ کچھ دن کے بعد رمضان المبارک جیسے مقدس ماہ کی آمد ہونے والی ہے تو اس کے ساتھ ہی بھکاریوں کی تعداد میں بھی اضافہ

دیکھنے کو مل رہا ہے، حکومت پاکستان کو اس سلسلے میں ٹھوس اور عملی اقدامات کرنے چاہئے تاکہ بھکاریوں سے عوام کی جان چھڑائی جاسکے۔

”سچ آکھاں تے میں وی ٹنگیا جاواں گا“

آج کا کالم میں اپنے پنجابی شعر سے شروع کرنا چاہ رہا ہوں۔

”سچ آکھاں تے میں وی ٹنگیا جاواں گا
ایسے لئی رکھ لئی یارو، میں پتھر ہیٹھ زبان“

اظہار کی آزادی اس دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور دنیا کے ملکوں کی اکثریت کو محض اسی ایک سبب سے غیر مہذب قرار دے کر ردی بنانے کی رسم عام ہے۔ دنیا میں جہاں آزادی اظہار کی اجازت ہے وہاں بھی یہ آزادی بڑی حد تک بس ایک وہم سا ہے۔ مثلاً جمہوریتوں میں اپنی مرضی سے دو تین پارٹیوں کے امیدواروں میں سے کسی ایک کو ووٹ دینے کا اختیار ضرور ہے، مگر اس کے بعد ان ووٹروں کو ملک کی سیاست اور پالیسیوں کی باریکیوں پر اثر انداز ہونے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ ووٹروں کی ایک چھوٹی سی اقلیت جس پارٹی کو اقتدار کا اہل سمجھ کر اسے پارلیمان میں اکثریت مہیا کر دیتی ہے وہ پارٹی بعد میں اہم خارجی اور داخلی امور پر اپنے ووٹروں کی رائے سننے کی روادار بھی نہیں

ہوتی۔ البتہ میڈیا کو ان پالیسیوں پر اکثر غیر موثر تنقید کرنے کا حق رہتا ہے اور وہیں سے آزادی اظہار کو ایک پر شوکت نعرے کے طور پر پیش کرنے کا راستہ کھلتا ہے. باقی جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ خود جمہوری ملکوں میں بھی یہ آزادی حکومت وقت عارضی طور پر سلب کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاں ایک طرف انسان کو کسی اہم (یا غیر اہم) معاملہ میں اپنی رائے طے کرنے کا حق ہے اور مناسب وقت اور مناسب محل ومقام پر اس کا اظہار کرنے کا حق بھی ہے وہاں تہذیبی اعتبار سے ہر بات ہر جگہ اور ہر موقعہ پر کرنا نہ کسی کا حق ہوتا ہے اور نہ ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میں اکثر اپنے شاگردوں امتیاز علی شاکر، ساحر قریشی, غلام مصطفٰی بھٹی، میاں نواز اشرف سے کہا کرتا ہوں کہ '' حق بات کہنا فرض ضرور ہے مگر ہر حق بات کا ہر وقت کہنا فرض نہیں ہے۔ '' چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہر مسئلہ پر دنیا کے ہر شخص کو رائے قائم کرنے اور ہر جگہ اس کے اظہار کرنے کا حق ہے تو اس سے معاشرتی فساد پیدا ہوتا ہے۔ اسی فساد سے بچنے کے لئے خصوصاً مغربی ممالک میں قابل رائے اور نا قابل رائے معاملات کی فہرستیں موجود ہیں اور ان سے روگردانی کے نتائج بہت سنگین ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلم ، یا ایشیائی ملکوں میں بات کرنے کو زباں ترس جاتی ہے اور قوموں کے جذبات تک کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ملک اور قومیں راہ راست سے بھٹکتے رہتے ہیں اور اسی گمراہی کو اپنے وجود کی دلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ اس قسم کی

پالیسیوں کا ایک نتیجہ شاہ ایران کی صورت میں سامنے آیا تھا. ایک نتیجہ فلپائن کا ڈکٹیٹر فرینڈس مارکوس تھا اور دو حالیہ نتائج کے نام زین العابدین علی اور حسنی مبارک ہیں۔لوگوں کو اگرچہ تاریخ کے حوالوں سے کچھ خاص دلچسپی نہیں ہوتی مگر بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔خلافت راشدہ کی بات تو آخری دلیل ہے۔ بنی عباس کے دور کا ایک لطیفہ ہے۔ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک خوشامدی کسی طرح آگیا۔یوں بھی خوشامدیوں کا اصل مقام دربار ہی ہوتے آئے ہیں۔اس خوشامدی کو بھی کچھ انعام کا لالچ ہارون کے سامنے لایا تھا۔اس خوشامدی نے کہا کہ جب سقیفہ بنو ساعدہ میں خلیفہ وقت کے انتخاب کا مسئلہ اٹھا تھا تو اگر عالم پناہ ہارون رشید وہاں موجود ہوتے تو معاملہ چٹکیوں میں طے ہوجاتا دربار میں موجود ایک عالم دین نے گرجدار آواز میں بادشاہ کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا یہ شخص جھوٹا ہے۔ سقیفہ میں امیر المومنین کے جد امجد حضرت عباس ابن عبد المطلب) کا تو کسی نے نام بھی نہیں لیا تھا، تو صحابہ کی موجودگی) میں ہارون رشید کا کیا ذکر۔ ہارون نے اس بات سے اتفاق کیا اور ہنستے ہوئے اس خوشامدی کو کچھ تھوڑا بہت مال دے کر رخصت کردیا۔یہ واقعہ آزادی اظہار کا اصول طے کرتا ہے۔ معقول بات مناسب موقع پر ہی کی جائے تو اظہار کا حق ادا ہوتا ہے، ورنہ اسے خوشامد اور دیوانے کی بڑ سمجھا جاتا ہے. غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہم اکثر جن موضوعات پر بات نہیں بلکہ بحثیں شروع کردیتے ہیں اکثر ان موضوعات پر لب کشائی ہمارا منصب نہیں

ہوتا۔ ہاں وقت گزاری کے لئے بات بے بات بولتے رہنے کی عادت الگ معاملہ ہے.

اس عادت کا آزادی اظہار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رمضان المبارک رحمتوں، برکتوں کا مہینہ

للہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ اے ایمان والو! تم پر رمضان المبارک کے روزے فرض کر دیئے گئے ہیں جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کئے جا چکے ہیں تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ اللہ رب العزت نے فرمایا ہے کہ روزے رکھنے کا حکم ہم نے بلاوجہ ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ یہ صرف تمہارے متقی بننے اور جنت میں داخل ہونے کے لئے ایک بہترین طریقہ ہے اور اس سے گریز کرنا ایسا ہی ہے جیسے متقی بننے اور جنت میں داخل ہونے سے انکار کرنا۔ کیا تم مسلمان ہو کر یہ گوارہ کروگے؟ تمہیں تو یہ چاہئے کہ جنت کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ پرہیزگار بننے کی جد وجہد کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان عظیم فرمایا اور ان کے لئے فضیلت کے اوقات مقرر کئے تاکہ وہ رمضان المبارک میں اپنے لئے نیکیاں اکٹھی کریں۔ جو قیامت کے دن کام آسکے اور کثرت سے حضورؐ پر درود و سلام بھیجیں، جنہوں نے رمضان المبارک میں عبادت اور بندگی کی منفرد مثال قائم کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ رمضان المبارک وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ رمضان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ قرآن پاک جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے حضور اکرمؐ کا سب سے بڑا معجزہ اور آپؐ کی امت کیلئے سب سے عظیم نعمت ہے اور قیامت تک آنے

والے تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے، وہ رمضان المبارک میں نازل ہوئی اور اسی وجہ سے رمضان کو قرآن کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ رسولؐ رمضان المبارک سے بہت محبت فرماتے تھے اور اس کے پانے کی دعا کرتے تھے۔ آپؐ اس مقدس ماہ کا استقبال ماہ شعبان میں ہی روزوں کی کثرت کے ساتھ کرتے تھے۔ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی حضورؐ کے معمولات، عبادت و ریاضت میں عام دنوں کی نسبت بہت اضافہ ہو جاتا تھا۔ حضورؐ رمضان کا چاند دیکھتے تو فرماتے یہ چاند خیر و برکت کا ہے۔ میں اس ذات پر یقین رکھتا ہوں جس نے مجھے پیدا فرمایا۔ حضورؐ روزے کا آغاز سحری کھانے سے کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے امت کو تلقین فرمائی کی سحری ضرور کھایا کرو۔ خواہ وہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: سحری سراپا برکت ہے اسے ترک نہ کرو۔ آپؐ نے فرمایا سحری کرنیوالے پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چاہئے کہ کھجور سے کرے۔ کیونکہ اس میں برکت ہے اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے کرے کیونکہ پانی پاک ہے۔ سحری کھانے میں تاخیر اور افطار کرنے میں جلدی کرنا حضورؐ کا زندگی بھر معمول رہا۔ روزہ رضائے حق حاصل کرنے کا ذریعہ اور مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت کا وسیلہ نفسانی خواہشات پر قابو پانے اور اپنے آپ کو منکرات سے بچانے کا اہم ذریعہ ہے۔ روزہ گناہوں کے لئے ڈھال ہے۔ روزہ دار کو چاہئے کہ وہ گناہ کا کام نہ کرے۔ روزہ کا مقصد قرآن پاک نے تقویٰ کو قرار دیا ہے اور تقویٰ بری باتوں اور

برے کاموں سے بچنے ، اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے۔ کہ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اور اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ یقیناً اللہ تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے۔ ایسے روزے دار بہت ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کو روزے کے نام پر صرف بھوک پیاس ملتی ہے اور بہت سے رات کو نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جن کو قیام لیل کے نام پر رات کا جاگنا ہی ملتا ہے۔ یہ لوگ روزہ تو رکھتے ہیں مگر روزے کے روحانی اور اخلاقی تقاضے پورے نہیں کرتے۔ زبان کو دوسروں کی غیبت سے، برائی سے اور بد گوئی سے محفوظ نہیں رکھتے۔ دوسروں کی حق تلفی سے، جھگڑنے اور لڑائی سے باز نہیں آتے۔ غرض ایسے لوگوں کو روزہ سے نہ خود فائدہ ہوگا اور نہ اللہ کو اس کے روزہ کی ضرورت ہے۔ رمضان وہ ماہ مقدس ہے جس میں نیکیوں کی فصل اگتی ہے اور پھر لہلہاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ بے شک روزہ خالص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا کہ بندہ میری ہی خاطر اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہش نفس سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ نیز فرمایا روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ اور بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ اچھی اور پاکیزہ ہے۔ الغرض رمضان قرآن کا مہینہ ہے ، رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ ہے اور اللہ کا مہینہ ہے۔ اس میں

ہر مسلمان کو اپنا گیارہ مہینوں کا محاسبہ کرنا چاہئے اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دوسرے مشاغل سے فارغ ہو کر یاد خداوندی میں لگانا چاہئے۔ اللہ ہم سب کو روزہ کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

عوامی لاشوں کی فروخت

الیکشن 2013ء سے پہلے نون لیگ کی قیادت کا کہنا تھا کہ اگر عوام نے اعتماد کیا تو اقتدار میں آکر مشرف اور زرداری ٹولے کے پیٹ پھاڑ کر کرپشن کے ذریعے لوٹی گئی عوامی دولت نکال کر عوام پر خرچ کریں گے۔ عوام کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ہر صورت ازالہ کیا جائے گا۔11 مئی کے دن عوام نے میاں نواز شریف کے حق میں ووٹ ڈال کر اعتماد کا بھرپور اظہار کیا جس کے بعد میاں نواز شریف دو تہائی اکثریت سے وزیر اعظم پاکستان اور میاں شہباز شریف دو تہائی سے بھی زیادہ اکثریت سے پاکستان کے سب سے بڑے صوبے،صوبہ پنجاب کے وزیراعلیٰ پنجاب منتخب ہوگئے ۔میاں نواز شریف نے وزیر اعظم پاکستان ،منتخب ہونے کے بعد اپنی تقریر میں کہا کہ 100نہیں صرف 30دنوں میں عوام کو محسوس ہوجائے گا کہ اُن کی حکومت درست سمت میں چل پڑی ہے ۔ابھی تک حکومت نے صرف عام آدمی کے پیٹ پر لات مارنے کے سواکچھ نہیں کیا۔بجلی وگیس کی چوری بدستور عروج پر ہے ،رشوت وسفارش کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی عمل نہیں لائی گئی ۔عدل وانصاف کے تقاجے پورے کرنے کی حکمت عملی کا کہیں کوئی وجود نہ ہے۔امیر کوامیر اور غریب کو غریب تر کرنے والا بنا بنایا آئی ایم ایفائی بجٹ پیش کرکے غریب کوزندہ دفن کردیا گیا۔ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر

قربانی دینا عوام کے حصے میں آیا اور جاگیر داروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کو مکمل ریلیف مل گیا۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ جس میں جتنا خون ہے اُتنا ہی نکالا جاتا لیکن غریب کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکال کر پہلے سے صحت مند اور موٹے تازے امیروں کو لگا دیا گیا ہے۔ کشکول توڑنے کا دعوہ کرنے والوں نے آئی ایم ایف کے سامنے جھولی پھیلا کر عوام کے مینڈیٹ کی عظیم توہین کی ہے اور ایک بار پھر عوامی لاشوں کو فروخت کر دیا گیا۔ جی ایس ٹی میں اضافہ، بجلی و گیس کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ 20 روپے کا موبائل بیلنس کروانے والوں پر مزید ٹیکس کا بوجھ تو ڈال دیا گیا ہے لیکن ابھی تک بجلی و گیس چوروں کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ 5 مرلے کے گھر پر تو ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے لیکن ڈیڈھ کروڑ کی گاڑی میں 25 لاکھ کی گھڑی پہن کر اسمبلی آنے والوں پر کسی قسم کا اضافی ٹیکس عائد نہیں کیا گیا۔ اہل پاکستان ذرہ غور کریں، بیرون ملک سے خیرات اور سود پر قرضہ لے کر بجٹ بنانے والے غریب پاکستان کے حکمران ارب پتی کس طرح ہو گئے؟ وہ کہاں سے رقم لے کر کروڑوں کی گاڑی اور لاکھوں کی گھڑی خریدتے ہیں۔ حکومت کے اب تک کے اقدامات سے تو محسوس ہوتا ہے کہ مشرف اور زرداری دور میں ہونے والی کرپشن کا ذمہ دار عام مزدور طبقہ ہے۔ بات بھی سچ ہے کہ اگر حاکمیت مشرف اور زرداری نے کی تو محکومیت کس نے کی؟ عام عوام نے کی، شائد اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر عوام مشرف اور زرداری کے دور میں ہونے

مظالم برداشت کر سکتے ہیں تو وہ کیوں مظالم میں کمی کریں ؟ پاکستانیوں کو اپنے لئے ایسی متبادل قیادت کا انتظام کرنا ہوگا، جو ملک میں موجود سب سے غریب طبقے کی سطح پر زندگی گزانے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ موجودہ قیادتوں میں کوئی بھی اس بات کا حوصلہ نہیں رکھتی، جو لوگ غریب کے چھ مہینے کے بجٹ کے برابر رقم صرف ایک وقت میں بیوٹی پارلر میں خرچ کردیتے ہیں وہ کیا جانے غریب کن حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ذرہ سی بیماری کا علاج لندن اور پیرس میں کروانے کیلئے جانیوالے کیا جانے کہ غریب والدین پر اُس وقت کیا گزرتی جب وہ اپنے بیمار بچے کی دوا لینے کیلئے اپنے گھر کا سامان فروخت کرنے جائیں اور وقت پر خریدار نہ ملنے کی وجہ سے متعلقہ رقم بچے کے کفن دفن پر خرچ کرنا پڑتی ہے۔

ماہِ رمضان اور لوڈشیڈنگ

جاپان کئی بار زلزلوں کی زد میں رہا اور وہاں پھر بھی طالب علموں کیلیئے بجلی کی سہولیات بالکل مفت ہیں، اٹلی میں سب سے زیادہ بجلی پیدا کی جاتی ہے، امریکہ میں لوگ بجلی بنا کر حکومت کو بیچتے ہیں، سنگا پور میں 12 مہینے بارش ہونے کے باوجود ایک منٹ کے لئے بھی بجلی نہیں جاتی، ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں 70% بجلی کوئلے سے پیدا کی جاتی ہے ،انگلینڈ میں لوگ اپنی ضرورت کے مطابق خود بجلی پیدا کر سکتے ہیں ،ہمارے دوست ملک چائینہ میں ہر گھر کے لئے بجلی مفت ہے ،ترکی اپنے علاوہ 3 ملکوں کو بھی بجلی دیتا ہے، سعودیہ ضرورت کی 90% بجلی پٹرول سے بناتا ہے، لیکن پاکستان میں بجلی وافر ہونے کے باوجود عوام کو لوڈشیڈنگ سے نوازا جاتا ہے ، چائنہ میں عوام کو حکومت بجلی مفت دیتی ہے، اور پاکستان میں امیر طبقہ کو بجلی کی مفت فراہمی ہے اور عام عوام سے ٹیکسوں کے انبار اکٹھے کئے جاتے ہیں، پاکستان میں بجلی پیدا کرنے کے چار بڑے ادارے موجود ہیں۔ نمبر ایک واپڈا واٹر اینڈ پاوور ڈیولیپمنٹ اتھارٹی، نمبر دو کے ای ایس سی یعنی کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی۔ سوم آئی پی پی یعنی انڈیپینڈینٹ پاور پروڈیوسرز اور چہارم پی اے ای سی یعنی پاکستان ایٹومک ایزجی کمیشن۔ پاکستان میں تیل، کوئلے اور گیس سے تقریباً اڑسٹھ اشاریہ آٹھ فیصد بجلی پیدا کی جارہی ہے، پانی سے اٹھائیس

اشاریہ دو فیصد اور ایٹمی بجلی تین فیصد ہے۔تربیلہ ڈیم سے 3478 میگا واٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے، منگلہ ڈیم سے ایک ہزار میگاواٹ بجلی، غازی بروتھا سے 1450 میگاواٹ، وارسک سے 243 میگاواٹ، چشمہ سے 184 میگاواٹ، درگائی سے 20 میگاواٹ، رسول بیراج سے 22 میگاواٹ، شادی وال سے 18 میگاواٹ، نندی پور سے 14 میگاواٹ، کرم گڑھی سے 4 میگاواٹ، رینالہ سے ایک میگاواٹ، چترال سے ایک میگاواٹ اور آزاد کشمیر سے انتالیس میگاواٹ بجلی حاصل کی جارہی ہے۔ یہ کل ملا کر ہوئے 6461 میگاواٹ۔اس کے علاوہ گیس ٹربائن پاور سٹیشن شاہدرہ سے 59 میگاواٹ، سٹیم پاور سٹیشن فیصل آباد سے 132 میگاواٹ، گیس ٹربائن پاور سٹیشن فیصل آباد سے 244 میگاواٹ، گیس پاور سٹیشن ملتان سے 195 میگاواٹ (یہ اب شاید بند پڑا ہے)، تھرمل پاور سٹیشن مظفر گڑھ سے 1350 میگاواٹ، تھرمل پاور گدو سے 1655 150 میگاواٹ، کوٹری سے 174 میگاواٹ، جامشورو سے 850، لاڑکانہ سے کوئیٹہ سے 35 میگاواٹ، پنجگر سے 39 میگاواٹ، تھرمل پاور پسنی سے 17، میگاواٹ بجلی پیدا کی جارہی ہے۔ یہ تھرمل اور گیس سے پیدا کی جانے والی کل بجلی ہوئی میگاواٹ۔کے ای ایس سی کے زیرِ سایہ بننے والی بجلی کی تفصیل یہ 11،272 ہے۔ تھرمل پاور سٹیشن کورنگی سے 316 میگاواٹ، گیس ٹربائن پور کورنگی سے 80 میگاواٹ، گیس ٹربائن سائٹ ایریا سے 100 میگاواٹ، تھرمل پاور بن قاسم سے میگاواٹ۔ یہ کے ای ایس سی کا کل ملا کر ہوگیا 1756 میگاواٹ۔آئی پی پی کے 1260 زیرِ سایہ بننے والی بجلی میں شامل ہیں ہب پاور

پراجیکٹ سے 1292 میگاواٹ، اے ای ایس لال پیر لیمیٹڈ محمود کوٹ مظفر گڑھ سے 362 میگاواٹ، اسی کمپنی کے پاک جین سے 365 میگاواٹ، آلٹرن ایزجی اٹک سے 29 میگاواٹ، فوجی کبیر والہ پاور کمپنی خانیوال سے 157 میگاواٹ، گل احمد ایزجی لیمیٹڈ کورنگی سے 136 میگاواٹ، حبیب اللہ کوسٹل پاور سے 140 میگاواٹ، جاپان پاور لاہور سے 120 میگاواٹ، کوہینور پاور سے 131 میگاواٹ، لبرٹی پاور گھوٹکی سے 232 میگاواٹ، روسچ پاور خانیوال سے 412 میگاواٹ، صبا پاور کمپنی شیخوپورہ سے 114 میگاواٹ، سدرن الیکٹرک پاور کمپنی رائیونڈ سے 135 میگاواٹ، ٹپال ایزجی لیمیٹڈ کراچی سے 126 میگاواٹ، اُچ پاور لیمیٹڈ ڈیرہ مراد جمانی نصیرآباد سے 586 میگاواٹ، اٹک جنریٹر لیمیٹڈ موگاہ راولپنڈی سے 165 میگاواٹ، اٹلس پاور شیخوپورہ سے 225 میگاواٹ، کوٹ ادو پاور کمپنی لیمیٹڈ سے 1638 میگاواٹ اور یہ جناب کل ملا کر ہو گیا 6365 میگاواٹ۔ایٹمی بجلی کے ادارے کہوٹہ پاور اور چشمہ پاور بالترتیب 137 اور 325 میگاواٹ بجلی پیدا کر رہے ہیں جو کل ملا کر 462 میگاواٹ بنتی ہے۔چلیں ہم کھلا ڈلا ایک کام کرتے ہیں کہ نہروں میں پانی کی کم موجودگی کو ایک وجہ بنا کر نہری پانی یعنی ہائڈرو پاور سے تیار ہونے والی بجلی کو کم کر دیتے ہیں جو کہ عام حالات میں 2414 میگاواٹ سے شروع ہو کر 6761 میگاواٹ تک چلی جاتی ہے۔اس وقت 2010 سے اب تک جو حالات ہمارے سامنے ہیں ان میں ملک کی بجلی کی پیداوار 19855 میگاواٹ ہے جبکہ بجلی کے استعمال کی شرح دیکھی جائے تو وہ 14500 میگاواٹ تک جا رہی ہے۔

اس ساری کہانی میں 10 سے اٹھارہ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کیوں کی جارہی ہے اور شہری علاقوں کو اس پریشانی اور خصوصاً رمضان کے مہینے میں یہ سب کیوں کیا جارہا ہے سمجھ سے بالاتر ہے۔ حکومت سے گزارش ہے کہ کم از کم ماہ رمضان جیسے مقدس مہینے میں تو لوڈشیڈنگ سے پرہیز کیا جائے۔ انڈیا پاکستان کا میچ ہو تو بجلی نہیں جاتی، لیکن اگر نماز تراویح جاری ہو، سحری کی جارہی ہو، یا افطار کا وقت ہو تو بجلی آتی ہی نہیں، اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کرو گے ویسا ہی بھرو گے

انسانی زندگی کے تین پڑاؤ ہوتے ہیں۔ بچپن ، جوانی ،بڑھاپا۔ بچپن اور جوانی تو ہنسی خوشی کھیل کو د کر اور اپنے والدین کی زیر نگرانی میں بڑی خوشی اور محبت سے گزر جاتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی بھی شخص بڑھاپا نہیں چاہتا۔ بڑھاپے کو زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ اور پریشانیوں سے بھرا ہوا مانا جاتا ہے لیکن بڑھاپا تو زندگی کا کڑوا سچ ہے۔ آدمی اس عمر میں اپنی لمبی زندگی کا سفر کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی زندگی کشمکش اور جدو جہد سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ جوانی سے بڑھاپے کی جانب بڑھتے بڑھتے زندگی کی رفتار میں ایک ٹھہراؤ سا آ جاتا ہے۔ انسان کے کام کرنے کی طاقت اور جوش وہ نہیں ہوتا جو جوانی میں ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ جوانی ٹھاٹھیں مارتی سمندری لہروں کی طرح ہوتی ہے اور بڑھاپا اس جھیل کے پانی کی طرح ہے جس کا پانی ساقط و جامد ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں کام کرنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ زندگی میں وہ جوش حرکت اور ولولے نہیں ہوتے جو جوانی کے دور میں تھے۔ انسان جب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو زندگی موت کی طرف بڑھتی ہے یا یوں کہئے کہ زندگی کی آخری منزل ہوتی ہے۔ انسان اپنی تمام زندگی کے کھٹے میٹھے تجربات اور زندگی کے اتار چڑھاؤ نشیب و فراز سے گزر کر اس پڑاؤ پر پہنچتا ہے تو وہ

بھی اپنی اولاد سے کچھ عزت و احترام کی امیدیں رکھتا ہے۔ لیکن جب اس کو اپنی اولاد سے اپنی توقع کے مخالف نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کے دل کو ایک ایسی ٹھیس پہنچتی ہے۔اور بوڑھا آدمی دل ہی دل میں سوچنے لگ جاتا ہے کہ شاید میں اپنے ہی گھر میں ایک بیکار انسان بن کر رہ گیا ہوں۔ لیکن اولاد اس بات کو بھول جاتی ہے کہ جس مقام پر آج وہ پہنچی ہے وہ انہیں بزرگوں اور بوڑھوں کی دعاؤں اور ان کی بے انتہا کوششوں اور قربانیوں کا ہی ایک نتیجہ ہوتا ہے۔نوجوان نسل کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر میں بزرگوں اور بوڑھوں کے اس ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح زندگی کو اپنی مدد اور عزت سے ان کا پورا ساتھ دیں ان کا خیال رکھیں تاکہ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں رات کی چاندنی کی طرح روشنی بکھیریں۔ وہ بزرگ تو مکان کو گھر بنانے والے ایسے چراغ ہیں جو خود جل کر بھی اپنے بچوں کو روشنی دیتے ہیں اور انہی کے رہتے ہوئے باقی تمام رشتہ داروں سے رشتہ جڑا رہتا ہے۔جب جب اولاد اپنے راستہ سے بھٹک یا ڈگمگا جاتی ہے تو بزرگ ان کا سہارا بننے کو تیار رہتے ہیں لیکن دوسری طرف کیا اولاد بھی اپنے بوڑھے ماں باپ کا سہارا بننے کو تیار ہوتی ہے؟ انہیں تو یہ سب بوجھ محسوس ہوتا ہے۔بڑھاپے میں بھی بوڑھے والدین اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرکے اولاد کی خوشیوں کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے اگر اپنی زندگی کو سنوارنا ہے تو پہلے وہ خود اپنے بوڑھے ماں باپ کی زندگی کو سنوارو نہیں تو ’’جیسا کروگے ویسا ہی بھروگے‘‘ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھ لو کہ وہ

اولاد بہت ہی بدنصیب ہے جو اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔ وہ اولاد بھول کر بھی اپنی زندگی میں یہ امید نہ رکھے کہ ماں باپ کی خدمت کئے بغیر وہ زندگی میں چین و سکون پائیں گے۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ خدا کس بندے پر مہربان اور راضی ہے تو یہ سمجھو کہ جس پر اس دنیا میں اس کے ماں باپ راضی اور خوش ہیں تو اسی پر خدا کی نظر عنایت ہے۔

بے حسی اور عدم برداشت

اکلوتا ہونا ایک اعزاز کی بات ہے اکلوتی اولاد پر والدین بھی ناز کرتے ہیں بلاشبہ اکلوتا آنکھوں کا تارا بھی ہوتا ہے کسی شراکت داری کا محتاج نہی ں ہوتا اس کو بہن یا بھائی کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی کیا وہ ہر ایک غم سے آزاد ہوتا ہے کبھی کسی نے اکلوتا ہونا اور اس کے دم قدم سے پھوٹتی کونپلیں دیکھی ہوں تو وہ بخوبی اندازہ کر سکتا ہے اکلوتے کو اس وقت تو اور تحسین کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے جب خاندان میں یا محلے میں زمیں، جائیداد، مکانات اور دولت کے بٹوارے پر بہن کو بھائی سے الجھتے دیکھا جاتا ہے اور بھائی اپنے ہی حقیقی بھائی کے مقابل کھڑا ہو کر ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو اس رشتے کی ہی نفی کر رہا ہوتا ہے اکلوتا ناز و نعم میں پلتا ہے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے برابر حسن سلوک کا حقدار ٹھہرتا ہے گھر میں اس کی مکمل پسند نا پسند کا خیال رکھا جاتا ہے کھانے پکائے جانے سے لے کر گھر کی سجاوٹ تک اس کے مشورے کو اہمیت دی جاتی ہے اکلوتا ہونے کی وجہ سے اس کی پڑھائی لکھائی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے سکول کے انتخاب سے لے کر مسجد و مدرسہ کی تعلیم تک اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ بندوبست کیا جاتا ہے اگر کبھی اکلوتی اولاد نانی، پھوپھی یا خالہ کے گھر کچھ وقت کے لئے جائے یا کچھ دن وہاں قیام کرے تو

والدین کی اداسی کے ساتھ ساتھ گھر کے در و دیوار بھی ویراں ہو جاتے ہیں گویا زندگی کا ہی پہیہ رک گیا ہو اور روز مرہ کے کاموں میں بھی جمود آ جاتا ہے جیسے یہ سب ایک ہی محور کی بدولت چل رہے ہوں اکلوتی اولاد بیٹا یا بیٹی اس کے پاس زندگی سے لطف اندوز ہونے اور بھرپور انداز میں گزارنے کے مواقع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ والدین ،خاندان، رشتہ داروں حتیٰ کہ دوستوں کی بھی بہت سی توقعات ہوتی ہیں اور ان کی توقعات پر پورا اترنا بعض اوقات اکلوتے آدمی کے لیے بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے اور جوں جوں یہ توقعات بڑھتی ہیں اور پورا نہ ہونے کی صورت میں نصیحتیں سننا پڑتی ہیں اور یہ نصیحتیں آگے چل کر طعنوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تب جا کر یہ تنگی کا باعث بنتا ہے اور گردش ایام اسے تھکا دیتی ہے تو وہ اکیلے پن کو محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے اور بارہا مرتبہ اپنے غم کی تقسیم کے لیے بھائی یا بہن کی خواہش اپنی زبان پر لے آتا ہے اور کاش کے لفظ کے ساتھ اپنی زندگی کی آسودگی کو بھی گرہن لگا دیتا ہے جی ہاں اکیلا ہونا اور تنہا ہونا باعث تکلیف اس وقت بنتا ہے اور جب کوئی غمگسار نہیں ملتا، جذبات کی قدر کرنے والوں میں کمی آ جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر جب سہارے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس وقت ان رشتوں کی لمس محسوس ہوتی ہے بیماری سے تنگ آ کر تو ایک بھائی سے بھائی تو لڑ سکتا ہے اور دل کی بھڑاس اور غصہ کا طوفان حقیقی بہن یا بھائی کے سوا کون سہہ سکتا ہے پاگل پن کے دورے پڑنے پر یہی رشتے ہی لپیٹ لپیٹ کر

رکھتے ہیں اور گھائل ہونے کی صورت میں انہی رشتوں نے مرہم رکھنا ہوتا ہے ہاں انہی لوگوں نے غم اور مصیبت میں گلے لگ کرآ نسوؤں کی برسات برسانی ہوتی ہے آپریشن تھیٹر کے باہر یا ائیر پورٹ کے لاؤنج میں ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر انتظار کی گھڑیاں کون گنتا ہے یہی حقیقی بہن یا بھائی، غم کا کوہِ گراں گرنے پر یا مصیبت کا شکار ہونے پر اپنے لوگوں کو منانے کی ضرورت نہیں پڑتی خوشی کے موقع پر رضا کارانہ کام کرنا ہو یا جوبن پر آ کر خوشیاں منانی ہوں تو یہی لوگ سب سے آگے ہوتے ہیں اس گلدستہ کی قدر تو ان سے پوچھیں جو اکلوتے ہیں ساری زندگی اسی کسک میں گزارتے ہیں بے شک ایسی بے نیازی کا مظاہرہ اکلوتا آدمی ہی کر سکتا ہے مگر یہاں تک پہنچنے کے لیے اس نے کیسے سفر کیا اس کا احساس اس حالت سے گزرنے والا ہی کر سکتا ہے دیوار کچی ہو یا پختہ سائے کا کام ضرور دیتی ہے مکان بارش اور موسم کی سختی سے ضرور محفوظ رکھتا ہے چاہے اس کی چھت ٹپک ہی رہی ہو اس لئے غنیمت جانو ان رشتوں کو اور قدر کرو ان چیزوں کی ہم خود غرضی، بے حسی اور عدم برداشت کی وجہ سے بہت کچھ کھو رہے ہیں ہمیں آگے بڑھ کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دینا ہوگی جب رب کائنات نے ایک انسان کو پیدا کیا اور اس کے مقدر میں جو کچھ ہے اسے مل رہا ہے تو ہمیں اس سے لا تعلقی اور بے رخی اختیار کرنے کا جواز کہاں سے مل رہا ہے۔

ہماری نوجوان نسل مایوس کیوں؟

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہمارے نوجوان جس تیزی سے ملک چھوڑ رہے ہیں اس کی وجوہات کیا ہیں اگر اسی طرح ہمارے پڑھے لکھے نوجوان ملک چھوڑتے رہیں گے تو ملک کی ترقی کیسے ہو گی۔ کیوں ہمارے نوجوان اپنے ملک کو چھوڑنے کے لیے اپنے گھر تک بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اچھی اچھی جاب چھوڑ کر وہ دوسرے ملک جا کر ویٹر تک کا کام خوشی سے کر لیتے ہیں۔ لوگ وزٹ ویزا پر جاتے ہیں اور دس دس سال تک واپس نہیں آتے آخر کیوں؟ آپ اندازہ کریں کہ جو نوجوان ہمارے اپنے ملک میں ماسٹر ڈگری کر کے ،بلکہ کچھ تو ایم فل کر کے بیرون ملک کسی سروس سٹیشن پر کام کر لیتے ہیں یا کسی دوکان پر نوکری کر لیتے ہیں لیکن واپسی کا نام نہیں لیتے آخر کیوں؟ ہماری نوجوان نسل اتنی زیادہ مایوس کیوں ہے اور اگر آپ کسی نوجوان سے کبھی پوچھیں گے تو شائد سب کے ملے جلے ایک جیسے ہی جواب ہوں گے۔ ملک نے ہمیں دیا ہی کیا ہے ،انٹرویو میں کہتے ہیں تجربہ نہیں نوکری ہی نہیں ملتی اگر مل جائے تو ختم کب ہو جائے پتا ہی نہیں چلتا۔ جاب پر اس طرح سلوک کیا جاتا ہے جیسے ہم کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔ تنخواہ بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اوپر سے مالکان ہمیشہ پریشر میں رکھتے ہیں۔ کوئی نوکری بغیر سفارش نہیں ملتی تعلیم کے مطابق نوکری نہیں ملتی۔ میرٹ نہیں کہیں بھی۔ جس کی لاٹھی اس کی

بھینس والا قانون ہے آپ کو جاہز، کاموں کے لیے بھی رشوت دینا پڑتی ہے اگر ہم ان سب باتوں کا جائزہ لیں تو کچھ باتیں ہمارے نوجوانوں کی ٹھیک بھی ہیں لیکن ہم سارا ملبہ حکومت پر یا پھر سسٹم پر نہیں ڈال سکتے۔اگر کچھ باتیں ہم اپنے ذمہ لے لیں تو بہت حد تک ہم ان سب چیزوں پر قابو پا سکتے ہیں ہم اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں۔حکومت کی نوکری ہر کوئی کرنا چاہتا ہے لیکن حکومت ہر کسی کو نوکری نہیں دے سکتی۔لیکن کچھ چیزیں ہیں جن پر ہم آسانی سے کام کر سکتے ہیں اور ہم اپنے نوجوانوں کی مایوسی بھی دور کر سکتے ہیں اور اپنے پڑھے لکھے نوجوانوں کو باہر مزدوری کے بجاے اپنے ملک میں محنت پر بھی لگا سکتے ہیں۔سب سے پہلے تو میں والدین سے گزارش کروں گا کہ جب وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے ہیں تو کچھ ایسے لوگوں سے ضرورہ مشورہ کرلیا کریں جن کو مارکیٹ کی ڈیمانڈ کا پتا ہو۔بچوں سے بھی مشورہ کریں کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں کبھی بھی اپنی مرضی ان پر تھوپنے کی غلطی نہ کریں۔اگراس کی تعلیم اچھی ہو اور اس کو اپنے گھر کے پاس ہی اچھی جاب بھی مل جاے تو اس کو کسی دوسرے ملک میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔۔ایک اور بڑا مسلہ یہ بھی ہے کہ بہت سے والدین ان پڑھ ہوتے ہیں ان کو کسی بھی چیز کا پتا نہیں ہوتا ہے کہ بچوں کو کس فیلڈ میں ڈالنا ہے کیا بہتر ہے اور کیا آگے کام آے گا بس وہ کہتے ہیں بچہ بس ایم اے کر جاے بچہ بھی آسان سے مضمون پاس کرلیتا ہے لیکن جب ڈگری ملتی ہے تو وہ کسی کام کی نہیں ہوتی ہے ایسے لڑکے

کو کوئی نوکری نہیں دیتا ہے سو ایسے لوگ بھی باہر ملک آ جاتے ہیں اور بس جو بھی کام ملے کرنے کو راضی ہوتے ہیں ان کا حل ان کے اپنے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ہاں کچھ مسلئے ایسے ہیں جن پر صرف اور صرف حکومت کا ہی کنٹرول ہے اور اس میں حکومت کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔جیسے بجلی،پانی اور گیس کا مسلہ ہے۔ ملک میں لا قانونیت ہے ،طاقتور کی ہی چلتی ہے مظلوم کی کوئی نہیں سنتا ہے۔غریب کی کسی جگہ کوی شنوائی نہیں ہے سو لوگ اپنی زمین جائیداد بیچ کر اپنے بچے باہر بھیج دیتے ہیں کہ پیسہ ہو گا تو وہ عزت کی زندگی گزاریں گے میں والدین سے درخواست کروں گا کہ بیرون ملک زندگی اتنی آسان نہیں جتنا سمجھی جاتی ہے بس جو آتا ہے وہ مجبوری کی وجہ سے واپس نہیں جا سکتا ورنہ کبھی آپ میرے کہنے پر ایک منٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے سوچیے گا کہ آپ جاب سے گھر آتے ہیں گھر آپکو کھانا خود بنانا ہے۔عید ہے اور آپ جاب پر ہیں یا زیادہ سے زیادہ گھر آ کر سو جائیں گے۔ کسی کی شادی نہیں نہ کوئی دوست آپکو وقت دے گا شاید ہی کوئی قسمت والے ہوں تو ورنہ آپ جس گھر میں ہوتے ہو اس میں رہنے والے ایک ایک مہینہ کے بعد ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں ادھر کوئی روٹین نہیں ہے آپ کی جاب رات کے بارہ بجے بھی شروع ہو سکتی ہے اور صبح کے چار بجے بھی۔ میں آپ کو مایوس نہیں کر رہا حقیقت بیان کر رہا ہوں۔جو پیسہ آپ نے بیرون ملک جانے میں ضائع کرنا ہے اپنے ملک میں اپنا کاروبار کریں ملک بھی ترقی کرے گا آپ بھی۔میں مانتا ہوں بہت مسلئے ہیں

لیکن جب آپ نیک نیتی کے ساتھ کام کریں گے لگن کے ساتھ تو ایک دن ضرور آپ
کامیاب ہوں گے۔

بچوں پر مرضی مسلط مت کریں

آمنہ آئی ٹی میں ماسٹر کرکے فارغ ہی ہوئی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی شادی کے لیے رشتے آنا شروع ہو گئے کچھ اس کی کلاس فیلو لڑکیوں کے بھائی تھے اور کچھ جاننے والوں کی بہت اچھی فیملی کے لڑکوں کے پرپوزل تھے اس کیلئے لیکن اس کے ابو نے صاف صاف بول دیا کہ وہ اپنی فیملی سے باہر کبھی بھی نہیں دیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے آمنہ کی امی جان نے بہت بار کہا بھی کہ ایک مرتبہ آمنہ سے بھی پوچھ لیں کیوں کہ ان کے اپنے خاندان میں ایسا کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اس کے ابو نے سختی سے منع کر دیا کہ آمنہ وہی کرے گی جیسا اسکے گھر والوں کی مرضی ہے۔اس کے ابو نے صاف صاف بول دیا کہ آمنہ کو پڑھانے کا مطلب یہ نہیں بس وہ بالکل ہی آزاد ہے اور دوسری بات کہ ہم خاندان سے باہر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے میں برادری میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا میری ناک کٹ جائے گی۔کچھ ہی دنوں میں اس کی شادی ابو کے ایک کزن کے بیٹے سے کر دی گئی جو مشکل سے میٹرک پاس بھی نہیں تھا ایک جگہ اس کی دوکان تھی ابو نے کہا کہ لڑکا اچھا کماتا ہے میری بیٹی بہت خوش رہے گی سو آمنہ کی شادی میں اس سے پوچھنا تک بھی گوارہ نہیں کیا گیا۔شادی کے بعد آمنہ نے کافی دفعہ اپنے شوہر سے اجازت بھی لینے کی کوشش کی کہ وہ کوئی جاب کرے یا پھر

اپنی آئی ٹی کی فیلڈ میں آگے بڑھے مگر اس کے شوہر نے ہمیشہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ دی اور کوئی جواب نہیں دیا آمنہ کا شوہر بس اپنے کاموں میں ہی مصروف رہتا تھا کبھی اس نے اپنی زندگی میں آمنہ کو وہ اہمیت بھی نہیں دی جو ایک عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا خاوند اس کا خیال رکھے اسے وقت دے اسے احساس دلائے کہ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔آمنہ نے کافی دفعہ سوچا گھر میں اپنی امی سے بات کرے مگر وہ کیا کر سکتی تھی سوائے آمنہ کو دلاسہ دینے کے سو آمنہ نے بس چپ سادھ لی اور اپنی خواہش کو دل میں ہی دفن کر دیا۔ کیونکہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی سوائے اس کے کہ اپنی اولاد کی خاطر اور ماں باپ کی خاطر وہ اپنی سب خواہشات کا گلہ گھونٹ دیتی سو اس نے ایسا ہی کیا۔ محترم قارئین یہ صرف ایک آمنہ کی کہانی نہیں ہے ہمارے یہاں ہر روز ایسی نجانے کتنی آمنہ ہیں جو یہ سب کچھ برداشت کرتی ہیں اور ان کی ہنسی ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے والدین کے سامنے یا پھر بڑوں کے سامنے کبھی بھی منہ نہیں کھولتی ہیں لیکن ان کے دل پر کیا گزرتی ہے ان کے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا ہے۔آپ کبھی اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے آپ کو ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی۔جہاں برادری سسٹم کی وجہ سے خواتین کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا ہے۔آپ کو اپنے خاندان میں ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ بعض دفعہ تو لڑکی ڈاکٹر بھی ہو گی یا بہت پڑھی لکھی بھی ہو گی تو بھی اس کی شادی کسی ان پڑھ یا کسی دوکاندار یا بس نارمل سی تعلیم والے لڑکے سے کر دی جائے

گی بلکہ بعض دفعہ بالکل ہی اجڈ گنوار سے کر دی جاتی ہے اس کی مرضی بھی نہیں پوچھی جاتی۔ وہ بندہ اس کو ذلیل کرے یا عزت دے اس کی مرضی ،ان کی بنے یا نہ بنے۔ بعض دفعہ لڑکا بہت پڑھا لکھا ہو گا لیکن اس کی شادی کسی ان پڑھ لڑکی سے کروا دی جاتی ہے۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ بعض دفعہ تو ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن بعض دفعہ ہر بات میں لڑائی کے لیے تیار ہوتی ہے اور وہ لڑکا گھر سے باہر ہی سکون محسوس کرتا ہے۔ اس بات کا اثر آنے والی نسل پر پڑتا ہے ان پر پوری توجہ نہیں دی جا سکتی ہے باپ کچھ اور کہتا ہے اور ماں کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ سوچ کا اختلاف ہوتا ہے یا ضد لیکن اس کا اثر بچوں کی تربیت پر بہت برا پڑتا ہے۔ وہ تعلیم پر پوری طرح توجہ نہیں دے سکتے ہیں۔ بچے بگڑ جاتے ہیں ان کا دھیان تعلیم پر نہیں رہتا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو اگلی نسل پر پڑتا ہے لیکن اس کے علاوہ اس لڑکے اور لڑکی کی زندگی بھی بس روبوٹ کی طرح ہوتی ہے بس روکھی سی نہ پیار نہ محبت بس سمجھوتہ۔ وہ سب کے سامنے خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اندر سے بہت اکیلے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ لڑکی یا لڑکا کسی اور میں دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ تعلیم کے حوالے سے یا پھر سوچ کے حوالے سے ان کی آپس میں
انڈرسٹنیڈنگ بھی اچھی ہوتی ہے لیکن صرف خاندان ایک نہ ہونے کی وجہ سے ان کے گھر والے اس بات کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ اگر ہم ذات پات کے سسٹم کو دیکھیں تو وہ پاکستان انڈیا میں ہندو کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہم اس کا بہت زیادہ اثر لے چکے ہیں جس طرح ہندو میں برہمن کھشتری، ویش اور شودر

ہوتے ہیں اور ان میں بھی عزت زات کے حساب سے کی جاتی ہے اور رشتے ناتے بھی زات سے باہر سوچ بھی نہیں جا سکتے ہیں اگر کوئی سوچے تو قتل تک کر دیا جاتا ہے ویسے ہی ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہم بھی راجہ، نائی، موچی، مصلی، آرائیں ملک اور اسی طرح کی اور فیملیز میں بٹ چکے ہیں اگر ہم اسلام کو دیکھیں تو اسلام نے ذات پات کے سسٹم کو آکر ختم کیا اللہ تعالی فرماتے ہیں اے لوگو ہم نے آپ کو ایک مرد اور ایک عورت کی جوڑی سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں بانٹا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو مگر تم میں سے افضل اور اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ نیک ہے اللہ تعالی کو مکمل علم اور پہچان ہے (القرآن) آپؐ نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا۔ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں کسی عربی کو کسی عجمی یا کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں نہ کسی کالے کو کسی گورے پر نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقوی کہ۔ (بخاری) میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کے والدین غلط فیصلے کرتے ہیں لیکن اسلام نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ مرد اور عورت کی مرضی معلوم کر لی جائے مگر ہمارے ہاں اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا جاتا ہے بلکہ بہت بڑے بڑے اسلامی گھرانے بھی اب اس زات پات کے سسٹم میں پوری طرح دھنس چکے ہیں کسی اچھی جگہ سے کسی لڑکے یا لڑکی کا پرپوزل ہو گا بھی تو برادری میں ناک کٹ جائے گی فلاں کیا کہے گا فلاں کیا کہے گا بس اس ڈر سے ہم اپنے فیصلے صحیح طرح نہیں کر پاتے ہیں دیکھیں اسلام نے برتری کا معیا

رتقوی پر رکھا ہے لیکن ہم نے خاندان پر بنا دیا۔ایک منٹ کے لیے سوچیے کہ تکبر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی زات کے لیے مخصوص ہے اور اللہ تعالیٰ کی زات کے علاوہ اگر کسی نے تکبر کیا تو اس کو سزا ملی ہم نے بھی بس خاندان کی وجہ سے تکبر شروع کر دیا ہے اپنی زات کو سب سے اعلیٰ سمجھنا اور باقی سب کو اپنے سے کمتر سمجھنا کل کو اللہ تعالیٰ نے قیامت کو اس بات کی بھی سزا دی تو ہمارا کیا ہو گا ہم کہاں جائیں گے۔آپؐ نے ارشاد فرمایا۔تم میں سے ہر ایک کو نگہبان بنایا گیا ہے اور قیامت والے دن اس سے اسکی رعایا کے متعلق سوال ہو گا۔آپ سے بھی سوال ہو گا بچوں کی تربیت شادی سب چیزوں کا اگر ہماری آج کی غلطی سے ہمارے بچوں کی زندگی خراب ہو گی تو کل کو ہم نے جواب دہ ہونا ہے۔کسی ایک کو آگے بڑھنا ہے اس سسٹم کو تبدیل کرنا ہے وہ ہم سب میں سے کسی کو کرنا ہے اس بات میں ہمارے علما کو بھی حصہ لینا ہے اور ہم میں سے ہر شخص کو اپنی اپنی جگہ پر اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ہمیں حضورؐ کی امت بن کر سوچنا ہو گا راجہ، یا ملک بن کر نہیں۔

فیشن شوز سے فحاشی کو فروغ ملنے لگا

حال ہی میں منظرِ عام پر آنے والے ایک عالمی سروے کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں سب سے زیادہ تناؤ کا شکار ایشیائی خواتین ہیں۔دنیا کے ترقی یافتہ اور تیزی سے عالمی افق پر ابھرتے 21 ممالک میں 18 سال سے زائد عمر کی 65 ہزار خواتین پر کرائے گئے اس سروے میں ایشیائی خواتین میں تناؤ کا تناسب سب سے زیادہ سامنے آیا۔اس سروے کے مطابق 87 فیصد ایشیائی خواتین کا کہنا ہے کہ وہ تقریباً ہر وقت تناؤ کا شکار رہتی ہیں جبکہ 82 فیصد کا کہنا ہے کہ انہیں آرام و سکون کا کوئی لمحہ میسر نہیں آتا۔اس سروے میں دوسرے نمبر پر میکسیکو کی خواتین آئیں جن میں تناؤ کا تناسب 74 فیصد دیکھا گیا جبکہ روسی خواتین 69 فیصد کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہیں۔ایک نئے مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ ترقی یافتہ اور امیر ترین ممالک میں لوگوں کے تناؤ ہونے کے امکانات زیادہ ہیں اور خواتین میں دماغی بیماریوں کی شرح مردوں کی نسبت دگنا ہوتی ہے۔ سماجی و معاشی اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ آمدنی والے ممالک کی 15 فی صد آبادی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تناؤ کا شکار ہوتی ہے۔جب کہ یہ شرح کم یا درمیانی آمدنی کے ممالک میں صرف 11 فیصد ہے۔امریکا،فرانس ،ہالینڈ اور ایشیائی ممالک میں تناؤ کی شرح 30 فی صد ہے۔سب سے کم ڈپریشن کی شرح چین میں 6.5 فی صد جب کہ میکسیکو میں 8 فی صد ہے۔

ایشیاء میں جہاں خواتین میں تناؤ کی یہ شرح 87 فی صد اور مجموعی شرح 30 فی صد ہو وہاں خواتین میں خود نمائی کا رجحان حیرت انگیز حد تک نا قابل یقین ہے۔ ملک میں گرچہ ایک عرصہ سے مغربی ثقافت کا حملہ جاری ہے اب سلٹ واک یعنی بے شرم مورچہ کے ذریعہ مغربی ثقافت نے ایک اور یلغار کی ہے۔ گزشتہ دنوں کراچی میں فیشن شوز کے نام پر جس طرح بے حیائی کو فروغ دیا گیا،اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ ان فیشن شوز میں شریک خواتین نے کہا ہے کہ انہیں اپنی مرضی کے لباس زیب تن کرنے کی آزادی ہونی چاہئے چاہے وہ لباس عریانی کو فروغ دیتے ہوں۔ ان کی دلیل ہے کہ وہ کسی کی بری نظر کی وجہ سے برقعہ نہیں پہن سکتیں غرض یہ کہ ان خواتین کے مطابق پاکستان میں خواتین کو آزادی نہیں ہے۔ وہیں یورپ میں مسلم خواتین اپنی آزادی کی دہائی دے رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستان میں خواتین ایسے لباس پہننا چاہتی ہیں جس سے ان کے جسم کے تمام اعضاء کے نشیب و فراز ظاہر ہوں۔ تو دوسری جانب یورپ کے کئی ممالک میں مسلم خواتین اپنے جسم اور چہرے کو ڈھانپنے کے لئے برقعہ اور حجاب کی متمنی ہیں۔ بیلجیئم اور فرانس کے بعد اب اٹلی میں بھی برقعہ اور حجاب پر پابندی لگانے پر غور و خوض کیا جارہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام اٹلی کا دوسرا بڑا مذہب ہے جہاں دس لاکھ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں لیکن وہاں ایسی خواتین کی تعداد بہت کم ہے جو برقعہ یا حجاب کا استعمال کرتی ہیں اس کے باوجود اٹلی کی حکومت ملک میں برقعہ اور حجاب پر پابندی کی تیاری کر رہی ہے۔ اٹلی کی

اسمبلی میں برقع پر پابندی کا بل پیش کر دیا گیا ہے جس پر جلد ہی بحث شروع کی جائے گی۔ بل کی منظوری کے بعد اٹلی میں چہرے اور سر کے بالوں کا ڈھانپنا غیر قانونی ہو جائے گا جس کی خلاف ورزی پر 150 سے 300 یورو تک جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ بل کے مطابق کسی خاتون کو زبردستی برقع اور نقاب پہننے پر زور دینا بھی سنگین جرم ہوگا جس پر 30 ہزار یورو جرمانہ اور ایک سال قید کی سزا دی جائے گی۔ نظر تیری بری، برقع میں پہنوں؟ فیشن شوز میں شریک اکثر خواتین کا کہنا ہے کہ اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ ہم نے کیا پہن رکھا ہے۔ اگر خواتین نے خود کو سر سے پیر تک بھی ڈھانپ رکھا ہو تب بھی وہ جنسی زیادتی کا شکار بنتی ہیں۔ اگر خواتین زیادتی کا شکار بنتی ہیں تو انہی پر یہ الزام عائد کر دیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایسا کرنے کی خود دعوت دی ہوگی۔ ایک جائزے کے مطابق 85 فیصد خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ مال و دولت اور حجاب کے تعلق سے سعودی عرب کی مثال سمجھی جا سکتی ہے جہاں دولت کی بھی فراوانی ہے اور خواتین بھی پردے کے ساتھ رہتی ہیں۔ لیکن سعودی خواتین نہ تو تناؤ کی شکار ہیں اور نہ ہی وہ بے حیائی کی حامی ہیں بلکہ سعودی عرب میں گزشتہ 60 برس کے دوران اوسط عمر 40 برس سے بڑھ کر 73 سال ہو گئی ہے۔ 1950 میں اوسط عمر 40 برس تھی جو 2010 میں بڑھ کر 73 برس ہو گئی ہے اور اس میں مزید اضافے کا امکان ہے۔ سعودی عرب کے آبادی کے منظر نامے سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ چند عشروں کے دوران بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور اس

میں سب سے نمایاں شرح اموات میں کمی ہے۔ شرح اموات میں کمی بالخصوص نومولود بچوں اور شیر خوار بچوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نمایاں تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ سعودی عرب میں شرح پیدائش میں خاصی کمی آئی ہے۔ محض تین عشرے قبل ایک خاتون کے ہاں اوسطاً 7 بچے پیدا ہوتے تھے یہ شرح اب کم ہو کر اوسطاً تین بچے فی خاتون پر آ گئی ہے۔ دنیا کے امیر ممالک کے افراد غریب ممالک کے مقابلے میں تناؤ کا زیادہ شکار ہیں جب کہ مردوں کی نسبت اس مرض کی شکار خواتین کی تعداد دگنی ہے۔ تناؤ کے اہم اسباب میں طمع و لالچ اہم ہیں۔ معاشرے میں لالچ کا عنصر دولت سے جنم لیتا ہے جو حسد، کینہ پروری اور عدم انصاف کو عام کرنے کا سبب بنتا ہے۔ دولت مند ہونا جرم نہیں بلکہ اس کا ناجائز استعمال خرابیوں کی جڑ ہے۔ ہر مذہب کے مطابق لالچی انسان کی محبت دولت سے ہوتی ہے جو معاشرے میں عدم انصاف کا باعث بنتی ہے۔ دنیا کے ہر اس حصے میں جہاں انصاف کی عدم فراوانی ہے وہاں کے عوام میں غربت کی انتہا اور وسائل کی غیر مساوی تقسیم ہے جن کی وجہ سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنی خواہشات کا محل اپنی حیثیت کے مطابق بنانا چاہیے۔ دولت کا لفظ ہی پراگندا اثر کا حامل ہے، دولت معاشرے میں غربت کی طرح چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے جس کا ہونا ناجائز نہیں بلکہ یہ خدا کا وہ عطیہ ہے جس کو نیک کاموں کے لئے استعمال کرکے خدا کا مشکور ہونا چاہیے۔ دولت کی بے حد فراوانی معاشروں کی تباہی کی بنیاد بھی ہے۔ معاشرے میں ہر شخص کو اپنی چادر

کے مطابق پاؤں پھیلانے چاہئیں کیونکہ اپنی خواہشوں کی عمارت ہمسایوں کو دیکھ کر تعمیر
کرنے والے ہمیشہ مایوسی کا شکار رہتے ہیں۔ بشکریہ

سیاسی جانشین

پاکستان میں برسوں سے چند خاندان ہی حکمرانی کا تاج پہنتے ہیں اور ان کی جانشینی انہی کی پیڑیاں کرتی ہیں، جیسے کہ پاکستان پیپلزپارٹی ذوالفقار علی بھٹو سے نصرت بھٹو، بے نظیر سے بلاول بھٹوتک اور اس کے بعد آصفہ بھی جانشینی کی امیدوار ہیں، پاکستان کی دوسری بڑی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ نواز جس نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت تلے آنکھ کھولی اور اسی کی جانشینی کرتے ہوئے انتخابات میں حصہ لیا اور بعد ازاں یہ جماعت بھی پیپلزپارٹی کی طرح گھر کی جماعت ہی بن سکی، جس کی قیادت میاں نواز شریف، شہباز شریف، حمزہ شریف، مریم نواز انہی کی فیملی کے گرد ہی گھومتی ہے، اور کبھی بھی کسی غریب ورکر کو قیادت کا مزہ نہیں چکھایا گیا۔ اور ورکر صرف ان قائدین کے جلسے جلوسوں میں تالیاں ہی مارنے کی حد تک رہ گئے، پاکستان کے صوبے خیبرپی کے میں بھی کچھ ایسا ہی ہے، کہ عوامی نیشنل پارٹی کو باچا خان سے، ولی خان، پھر اسفند ولی خان یعنی کے خاندان میں ہی رکھا گیا، پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار دیکھنے کوملا کہ 16 سال سے سیاست کی وادی پرخار میں رہنے والے عمران خان کو جب عوام نے تیسری سیاسی قوت بنایا تو عمران خان نے بھی عوام پر اپنا حق ادا کیا اور پارٹی میں الیکشن کروا دیئے حالانکہ اس فیصلے سے پارٹی کی پاپولیرٹی پر بھی کچھ

اثر پڑا لیکن عمران خان نے وہ کر دکھایا جو آج تک باقی سیاسی پارٹیوں نے ورکرز کے ڈر سے نہ کیا کہ کہیں کوئی ورکر ہی پارٹی کا سربراہ نہ بن جائے لیکن کپتان نے ایسا کیا اور پارٹی کو ورکرز کے ہاتھوں میں دے دیا، پاکستان میں موروثی جانشینی کا مسئلہ یہ ہے کہ ہر پیڑھی میں تعداد بڑھتی جاتی ہے لیکن دستیاب عہدوں کی تعداد وہی برقرار رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے پوتے پڑپوتوں میں اقتدار کی جنگ بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ خاندان کی شاخیں دور دور تک مختلف سمتوں میں پھیلی ہوتی ہیں اس لیے جانشینی کی قطار خلط ملط ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے کنبہ وسیع ہوتا جاتا ہے پیدائش کی ترتیب کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور سیاسی طاقت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جس سے جھگڑا اور رسہ کشی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ پاکستان اکیلا ہی موروثی سیاست کا ڈسہ ہوا نہیں پاکستان کیساتھ ساتھ پڑوسی ملک بھارت اور سعودی عرب کی مثالیں سامنے ہیں جو قیادت کی نئی پیڑھی میں منتقلی کی صورت حال سے دوچار ہیں جہاں اس قسم کے منتقلی اقتدار کو درپیش چیلنج سامنے آرہے ہیں۔ مملکت سعودی عربیہ میں اگلے دس بارہ سال کے دوران لیڈروں کی تیسری یا چوتھی نسل کے لیڈروں کو اقتدار منتقل ہو جائے گا۔ کیونکہ سعودی عرب میں فرمانروائے وقت کی زندگی میں نہیں بلکہ اس کی موت کے بعد ہی اقتدار منتقل ہوتا ہے۔ مملکت کے بانی کے بیٹے 1953 سے اب تک برسر اقتدار ہیں۔ سعودی عرب میں شاہی خاندان ہی مملکت ہے۔ کسی پارٹی کے ذریعہ اسے حکومت سے الگ نہیں کیا جاتا لیکن پھر بھی وہاں الگ الگ دھڑے

اور گروہ بندی ہے۔ شاہی خاندان کے افراد چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹے ہیں۔ جس سے سعودی عرب میں نئی نسل کو اقتدار کی منتقلی کا عمل انتہائی دھندلا اور مبہم ہو جاتا ہے۔ لازمی طور پر یہ ایک خاندانی معاملہ ہے، جس میں شاہی خاندان کے اراکین کسی بادشاہ یا ولی عہد شہزادے کی موت کے بعد جانشین کے نام پر اتفاق رائے ہونے تک باہم تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ جانشینی کی ایک رسمی پالیسی موجود ہے لیکن اس پر کبھی عمل ہی نہیں کیا گیا۔

سعودی عرب داخلی استحکام کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے عام طور پر اپنی تیل کی دولت کا استعمال کرتا ہے لیکن یہ پالیسی آئندہ آنے والی دہائیوں میں اپنی حدیں چھو سکتی ہے کیونکہ تیسری اور چوتھی پشتیں قیادت سنبھال رہی ہیں۔ تیل کی دولت سعودی عرب کی نمایاں پہچان رہی ہے اور اس پر نئی نسل یقیناً انحصار کر سکتی ہے لیکن اس امر کی کوئی توقع نہیں ہے کہ وہ اس تیل طاقت کو اپنے پیشروؤں کی طرح موثر ہتھیار بنا سکیں گے۔ دنیا بھر میں تیل کی پیداوار میں کافی اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے عالمی تیل ذخیرے میں سعودی عرب کے حصہ میں کمی واقع ہو رہی ہے اور اب تیل کی دولت اس کے اقتدار کا ذریعہ بھی نہیں رہ گئی۔ اختیارات اور طاقت حاصل کرنے والے تیل جیسے کھلے آلہ کی کمزوری تیسری اور چوتھی نسل کے لیے سعودی عرب کے شاہی خاندان کی داخلی سیاست کو اور بھی پیچیدہ کر دے گی۔ کسی بھی سیاسی نظام میں دوسری پیڑھی کو منتقلی یا

ادلا بدلی ایک انتہائی حساس عمل ہو سکتا ہے۔

دوسروں کا احتساب، اپنا محاسبہ کریں

وہ سچ کی تلاش میں تھا۔ اس نے آنکھ ایسے ماحول میں کھولی جس کی تمنا دوسرے کئی برس سپنوں کی طرح کھلی آنکھوں میں بساتے ہیں۔ مگر جن میں مایوسی لوڈ شیڈنگ کے اندھیروں سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے۔ معاشرہ سے کٹ کر ضرورت صرف معاش رہ جاتی ہے۔ پھر انسان بھی انسان نہیں رہتا۔ رشتوں کے ٹوٹنے کی آواز سوکھی لکڑی کے تنے سے الگ ہونے جیسی ہوتی ہے مگر سنائی نہیں دیتی۔ اپنے پن سے جدا ہونے کا درد محسوسات سے خالی کبھی نہیں ہوتا۔ اس کا یہی درد پیشانی پہ پڑی سلوٹوں سے عیاں تھا۔ ہر سوال کے آخر میں کیوں اور پھر ایک نئے سوال کی ابتداء، یوں نہ تو وہ سوال سے اپنے آپ کو روک پایا اور نہ ہی جواب سے تسلی۔ " کیوں "نے اس میں گھبراہٹ کا سایہ پھیلا رکھا تھا۔ سایہ اتنا گہرا ہو گیا کہ مایوسی کے اندھیرے میں اسے روشنی کی تلاش نے بے چین کر دیا۔ باپ سے سوال کرتا تو وہ دوسری بیوی اور اس کے پہلے بچوں کے معاملات میں الجھنے کی وجہ سے اسے پہلی غلطی کی سزا نظر آتا۔ اس کی پہلی بیوی دوسرے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے اس کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئی اور دوسری بیوی اپنی پہلی اولاد کے ساتھ ساتھ اس کی بچی پر بھی اپنا حق جتاتی۔ ہمسائے اس سے نالاں، دوست اس سے کنارہ کرتے، مذہب میں اسے پناہ نہ ملتی۔ وہ الجھتا چلا گیا۔ نشہ کی بجائے اس نے دوا کا سہارا لیا۔ جس

سے خیالات کچھ دیر ستا لیتے مگر آنکھ کھولتے ہی اسے بے رحم سوالوں کے تھپیڑے آ لیتے۔ وہ سوالوں کی گٹھڑی کندھوں سے اوپر دماغ میں سجائے سوالی بنا پھرتا۔ آخر اسے کس کی تلاش تھی۔ کہیں رشتوں سے فرار کا راستہ ڈھونڈنے کے لئے سہارے کی تلاش میں تو نہیں مارا مارا پھرتا رہا۔ ملاقات دوسری بار سوال پہلے والا۔ اسے ایسی کتاب کی تلاش کیوں جس کے ایک ایک لفظ پہ سچائی لکھی ہو۔ بندے پہ جس کا اثر تو ہو مگر دسترس واختیار سے اوپر ہو۔ جن کی نظریں اپنے چاروں اطراف برپا ہنگامہ خیزی سے دوچار ہوں۔ دماغ کے تندور میں خیال کے پیڑے سے اختلاف کی روٹی پکانے کا عمل جاری و ساری ہو۔ وہاں قلب میں میوے انتظار میں ہی سوکھ جاتے ہیں۔ جو زندگی آنکھوں اور کانوں سے بسر کرتے ہیں زندہ قلب سے نہیں رہتے۔ جو لفظ پڑھنے یا سننے سے ذہن میں سما جائیں مگر قلب میں نہ اتر پائیں تو برین واش تو ہو جاتا ہے مگر قلب صفائی سے محروم رہ جاتا ہے۔ دروازے پہ دستک گھر کے مکین سے تعلق کی غماز ہوتی ہے۔ مکین سے محبت ہو تو دستک ملائمت احساس سے بھری ہو گی۔ دوسری صورت میں ہاتھ کی ضرب آنے والے کے ارادے کا ڈھنڈورا پیٹے گی۔ اللہ سبحان تعالی کے فرمان تک پہنچنے کے لئے ذہن کے دریچے بند کر کے قلب کی سیڑھی سے سچائی کی رسی تک رسائی ممکن بنائی جا سکتی ہے۔ اگر جینے میں کیوں، کیا، کیسے کے حروف اضافی کی تکرار ہو تو سوالوں کی بھرمار کے وزن سے پیشانی پہ سلوٹیں بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ چاند پر پڑتی سورج کی شعاعیں اسے گھٹا بڑھا کر تاریکیوں میں بدل دیتی

ہیں۔ یہی شعائیں زمین پر دن رات کی تمیز کرتی ہیں۔ اس سے آگے کا علم نہیں۔ کہیں مفروضے تو کہیں کہانیاں ہیں۔ زمین میں ننھے بیج کے دبانے سے خوشبو اور مہک میں لپٹنے تک پھل اور پھول ایک وقت کی حقیقت کے عکاس ہیں۔ پل بھر کے چکھنے کی داستان نہیں۔ جو ابر کے کرم کے محتاج ہیں۔ جو اتاریں نہ جا سکیں تو خود ہی اتر کر زمین سے لپٹ کر فنا ہو کر پھر نئی زندگی بن جاتے ہیں۔ رب العالمین کا تصور کرنے کے لئے بند کمرے سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آنا ہو گا۔ نعمتوں کا تصور باغوں و بہاروں سے جدا ہو کر رنگ نہیں دکھا پائے گا۔ مہتاب کو اپنا کہہ دینے سے کسی کی ناراضگی کا اندیشہ نہیں رہتا۔ کیونکہ زمین کے عشق میں وہ خود دیوانہ وار جھومتا ہے۔ ہوائیں زندگی کی محبت میں بستر سے لپٹی سانس تک آمدورفت جاری رکھتی ہے جو زرد پتوں کو گرا دیتی ہیں اور آندھی بن جائیں تو اڑا دیتی ہیں۔ خیالات کی زمین پر جب شک کی پنیری لگائی جائے گی۔ تو اختلاف کی فصل کو کاٹنا بہ امر مجبوری بن جائے گا۔ دوسروں کا احتساب کرنے سے پہلے اپنا محاسبہ ضروری ہے۔ ترازو میں تولنے والا ایک طرف ہمیشہ اپنے پاس باٹ رکھتا ہے۔ جس کے وزن کا پورا ہونا تول کی گارنٹی ہے۔ نئے ماڈل کی کار، پوش علاقے میں مہنگے بنگلے خواہشات کے غلاموں کی امارت کی منڈیوں میں نیلام ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جسے پانے کے لئے آزادی کے پروانے اپنی جانوں پر کھیل جاتے ہیں۔ باتیں تو پرانی تھیں اسے نہ جانے کیوں نئی محسوس ہوئیں۔ شائد اسے دنیا میں جینے کے لئے جینے کا ڈھنگ ہی بتایا جاتا رہا۔ مگر

سچ تو قلب میں ایسے اترے جیسے پھل میں رس اترتا ہے۔ کلام کا اثر قلب کے پاک ہونے سے بڑھ جاتا ہے۔ علم تو معلم کا محتاج ہو سکتا ہے۔ عقیدتِ عشق، محبوب کے وصل سے وابستہ نہیں۔ خوشنودی کے لئے رضا بھی درکار ہوتی ہے۔ زیادہ سوالات کبھی گتھیاں سلجھانے کی بجائے خود ہی الجھ جاتے ہیں۔ جس سے طالب متعلّم ہو جاتے ہیں اور فیصلے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو علم کی معراج تو بن جاتے ہیں مگر عمل کی میراث نہیں۔ برسہا برس کی دھول چند لمحوں میں قلب سے دھل جائے تو شکریہ کا ہار الفاظ کے گلے میں نہیں ڈالا جائے گا۔ بلکہ اس قلب کو پہنایا جائے گا جو سچائی کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا تھا۔ لفظوں کو موتیوں کی مالا بنا کر جس نے پرو لیا۔

غربت تمہیں کفر تک لے جائیگی

انسان کی زندگی میں بہت سے تکلیف دہ لمحات آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے خوشی اور غم دونوں ہی زندگی کے اہم حصے ہیں میرے لیے زندگی کا سب سے تکلیف دہ لمحہ وہ ہے جب کسی غریب کی آنکھوں کے خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کی امید دم توڑ دیتی ہے ہمارے معاشرے میں اب یہ لمحہ روز ہی دیکھنے کو ملتا ہے.بڑھتی مہنگائی، بے روزگاری نے غریب کو مار ہی دیا ہے تو امید نے بھی مرنا ہی تھا موجودہ دور میں پاکستانی عوام کو سب سے زیادہ اہم مسئلہ درپیش ہے وہ غربت ہے ہمارے ملک کو دو طبقات میں استعمال کیا جا سکتا ہے ایک امیر اور ایک غریب امیر جو ہے وہ امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور غریب لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں ان دو طبقوں کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو متوسط طبقہ کہلاتا ہے اس طبقے کے لوگ زندگی گزارنے کے لیے سخت محنت کرتے ہیں اور با مشکل اپنی قلیل آمدنی میں گزارا کرتے ہیں موجودہ حالات اس طبقے کے لیے زندگی گزارنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کیونکہ ایک محدود آمدنی میں پیٹ بھرنا، بجلی کا بل، گیس کا بل، بچوں کی فیس کی ادائیگی کرنا اب ناممکن ہوگیا ہے ملک میں بڑھتے جرائم دہشت گردی، کرپشن ،چوری دن دیہاڑے ڈاکے ، قتل و غارت نے انسان کا سکون تک چھین لیا یہ سب چیزیں انسان کے لیے فکر کا باعث ہیں مگر

یہ حقیقت ہے کہ تمام جرائم معاشرے میں اس وقت بڑھتے ہیں جب غربت کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے مشہور کہاوت ہے کہ پیٹ بھرا ہوا نہ ہو تو کسی کی بات بھی اچھی نہیں لگتی، تو ایسا انسان جس کے پاس ایک اچھے کل کی امید نہ ہو، پیٹ بھرنے کے لیے روٹی نہ ہو، تعلیم ہو پر بے روزگار ہو، گولڈ میڈل لسٹ ہو مگر مزدوری کرنے پر مجبور ہو تو ان حالات میں قتل نہیں ہوں گے ؟ چوریاں نہیں ہوں گی؟ دہشت گردی نہیں بڑھے گی؟ یقیناً ہاں ایسا ہی ہو گا۔

نبی کریمؐ نے فرمایا کہ " غربت تمہیں کفر تک لے جائیگی"۔

غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں ہے لیکن غربت جرائم کی طرف لے کر جانے والا راستہ ضرور ہے ہمارے ملک میں غریب کا دل جھوٹے وعدوں، مستقبل کے حسین خوابوں سے ہمارے سیاست دان بہلاتے ہیں اور ووٹ لینے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جو غریب کو متاثر کر سکے اور ووٹ لینے کے بعد غریب کو بھول جاتے ہیں غریب کو نعروں سے کیا مطلب ؟ لانگ مارچ کے کیا فائدے؟ اس کو تو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی چاہیے اپنے بچوں کا مستقبل چاہیے اچھے کل کی امید چاہیے امن چاہیے ایسا تو تب ہی ممکن ہے جب ملک سے غربت کا خاتمہ ہو تبدیلی کے صرف وعدے نہ کیے جائیں بلکہ مثبت تبدیلی لائی جائے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

دکھ درد بٹانے والے، مصیبت کے وقت کام آنے والے، آنسوؤں کا سبب بننے والے حالات کے آگے کسی کی خاطر بندھ باندھنے والے اور سب سے بڑھ کر کسی کے لئے آسانی پیدا کرنے کی خاطر خود کو مصیبت تک میں ڈالنے والے کو ہمدرد کہتے ہیں۔ کسی کی ہاں میں ہاں ملا دینا یا چند گھڑیاں پاس بیٹھ کر گزرار دینا ہمدردی نہیں کہلاتا۔ ایک مصیبت زدہ کے ساتھ خود بھی دن اور رات خود کو مصیبت میں مبتلا کر لینا ہی حقیقتاً ہمدرد ہوتا ہے۔ بعض اوقات مجبوریاں اور بندشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک شخص کسی کیلیئے کچھ نہیں کر سکتا مگر اندر ہی اندر کڑھتا ضرور ہے۔ وہ بھی تو ہمدردی میں ہی ایسا کر رہا ہوتا ہے ایک شخص ظاہراً تو کہیں نظر نہیں آ رہا ہوتا مگر مظلوم کو ڈھارس بندھا رہا ہوتا ہے۔ بچے کی اس جہانِ فانی میں آمد کے ساتھ ہی اس کے ساتھ کچھ ہمدرد سامنے آنا شروع ہوتے ہیں کسی کو دادا، دادی، چچاؤں سے زیادہ ہمدردی ملتی ہے اور کسی کے لئے نانا، نانی، خالہ اور ماموں دیدہ دل فرش راہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سکول میں کسی استاد کی شفقت اس کیلیئے ہمدردی کا روپ دھارتی ہے اور شباب کا عالم سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہوتا ہے جس کی نہ تو کسی سے فرمائش کی جا سکتی ہے اور نہ حد سے زیادہ توقع یہ ربِ عظیم کی طرف سے کسی کے دل میں کسی کیلیئے ڈال دی جاتی ہے۔ سفر

کی تیزی میں اور حالات کی دھند میں ہمیں اپنے ہمدردوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔ ہمدرد سے ملنا روز ضروری نہیں ہوتا۔ آپ جب بھی سالوں بعد، کبھی کبھار بھی مل جائیں تو اس کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھے گا اور سالوں کے فاصلے اس کی مسکراہٹ میں حل ہو جائیں گے۔ ربِ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت، رزق تک کا ذمہ خود لے رکھا ہے تو ہمارا کام تو صرف اور صرف ہمدردی ہی رہ جاتا ہے۔ آج ہم نے عیب جوئی، غیبت اور خواہ مخواہ کسی کی ترقی خوشحالی اور دولت مندی کو موضوع بحث بنایا ہوا ہے درحقیقت ہم نے ہمدردی کو موضوعِ سخن بنانا تھا۔ کسی کے راستے کے کانٹے چننے کی تدبیریں سوچنے کیلئے وقت کو صرف کرنا تھا۔ آہوں سسکیوں کو خوشیوں میں بدلنے کیلئے کام کرنا تھا۔ کیونکہ علامہ محمد اقبالؒ نے بھی انسان کا مقصد یہی بیان کیا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ اطاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

حال ہی میں یورپ سے آئے ایک دوست نے چند ماہ یہاں گزارے اور ان کی اس بات نے مجھے چونکا دیا کہ دیارِ غیر میں ہم بم دھماکوں، فائرنگ اور دہشت گردی کے واقعات میں ہم وطنوں کی جانوں کے نذرانے دینے پر ہر وقت متفکر رہتے ہیں مگر یہاں آکر تو ہم نے کسی کو بھی حیران و پشیمان نہیں دیکھا ہر ایک اپنے کاموں میں جتا ہوا ہے اور خوشی والا خوشی کر رہا ہے اور کسی کو کسی حد تک

کوئی پرواہ نہیں ہے۔ جب دو ہزار پانچ کو زلزلہ آیا تو ساؤتھ افریقہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر کے اس سوال نے ہمیں دم بخود کر دیا کہ کنٹونمنٹ جنرل ہسپتال صدر راولپنڈی کے آپریشن تھیٹر میں وہ تو کام کیلئے اتنے دور سے یہاں آ گئے تھے مگر یہاں کے کلینکس کھلے ہوئے ہیں اور ڈاکٹرز پرائیویٹ پریکٹس میں مصروف ہیں کیا یہ لوگ اپنے ہم وطنوں کے لئے وقت نہیں نکال سکتے تو یقیناً اس کا جواب یہ ہی ہو سکتا ہے کہ ہم وطنوں کی

خدمت

بھی ہمدردی کے جذبے کے بغیر نہیں ہوتی اور یہ جذبہ بھی رب عظیم کی طرف سے ہی انسان کو ملتا ہے۔

نئی نسل منشیات کی عادی۔۔۔ذمہ دار کون؟

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے حالات و واقعات تبدیل ہوتے جا رہے ہیں پرانے وقتوں میں ہر چیز اصل اور خالص ہوا کرتی تھی بڑوں کا ادب چھوٹوں پر شفقت ،انسان کا احترام اور اپنی اولادوں کی تربیت کی فکریں ہر کسی کو لاحق ہوتی تھیں۔خاندان کا ہر شخص عزت کو ترجیح دیتا تھا اور خاندان، باپ دادا کی عزت و ناموس بحال رکھنے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا اولین خواہش ہوتی تھی۔خاندان کے بڑے۔بزرگ چھوٹوں کی تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔چھوٹے بچوں کی ہر بات پر روک ٹوک اور حرکات و سکنات پر نظر رکھنا۔بری سوسائٹی سے دور رکھنا اولین فرض سمجھا جاتا تھا۔بزرگ کہا کرتے تھے کہ خاندان کے بڑوں کی عزت و وقار برقرار رکھنے کے لیے اولاد کی صحیح تربیت بہت ضروری ہے مگر نہ جانے کیوں جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ رسم و رواج،اقدار، طور طریقے بھی بدلتے جا رہے ہیں نہ بڑوں بزرگوں کا احترام نہ چھوٹوں سے شفقت کسی کو کسی کی پرواہ نہیں حتیٰ کہ اولاد سے بے خبری ، لاپرواہی کے نتیجے میں بری سوسائٹی اور برے کاموں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم عام ہو گئی ہے مگر ادب آداب اور احترام کا نام ونشان نہیں، دولت عام ہو گئی ہے مگر ہمدردی اور میل جول پیار محبت کا خاتمہ نمود و نمائش کے ساتھ ساتھ تکبر، غرور، بے حیائی

فیشن میں اضافہ ہو گیا ہے نفسا نفسی کا عالم ہے ہمدردی تو دور کی بات ہمدردی کے دو بول بولنے اور دلاسہ دینے یا نصیحت کرنے کا احساس ختم ہو چکا ہے۔شاید اس کی بڑی وجہ اولاد کی صحیح تربیت نہ کرنا ہے اولاد کے ساتھ لاڈ،پیار کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی بچہ کسی بڑے سے بد تمیزی کر رہا ہے،گالیاں دے رہا ہے یا کوئی بھی الٹے سیدھے الفاظ کہہ رہا ہو تو والدین بجائے منع کرنے یا سمجھانے کے خوش ہوتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا یا بیٹی میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے بچوں کو آرام سے بیٹھنے یا بڑوں سے بد تمیزی نہ کرنے کے دو بول بھی نہیں کہہ پاتا اور بالآخر وہی بچہ تھوڑا بڑا ہو کر والدین کے لیے درد سر بن جاتا ہے اور والدین خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے بچپن کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے اگر بغور ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو نوجوان نسل غلط کاموں اور بری سوسائٹی سے وابستہ نظر آتی ہے شہر تو شہر دیہاتوں میں بھی حالات خراب اور منشیات میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔جس میں والدین اور سرپرستوں کا قصور ہے کہ وہ اپنی اولاد کی نگرانی اور تربیت پر خصوصی توجہ نہیں دیتے کہ ان کے بچوں کا کس سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا ہے کس شخص سے کس طرح کے مراسم ہیں،کب گھر سے باہر جاتے ہیں کب واپس آتے ہیں رات کا کتنا حصہ غائب رہتے ہیں، کس قسم کا نشہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات والدین کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا بچہ کہاں کام کرتا ہے کیا کماتا ہے کتنا اور کہاں کہاں خرچ کرتا ہے کچھ

والدین بچوں پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے انھیں سمجھدار نیک، پارسا سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ غلط نکلنا فطری امر ہے۔زیادہ تر نوجوان بے روزگاری کی وجہ سے آوارہ گردی کرتے ہیں اور بری سوسائٹی کا شکار ہو جاتے ہیں اور خاص کر منشیات کے عادی ہو جاتے ہیں اور چرس، شراب، ہیروئن جسے عرف عام میں پوڈر کہا جاتا ہے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ انھیں اس منشیات کے استعمال کو چھوڑنا زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔اس میں منشیات مافیا کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے جو کہ پہلے پہل مفت فیشن کے طور پر ان چیزوں کو مہیا کرتے ہیں اور بعد میں آمدن کا ذریعہ بنا لیتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین اپنے بچوں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے انھیں کنٹرول کریں اب تو نوجوان لڑکیاں بھی منشیات میں ملوث ہو رہی ہیں اور کسی حد تک منشیات کی عادی ہو چکی ہیں اور بے خبرے والدین کو بھنک تک نہیں پڑنے دی جا رہی۔منشیات کی وجہ سے معاشرے میں اور بہت سی برائیاں جنم لے رہی ہیں جن میں چوری، ڈکیتی، فراڈ، زنا جیسے جرائم جنم لے رہے ہیں۔اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو دیہاتوں کے نزدیک قبرستانوں' ویران جگہوں، پلوں کے نیچے، گاؤں میں قائم دکانوں، با اختیار لوگوں کی بیٹھکوں میں سر عام نوجوانوں کی محفلیں سج جاتی ہیں اور نشہ کیا جاتا ہے۔حالانکہ بعض اوقات چند افراد کو خبر ہونے کے باوجود ان نوجوانوں کو منع کرنے یا روکنے کی جرات نہیں کی جاتی اور نہ ہی ذمہ داروں یا والدین کو آگاہ کیا جاتا ہے بعض اوقات اگر والدین کو دبے لفظوں میں آگاہ کیا بھی

جائے تو وہ برا منا جاتے ہیں۔منشیات کے عادی نوجوانوں کی زیادہ تعداد کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے ہوتا ہے جو کہ والدین کی طرف سے نوجوان بچوں کو جیب خرچ کی صورت میں دی جانے والی رقم اس کا سبب بنتی ہے دیہاتوں میں رہنے والے نوجوان طبقہ جن کی گھر کی مالی پوزیشن بہتر ہوتی ہے یا ایسے نوجوان جن کی بازپرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتااس گھناؤنی اور جان لیوالت میں پڑ جاتے ہیں اور ساتھ شریف گھرانوں کے لاڈلوں کو بھی ملوث کر لیتے ہیں اکثر اوقات گھروں کے مخصوص کمروں میں بیٹھ کر ٹی وی کیبل،ڈی وی ڈی، کمپیوٹر پر فحش فلمیں اور گانے سننے والے دوست گروپوں میں عام طور پر منشیات کا استعمال زیادہ ہوتا ہے کسی زمانے میں اگر کسی گھر کا بچہ یا نوجوان سگریٹ پیتا تھا تو اسے معیوب سمجھا جاتا تھا اور پینے والا بڑوں،بزرگوں سے چھپ کر پیتا تھا مگر آج کل کے دور میں سب کے سامنے بطور فیشن سگریٹ نوشی اور نسوار خوری کی جاتی ہے۔ کئی جگہوں پر والدین اولاد کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں جنہیں آخر کار مشکلات اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور روز مرہ زندگی میں بے شمار مسائل جن میں لو میرج، اغواء ،لڑکی لڑکے میں طلاق کا معاملہ، عاشق معشوقی، زنا، راہزنی، چوری، ڈکیتی، اور بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جنہیں بعد میں کنٹرول کرنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ شروع دن سے ہی اولاد پر کنٹرول رکھیں اور انھیں بری سوسائٹی اور دوستوں سے دور رکھیں اور بے جا جیب خرچ سے اجتناب کریں اور ان کی حرکات و سکنات پر

کڑی نظر رکھیں تاکہ معاشرے میں بہتری کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد بھی ایک بہترین انسان کے روپ میں ان کی نیک نامی اور عزت و وقار میں اضافے کے طور پر زندگی گزارے۔ ہمیں چاہیے کہ معاشرے سے برائیوں کے خاتمے اور اپنی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے لیے غور و فکر کریں اور جہاں تک ممکن ہو سکے اسے عملی جامہ پہنائیں۔

صحافت اور صحافی

موجودہ دور میں معمولی پڑھا لکھا شخص کچھ نہ کچھ علم رکھتا ہے اور کسی نہ کسی میدان میں اپنے آپ کو منوانے میں کوشاں ہے زیادہ تر دیکھا دیکھی میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہوئے اپنے آپ کو کسی نہ کسی صف میں شامل کرنے کی کوشش میں ہے کچھ ناکام کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ درپردہ کسی اور کے سہارے اپنے آپ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا مقام اور مفاد حاصل کرنے کی کوشش میں نہ جانے کن سچے جھوٹے اور من گھڑت قصے کہانیوں کی بدولت لوگوں کو بے وقوف بنانے میں مصروف ہوتے ہیں اور بظاہر بڑے مخلص ،دیانتدار اور شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں اسی طرح صحافت بھی ایک معزز پڑھا لکھا اور محب وطن پیشہ ہے جو کہ تمام تر آسائشوں سے بالاتر ہو کر بلا تفریق خدمت خلق اور لوگوں میں شعور کے ساتھ ساتھ آگہی پیدا کرنے کا نام ہے۔اس پیشے میں اچھے.برے ہر طرح کے لوگ شامل ہیں اور ہو رہے ہیں کچھ شوق کے ہاتھوں مجبور کچھ روزی روٹی کی خاطر اور کچھ صرف نام کمانے اور کچھ لوگ اپنے آپ اور اپنی کرپشن چھپانے کے لیے اس پیشے سے وابستہ ہیں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کہ ان تمام باتوں سے ہٹ کر معمولی پڑھا لکھا بظاہر دانشور ، معزز، اور منجھا ہوا شریف صحافی کے طور پر جانا جاتا ہے مگر درپردہ بہت سی قباحتیں لیے ہوئے ہوتا ہے خود لکھنے پڑھنے سے

قاصر ہوتا ہے مگر آپ کو محسوس تک نہیں ہونے دیتا اور زبانی جمع خرچ سے آپ کو مطمئن کر کے صرف اور صرف پیدا گیری، بلیک میلنگ اور اثر رسوخ بنا کر مختلف مفاداتی کام سرانجام دیتا ہے اور خود شاید درپردہ کسی چوکیداری یا نائب قاصد جیسی ملازمت سے وابستہ ہو مگر اپنے آپ کو عام لوگوں کے سامنے ایک پڑھا لکھا اور منجھے ہوئے صحافی کے طور پر پیش کرے۔ صحافت ایک معزز، ذمہ دارانہ پیشہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مشکل ترین کام ہے اور بعض اوقات جان سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے ہیں۔ صحافی معاشرے کی آنکھ کا کام کرتے ہیں اور صحیح کاموں کے ساتھ ساتھ غلط اور برے کاموں کی نشاندہی بھی کرنی ہوتی ہے اور ملکی صورتحال کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بہتری کے پیش نظر حقائق سامنے لانا ہوتے ہیں جبکہ کچھ صحافی برائے نام کسی اخبار، رسالے، جریدے سے وابستہ ہو کر اور اپنی صحافتی دھاک بٹھا کر پیدا گیری اور مختلف محکموں سے مفاد حاصل کرتے ہیں اور اپنے مفاد کے ساتھ صحافت کو گڈمڈ کر کے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی دیہاڑی لگانے کے چکروں میں رہتے ہیں اور لوگوں کے چندے سے اپنے آپ کو صحافتی طور پر پیش پیش رکھتے ہیں حالانکہ صحافی کو کسی لالچ یا مفاد سے غرض نہیں ہونی چاہیے بلکہ صحافی ایک دیانتدار اور بے غرض قسم کا پیشہ ہے جو کہ صرف اور صرف مفاد عامہ کے لیے کام کرتا ہے۔ مفاد پرست اور لالچی قسم کے صحافی اپنے ساتھ چند ایک ایسے لوگوں کو ملا لیتے ہیں جن کا صحافت کی الف ب سے دور تک واسطہ نہیں ہوتا اور ان لوگوں کی معاونت سے مختلف حیلے بہانوں سے

سادہ لوح لوگوں کو پھنسا کر ان کو مشکل سے نکالنے ان کا سہارا بننے اور مختلف محکموں میں ان کی سفارش کرنے جیسے سہانے سپنے دکھا کر چند ٹکے وصول کرتے ہیں اور اس طرح کئی لوگوں سے خرچہ پانی کے نام پر رقم بٹور لیتے ہیں اور پھر خبروں کا سہارا لے کر انھیں مطمئن کرتے رہتے ہیں ایسے افراد معاشرے میں بلکہ صحافت پر بد نما داغ ہیں اور ان کا شمار لٹیروں اور ٹھگوں میں ہوتا ہے ایسے بہت سے صحافی آپ کو ملیں گے جو کہ اپنی صحافت کے نام پر آپ پر رعب ڈالنے کے ساتھ ساتھ اپنے اثر ورسوخ کی من گھڑت داستانیں سناتے ہیں اور اپنے اسی فن کی بدولت قائل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور لوگ آنکھیں بند کرکے ان پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے ان کی ضروریات کو پورا کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ کسی صحافی کو اپنی پہچان کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ خود بخود اس کے کام اس کی گواہی دیتے ہیں اور ایک معزز صحافی صحافت کو برائے خدمت کے طور پر سرانجام دیتا ہے مگر پیشہ ور پیداگیر صحافی خود لوگوں کو قائل کرکے اپنے جال میں پھنساتا ہے اور اپنا مفاد حاصل کرتے ہوئے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ایسے نام نہاد صحافیوں کا محاسبہ ہونا چاہیے جو صحافت کے نام پر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور صحافت جیسے مقدس پیشے کو بدنام کرتے ہیں یہ اب لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایسے مفاد پرست صحافیوں پر نظر رکھیں اور ان کا محاسبہ کرتے ہوئے انھیں منطقی انجام تک پہنچائیں اور ایسے صحافیوں کو معاشرے میں رسوا کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے کنارہ کشی

کریں تاکہ ایسے صحافی آپ کی مجبوری اور سادگی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

کتب بینی

آج سے 15 یا 20 سال قبل لوگ کتاب پڑھنے کے لیے ایک دن منتخب کر لیا کرتے تھے اور اس دن وہ سب مل بیٹھتے اور کوئی ایک کتاب پڑھتا اور باقی لوگ خاموشی سے بیٹھ کے اس کو سنا کرتے اسی طرح طالب علم جو کہ سکولوں میں پڑھنے جایا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح کوئی ایک دن منتخب کر لیتے اور اس دن اکٹھے مل جل کر پڑھتے لیکن آہستہ آہستہ یہ رواج مانند پڑھتا گیا وقت گزرتا چلا گیا اور آج سے پانچ یا دس سال قبل تک کی اگر ہم بات کریں تو اس وقت بھی بڑی عمر کے لوگ گھروں میں فارغ ہونے کی وجہ سے کتابوں میں ہی زیادہ وقت گزارا کرتے اور کتابوں میں خصوصی دلچسپی لیا کرتے اور ان کا مطالعہ کیا کرتے تھے مگر ان دو تین سالوں میں تبدیلی کی ایک ایسی لہر آئی کہ جس نے سب کچھ یکسر بدل کر رکھ دیا لوگ کتاب سے دور ہوتے چلے گئے اس بات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ایک طرف الیکٹرانک میڈیا دنیا پر تیزی سے راج کرتا چلا جا رہا تھا نت نئے جدید طریقے انفارمیشن حاصل کرنے کے لیے سامنے آتے گئے جن میں سب سے پہلے ریڈیو جس کو اب لوگ کم ہی سنتے ہیں لیکن چند سال پہلے تک تو انفارمیشن کا ایک بڑا ذریعہ سمجھ کر اس کو سنا جاتا تھا لیکن اب ریڈیو کی نشریات کو بھی لوگ کم ہی سننے لگے ہیں جس کی بڑی وجہ شاید الیکٹرانک میڈیا

میں ایک بڑی تبدیلی جو کہ پچھلے چند سالوں میں ٹی وی کے آنے سے بھی کتاب کے مطالعے میں کمی آئی کیونکہ لوگ آرام سے بیٹھ کر کتاب کو پڑھنے کے بجائے ٹی وی کو ہی دیکھنے لگے کیونکہ اس میں تصویر بھی دکھائی دیتی تھی ریڈیو پر تو صرف آواز ہی آتی ہے ٹی وی کے آنے سے ریڈیو کی مقبولیت میں بھی کمی آئی اور لوگ زیادہ تر ٹی وی پر ہی انحصار کرنے لگے پھر اس کے بعد کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے رہی سہی کسر نکال دی کیونکہ لوگوں کو نت نئی انفارمیشن انٹرنیٹ سے ملنے لگی اور لوگ انٹرنیٹ کو استعمال کرنے میں دلچسپی کا اظہار بھی کرنے لگے اور اس کے استعمال میں آئے روز اضافہ بھی ہونے لگااور یہی وجہ ہے کہ اس وقت انٹرنیٹ کے صارفین کی تعداد ان گنت ہے پرنٹ میڈیا بھی اس سلسلے میں کافی نمایاں رہااور لوگوں کی توجہ پچھلے چند برسوں میں اخبارات کی طرف آئی اور لوگ اخبارات کو بھی پڑھنے لگے لیکن جو بھی ہو جیسے بھی ہو آخر یہ سوال دماغ کی کھڑکی کو دستک دیتا ہے کہ کیا کتاب زوال کا شکار ہو گئ ؟ہماری لائبریریاں سنسان پڑی ہیں اور کتاب پڑھنے کا وقت ہمارے پاس نہیں رہا تو وہ کتابیں پھر کس لیے لکھی گئیں کتاب کو لکھنے والوں نے تو اپنی زندگی کے تجربات مشاہدات اور تجزیے کرکے لکھی خیر ہم نے تو اس کتاب کو بھی بھلا دیا جو آئی ہی خاص الخاص انسانیت کی بھلائی کے لیے تھی جس میں حق کے علاوہ کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہم نے تو اس کو بھی ایک خوبصورت غلاف کے اندر بند کرکے رکھا ہے تو ہم باقی کتابوں کا کیا مطالعہ کریں ایک سوال تو یہ بھی بنتا

ہے شاید انسان کو ذلیل و رسوا بھی آج اسی لیے ہونا پڑھ رہا ہے کیا یہ کتاب الماریوں کے اندر سجانے کے لیے ہی رہ گئی تھی ؟نوجوانوں میں ناول کچھ عرصہ قبل بہت مقبول ہوئے اور دھیرے دھیرے ان کی مقبولیت میں بھی کمی آ گئی ،کتابوں کے اندر موتیوں کی طرح اپنی تحریروں کو سجانے والے بھی کوئی عام انسان نہیں تھے نامور ادیب اور شعراء جن میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ ، حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ ، فیض احمد فیض جیسی ہستیاں خداداد صلاحیتوں کے مالک جنھوں نے ادب کی تعمیر میں بہت بڑا کردار ادا کیا اور یہ ادب ان لوگوں نے کتابوں کے ذریعے ہی ہر خاص و عام تک پہنچایااور آج ادب صرف اور صرف ان لوگوں کی وجہ سے زندہ ہے۔ ہم نے اپنی تاریخ کو بھلا دیا ہے اگر تاریخ کو نہ بھولتے تو شاید آج یہ حال نہ ہوتا۔کتابوں کا مطالعہ اور ان میں لکھی گئی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے

ایک نئی تحقیق کے مطابق کسی بھی انسان کے جسم میں پہلی مرتبہ پیئے جانے والے سگریٹ کے چند اولین کش ہی لمحوں میں ایسے جینیاتی نقصانات کی وجہ بن سکتے ہیں، جن کا تعلق سرطان سے ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق یہی جینیاتی نقصانات زندگی میں پہلی مرتبہ کی جانے والی تمباکو نوشی کے دوران شروع کے چند کشوں کے بعد بھی دیکھنے میں آ سکتے ہیں۔ سگریٹ نوشی کے انسانی جسم پر اثرات اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں کہ انہیں دوران خون میں انجیکشن کے ذریعے ایک دم داخل کیے گئے کسی بھی مضر صحت مادے کی منتقلی کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ دنیا بھر میں ہر روز قریب تین ہزار انسان پھیپھڑوں کے سرطان کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور ان میں سے 90 فیصد اموات کی براہ راست وجہ تمباکو نوشی ہوتی ہے۔ محققین کے مطابق سگریٹ کا دھواں بڑھتی ہوئی عمر اور غیر معمولی شور سے بھی کہیں زیادہ انسانوں کی قوت سماعت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ماہرین نے پہلے سے ہی اس بارے میں انتباہ کر رکھا تھا کہ تمباکو نوشوں کے بہرہ پن میں مبتلا ہونے کے خطرات کافی زیادہ ہوتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ تمباکو کا دھواں دوران خون میں انتشار پھیلاتے ہوئے کانوں کے اندر خون کی باریک اور چھوٹی شریانوں میں داخل

ہو جاتا ہے۔ اس سے کانوں میں آکسیجن ٹھیک طرح سے نہیں پہنچ پاتی۔ ہر 100 اموات میں سے ایک کی وجہ ''سموکنگ'' بنتی ہے۔ تمباکو نوشی نہ کرنے والے ایسے افراد تک بھی تمباکو کا دھواں موت کا سبب بن کر پہنچتا ہے، جو سگریٹ پینے والوں کے نزدیک رہتے ہیں اور جنہیں اسموکر یا غیر فعال تمباکو نوش بھی کہا جاتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے پیش کردہ تازہ ترین اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ دنیا بھر میں ہر سال چھ لاکھ غیر فعال تمباکو نوشوں کی اموات واقع ہوتی ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے تمباکو نوشی کے عالمی اثرات پر کروائی جانے والی پہلی تحقیق کے نتائج سے یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ تمباکو کے دھوئیں سے سب سے زیادہ متاثر بچے ہو رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ہر سال دنیا بھر میں غیر فعال تمباکو نوشی کے مضر اثرات کے سبب ایک لاکھ 65 ہزار بچے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ غیر فعال تمباکو نوشی کے سبب دنیا بھر میں ہلاک ہونے والے بچوں کی کل تعداد کے دو تہائی حصے کا تعلق افریقہ اور ایشیا سے ہے۔ دنیا بھر میں سالانہ 51 لاکھ افراد تمباکو نوشی سے ہلاک ہوتے ہیں جب کہ 603000 افراد سیکنڈ ہینڈ اسموکنگ کا شکار ہوتے ہیں۔ چین اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ بنانے اور استعمال کرنے والا ملک ہے اور سب سے زیادہ تمباکو نوشی سے اموات بھی چین میں ہو رہی ہیں۔ چین میں تمباکو نوشی سے ہلاکتوں کی تعداد 2030 تک سالانہ تین گنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ چین میں تین سو ملین افراد سگریٹ نوشی کی لت میں مبتلا ہیں۔ کیا سگریٹ نوشی صحت کے لئے فائدہ مند

بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا کوئی ملک ایسا بھی ہے جہاں لوگوں کو تمباکو نوشی کی ترغیب دی جاتی ہے؟ جی ہاں، بنگلہ دیش میں جگہ جگہ ایسے اشتہارات دکھائی دیتے ہیں، جو خاص طور پر خواتین کو سگریٹ نوشی کی دعوت دیتے ہیں۔ ’تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے ویسے تو شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ یہی اشتہار دیکھنے اور سننے میں آتا ہے۔ سینما ‘ ہو، ٹی وی یا پھر سگریٹ کے پیکٹوں پر وزارت صحت کے حکم پر لکھی گئی عبارت، ہر جگہ سگریٹ نوشی کے نقصانات کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے۔تاہم بنگلہ دیش میں سگریٹ کے بہت سے اشتہارات گمراہ کرنے والے نظر آتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں جگہ جگہ ایسے اشتہارات نظر آتے ہیں، جن میں تمباکو نوشی کرنے والوں سے یہ کہا جارہا ہوتا ہے کہ وہ سگریٹ نہ پینے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اسمارٹ، طاقتور اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور ’ سگریٹ بچے کی پیدائش کے عمل کو سہل تر بنا دیتا ہے یا حاملہ خواتین کے لئے سگریٹ نوشی نہایت فائدہ مند ہے کیونکہ جب ایک عورت سگریٹ پیتی ہے تو اُس کے شکم میں موجود بچے کا سائز زیادہ نہیں بڑھتا اور اس طرح بچے کی ولادت کا عمل کم تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا دوسرے معاشروں میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ یہی رجحان بہت سے دیگر ترقی پذیر معاشروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے ایک تازہ ترین سروے کے مطابق بنگلہ دیش میں بالغ خواتین کا 28 فیصد حصہ تمباکو کا استعمال کر رہا ہے جبکہ تمباکو نوشی کرنے

والے مردوں اور خواتین دونوں کی شرح 43 فیصد ہے۔انڈیا میں بہت بڑی تعداد میں نوشی کرتے ہیں، وہیں خواتین میں بھی online casino scams مرد شہری تمباکو سگریٹ نوشی کا رجحان حیران کن حد تک زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ سگریٹ نوشی کرنے والی خواتین کے معاملے میں امریکہ اور چین کے بعد آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک انڈیا اب تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ بھوٹان دُنیا کا پہلا ملک ہے، جہاں تمباکو کی مصنوعات کی فروخت پر پابندی لگائی گئی۔ اس حوالے سے قانون سازی 2004 میں کی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بلیک مارکیٹنگ کی وجہ سے حکام کو اس قانون کے نفاذ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ رواں برس کے آغاز سے بھوٹان حکام نے اس قانون کے نفاذ کے لیے زیادہ سخت رویہ اپنایا، جس کے تحت سگریٹ نوشی کرنے والوں اور تمباکو کی مصنوعات کی فروخت میں ملوث افراد کو بھاری جرمانے بھی عائد کیے جا رہے
ہیں۔برطانیہ کے نیشنل ہیلتھ سروسز نے نئے سال کے موقع پر سگریٹ نوشی ترک کرنے کے خواہش مند افراد کو اس توقع کے ساتھ کہ اس سے لوگوں کو یہ عادت چھوڑنے میں مدد ملے گی، ایک ہفتہ کے لئے نکوٹین پیچز مفت تقسیم کئے تھے۔ سگریٹ نوشی ترک کرنے کے خواہاں افراد کو ایک ’’کیوٹ کٹ‘‘ دی گئی جس میں ایک ہفتہ کے لئے نکوٹین پیچز کے کوپن بھی تھے جنہیں کسی بھی فارمیسی سے حاصل کیا جا سکتا تھا اور اس میں ایسا آڈیو مواد بھی تھا جس کے ذریعے لوگوں کو سگریٹ نوشی کے نقصان اور اسے چھوڑنے کے فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ ان نکوٹین پیچز کے استعمال سے سگریٹ

چھوڑنے کے امکانات دوگنا ہو جاتے ہیں۔پاکستان میں حکومت کو ان ہی طرز پر فلاحی اداروں کے ساتھ مل کر تمباکو نوشی کے خلاف موثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

مایوسی گناہ ہے

اس تحریر میں ہم نے مایوسی کے خاتمے کی جو تجاویز پیش کی ہیں، ان کو یہاں مختصراً بیان کیا جارہا ہے اور اس کے ساتھ کچھ نئی تجاویز بھی پیش کی جارہی ہیں۔ جو بھائی یا بہنیں مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہوں، ان سے گذارش ہے کہ وہ تحریر کے اس حصے کو اپنے سامنے والی دیوار پر چسپاں کرلیں یا پھر اپنے پرس میں رکھ لیں اور جب بھی مایوسی حملہ آور ہو تو محض ان تجاویز کو ایک نظر دیکھ ہی لیں تو انہیں مایوسی سے نجات کا کوئی نہ کوئی طریقہ سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ سب سے پہلے یہ طے کر لیجیے کہ آپ مایوسی اور ڈپریشن سے ہر قیمت پر نکلنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ اپنی خواہشات کا جائزہ لیجیے اور ان میں سے جو بھی غیر حقیقت پسندانہ خواہش ہو، اسے ذہن سے نکال دیجیے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پر سکون ہو کر خود کو suggestion دیجیے کہ یہ خواہش کتنی احمقانہ ہے۔ اپنی سوچ میں ایسی خواہشات کا خود ہی مذاق اڑائیے۔ اس طرح ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر اک خواہش پہ دم نکلے کو غلط ثابت کیجیے۔ اپنی خواہشات کی شدت کو کنٹرول کیجیے۔ اپنی شدت کی ایک controllable limit مقرر کر لیجیے۔ جیسے ہی یہ محسوس ہو کہ کوئی خواہش شدت اختیار کرتی جارہی ہے اور اس حد سے گزرنے والی ہے، فوراً الرٹ ہو جایئے اور اس شدت کو

کم کرنے کے اقدامات کیجیے۔ اس کا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خواہش کی معقولیت پر غور کیجیے اور اس کے پورا نہ ہو سکنے کے نقصانات کا اندازہ لگائیے۔ خواہش پورا نہ ہونے کی provision ذہن میں رکھیے اور اس صورت میں متبادل لائحہ عمل پر غور کیجیے۔ اس طرح کی سوچ خواہش کی شدت کو خود بخود کم کر دے گی۔ آپ بہت سی خواہشات کے بارے میں یہ محسوس کریں گے کہ اگر یہ پوری نہ بھی ہوئی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ خواہش کی شدت اتنی کم بھی نہ ہو جائے کہ آپ کی قوت عمل ہی جاتی رہے۔ خواہش کا ایک مناسب حد تک شدید ہونا ہی انسان کو عمل پر متحرک کرتا ہے۔ دوسروں سے زیادہ توقعات وابستہ مت کیجیے۔ یہ فرض کر لیجیے کہ دوسرا آپ کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اس مفروضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسروں سے اپنی خواہش کا اظہار کیجیے۔ اگر اس نے تھوڑی سی مدد بھی کر دی تو آپ کو ڈپریشن کی بجائے خوشی ملے گی۔ بڑی بڑی توقعات رکھنے سے انسان کو سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے نے کچھ قربانی دے کر آپ کے لئے جو کچھ کیا ہوتا ہے وہ بھی ضائع جاتا ہے۔ مایوسی پھیلانے والے افراد، کہانیوں، ڈراموں، کتابوں، خبروں، نظموں اور نغموں سے مکمل طور پر اجتناب کیجیے اور ہمیشہ امنگ پیدا کرنے والے افراد اور ان کی تخلیقات ہی کو قابل اعتنا سمجھیے۔ اگر آپ مایوسی اور ڈپریشن کے مریض نہیں بھی ہیں، تب بھی ایسی چیزوں سے بچیے۔ اس بات کا خیال بھی رکھیے کہ امنگ پیدا کرنے والے افراد اور چیزوں کے زیر اثر کہیں کسی سے بہت زیادہ

توقعات بھی وابستہ نہ کرلیں ورنہ یہی مایوسی بعد میں زیادہ شدت سے حملہ آور ہوگی۔ گندگی پھیلانے والی مکھی ہمیشہ گندی چیزوں کا ہی انتخاب کرتی ہے۔ اس کی طرح ہمیشہ دوسروں کی خامیوں اور کمزوریوں پر نظر نہ رکھئے۔ اس کے بر عکس شہد کی مکھی، جو پھولوں ہی پر بیٹھتی ہے کی طرح دوسروں کی خوبیوں اور اچھائیوں کو اپنی سوچ میں زیادہ جگہ دیجئے۔ ان دوسروں میں خاص طور پر وہ لوگ ہونے چاہئیں جو آپ کے زیادہ قریب ہیں۔ اپنی خواہش اور عمل میں تضاد کو دور کیجئے۔ اپنی ناکامیوں کا الزام دوسروں پر دھرنے کی بجائے اپنی کمزوریوں پر زیادہ سوچئے اور ان کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ ہر معاملے میں دوسروں کی سازش تلاش کرنے سے اجتناب کیجئے اور بدگمانی سے بچئے۔ یہ طرز فکر آپ میں جینے کی امنگ اور مثبت طرز فکر پیدا کرے گا۔ اس ضمن میں سورۃ الحجرات کا بار بار مطالعہ بہت مفید ہے۔ اگر آپ بے روزگاری اور غربت کے مسائل کے حل کے لئے کوئی بڑا سیٹ اپ تشکیل دے سکتے ہوں تو ضرور کیجئے ورنہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کی حد تک کوئی چھوٹا موٹا گروپ بنا کر اپنے مسائل کو کم کرنے کی کوشش کیجئے۔ اس ضمن میں حکومت یا کسی بڑے ادارے کے اقدامات کا انتظار نہ کیجئے۔ اگر آپ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو آپ کی مایوسی انشاء اللہ شکر کے احساس میں بدل جائے گی۔ خوشی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونا سیکھیے اور بڑے سے بڑے غم کا سامنا مردانہ وار کرنے کی عادت ڈالئے۔ اپنے حلقہ احباب میں زیادہ تر خوش مزاج لوگوں کی صحبت اختیار کیجئے اور سڑیل سے لوگوں سے

پرہیز کیجئے۔ اگر کوئی چیز آپ کو مسلسل پریشان کر رہی ہو اور اس مسئلے کو حل کرنا آپ کے بس میں نہ ہو تو اس سے دور ہونے کی کوشش کیجئے۔ مثلاً اگر آپ کے دوست آپ کو پریشان کر رہے ہوں تو ان سے چھٹکارا حاصل کیجئے۔ اگر آپ کی جاب آپ کے لئے مسائل کا باعث بنی ہو تو دوسری جاب کی تلاش جاری رکھئے۔ اگر آپ کے شہر میں آپ کے لئے زمین تنگ ہو گئی ہے تو کسی دوسرے شہر کا قصد کیجئے۔ اگر آپ کو کسی بہت بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے اور آپ کے لئے اس سے جسمانی فرار بھی ممکن نہ ہو تو ایک خاص حد تک ذہنی فرار بھی تکلیف کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔ اس کو علم نفسیات کی اصطلاح میں بیدار خوابی (Day Dreaming) کہا جاتا ہے۔ اس میں انسان خیالی پلاؤ پکاتا ہے اور خود کو خیال ہی خیال میں اپنی مرضی کے ماحول میں موجود پاتا ہے جہاں وہ اپنی ہر خواہش کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے۔ جیل میں بہت سے قیدی اسی طریقے سے اپنی آزادی کی خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق ہر شخص کسی نہ کسی حد تک بیدار خوابی کرتا ہے اور اس کے ذریعے اپنے مسائل کی شدت کو کم کرتا ہے۔ مثلاً موجودہ دور میں جو لوگ معاشرے کی خرابیوں پر بہت زیادہ جلتے کڑھتے ہیں، وہ خود کو کسی آئیڈیل معاشرے میں موجود پا کر اپنی مایوسی کے احساس کو کم کر سکتے ہیں۔ اسی طرز پر افلاطون نے یوٹوپیا کا تصور ایجاد کیا۔ اس ضمن میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ بیدار خوابی اگر بہت زیادہ شدت اختیار کر جائے تو یہ بہت سے نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا باعث بنتی ہے۔ شیخ چلی بھی اسی طرز کا

ایک کردار تھا جو بہت زیادہ خیالی پلاؤ پکایا کرتا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس طریقے کو مناسب حد تک ہی استعمال کیا جائے۔ آپ کو جو بھی مصیبت پہنچی ہو، اس کے بارے میں یہ جان لیجئے کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرکے آپ کو کسی طرح بھی اس مصیبت سے نجات نہیں ملے گی بلکہ مشہور حدیث کے مطابق موت کے بعد وہی حالات خود کشی کرنے والے پر مسلط کئے جائیں گے اور وہ بار بار خود کو ہلاک کرکے اسی تکلیف سے گزرے گا۔ اس سزا کی طوالت کا انحصار اس کے قصور کی نوعیت اور شدت پر ہوگا۔

ہمارے یہاں خود کشی کرنے والے صرف ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جن مصیبتوں سے بچنے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں، اس سے بڑی مصیبتیں ان کی منتظر ہوتی ہیں۔ آپ نے ایسا بہت کم دیکھا ہوگا کہ مصائب سے تنگ آ کر کسی دین دار شخص نے خود کشی کی ہو کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ مصیبت کا کیا ہے، آج ہے کل ٹل جائے گی اور درحقیقت ایسا ہی ہوتا ہے۔ان تمام طریقوں سے بڑھ کر سب سے زیادہ اہم رویہ جو ہمیں اختیار کرنا چاہئے وہ رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل توکل اور قناعت ہے۔ توکل کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہا جائے۔ اس کا انتہائی معیار یہ ہے کہ انسان کسی بھی مصیبت پر دکھی نہ ہو بلکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو، اسے دل و جان سے قبول کرلے۔ ظاہر ہے عملاً اس معیار کو اپنانا ناممکن ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ اس کے جتنا بھی قریب ہو

سکتا ہو، ہو جائے۔ قناعت کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا عطا کر دیا ہے، اسی پر خوش رہا جائے۔ اس سے زیادہ کی کوشش اگرچہ انسان ضرور کرتا رہے لیکن جو بھی اسے مل جائے اسے اپنے رب کی اعلیٰ ترین نعمت سمجھتے ہوئے خوش رہے اور جو اسے نہیں ملا، اس پر غمگین نہ ہو۔ وہ آدھے گلاس میں پانی دیکھ کر شکر کرے کہ آدھا گلاس پانی تو ہے، اس غم میں نہ گھلتا رہے کہ باقی آدھا خالی کیوں ہے؟ اگر ہم ہمیشہ دنیا میں اپنے سے اوپر والوں کو دیکھنے کی بجائے خود سے نیچے والوں کو ہی دیکھتے رہیں تو ہماری بہت سی پریشانیاں ختم ہو جائیں۔ گناہوں کی وجہ سے کبھی مایوس نہ ہوں بلکہ ہمیشہ اللہ کی رحمت سے امید رکھتے ہوئے اپنے گناہوں سے توبہ کیجیے اور آئندہ یہ گناہ نہ کرنے کا عزم کیجیے۔

پیار کو پیار بناتی ہوئی عید آئی ہے

عیدالفطر مسلمانوں کا سب سے بڑا ملی تہوار ہے۔ عید عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی اس خوشی و مسرت کے ہیں جو لوٹ کر بار بار آئے۔ اس تہوار میں امن وسلامتی ہے بھائی چارہ ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی، یکجہتی ، مساوات اور ہمدردی واتحاد کا بہترین مظاہرہ بھی ہے۔ عیدین میں تین خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ وہ بیک وقت قومی بھی ہیں اور اجتماعی بھی یعنی جن کی بنیاد انسانیت کے لئے مشترک اہمیت رکھنے والے جذبات و روایات پر ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام چونکہ ایک عالمگیر ایمانی، اصلاحی و اخلاقی دعوت ہے اس لئے اس نے اپنے تہواروں اور عیدین میں صرف خدا پرستی کو ملحوظ رکھا ہے جو انسانیت کی اصل جڑ ہے۔ ان کو مخلوق پرستی اور مشرکانہ تو ہمات کی ملاوٹ سے پاک کرکے خالص خدا پرستی کا گہرا رنگ دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ اسلام نے اپنے تہواروں میں اخلاق کا بھی ایک بلند نصب العین عطا کیا ہے جہاں لطف و تفریح تہذیب کے ساتھ اور خوشی کا مظاہرہ سنجیدگی کے ساتھ کرنے کی ہدایت ہے۔ عید اسلام کی ابتداء: تاریخ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ 2 ہجری کو عیدالفطر کا تصور محمدؐ نے امت کو دیا۔ اسی سال رمضان المبارک کا روزہ فرض ہوا۔ ہجرت کے بعد کفار مکہ سے پہلا مقابلہ جنگ بدر کے نام سے 17 رمضان 2 ہجری ہی کو پیش آیا۔ حدیث پاک میں حضور

نے ارشاد فرمایا کہ ہر قوم کے لئے خوشی کا دن متعین ہوتا ہے اور ہمارے لئے یہ خوشی کا دن ہے اور آپ اس طرح سے اپنے صحابہؓ کے ساتھ یکم شوال 2 ہجری کو مدینہ منورہ سے نصف میل دور ایک کھلے میدان میں تشریف لے گئے اور عیدالفطر کی نماز ادا فرمائی۔ عیدالفطر کے روز جو سب سے پہلا کام آپؐ کیا کرتے وہ صدقہ فطر کی ادائیگی ہوتی تھی۔ یہی وہ اخلاقی دعوت اور مشترکہ تہذیب ہے جو یہاں صدقہ فطر کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے کہ آپ کے پڑوس میں آپ کے محلے اور بستی میں آپ ہی کے بچوں کی طرح دل رکھنے والے اور دلوں میں ارمان و شوق رکھنے والے کچھ اور بچے بھی ہیں جن کے ناز.بردار ماں باپ آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ عیدان کے گھر بھی آئی ہے مگرانکے چہرے اداس ہیں۔ وہ بے یارو مددگار ہیں آپ ان کی سرپرستی کیجئے۔ وہ بے آسرا ہیں آپ ان کا آسرا بنئے۔ آپ کی عیدجب ہی مقبول ہو سکتی ہے۔ آپ اگر عید کی حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پر تکلف کھانے سے پہلے ان فاقہ کشوں، محتاجوں اور مسکینوں کو کھانا کھلا کر ان کی مجبوری کا روزہ کھلوایئے اس لئے کہ آپؐ کا یہی طریقہ تھا کہ یتیموں کی غمخواری، مسکینوں کی دستگیری اور درد مندوں کی حاجت روائی فرماتے تھے۔ صدقہ فطر کی ادائیگی اسی لئے ہر مسلمان عاقل بالغ صاحب استطاعت پر قبل نماز عیدواجب ہے۔ بہرحال اطاعت اور شکرگزاری کے جشن کے طور پر مسلمانوں کو عیدالفطر کا دن نصیب ہوا۔ عیدالفطر رمضان المبارک میں پورے ایک مہینے کے روزے رکھنے کے بعد روحانی مسرت اور نفس و شیطان پر فتح

پانے کی خوشی کا دن ہے۔ حضرت محمد مصطفیؐ نے فرمایا کہ جب عیدالفطر کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجتے ہیں وہ زمین پر اتر کر گلیوں راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی آواز سے پکارتے ہیں جس کو جنات وانس کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے اے محمدؐ کی امت اس کریم رب کی بارگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا کرنے والا ' ہے،،بڑے بڑے قصور معاف کرنیوالے ہے۔ پھر جب لوگ عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہو، وہ عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے معبود اس کا بدلہ یہی ہے کہ ان کی مزدوری پوری پوری دی جائے۔ پھر حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو گواہ بنا کر فرماتے ہیں کہ اے فرشتوں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں ان کو رمضان کے روزے اور تراویح کے بدلے میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کرتا ہوں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو خوشی کے اظہار کی اجازت تو دیتا ہے۔ مگر بے قابو ہونے کی اجازت نہیں دیتا، عید منانے کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق مسلمانوں کو اس موقع پر نئے کپڑے یا حتی الوسع عمدہ کپڑے پہنے، عطر لگانے، بہتر کھانا کھانے ،ایک دوسرے کو مبارک باد دینے، رشتہ داروں اور دوستوں کے یہاں آنے جانے کی اجازت ہے،اس دن دوگانہ نماز ادا کرنے اور فقراء و مساکین کا تعاون کرنے کی بھی ہدایت ہے۔ مگر کسی غیر شرعی کام کرنے کی اس دن بھی اجازت نہیں ہے، نہ خوشی میں ناچنے گانے کی اجازت ہے نہ ڈانس کلبوں میں جانے کی اجازت ہے، نہ شراب

پینے کی اجازت ہے، نہ غیر عورتوں سے باتیں کرنے اور نہ انہیں دیکھنے کی اجازت ہے، نہ زناکاری، فحاشی و بے حیائی کی اجازت ہے، نہ اصراف اور فضول خرچی کی اجازت ہے، غرض ہر وہ عمل جو اسلام میں دیگر دنوں میں جائز نہیں وہ اس دن بھی جائز نہیں ہے۔ عیدالفطر کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی چارے کے ساتھ رہیں ان کے درمیان نفرت و کدورت کی خلیجیں قائم نہ ہوں، اگر پہلے سے ہوں تو عید کے موقع پر ختم ہو جانی چاہئیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اجتماعی طور سے خوشی کا یہ دن فراہم کر کے یہ درس دیتا ہے کہ جس طرح اس دن مسلمانوں نے آپسی بھائی چارے کا مظاہرہ کیا ہے، کسی اختلاف کو اس دن نہیں چھیڑا تو بقیہ دنوں میں بھی اسی بھائی چارے کو قائم رکھیں، تاکہ آپسی اتحاد قائم رہے اور ایک اجتماعی طاقت کا مظاہرہ ہو،آج مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا جو سلسلہ جاری ہے اور جن چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور مسلکوں میں تقسیم ہو کر وہ تباہی کا شکار ہو رہے ہیں، عیدالفطر ان کو جوڑنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس روز کسی قسم کے امتیاز، نفرت، کدورت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اگر کوئی منفی جذبہ دل میں باقی رہ جائے تو پھر عید حقیقتاً عید کہلانے کی مستحق نہیں اس لئے عید کے دن ہر کسی سے معانقہ و مصافحہ کیجئے تاکہ دل صاف ہو اس سے اخوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

پیار کو پیار بناتی ہوئی عید آئی ہے
رونق بزم بڑھاتی ہوئی عید آئی ہے

قوم کو یکجہتی کا یہ دکھانے تہوار
دوست دشمن کو ملاتی ہوئی عید آئی ہے

چاند دیکھنے کے بعد جو اس رات میں عبادت کرتا ہے اس کا دل کبھی مردہ نہیں ہوتا۔ شریعت کے موافق اپنی آرائش کرنا، غسل کرنا، مسواک کرنا، عمدہ و صاف کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، صبح کو بہت سویرے اٹھنا، عیدگاہ میں جلدی جانا، عیدگاہ جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھانا جیسے چھوہارہ، کھجور حلوہ وغیرہ، عیدگاہ جانے سے قبل صدقہ فطر ادا کرنا، عید کی نماز عیدگاہ میں جا کر پڑھنا، عیدگاہ میں ایک راستے سے جانا دوسرے سے واپس آنا، پیدل چلنا، راستے میں تکبیر اللہ اکبر اللہ اکبر لاالہ الااللہ واللہ اکبر اللہ اکبر واالحمد پڑھنا (یہ تکبیر عیدالفطر میں آہستہ آواز سے اور عیدالاضحیٰ میں بلند آواز سے پڑھنا مسنون ہے) دوگانہ شکرواحسان ادا کرنے کے بعد خطبہ سننا بھی واجب ہے۔

جشن آزادی یا ماتم

وطن عزیز کو معرضِ وجود میں آئے 66 سال کا عرصہ گزر چکا ہے ''یوم آزادی'' ایک طرف تاریخ کے لہو رنگ اوراق کی یاد تازہ کرتی ہے، تو دوسری طرف وہ آزادی کے حسین خواب پر قربان ہوئی قیمتی جانوں، لٹی عصمتوں سے تجدید عہد وفا کا ایک اور موقع بھی فراہم کرتی ہے تاکہ ہم اپنے ماضی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حال کا محاسبہ کریں اور مستقبل کے لئے ان راہوں کا انتخاب کریں جو ہماری قوم کو زندہ ضمیر لئے حقیقی معنوں میں آزاد قوموں کی فہرست میں لا کھڑا کریں۔ ہم آج تک قومی محاسبہ سے نگاہیں چراتے ہوئے ہر سال چودہ اگست کے دن کو بھرپور جوش وخروش سے منانا قومی روایت تو سمجھتے آرہے ہیں۔ جشن آزادی کا مقصد بحیثیت قوم ہمارا قومی محاسبہ ہونا چاہیے جو گزشتہ ماہ و سال کے آئینے میں ہمیں ہماری ناکامیاں اور کامیابیاں صاف صاف دکھائے تاکہ ہم دوسری قوموں سے مقابلہ کرنے کا ظرف پیدا کرسکیں۔ اگر آزادی کا صحیح مفہوم سمجھنا ہے تو ایک نظر جرمنی اور جاپان پر ڈال لیجئے جو دوسری جنگ عظیم 1945 کی بھیانک تباہی کے بعد دوبارہ نئے سرے سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں جٹ گئے تھے اور ہم نے بھی تقریباً اسی وقت 1947 میں ایک نوزائیدہ آزاد مملکت کے طور پر اپنا سفر اختیار کیا تھا اگر آج ان سے موازنہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ 66 برس کا عرصہ آگے

کی بجائے ہمیں مزید صدیوں پیچھے لے گیا ہے۔ جرمن قوم کے اتحاد و یکجہتی نے دیوار برلن تک گرادی ... مگر ہماری قومی ناؤ فرقہ وارانہ چھیدوں نے قومی سلامتی منافرت کے سیلاب میں بہادی۔ جاپانی قوم کے حوصلے اور قوت ارادی نے انہیں ایک بار پھر سے دنیا کی عظیم ترقی یافتہ قوموں میں سرفہرست لا کھڑا کیا .... مگر جہالت اور ضمیر فروشی نے ہمیں آسمان کی بلندیوں سے ذلت کی گہرائیوں میں لا پٹخا ... کہ آج ہمیں آزادی کا دن تو یاد رہا مگر آزادی کا حقیقی مفہوم کیا ہے یہ بھول گئے.. آج تک ہم جس نام و نہاد آزادی کی مالا جپتے چلے آرہے ہیں وہ تو ہمیں کبھی نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی اگر ہمیں اپنی قومی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آزادی کا جشن منانا ہے تو پھر شوق سے منایئے مگر ساتھ ساتھ غربت میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... ، بے روزگاری میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... خودکشیوں میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... اخلاقی اقدار سے آزادی اور قانون سے آزادی کا جشن بھی منایئے ...، دہشت گردی اور جرائم میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... انسانی حقوق سے آزادی کا جشن بھی منایئے .... اور پھر اپنی قومی جہالت کی آزادی کا جشن بھی منایئے۔ آج ہم بحیثیت قوم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں چاروں طرف سینکڑوں بحران جبڑے کھولے ہماری ذرا سی لغزش کے منتظر ہیں۔ ایک طرف ہمارا سب سے بڑا بحران نظریاتی یکجہتی فکری وحدت اور اتحاد و اتفاق سے محروم ہے تو دوسری طرف امن و امان کی دگرگوں، صورتحال کا بحران ہے، ایک طرف ہمارا

حال ہے جو روز بروز لا قانونیت کی دلدل میں دھنسا چلا جا رہا ہے تو دوسری طرف ہمارا مستقبل وہ نوجوان نسل ہے جسے علم کو اپنا آلہ کار بنانا ہے، مگر وہ خود دہشت گردی کا آلہ کار بن چکی ہے۔ جن کے ہاتھوں کو کل قوم کے مستقبل کی باگ ڈور سنبھالنی ہے ان میں آج کتابیں نہیں بلکہ قوم کی تباہی کے سامان ہیں۔ دماغ علم کی روشنی سے منور نہیں بلکہ اسلحہ اور ہتھیاروں سے لیس ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ طبقاتی تفریق، استحصالی نظام، ہنر کی نا قدری، تعلیمی ڈھانچے کا کھوکھلا پن، اختیارات کا ناجائز استعمال اور اخلاقی اقدار کا فقدان جیسی خوفناک آندھیاں ہیں جن سے ہمارا حال بری طرح لرز رہا ہے۔ جمہوری روایات کے فقدان کا المیہ جس نے ماضی تباہ حال سے بے حال اور اب مستقبل کو رسوا کرنے کا بیڑہ اپنی قوم کو ہر پل گرتی معیشت کے ساتھ ہاتھوں میں کشکول کا تحفہ دے کر ایک شان سے اٹھا رکھا ہے۔ غریب کا چولہا بجھ گیا ہے تو اشیائے خورد و نوش کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں۔ 60 فیصد ہم وطن پہلے ہی خط غربت تلے زندگیاں گزارنے پر مجبور تھے تو رہی سہی کسر قدرتی آفات سے بے گھر ہوئے ہم وطنوں نے پوری کر دی۔ پینے کے صاف پانی سے محروم اور بجلی کی نعمت چھینی جا چکی ہے۔

نظام صحت کے اخراجات نا قابل برداشت اور ایک عام انسان کے بس سے باہر ہیں۔ یہی قیامتیں کیا کم تھیں کہ کراچی اور کوئٹہ کی دہشت گردی سے اور ملک بھر میں ہوتے ہوئے بم دھماکوں نے لاشوں کے انبار لگا دئے۔

میں یہ کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
مرے شہر جل رہے ہیں مرے لوگ مر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطہ زمیں پر
وہی خطہ زمیں ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
کوئی اور تو نہیں ہے پس خنجر آزمائی
ہمیں قتل ہو رہے ہیں ہمیں قتل کر رہے ہیں

میرے ہم وطنو ! ...ابابیلوں کے لشکر ہم جیسی بے ایمان ، بے یقین اور بے حس قوموں کی طرف نہیں اترا کرتے۔ ہم ایک ضمیر فروش وطن فروش اور ایمان فروش قوم ہیں۔

ہم وہ قوم ہیں کہ جن کے مولوی حلوے کی چند پلیٹوں کی خاطر تو کافر میں مومن میں مسلمان تو مرتد کا ورد کرتے ہیں اور ہم اس پر آمین کرتے چلے آرہے ہیں ...ہم خود وہ غربت کی ماری قوم ہیں جو یوں تو جمہوریت کا رونا روتے ہیں مگر چودھری وڈیرے اور جاگیردارانہ نظام کے تناور درخت کو اپنے لہو سے سینچتے چلے آرہے ہیں . ... ہم وہ بے غیرت قوم ہیں جو" امریکی کتے ہائے ہائے" کے نعرے تو بہت غیر تمندی سے لگاتے ہیں مگر جب بھی مصیبت پڑے کشکول تھامے بے غیرتی سے اسی کی طرف دوڑتے ہیں ....

ہم وہ بے ضمیر قوم ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اپنے مسلمان بھائیوں کا لہو تک بیچتے ہیں ...کہ آؤ ہم پر سے اقتصادی پابندیاں اٹھانے کا وعدہ کرو ہم پاکستان کو قبرستان بنانے کے لئے

تمہاری راہیں ہموار کرتے ہیں ... آؤاور مال وزر سے ہماری تجوریاں بھر دو ہم اپنے مادر وطن کے کسی بھی حصے پر بمباری کرنے کی پوری اجازت دیتے ہیں ... آؤاور ہمیں جنت کے ٹکٹ دو ہم ملک کو جہنم بناکے تمہارے ازلی سپنے پورے کرتے ہیں ....آؤاور صرف ہمیں مسلمانیت کا سرٹیفکیٹ دے دواور ہم اپنی سرزمین پاک پراپنے ہی مسلمان بھائیوں کے لہو کی ندیاں بہا کر تمہاری خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں ....یہ ہے ہمارا اسلامی جمہوریہ پاکستان، جہاں عدالتوں میں انصاف، درسگاہوں میں ڈگریاں، اسمبلیوں میں ضمیر، اسپتالوں میں جعلی دوائیاں اور مسجدوں میں ایمان تک بکتے ہیں۔ جہاں کلمہ پڑھنے، سلام کرنے اور بسم اللہ کہنے پر تو ایک غیر مسلم کو پھانسی پر بھی چڑھایا جا سکتا ہے مگر مزار قائد پر دختر ملت کی آبرو ریزی کرنے والے کو کٹہرے تک نہیں لایا جا سکتا۔اگر مسجدوں سے نفرت کی منادی اور مدرسوں سے خودکش بمبار جہادی بن کر نکلتے ہیں تو نکلنے دو ہم اپنے گھروں میں بیٹھے اسلام کے نام کی مالا جپتے رہیں گے۔اگر امریکی فوج اور طالبان نامی ظالمان ہماری ہی سرزمیں پر ایک دوسرے کا لہو پی کر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو کرنے دو، ہم منرل واٹر سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔اگر ماؤں بہنوں کی عصمتیں نیلام ہوتی ہیں تو ہونے دو ہم جوش و خروش سے مدر ڈے منا لیا کریں گے ..... اگر حکمران ملکی خزانہ لوٹتے ہیں تو لوٹنے دو، تو ہم بسنت کی چڑھتی پتنگیں لوٹتے رہیں گے ....اگر ہم وطنوں کی تمناؤں کے پھول مرجھاتے ہیں تو مرجھانے دو ہم ویلن ٹائن ڈے دھوم سے منا لیا

کریں گے ...اگر غریب کا چولہا بجھتا ہے ، فاقوں سے بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بلبلاتے ہیں صاف پانی نہ پینے سے ہزاروں اموات ہوتی ہیں ، بے روزگاری کے ستائے مینار ، پاکستان سے چھلانگیں لگا کر جان دینے والوں کی آرزوئیں لٹتی ہوں یا پھر مزار قائد پر قوم کی بیٹیوں کی عصمتیں ...ہمیں سوچنے کی بھلا کیا ضرورت ہے ہمارے لئے تو اتنا ہی بہت ہے کہ ہمارا پاکستان آزاد ہے۔ پاکستان زندہ باد...پاکستان زندہ باد...پاکستان زندہ باد ....

میرے عزیز ہم وطنو ! ...کب تک خون بہے گا اپنے اس گلستان میں ؟ ...کب تک وقت کی آندھیاں ہماری شاخیں قلم کرتی رہیں گی ؟ . . کب تک ہم اپنے ہاتھ اپنے ہی ہم وطنوکے لہو سے رنگتے رہیں گے ؟...کب تک ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی اس نام و نہاد آزادی کا جشن دھوم دھام سے مناتے رہیں گے ؟ ... کب تک اس 66 سالہ بوسیدہ آزادی کے تصور کو لئے خود کو دھوکہ دیتے رہیں گے ؟ ...احساس کی کونپلیں اب بھی نہ پھوٹیں تو پھر کب پھوٹیں گی ؟ ہمارا سویا ہوا ضمیر اب بھی نہ جاگا تو پھر کب جاگے گا ؟ آخر کب تک ہم اپنی ناکامیوں پر آزادی کے جشن کا پردہ ڈال کر ناچتے رہیں گے ؟... آخر کب تک ؟ ایک نہ ایک دن تو ہمیں بھی وقت کے کٹھہرے اور ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہو کر اس سوال کا جواب دینا ہی ہو گا کہ '' کیا ہم آزاد ہیں ؟

نوزائیدہ بچوں کی پرورش

موجودہ دور میں بچوں کی نگہداشت ایک اہم مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ بہتر معاشی حالت کی تلاش میں والدین کا گھر سے باہر رہنا ضروری ہوگیا ہے۔ ماؤں کے پاس بچوں کی نگہداشت کے لئے وقت کم ہے پھر بھی جو وقت ملتا ہے اس میں بچوں کی صحت وتندرستی اور اس کی خصوصی نگہداشت کی ضرورت ہے چھوٹے بچوں کی ایک سال کی عمر تک دیکھ بھال کے لئے کچھ ضروری ہدایتوں پر عمل ضروری ہے جس سے بچے کو بھی آرام ملے گا اور اس کی وجہ سے والدین کو بھی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ نئے نوجوان جوڑوں کو جو کسی وجہ سے گھر کے بڑے بزرگوں کے سائے سے دور تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں ان کے سامنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے عوامل بھی موجود ہیں۔ انسان کا بچہ دیگر جاندار کے بچوں سے مختلف ہے اس میں سیکھنے کا عمل رفتہ رفتہ ہوتا ہے اور بہت دیر میں یہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ خواہشوں کے اظہار اور ان کے لئے زبان کا استعمال ماحول۔ گھر کے افراد۔ ہم عمر بھائی بہنوں اور بعد میں دوست واحباب کے ساتھ سیکھتا ہے۔ ان حالات سے پہلے وہ اپنی ضرورتوں کے اظہار کا محتاج ہوتا ہے اور اس کی جسمانی ضرورتوں۔ فطری ضرورتوں، اور

تکلیفوں کے سمجھنے کے لئے حاضر دماغی خاص دھیان اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔پیدائش کے بعد نوزائیدہ بچے کی جسمانی صلاحیت دنیا کے سرد و گرم کو جھیلنے کے لائق بالکل نہیں ہوتی۔ اس کا جسم ابتدائی دنوں میں سردی اور گرمی دونوں سے ہی فورا متاثر ہوتا ہے۔ اسے ماں کے آغوش کی گرمی مستقل چاہئے۔ ہاں گرمی کے دنوں میں ہلکے گرم پانی سے غسل دے کر فوراہی تولیہ سے بچے کے جسم کو اچھی طرح رگڑ کر خشک کرکے اور اونی کپڑوں سے ڈھک کر رکھنا چاہئے۔ یہ عمل کمرہ کے اندر کیا جائے تو بہتر ہے۔ نوزائیدہ بچے کو ہر ایک گھنٹہ پر مدر فیڈنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچہ سوتا رہتا ہے ابتدائی دنوں میں بچہ 20 سے 22 گھنٹہ سوتا ہے۔ اس دوران بچے کو ہر ایک 2 گھنٹہ پر غذا کی ضرورت ہوتی ہے مدر فیڈنگ سب سے بہتر طریقہ ہے اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ بچوں کی نشو ونما میں ماں کا دودھ سب سے بہتر دودھ ہوتا ہے۔ بچہ کو دودھ پلانے سے ماں کو رحم کا کینسر ہونے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ اور عورتوں کو رحم کی دیگر بیماریوں سے بھی اس سے نجات ملتی ہے۔ بچے کو گود میں لے کر سر کو اونچا کرکے دودھ پلانا چاہئے۔ لیٹ کر دودھ پلانے سے بچوں کے کان بہنے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ دن میں چار بار اس کے جسم پر زیتون یا خالص سرسوں کا تیل نرم ہاتھوں سے مالش کرنی چاہئے غذا دینے اور تیل مالش کا کام آرام کے وقفے یہ ایک وقت مقرر کرکے کرنے سے بچے کو اور ماں کو دونوں کو کافی راحت اور آرام ملتا ہے۔ بچے کو کھلا کبھی بھی نہ سلائیں۔ تکیہ گھر میں اس طرح

بنائیں کہ اس کے درمیان کا حصہ کم گہرا ہو اور تکیہ کی دو دیواریں اونچی ہوں بچے کو کچھ دیر چت پھر کروٹ سلائیں ورنہ تکیہ کے استعمال سے سر ایک جانب سے چپٹا ہو جائے گا۔ بچے کے رونے کی آواز اور کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کسی تکلیف کی وجہ سے بچہ اگر روتا ہے تو ہاتھ اس تکلیف کے مقام پر بار بار لے جاتا ہے۔ بچے کے پیٹ میں گیس بھر کر تکلیف کا سبب بن سکتی ہے۔ لیٹرن کا نہیں ہونا، پیشاب کا نہیں ہونا، کان میں تکلیف یا چیونٹی اور کالے چیونٹا کے کاٹنے جیسے اسباب بھی تکلیف کا سبب بن سکتے ہیں۔ بچے کو لیٹرن کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ بچہ پیشاب یا پاخانہ کرنے کے بعد گیلے بستر پر رہنا نہیں چاہتا اس کے رونے کا سبب بستر کا گیلا ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ بچے کے اوڑھنے بچھانے منہ صاف کرنے کے کپڑوں کا صابن سے روزانہ دھلنا ضروری ہے۔ بچوں کی انگلیوں کے درمیان گلے اور بازو میں اکثر ماؤں کے لمبے بال پھنس جاتے ہیں ان سے جسم کٹ سکتا ہے اور زخمی ہو سکتا ہے بچے کو منہ ڈھک کر نہ سلائیں اگر ایسا ضروری ہو تو باریک کپڑے کا ٹکڑا یا چھوٹی مچھر دانی کا استعمال کریں۔ نیپی کو صابن سے صاف دھویا کریں۔ موسم کے اعتبار سے بچوں کے کپڑے ڈھیلے اور نرم استعمال کریں جس سے بچہ آرام محسوس کرے ربڑ کی بیلٹ اور ٹائٹ پاجامہ ودیگر لباس کا استعمال نا کریں ربڑ کمر پر خون کے دوران کو روک دیتا ہے اس سے تکلیف کے علاوہ بچے کو پولیو اور سوکھا کا مرض ہو سکتا ہے۔ ہلکے ازار بند یا بٹن والے کپڑوں کا استعمال کریں۔ بچہ جب چھ ماہ اور

اوپر کا ہو جائے تو خصوصی خیال رکھیں۔ ہلکی غذا دینا شروع کر دیں اس میں دال کا پانی، سبزی کا ابلا ہوا سوپ، کھچڑی اور نرم چاول کھلانے کی عادت ڈالیں۔ سات ماہ کے بعد عام طور پر بچوں کو دانت نکلنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اس وقت بچوں کو قے اور دست کی بیماریاں عام طور پر ہوتی ہیں۔ بچوں کو ڈائریا سے اور دست کی بیماری سے بچانا ضروری ہے اس کے لئے دانت نکلنے دینے میں معاون دواؤں کا استعمال مستقل ایک سال تک کیا جانا چاہئے ورنہ بچوں کو سوکھا کی بیماری ہو سکتی ہے یا ڈائریا سے جان جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بچہ جب چلنے کے لائق ہو جائے تو اس کے آس پاس کسی ایسی چیز کو نا رہنے دیں جس سے بچے کو نقصان ہو۔ مثلاً جلتا ہوا لیمپ۔ گرم پانی کا بوتل، قینچی، چھری، چاقو یا پتھروں اور اینٹ کے ٹکڑے۔ اس عمر میں بچے تمام اچھی.بری چیز کو منہ میں ڈال لیتے ہیں اس لئے اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ بچہ منہ میں کسی ایسی چیز کو نا رکھے جو اس کے لئے نقصان دہ ہو۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کی وجہ سے بچے مٹی کھانے لگتے ہیں یا دیگر عادت ڈال لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو پرم پر اگر باہر لے جائیں تو دونوں بازو میں تکیہ لگا دیں تاکہ وہ جھٹکہ سے دائیں بائیں جھکولے نہ کھائے ایسے میں گردن میں موچ آ سکتی ہے۔ پرم کو فٹ پاتھ پر۔ لان پر تنہا نا چھوڑیں۔ مضبوط نا باندھیں پھندا لگ سکتا ہے۔ بچے کو باتھنگ ٹب اور کچن میں یا چولھا کے پاس اکیلا چھوڑنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ بچہ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے لگے تو چیزوں کو اس کے ہاتھ کے پہنچ سے دور

رکھیں۔

سمندر پار پاکستانیوں کے مسائل

حضرتِ عمر فاروقؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے پوچھا کہ تم میری دُوری کو کتنا عرصہ برداشت کر سکتی ہو زوجہ محترمہ نے نہایت ادب سے جواب دیا زیادہ سے زیادہ چھ ماہ۔۔۔ حضرتِ عمر فاروقؓ نے فوراً فرمان جاری کیا کہ کسی فوجی کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ محاذ پر نہ روکا جائے اور ہر سپاہی کو چھ ماہ کے بعد چھٹی دی جائے۔ حضرتِ عمر فاروقؓ کا یہ فرمان تمام دُنیا کی سپاہ پر تاحال لاگو ہے اور شدید جنگ کی صورت میں بھی اس پر من و عن عمل کیا جاتا ہے۔ جبکہ برطانیہ نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران اپنے فوجیوں کے دل بستگیوں کیلئے چھاؤنیوں کے نزدیک پیشہ ور عورتوں کے اڈے بسائے اور انہیں مکمل تحفظ بھی دیا۔ مگر عساکرِ اسلامی نے اپنے سپاہ کی کردار سازی پر تاحال بھرپور توجہ رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ قلیل تعداد کثیر پر بھاری ہے۔تلاشِ معاش کے سلسلے میں ہجرت کا سلسلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا اولادِ آدم کا وجود مگر زیادہ تر لوگ زمین کا سینہ چیر کر اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرتے تھے اور آج بھی آبادی کا 75% طبقہ اسی شعبہ زراعت سے وابستہ ہے جو سخت سردی اور شدید گرمی کی پروا کیے بغیر زمین کا سینہ چیر کر نہ صرف اپنی بلکہ شہروں میں رہنے والے باسیوں کی خوراک کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ 60ء کی دہائی

سے قبل وطن عزیز کے زیادہ تر لوگ دیہات سے شہروں کا رُخ کرتے تھے اور فصل کی تیاری تک شہروں میں کام کاج کرتے اور کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی یہی لوگ اپنے اپنے دیہاتوں کو لوٹ جاتے تھے۔ 60ء کی دہائی میں جب وطن عزیز میں پہلی بار مارشل لاء لگا تو سیاسی عدم استحکام مزید شدید تر ہو گیا جسکے بطن سے معاشی عدم مساوات نے جنم لیا اور ملکی دولت اور وسائل چند خاندانوں تک محدود ہو گئے زیادہ تر لوگوں نے سیاسی پناہ کے بہانے مغربی ملکوں کا بالعموم اور برطانیہ کا بالخصوص رُخ کیا وہاں کی چکا چوند اور ترقی کے مواقع وافر ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت وہاں آباد ہونے لگی پھر بھی صورتحال اتنی ابتر نہ ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے 70ء کی دہائی میں سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد جب باقی ماندہ پاکستان کے معاشی حالات انتہائی دگرگوں ہو گئے اور راشن بندی ہونے لگی تو ایسے میں ذوالفقار علی بھٹو جو خارجہ امور کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ دُنیا کے بیشتر حکمرانوں سے ذاتی مراسم تھے۔ بالخصوص 74ء کی اسلامی سربراہی کانفرنس کا میزبان ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور خلیجی ریاستوں کے حکمران اور بالخصوص سعودی عربیہ کے شاہ فیصل مرحوم) سے تو انکے تعلقات ضرب المثل تھے۔ عرب کے صحراؤں میں جب سیال) سونا دریافت ہوا تو مغربی ممالک نے اور بالخصوص امریکہ نے اس خطہ پر اپنے پنجے گاڑھنا شروع کر دیئے جبکہ بھٹو (مرحوم) نے عرب کے شیوخ کو پاکستان سے افرادی قوت منگوانے پر راضی کر لیا چنانچہ گرین پاسپورٹ پر

سینکڑوں لوگ سہانے مستقبل کی خاطر عرب کے صحراؤں کا رُخ کرنے لگے جس کے نتیجے میں عرب کے صحرا شاداب ہونے لگے دوسری جانب وطن عزیز کے متوسط طبقے کے لوگ بھی خوشحال ہونے لگے مگر اس خوشحالی نے بہت سی دوسری معاشرتی برائیوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ وفاشعاری کی جگہ ہوس اور کچے آنگن کے سکون کی جگہ پکے چوباروں میں بے سکونی نے ڈیرے ڈال دیے۔ جو بچے شام ڈھلے اپنے باپ کی راہ دیکھتے تھے وہ باپ کی صورت بھول گئے عورتیں سہاگن ہونے کے باوجود بیوہ جیسی زندگی اور بچے باپ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو یتیم محسوس کرنے لگے۔ انسانی فطرت کے تقاضوں نے وفاؤں کے انداز بدل ڈالے جس کا لازمی نتیجہ عدالتوں میں طلاق اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو گستاخ بنا ڈالا جسکے نتیجے میں جن بچوں کے سہانے مستقبل کی خاطر باپ نے عرب کے صحراؤں کی خاک چھانی تھی وہی بڑھاپے کی لاٹھی کی بجائے دکھ کا باعث بننے لگے نتیجتاً آج اولڈ ایج ہاؤس جنکا تصور کبھی وطنِ عزیز کے لوگوں نے نہ کیا تھا وہ آباد ہونے کو ہیں۔ انسان کیلئے معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کی مناسب دیکھ بھال اور وقت دینا بھی بہت ضروری ہے۔ مانا کے وطن عزیز کے معاشی حالات اتنے بہتر نہیں اور نہ ہی روزگار کے اتنے زیادہ مواقع میسر ہیں مگر سالہا سال گھر سے ذوری بہت سی معاشرتی برائیوں اور مخصوص مشرقی وفاؤں کیلئے زہر قاتل ہے وہ سہاگن شادی کے فوراً بعد سالہا سال کی ذوری برداشت کیسے کر سکتی ہے جسکے ہاتھوں کی مہندی بھی ابھی نہ اتری ہو۔ ہونا تو یہ

چاہیے تھا کہ کم از کم چھ ماہ کے بعد دو ماہ کی رخصت لیکر گھر آتے مگر خلیجی ریاستوں کی دوسالہ ویزہ پالیسی نے تمام ارمانوں کا خون کرڈالا۔ وطن عزیز کے ارباب اقتدار کو بھی چاہیے کہ وہ سمندر پار پاکستانیوں کے مسائل کو سمجھیں اور ان کے تدارک کیلئے کوئی راست قدم اٹھائیں۔ میں جب بھی ملک کے ویزہ سیکشن کے سامنے میلوں لمبی قطار دیکھتا ہوں تو چشم تصور میں نوبیاہتا سہاگنوں کے مرجھائے چہرے اور معصوم بچوں کی ترستی نگاہیں ایک لمبی آہ بھرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ یا اللہ وطن عزیز کو بہتر قیادت اور خوشحالی عطا فرما۔

مشرقی عورت اور ہمارا معاشرہ

اقوام متحدہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 59 فیصد خواتین صرف پرائمری تک ہی تعلیم حاصل کرتی ہیں، جبکہ دنیا کے ہر دوسرے ترقی یافتہ خطہ میں یہ شرح 97 فیصد ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق اس سال بھی گزشتہ سالوں کی طرح خواتین کے ساتھ تشدد کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس رپورٹ کے حوالے سے مری سے میڈیکل کی طالبہ طوبہ عباسی کا کہنا ہے کہ ''گھریلو تشدد کا بری طرح شکار ہونے والی خواتین میں ایک بڑی تعداد ان پردہ نشین خواتین کی ہے جنھیں تعلیم سے بے بہرہ رکھ کر ان کے تمام حقوق سلب کر لئے جاتے ہیں۔ باپ بھی اور شوہر بھی ان کے حصے کی جائیداد حاصل کرنے کے لئے ہر ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔ کردار کشی کے جھوٹے الزامات میں جیل اور غیرت کے نام پر قتل تو اب معمول بن چکا ہے۔ آج تک کوئی بھی ایسی قانون سازی نہیں ہو سکی جو خواتین کے حقوق کی حفاظت کر سکے۔'' مبارکباد کا حقدار ہے مشرقی معاشرہ کہ بھلے ہی کسی اور میدان میں ہم فتح یاب ہوں یا نہ ہوں، مگر عورت پر تشدد کرکے غیرت مندی کے اس گھناؤنے کھیل کے عالمی کھلاڑی یقینا ہم ہی ہیں۔ مبارک باد ہو ان تمام والدین کو جنھوں نے اپنی کمسن بچیاں جنسی بازاروں کی زینت بنائیں، کم عمری میں بدلے کی شادیوں کی بھینٹ چڑھائیں، ستی کی رسمیں نبھائیں اور اپنی پگڑیوں کی شان

کی خاطر نوجوان بیٹوں کی لاشیں اٹھائیں۔

بہت عجیب ہے روایت مرے بزرگوں کی
پگڑیوں کو سروں سے عزیز تر رکھنا

بے حد مبارک ہو ان تمام بھائیوں کو جن کی نام و نہاد عزت اور انا نے بہنیں سولی پر چڑھائیں۔اپنے مکروہ اعمال کی نقاب کشائی پر بہنوں کی صورت میں تاوان ادا کرکے جرگوں نے انصاف اور بھائیوں نے فرائض نبھائے۔جائداد میں شراکت کی بناپر اپنی ہی ماؤں کی کوکھیں اجاڑیں... اور مبارک ہو ان تمام مجازی خداؤں کو جن کی غیر تمندی کی اٹھان خدائے حقیقی کے تخت کو بھی کہیں نیچے چھوڑ گئی، جنہوں نے اپنی بیویاں جہیز کے لالچ میں چولہوں کے ساتھ جلادیں اور حاکمیت کے نشے میں تیزاب سے راکھ کردیں۔آج مشرق میں عورت اکثریت میں ہونے کے باوجود ویہاں کی سب سے بڑی اقلیت ہے۔ لاکھوں تعصبات میں گھرے اہل مشرق عورت کے حقوق غصب کرنے کی خاطر یکجا ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہ بھانے والے نفرتوں کے بیوپاری چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو، سکھ ہوں یا پھر عیسائی عورت پر تشدد کے معاملے میں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ رنگ و نسل، ذات و برادری، صوبائی و لسانی حتیٰ کہ تمام ترمذہبی اختلافات کے باوجود عورت کے حقوق سلب کرنے، جسمانی تشدد کی حمایت کرنے کا وہ واحد پلیٹ فارم ہے، جس پر سب ہی متحد ہیں۔اس مردزدہ مشرقی معاشرے کی

روایت اور رسوم و رواج ہمیشہ سے مرد کی حاکمیت کے معاون و مدد گار ہیں، جو دختران مشرق کی گردنوں میں پھندوں کی مانند ہیں جو یا تو بے دریغ ان کی سانسیں چھین رہے ہیں یا پھر موت سے بھی بدتر زندگی جینے پر مجبور کرتے ہیں۔ مشرق میں عورت آج بھی تیسرے درجہ کی شہری ہے، جسے برابری کے حقوق تو بہت دور کی بات وہ تو اپنی مرضی سے سانس تک لینے کی مجاز نہیں۔ یوں تو آسمان کی چھت تلے اس دھرتی پر فردوس نما ہستی عورت ہی ہے، جس کے جذبات کی تپش آفتاب کو گہنا دے، وہ حسن کی دیوی جس کی خوبصورتی مہتاب کی کرنوں کو بھی ماند کر دے، وہ پیار کی برسات جسے ابن آدم پر برسا کر احسان عظیم کیا گیا، عشق کی وہ مورت ہے جو آندھیوں کو رخ بدلنے پر مجبور کر دے، جس کی ممتا میں وہ چاشنی ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے سامنے بے وقعت ہو کر رہ جائے۔ جی ہاں! مشرقی عورت کی یہ تعظیم صرف اور صرف ان خوبصورت الفاظ تک ہی محدود ہے اور یہ قصیدے صرف کتابوں تک۔ اگر حقیقت سے نظر ملانا مقصود ہو تو ذرا ایک نظر ان تمام جیلوں پر ڈال لیجئے جو کردار کشی کے جھوٹے اور بے بنیاد الزامات میں ان کنواری دوشیزاؤں سے بھرے پڑے ہیں جو جیلوں میں آ کر بچوں کی مائیں بن چکی ہیں اور ایک نظر ان تمام پاگل خانوں کو بھی دیکھ لیجئے جو گھریلو تشدد اور ذہنی اذیت سے دوچار ہیں اور دماغی توازن کھو دینے والی دختران مشرق کی۔ مشرق کے معاشرے میں اس بے چارگی و لاچاری کی بھیانک تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ایک نظر ان بھرے اسپتالوں پر بھی ڈال لیجئے جو تیزاب سے جلی چولہوں کے ساتھ

بچٹی اپنے ہی گھروں کی چار دیواری میں جنسی و جسمانی تشدد و بربریت کا شکار مشرق میں بہو بیٹیوں کی قدر و قیمت کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ اگر پھر بھی کسی شک کی گنجائش باقی ہو تو ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک لیجئے اور ایک نظر اپنے گھروں پر ڈال لیجیے، ہر گھر میں کوئی نہ کوئی حوا کی بیٹی خواہ وہ ماں کے روپ میں ہو یا بیٹی کے، بہن ہو یا پھر بہو کے روپ میں مرد کی حاکمیت کا شکار خون کے آنسو بہاتی ضرور دکھائی دے گی۔ کہنے کو تو ماں کے قدموں تلے جنت ہے تو پھر مشرق کی ماؤں کی زندگی جہنم سے بھی بد تر کیوں ہے؟ کہنے کو تو اسلام میں عورت کا افضل و اعلیٰ مقام ہے، مگر اسلامی معاشرے کی عورت اس قدر بے یار و مددگار کیوں ہے؟ کہنے کو تو عورت ایک عظیم ہستی ہے، مگر ہمارے یہاں وہ ذلت و رسوائی کا موجب کیوں ہے؟ کہنے کو تو عورت ایک مقدس وجود ہے تو پھر معاشرے میں اس کے تقدس کو پامال کرنے کی روایات کیوں موجود ہیں؟ کہنے کو تو عورت کا مکمل وجود ابن آدم کی تخلیق کا سبب بنتا ہے، مگر ہماری مشرقی عورت اس قدر بے سہارا کیوں ہے کہ اسے خود کے مکمل ہونے کی ضمانت بھی مرد سے لینی پڑے؟ الغرض آج کے دور میں بھی ہمارے معاشرے میں ایک عورت ہونا نا قابل معافی جرم کیوں ہے؟ مذہبی تعلیمات میں موجود عورت کی عظمت کی دن رات گیت گانے والے یہ اسلام کے علمبردار قوم کی بہنوں بیٹیوں کے زندہ درگور ہونے پر آنکھیں کیوں موند لیتے ہیں؟ ثناخوان تقدیس مشرق میں ستی ہوتی دختران مشرق کی حالت زار پر چپ کیوں سادھ لیتے ہیں؟ نقاب اور برقع

کو عورت کا محافظ قرار دے کر تحفظ نسواں کی تڑپ میں جلسے جلوس نکالنے والے بنت حوا کی سر عام بے حرمتیوں پر نظریں کیوں چرا لیتے ہیں؟ دن کے اجالوں میں بادشاہی مسجد کے احاطے میں بیٹھے جوشیلے وارثین اسلام اور محبان رسول رات کی تاریکیوں میں بادشاہی مسجد کے عقب میں موجود تاریخی ہیرا منڈی میں اپنی مجبوریوں اور حالات کے زیر عتاب آئی ہوس پرستوں کا شکار بنتی دختران قوم کی بے چارگی و مظلومیت سے بے بہرہ کیوں ہوجاتے ہیں؟ پارلیمنٹ میں براجمان خواتین کے حقوق کے پاسبان جو غیرت کے نام پر قتل و غارت گری کا جواز تو علاقائی روایت بتاتے ہیں، مگر اقوام عالم کے سامنے مشرق میں عورت کی تحقیر وتذلیل پر مبنی حقیقی تصویر سے آنکھیں کیوں موند لیتے ہیں؟آج مشرق کی عورت کو فقط عورت کی عظمت پر خطبات و تقریر نہیں، بلکہ اس کے وجود کا حقیقی احساس چاہیے۔آج دختران مشرق کو صرف نقاب نما کپڑے کے اس ٹکڑے کا فرضی تحفظ نہیں، بلکہ ابن آدم کے ناپاک ارادوں، مکروہ عزائم، ابلیسی کردار اور حاکمانہ و مجرمانہ ذہنیت سے تحفظ چاہیے۔آج مشرق کی بیٹی کو یہ جھوٹی تسلیاں نہیں، بلکہ غیر انسانی فرسودہ رسوم و رواج سے نجات اور وہ آہنی قانون سازی چاہیے جوان کی جان و عزت وآبرو کے لٹیروں کو سولی پر لٹکا سکے۔ٹیپو سلطان نے کہا تھا کہ ”عورت کو گھریلو سکون اور ہر خوشی دو تاکہ اس کے وجود سے پیدا ہونے والی نسل بہادر اور نڈر ہو کیوں کہ ایک دکھی اور مظلوم عورت کے بطن سے صرف ظالم اور مجرمانہ ذہنیت کی نسل ہی جنم لے سکتی ہے۔

اسلام میں خواتین کا مقام

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ جاہلیت میں خواتین کا مرتبہ صرف ایک گھریلو سامان کی حیثیت سے زیادہ نہ تھا، جن کی جانوروں کی طرح خرید وفروخت ہوا کرتی تھی اور ان کے حقوق کا گھلا گھونٹا جاتا تھا۔ تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتی تھیں، وہ اپنے حقوق بھی نہیں مانگ سکتی تھیں اور اگر اپنے حقوق یا کسی بھی شے پر آواز اٹھاتی، تو موت کے گھاٹ اتار دی جاتی۔ مگر مذہب اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، وہ جج بن سکتی ہیں۔ اسلام نے انہیں صحیح آزادی کا تصور دیا ہے جو دیگر مذاہب میں قطعی نہیں تھا۔ اگر یوں کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ آج کے دور میں خواتین کے لیے ایک بیداری مہم چلانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ مگر پہلی بات، مغرب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس نے دنیا کو جمہوریت اور سیکولرازم کا تحفہ دیا ہے، جس میں ہر شخص کو اظہارِ خیال کی اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ رہنے کی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور کسی پر کوئی رائے تھوپی نہیں جاسکتی۔ عالم اسلام پر اس کا دباؤ ہے کہ وہ اپنے یہاں خواتین کو اپنے خیال کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیں، ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اختیار دیں اور اس میں جبراً، زور زبردستی کا طریقہ اختیار نہ

کریں۔ مگر مغرب میں شاید آزادی کا حقیقی مقصد انسان کو اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد کرنا ہے، نہ کہ آزادی سے ہمکنار کرنا۔ اسی لیے مغرب مسلمانوں کو ان کی مذہبی شناخت سے محروم کرنے اور مسلمان خواتین کو نقاب سے روکنے کی نہ جانے کیسی کیسی مہم چلاتا رہتا ہے۔ واضح ہو کہ حال ہی میں فرانس میں اسکول اور سرکاری اداروں میں سکھوں کے لیے پگڑی، مسلمان خواتین کے لیے 'اسکارف' یہودیوں کے لیے ان کی مخصوص 'ٹوپی' اور عیسائیوں کے لیے صلیب رکھنے کی ممانعت کی تھی، جس کا وبال پوری دنیا میں گونجا تھا۔ افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ کچھ خواتین بھی خواتین کے لیے پردہ کرانے کو غلط بتاتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ یہ جمہوری تصور کے مغائر ہے، جس میں تمام لوگوں کو یکساں حقوق دینے کا اور اپنی سوچ کے مطابق عمل کرنے کا حق دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے! کیا سیکولرازم کا مطلب یہی ہے کہ ایک شخص کو جانوروں کی طرح بے لباس ہونے کی تو اجازت ہو؟ لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور خواہش سے لباس پہننا چاہیں تو اس پر پابندی لگا دی جائے؟ خدا کا نظام ہے کہ جو چیز اہم بھی ہوتی ہے اور نازک، اسے حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ پاؤں پر کوئی حصار نہیں رکھا گیا، لیکن دماغ کو سخت ہڈیوں والی کھوپڑی کے اندر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا تحفظ ہو سکے۔ دل کی جگہ سینے کی لچک دار ہڈیوں کے بیچ رکھی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کی حفاظت ہو سکے۔ آنکھوں پر پلکوں کا پہرہ بٹھایا گیا۔ یہ ان اعضاء کی حفاظت کے لیے ہے۔ نباتات ہی کو دیکھئے اگر آم پر دبیز چھلکوں کا لباس نہ ہوتا تو کیا مکھیوں اور بھرنڈوں سے بچ کر وہ انسان کے ہاتھ آسکتا؟ اگر چاول اور گیہوں کے

دانوں پر ان کی حفاظت کے لیے چھلکے نہ ہوتے تو انسان انہیں اپنی خوراک نہیں بنا سکتا تھا۔ خود انسانی معاشرہ میں دیکھیے، ملک کا ایک عام شہری کھلے عام ہر جگہ آمد و رفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ سیکورٹی گارڈ ہے نہ اس کی رہائش گاہ پر پہرے دار ہے، جبکہ اہم شخصیتوں کے لیے تحفظ کا خصوصی نظم کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں میں عورتوں کی حفاظت کی زیادہ ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خدا نے انہیں مردوں کے لیے وجہ کشش بنایا ہے، اس لیے ان کی تراش و خراش میں حسن کاری اور لطافت کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر کسی کا لڑکا شہر جائے تو اسے شام کے 4 بجے آ جانا چاہیے تھا، لیکن وہ رات کے 10 بجے لوٹے تو اس سے گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر یہی واقعہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آ جائے تو دل کا قرار چھن جاتا ہے اور ماں باپ کی کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں۔ اسی کو دیکھیے کہ پوری دنیا میں اور پاکستان میں بھی مردوں اور عورتوں کے تناسب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ خدا نے ان دونوں صنفوں کو ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے تاکہ دونوں طبقات کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ 100 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اہل مغرب عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینے کا نعرہ لگا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آج بھی عورتیں حقوق مانگتی ہیں اور انہیں وہ حقوق و اختیارات پوری طرح نہیں دیے جاتے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں امریکہ و روس میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی؟ اور یورپ میں مارگریٹ تھیچر کے علاوہ کوئی خاتون وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر نہیں پہنچ سکی۔ یہ ظلم و حق تلفی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ قانونِ فطرت کا فیصلہ ہے۔ قدرت نے خود دونوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اور صلاحیتوں کے لحاظ

سے دائرہ کار متعین کیا ہے۔ پردہ بھی اسی فرق کا ایک حصہ ہے۔ جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اور شہوانی جذبات رکھتے ہیں، لیکن ان کی فطرت لباس کے تصور سے عاری ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریانیت سے بچائے اور لباس زیب تن کرے۔ وہی فطرت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ مردوں کے مقابلے عورتیں زیادہ ڈھکی چھپی ہوں۔ فرض کیجئے دو لڑکیاں راستے سے گزر رہی ہیں، ایک لڑکی کا لباس چست اور شوخ ہو، اس کا سر کھلا ہو، اس کے بازو کھلے ہوں، اس کا پیٹ نگاہِ ہوس کو دعوت نظارہ دیتا ہو اور اس کا کسا ہوا لباس جسم کے نشیب وفراز کو نمایاں کرتا ہو اور دوسری لڑکی سرتاپا نقاب میں ہو یا کم سے کم ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر دوپٹہ ہو تو اوباش قسم کے لڑکے ان میں سے کس کو چھیڑنے کی کوشش کریں گے؟ ہوس ناک نگاہوں کا تیر کس کی طرف متوجہ ہوگا؟ برائی کے جذبات ان میں سے کس کے تئیں دلوں میں کروٹ لیں گے؟ یقیناً بے پردہ لڑکی اس کا نشانہ بنے گی۔ پردہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو نہایت واضح ہیں ہی، قرآن مجید نے عورتوں کو پورے جسم کے علاوہ چہرے پر بھی گھونگھٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ خواتین کے لیے اللہ کے رسول نے مسجد میں پیچھے کی صف رکھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ خواتین کے لیے شریعت نے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں مقرر کیں جو اندرون خانہ کی ہیں اور انہیں شمع محفل بننے کی بجائے گھر کی ملکہ بنایا۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے۔ بائبل میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ جو کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں بلکہ بعض وہ ہیں جو پردہ کی وجہ سے پہچانی نہیں گئیں۔ آج بھی حضرت مریم کا

جو فرضی مجسمہ بنایا جاتا ہے اس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ حالانکہ رومن تہذیب اور اس کے بعد یورپ میں عورتوں کے عریاں مجسمے بنانے اور جسم کے ایک ایک نشیب وفراز اور خط و خال کو نمایاں کرنے کا رواج عام ہے۔ گویا جو لوگ عریانیت اور بے پردگی کے مبلغ ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں کا تقدس باپردہ رہنے میں ہی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بہت سی باکمال خواتین پیدا ہوئی ہیں جن کے حالات پر کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، کارِ افتاء انجام دے سکتی ہیں، وہ حدود قصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات کی جج بن سکتی ہیں۔ یعنی مردوں کی طرح حدود میں رہتے ہوئے ہر کام کر سکتی ہیں۔ کاش اہل مغرب اور پردے کے مخالف حضرات عورتوں کے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے دکھ کا مداوا کر سکیں۔ یہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مریم ایک مقدس ترین شخصیت کی مالک ہیں بلکہ بعض تو انہیں عیسائی عقیدہ کے مطابق تین خداؤں میں ایک خیال کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ کنواری تھیں۔ انہیں کسی مرد نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی حکم کی بناپر وہ حاملہ ہوئیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جس عورت کو اتنا بڑا رتبہ دیا گیا ہو، آج انہی پر ایمان رکھنے والی عیسائی قوم دامنِ عفت تار تار کرنے کو بے قرار ہے۔

ہم پر بے رحم، سفاک حکمران ہی مسلط کیوں؟

اسلامی ممالک کی فہرست میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جو نظریہ اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا۔اس کے قیام میں مسلمانوں کو لاکھوں قربانیاں دینا پڑیں۔پاکستان کے حصول کا مقصد اسلامی اقدار کے سایے میں زندگی بسر کرنا تھا مگر بد قسمتی سے یہ ملک بڑی منصوبہ بندی اور سوچی سمجھی سازش کے ساتھ اپنے اعلیٰ اہداف سے ہٹا کر قتل و غارت اور انسانیت سوز مظالم کی آماجگاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔آج ملک کے اندر بد عنوانی اور لاقانونیت کا راج ہے۔خوف و ہراس کی ایک عجیب فضا پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔جن کی قربانیوں سے یہ ملک وجود میں آیا آج وہی اس ملک کے اندر دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ان کا خون ہر چیز سے سستا ہے آج نہ ان کی جان محفوظ ہے نہ عزت ان کا وجود اس ملک کے اندر غیر محفوظ ہے۔نااہل اور کرپٹ حکمرانوں کے ہاتھ میں اس ملک کی تقدیر تھما دی گئی ہے۔ایک طرف مافیائی نظام اپنی درندگی کے خنجر سے اس قوم کو زخم لگا رہا ہے تو دوسری طرف نام نہاد اور مفاد پرست این جی اوز بھٹکی ہوئی لاچار قوم کے ذہنوں میں اپنی شاطر سوچ پیوست کر رہی ہیں ۔پاکستان میں دہشت گردی، قتل و غارت عام ہے یہاں انسانیت کشی کبھی ثواب کا ذریعہ سمجھی گئی تو کبھی جھوٹی انا کی تسکین کا ذریعہ ۔دہشت گردی مذہبی طبقے کی جہالت ونادانی ، حکمران

طبقے کی مغرب نوازی اور امریکہ کی گھناؤنی، مکارانہ سوچ کا نتیجہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پاکستان اس وقت دہشت گردی کے لیے ایک زرخیز میدان ہے جو دشمنان وطن کے پیسے اور امریکہ کی مکاریوں سے وجود میں آئی۔ اس طرح قتل و غارت اس ملک کے انسان نما درندوں کے لیے ذریعہ معاش بنی ہوئی ہے۔ قتل و غارت اس قدر عام ہے کہ اگر کہیں پندرہ بیس لاشیں گر جائیں تو میڈیا اس کو معمولی خبر سمجھ کے شائع نہیں کرتا اور عوام اس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لہٰذا اس طرح کی صورت حال میں ایک پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ حالات کا درست جائزہ لیکر اس مایوسی، نفسا نفسی کے ماحول میں زندگی گزارنے کے آداب سے آگاہ ہو اور وقت کی آواز پر لبیک کہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے؟ اس وقت قوم کے سامنے ہجرت کے نام پر فرار، ذاتی مفادات کے حصول وبقاء کیلئے ملکی مفاد کی غلط تفسیر کا سہارا، اقدار کو اوزار کے طور پر استعمال کرنے، عوام کو پست، بھکاری، چپاتی پرست، بیرونی امداد کا دلدادہ، آرام طلبی کو راہ حل کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ بدعنوان اور نااہل حکمرانوں کی ایک نفسیاتی خامی یہ ہوتی ہے وہ ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کوئی ان کی پگڑی نہ اچھال دے، کہیں ان کی شان میں کمی نہ ہو، لہٰذا اپنے لئے ایک جھوٹی فضاء قائم کرتے ہیں، طاقت اور اسلحہ کے زور پر ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے خلاف اٹھے یہ ہر اس شخص سے ہراساں رہتے ہیں جو اپنے وجود کا اظہار کھل کر کرے، اگر ہم ایک قوم بن کر ان بھیڑیوں، مگرمچھوں کا مقابلہ کریں

تو یہ جرائم پیشہ قاتل بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر بن سکتی ہے آج ہمیں اپنے وجود کا اظہار اس طرح سے کرنا ہے کہ اگر دشمن ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھے تو اسے اس کی قیمت چکانا پڑے۔آج درحقیقت ہم دشمن کے ہاتھوں نہیں بلکہ حالات کے تقاضوں پر کان نہ دھرنے کی وجہ سے رسواء ہیں جو قومیں حالات کے تقاضے پورے نہ کریں تو بے رحم اور سفاک ان پر مسلط ہو جاتے ہیں حالات کے تقاضوں کو سمجھنے کیلئے بصیرت کی ضرورت ہے اس لئے لوگوں کے اندر شعور وآگاہی پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ مافیائی نظام کو سمجھیں اور اس سے لاتعلقی کا اظہار کریں۔ہم بحیثیت پاکستانی شہری اپنے وجود کو محسوس کروائیں،ہماری ناکامی کی ایک وجہ ہمارا جرم اور مجرم کا تعاقب نہ کرنا ہے پورے ملک کا یہ حال ہے کہ کہیں بھی جرم ہو کوئی تعاقب کرنے والا نہیں ۔اگر کوئی مجرم اپنے ہاتھ خون ناحق سے رنگ بھی لیتا ہے تو اس کے خلاف ایف آئی آر تک نہیں کاٹی جاتی۔لہٰذا قاتل کو کوئی قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی حتیٰ کہ اسے ایک دفعہ بھی تھانے نہیں جانا پڑتا۔آج پاکستان میں مختلف طبقات کے اندر خود اعتمادی کا فقدان ہے لہٰذا اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں،ہمیں یہ کسی احمق نے باور کرادیا ہے کہ ہمارے مسائل کوئی باہر سے حل کریگا۔آج ہمیں بحیثیت قوم اپنی مشکلات کا خود حل نکالنا ہوگا،کسی دوسری قوم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں کہ کوئی باہر سے مسیحا بن کر آئے گا اور ہماری مشکلات کو حل کریگا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم تمام فرائض کو چھوڑ کر ہاتھ

پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں اور سارا کام اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں، اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہمارا کام ہے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر مندرجہ بالا نکات کی طرف پوری قوم توجہ دے تو انشاء اللہ پاکستان کے اوپر بدبختی کے منڈلاتے بادل چھٹ جائیں گے اور یہ قوم سکھ کا سانس لے گی۔

اے حکمرانوں! اللہ کے عذاب سے ڈرو

امریکہ کی جنگ میں فرنٹ لائن سٹیٹ بن کر پاکستان نے کیا کمایا؟ حقیر بھیک میں چند ارب ڈالر جو زیادہ تر کرپٹ حکمرانوں کی جیبوں میں گئے جب کہ اس صلیبی جنگ نے پاکستان کو ستر ارب ڈالر کا نقصان پہنچایا۔اس عرصے میں امریکی سرپرستی میں مشرف، زرداری اور گیلانی جیسے برسراقتدار لوگ ملک کے تمام اہم ترین اداروں کو تباہی کے کنارے پہنچاتے رہے جو امریکی ایجنڈے کے عین مطابق تھا۔ایسے ہی امریکی غلام آج بھی اللہ کے عذاب کی طرح قوم پر مسلط ہیں اور ملک کی بقا اور آزادی کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔امریکہ نے ان کی مدد سے پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور اس کی معاشی کمر توڑ ڈالی۔ ہمارے تمام داخلی اور خارجی مسائل امریکہ ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ امریکہ ہی تو ہے جس نے پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔بدقسمتی سے کسی کو پاکستان کی بربادی سے کوئی پریشانی نہیں۔ حکمران تو اسی خدمت پر مامور ہیں، پاکستان کو جتنا نقصان پہنچے گا ان کو اتنے ہی زیادہ ڈالر ملیں گے۔دوسری طرف پاکستانی قوم ہے جو نظریاتی خلفشار میں مبتلا کر دی گئی ہے۔ ہمارے اہل علم و دانش ہیں، جن کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں ہیں، وہ ملک و قوم کے بجائے ذاتی مفادات کے لیے سوچتے ہیں۔ ہمارا میڈیا ہے جو کترینہ کیف کی سالگرہ جیسی لغویات پر لوگوں کو مشغول

رکھتا ہے۔اسی طرح ٹوٹی بکھری قوم ہے جس کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کی جان مہنگائی بیروزگاری، کرپشن اور قومی اداروں کی بدترین کارکردگی کی وجہ سے سولی پر کیوں لٹکی، ہوئی ہے۔ قوم اس حقیقت سے بے خبر بھی ہے اور لاتعلق بھی کہ یہ حکمران پاکستان کے بجائے امریکی مفادات کے محافظ کیوں بن گئے ہیں۔ان کو پاکستان کے عوام نے مینڈیٹ دیا تھاتوانھوں نے امریکی مینڈیٹ کیوں کر حاصل کر لیا۔ قومیں جب رہزنوں کے ہاتھوں لٹتی ہیں توان کی حالت زار کیا ہوتی ہے۔ ورنہ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ یہ کون ہے جو چاہتا ہے پاکستان تباہ ہو؟امریکہ کے بغیر کون ہے جس کی آرزو ہے پاکستان کمزور ہو، بلوچستان اور وزیرستان میں بغاوت ہو،پاکستان کی معیشت تباہ ہو،اس کی فوج برباد ہو،اس کا ایٹمی پروگرام ختم ہو جائے اورآخرکار وہ بطور ریاست ختم ہو جائے کیا ہمیں نظر نہیں آتا کہ پاکستان کے اداروں کو ایک منصوبے کے تحت تباہ کیا جارہاہے؟

ایک محتاط جائزے کے مطابق پاکستان میں سالانہ 3100ارب یا 30 کھرب سے زیادہ رقم خیانت یعنی کرپشن کی نذر ہو جاتی ہے۔اگر یہ رقم بچائی جاسکے تو ملک اور اس کے پسے ہوئے عوام کی قسمت بدل جائے۔ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ ملک کو کرپشن کی مد میں سالانہ 1200ارب (بارہ کھرب) روپے سے محروم ہونا پڑتا ہے جب کہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے مختلف ٹیکس وصول نہ ہونے یا ٹیکس چوری کرنے کی وجہ سے سالانہ 1900 ارب روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ ورلڈ بنک اورٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے مطابق ملک کے ترقیاتی بجٹ کا40 فی صد

حصہ (2810 ارب روپے) بے ضابطگیوں اور کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے فاسق و فاجر حکمران اور عیش پرست امراء 66برس سے اس ملک پر اپنی بداعمالی اور سیاہ کاری کے ساتھ کسی عذاب کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ملک پر بدامنی، قتل وغارت گری، لوٹ مار، مہنگائی، کرپشن، لوڈشیڈنگ،ڈرون حملے اور صلیبی یلغار ان ہی ظالم امریکی غلاموں کی وجہ سے ہے۔ملک کی باگ ڈور شروع دن سے ان ہی سیاہ کاروں کے ہاتھوں میں ہے۔ایک بدبخت جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک زلزلوں، طوفانی بارشوں اور سیلابوں سمیت مختلف مصائب کے گرداب میں بری طرح پھنسا ہوا ہے اور دن بدن پھنستا چلا جارہا ہے۔اللہ تعالی معاف کرنے والا ہے۔اُس کی رحمت بے پایاں ہے وہ انسانوں کو ان کے سارے گناہوں کی سزا فورا نہیں دیتا،بلکہ انہیں ان کے بعض گناہوں کی جزوی سزا دیتا ہے تاکہ وہ ڈر جائیں اور گناہوں کو ترک کرکے واپس اللہ کی طرف پلٹ آئیں،جب سرکشی حد سے تجاوز کرنے لگے تو پھر سزا دی جاتی ہے۔اس طرح ہم جن انفرادی اور اجتماعی عذابوں کا آج شکار ہیں،وہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا دھرا ہے۔ ہم ان ہی کڑوے بیجوں کا پھل کھانے پر مجبور ہیں جو ہم نے بوئے تھے۔ہم نے اس ملک کو جو اسلام کا کلمہ بلند کرنے اور کفر کی بات پست کرنے کے لیے بنایا گیا تھا،اسلام واہل اسلام سے دشمنی اور امریکہ و عالم کفر کی غلامی کے لیے وقف کردیا۔پاکستان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو قدرتی آفات ومصائب اس پر نازل ہو رہی ہیں،وہ سب اس کے حکمرانوں کے کرتوتوں اور سرکشی کا نتیجہ ہے۔اللہ تعالی

نے پاکستان پر ظلم نہیں کیا پاکستانیوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔" بلاشبہ اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔" (النساء :40) دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور ایمان لے آؤ، اور اللہ قدر شناس خوب جاننے والا ہے۔" (النساء :147) اللہ تعالیٰ کا یہ ابدی قانون ہے کہ وہ قوموں، اور افراد پر عذاب ٹال بھی دیتا ہے، ان کو معاف بھی کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے ظلم سے باز آ جائیں اور اپنی بداعمالیوں پر سچے دل کے ساتھ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے نیک اعمال کرنے لگیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی مثال ہمارے سامنے ہے، جس پر آنے والا عذاب توبہ سے ٹل گیا تھا، لیکن اگر ہم پاکستان میں کبھی بھی اسلام کا عملی نفاذ نہ ہونے دیں، اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں امریکہ، اقوام متحدہ اور یورپی یونین کے کفریہ قوانین جاری رکھ کر پاکستانی عوام پر یہود و نصاریٰ کی بالادستی برقرار رکھیں، کفار کے مشن کی تکمیل میں مدد و معاون بنے رہیں، مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے بالواسطہ اور بلاواسطہ خدمات انجام دیں اور مسلمانوں کا خون بہتا دیکھ کر لطف اندوز ہوں، تو پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرکے ہم پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے گا۔ ہمارے چال باز حکمران اور ان کے چیلے پاکستانی عوام کو بیوقوف بنا کر ان کی ہمدردیاں تو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن وہ اللہ رب العزت کو کبھی دھوکا نہیں دے سکتے اور نہ ڈرامے رچا کر عذابوں اور مصیبتوں کو ٹال سکتے ہیں۔ گناہوں اور جرائم پر اصرار کی وجہ سے کی

معافی نہیں ملتی ،اللہ تعالیٰ کا عذاب اور سزا آتی ہے۔اس کا یہ ابدی قانون اور سنت ہے کہ وہ ایسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرتا جسے خود اپنی حالت تبدیل کرنے کی فکر نہ ہو۔بے شک وہ عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا، لیکن جب پکڑتا ہے تو مجرموں کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

اسامہ نہیں القاعدہ

پچھلے دنوں سابق وزیر داخلہ اور پرویز مشرف کے ساتھی زاہد سرفراز نے اسلام آباد میں کی گئی اپنی پریس کانفرنس میں ایک شوشہ چھوڑا کہ امریکی اسامہ بن لادن کو زخمی حالت میں زندہ ہی اپنے ساتھ امریکہ لے گئے تھے اور اسامہ بن لادن سے امریکہ کی ایک خفیہ جیل میں تفتیش کی جا رہی ہے، میں زاہد سرفراز کے اس شوشے پر دل کھول کر ہنسا کہ امریکہ کیسے کیسے بندوں سے کام لیتا ہے، مجھے مری سے میڈیکل کی طالبہ طوبہ عباسی تقریبا ای میل کرتی رہتی ہیں، اس بار بھی ان کا سوال تھا کہ تبسم صاحب کیا واقع اسامہ بن لادن ابھی زندہ ہے ؟ میں بہت خوب ہنسا اور سوچ میں گم ہوگیا کہ یار پتا نہیں ہماری قوم ان باتوں سے خود کو کیسے نجات دلا پائے گی، ہماری طرف سے اسامہ زندہ ہو یا مرا ہمیں کیا فرق پڑتا ہے ، جن لوگوں نے مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی کو پڑھا ہے وہ ایکس ٹو کے کردار سے بہ خوبی واقف ہوں گے۔ ایکس ٹو دشمن سرغنہ کے خلاف کس طرح جال بچھاتا ہے اور پھر پورے نیٹ ورک کو تباہ کرتا ہوا کس طرح ایک سرا چھوڑ کر کہانی کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے جبکہ سسپنس اور ڈرامائی حالات کس طرح ہیرو کی شبیہ لافانی بنائے رکھتے ہیں۔ اس کا لائیو نظارہ ہم امریکہ اور اسامہ جنگ میں دیکھ چکے ہیں فی الحال قرائن

ثبوت و شواہد کم از کم اس بات کی گواہی دینے لگے ہیں کہ امریکہ کو ناکوں چنے چبوانے والا اسامہ بن لادن اس دار فانی سے دار جاودانی کو منتقل ہوگئے ہیں اور انہیں شہادت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ لیکن القاعدہ کا بھوت اب بھی زندہ ہے اور امریکی میڈیا اس غیر مرئی نیٹ ورک کی موجودگی کو باور کراتے ہوئے کس طرح اپنی لافانی حقیقت کا بھرم قائم کرنے میں مصروف ہے اس کا بھی نظارہ ہم دیکھ رہے ہیں، گو کہ امریکی خبروں پر مکمل انحصار نہیں کیا جاسکتا، جبکہ جو ویڈیوز ریلیز کئے جارہے ہیں اس کی صداقت پر انگلیاں بھی اٹھائی جارہی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اسے حقیقت تسلیم کئے لیتے ہیں کیونکہ موت یقینی ہے،اور کسی بھی شخص کو اس سے انکار نہیں۔ البتہ اسامہ کی موت پر جس قدر خاموشی پاکستانی حکمرانوں میں دیکھی اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم امریکہ کے کس قدر غلام ہو چکے ہیں۔ میں یہاں امریکہ و القاعدہ کے حوالے سے جو باتیں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ امریکہ ہی تھا جس نے 80 کی دہائی کے سپرپاور سویت روس کا خاتمہ اسامہ اور اس کے حواریوں کے ذریعہ کروایااور واحد سپرپاور کا تمغہ حاصل کرلیا۔ 90 کی دہائی میں جب پوری دنیا میں اسلامی تحریکات کا غلبہ تھا اور دنیا بھر میں اسلام پسند ایک ابھرتی ہوئی قوت محسوس ہورہے تھے کہ 1993 میں سموئیل ہنٹنگٹن نے فارن افیئرز جرنل میں اپنا مقالہ تہذیبوں کا تصادم شائع کروایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر ابھرتی ہوئی اسلامی تحریکات کو دفن نہیں کیا گیا تو

Clash پھر امریکہ اپنی چودھراہٹ قائم نہیں رکھ سکے گا۔ بالآخر 1996 میں یہی مضمون of Civilization and new world order کی کتابی صورت میں سامنے آیا اور پوری دنیا کی پالیسی پر اثر انداز ہوا۔ 11/9 کے واقعہ پر اب بھی تذبذب قائم ہے جبکہ اس کی آڑ میں افغانستان میں ابھرتی ہوئی اسلامی حکومت کا خاتمہ کردیا گیا اور قدرتی معدنی ذخائر پر قبضہ حاصل کرلیا گیا۔ وقت گذرتے ہی عراق کا قلعہ قمع کردیا گیا اور پٹرول کے حصول کے ساتھ ہی پورے عرب میں ایک نا معلوم دہشت قائم کردی گئی۔ یہ تمام کام بھی حیاتیاتی ہتھیار، القاعدہ اور اسامہ کے نام پر ہی کیا گیا تھا۔ امریکہ میں جب معاشی مندی کا دور دورہ شروع ہوا تو امریکی انتظامیہ نے دوبارہ گیم پلان ترتیب دیا اور عرب ممالک میں اپنے کٹھ پتلیوں کو ہٹا کر ان کے تمام اثاثے منجمد کر لئے اس طرح جہاں اس نے اپنی معیشت مستحکم کر لی وہیں عرب ممالک کے اندر پک رہے اندرونی لاوے کو بھی دبانے کی کوشش کی لیکن اس دوران جب مصر، تیونس اور لیبیا میں اسے ویسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کا کہ وہ متقاضی تھا تو اس نے دوبارہ اسامہ کا گیم ترتیب دیا اور معاشی بحران سے جہاں خود کو نکالنے کی کوشش کی ہے وہیں غیر محسوس انداز میں مخالفین کو یہ باور بھی کرایا ہے کہ ہوشیار اب بھی ہم زندہ ہیں!!! دراصل اسامہ کے نام پر امریکہ نے جس قدر فائدہ حاصل کیا ہے اس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، سیاست ایک ایسا چھلاوہ ہے جس پر صدق و صفا کا گمان نہیں کیا جا سکتا، سیاست میں نہ تو کوئی مستقل دوست ہوتا ہے اور نہ ہی

مستقل دشمن۔ بلکہ تمام چیزیں وقت و حالات کے اعتبار سے طے کی جاتی ہیں۔جب گلی محلوں کی سیاست میں کسی کو مہرہ بنا کر اپنی چالیں چلی جاتی ہیں تو بین الاقوامی حالات میں کس قدر مہرے استعمال کئے جاتے ہوں گے اس کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس وقت دنیا نئی امنگوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ کروٹ بدلنا چاہتی ہے۔یک قطبی قوت کا خاتمہ بھی حتمی ہے لیکن اس سے پہلے جو ڈرامے کھیلے جارہے ہیں پوری دنیا خصوصاً تیسری دنیا تماش بین کے طور پر تماشہ دیکھ رہی ہے۔1980 کی دہائی کے بعد سے ہی امریکہ نے اسلام اور عالم اسلام کو ہدف بناتے ہوئے جتنے پلان ترتیب دئے تھے یقینا وہ اس میں کامیاب ہوتا جا رہا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ صیہونی قوتوں نے خود امریکہ کی جو حالت بنا رکھی ہے وہ خود امریکیوں کے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، معاشی مندی کے ساتھ عام بے روزگاری کا سیلاب آیا ہوا ہے ،بڑے بڑے بینک دیوالیہ ہوتے جارہے ہیں جبکہ اوبامہ نے عالم اسلام سے رشتوں کو مستحکم کرنے کے لئے قاہرہ خطاب کے ذریعہ جو پہل کی تھی ، صیہونی قوتیں اب اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔یہ ایک حقیقت ہے کہ ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے ،امریکہ اپنی ساکھ بچانے اور اپنا دبدبہ قائم رکھنے کی جو کوشش کر رہا ہے یہ اس کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ مجبوری بھی ہے۔اور شاید اسامہ کی موت کے بعد وہ افغانستان چھوڑ کر جس طرح نکلنا چاہتا ہے اور اپنی معیشت مستحکم کرنا چاہتا ہے، وہ باعث تشویش ہے۔امریکی عوام نہ حقیقی صورتحال سے آگاہ ہیں اور نہ

انہیں آگاہ ہونے دیا جارہا ہے۔بلکہ ایسے جذباتی ایشوز کو ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے جس کا کہ ان کے مسائل سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔المیہ تو یہ ہے کہ امریکی میڈیا بھی جذبات کی آڑ میں ہی اپنی عوام کو ان تمام حقائق سے دور رکھنا چاہتا ہے جس سے آگہی ان کا جمہوری حق ہے لیکن کہتے ہیں کہ جمہوریت تو 49 عقلمندوں پر 51 بیوقوفوں کی حکمرانی کا نام ہے تو یہ ہم امریکہ میں دیکھ رہے ہیں۔البتہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اسامہ کی موت کے بعد بھی القاعدہ کا بھوت جس طرح زندہ رکھا گیا ہے یہ اب مزید کیا کیا گل کھلاتا رہے گا یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ صیہونی قوتیں کوئی ایسا پلان ترتیب دے دیں جو خود امریکی وجود کے خاتمے کا باعث بن جائے۔کیا امریکی عوام اس رخ پر سوچتے ہوئے اسامہ کے احسانات کو یاد کریں گے؟۔

عسکریت پسندوں کیساتھ مذاکرات

وزیراعظم کا قوم سے پہلا خطاب مثبت اور فکرمندانہ ہونے کے باوجود عوامی اُمنگوں کی ترجمانی نہ کرسکا۔وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف نے اپنے خطاب میں ملک کو درپیش مسائل کا بڑے ہی غور و فکر کے ساتھ ذکر کیا لیکن اُن کے حل کے لئے کوئی حتمی حکمت عملی پیش نہ کرسکے۔ عسکریت پسندوں کو مذاکرات کی دعوت اور تمام جماعتوں کو اعتماد میں لے کر قومی پالیسی بنانے کی باتیں تو گزشتہ پانچ سال پیپلزپارٹی کی حکومت بھی کرتی رہی ہے لیکن نہ تو تمام جماعتوں کو اعتماد میں لیا جاسکا اور نہ عسکریت پسندوں کے ساتھ کوئی سنجیدہ مذاکرات کئے گئے جس کا نتیجہ قوم بھگت رہی ہے۔اگر وزیراعظم عسکریت پسندوں کے ساتھ مذاکرات کا مکمل خاکہ پیش کرتے جس میں حکومت کی طرف سے عسکریت پسندوں کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے سے پہلے اُن کے سامنے تمام حکومتی شرائط بھی شامل ہوتیں تو قدرے بہتر ہوتا اور اگر یہ بات بھی واضح کردیتے کہ اگر عسکریت پسند حکومت کی ان شرائط کے مطابق مذاکرات نہیں کرتے تو اُن کے خلاف اتنے عرصے تک طاقت کا استعمال شروع کردیا جائے گا۔ایک طرف تو وزیراعظم نے انتہائی کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا اب ہم مزید لاشیں اُٹھانے کے قابل نہیں ہیں اور دوسری طرف طاقت کا آپشن کھلا رکھنے کا بھی

اعلان کیا ہے۔ایک ایٹمی طاقت رکھنے والے ملک کا وزیر اعظم ملک دشمن قوتوں کے خلاف طاقت کے استعمال کی بات کرے تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ساتھ ہی انتہائی بے بسی کا اظہار میری سمجھ سے بالاتر ہے، میرے کہنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کے ہمیں مذاکرات کا راستہ اختیار کئے بغیر طاقت کا استعمال شروع کر دینا چاہئے لیکن جو ریاست کو تسلیم ہی نہیں کرتے اُن کے سامنے گھٹنے ٹیکنا بھی مناسب نہیں۔میں ذاتی طور پر کسی بھی مسئلے کو طاقت کے ذریعے حل کرنے کا حامی نہیں ہوں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عسکریت پسند عرصے سے حکومت کو مذاکرات کی پیش کشیں کر رہے ہیں اور حکومت بھی تمام جماعتوں کو اعتماد میں لے کر عسکریت پسندوں کے ساتھ مذاکرات اور قیام امن کے لئے پر عزم ہے پھر کیوں سالوں گزر جانے اور لاکھوں جانوں کا ضیاع ہونے کے باوجود آج تک امن قائم نہیں ہوااور نہ مذاکرات کا عمل شروع ہو سکا؟آخروہ کون سی وجوہات ہیں جو ملک میں قیام امن کے پلیٹ فورم پر بھی تمام جماعتیں متفق نہیں ہو رہی؟کیا سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو ملکی امن سے زیادہ اپنے مفادات کا فکر ہے؟

پچھلی حکومت کی طرح وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے قوم سے خطاب میں ایک مرتبہ پھر عسکریت پسندوں کو مذاکرات کی دعوت دیتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر قومی ایجنڈے پر بات کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ریاست کے خلاف سر گرم عمل قوتوں کو بھی مذاکرات کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد ملک سے دہشتگردی کا خاتمہ کرکے استحکام لانا ہے تاکہ ملک میں

معاشی انقلاب برپا کیا جاسکے ۔ دہشتگردی کے خاتمہ کے لئے وہ مذاکرات یا ریاستی طاقت کا استعمال ہر دو طرح کے آپشن کھلے رکھے ہوئے ہیں ۔انہوں نے اس حوالے سے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا کہ ہم ابھی اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتے کہ مجرموں کا ہاتھ روک سکیں یا انہیں پہچان سکیں ۔ وزیراعظم نے غیر جذباتی اور فکر انگیز خطاب میں توانائی کے بحران، معاشی صورتحال ، ملک میں پھیلی بدترین دہشتگردی، کرپشن ، قومی اداروں کی تباہی ، خارجہ پالیسی ،ڈرون حملوں ، کشمیر، بھارت سے تعلقات ،انتظامی مشینری ، سیلابی صورتحال ، صحت و تعلیم اور روزگار جیسے اہم معاملات پر تحریر شدہ تقریر سے ہٹ کر اپنے دل کی باتیں بھی کیں۔اگرچہ انہوں نے کوئی باقاعدہ روڈمیپ پیش نہیں کیا جس کی عوام اُن سے توقع لگائے بیٹھے تھے ۔انہوں نے ملک کو درپیش مسائل کا ذکر بڑی فکرمندی کے ساتھ کیا لیکن مسائل کے حل کے بارے کوئی روڈ میپ پیش کرنے کی بجائے ہر مسئلے کے حل کا دھندلا سا خاکہ پیش کرتے ہوئے اپنا خطاب سمیٹ دیا۔ وزیراعظم کا خطاب کسی بھی لحاظ سے عوامی امنگوں کا ترجمان نہ تھا کیونکہ عوام اُن کے خطاب سے یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ اُن کا وزیراعظم اُن کے دکھوں کا مداوا کرنے آئے گا۔ جیسا کہ مہنگائی میں کمی کا اعلان، بے روزگاروں کے لئے مناسب روزگار کا اعلان ، صحت و تعلیم میں عام آدمی کے بچوں کیلئے کوئی انتظام اور جانے کیا ، کیا اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے عوام اپنے منتخب وزیراعظم کے خطاب سے

رابطہ اور امید صرف اللہ سے جوڑ لیجے

میں اپنے اردگرد نظر دوڑاؤں تو ہر طرف عجیب نفسا نفسی، پریشانی، ڈپریشن، بے سکونی اور ایسی ہی مضمحل کر دینے والی صورتحال نظر آتی ہے۔ یہ ساری دنیا کسی میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہی ہے جہاں ہر کوئی لڑ تو اپنے اپنے طریقے سے رہا ہے مگر سب کا مقصد ایک ہے۔ اور مقصد ہے survival۔ دورِ حاضر کا ہر انسان اس میں شاملِ کردار نظر آتا ہے۔سب ایک نا ختم ہونے والی دوڑ میں شریک اندھا دھند بھاگتے جا رہے ہیں۔ survival اور status کا ایک ایسا منہ زور طوفان اور جنون ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک حرص و حریص کی گرد میں اٹے ہیں کہ نا تو انھیں کچھ سنائی دیتا ہے اور نا دکھائی۔ بس ہر کسی کو دوسرے پر فوقیت حاصل کر لینے کی چاہ نے دیوانہ کر رکھا ہے ۔ سب ایک دوسرے کو کچلتے، مسلتے، دھکیلتے، حق مارتے، ڈاکے ڈالتے، رشوت دیتے ، لیتے، غلط کاریاں کرتے، حرام کھاتے اور نجانے کیا کیا کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ صرف پیسے اور سٹیٹس کے لیے۔ذرا سوچیے ایسا کیوں ہے؟ کہ ہر انسان survival))کے لیے ایک لا محدود دوڑ میں لگا ہوا ہے جسے میرے نزدیک world war III)) کہنا غلط نہیں ہے۔جب کہ ناشکرے انسان کی ناقص عقل اپنے رب کے ارشاد پہ غور نہیں کرتی ارشادِ باری تعالی ہے کہ اگر میں تمھارا رزق روک

لوں تو وہ کون ہے جو تمھیں رزق دے۔ اسی طرح رسول ﷺ نے فرمایا '' اگر تم لوگ اللہ پر اس طرح بھروسا کرو جیسے اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو وہ تمھیں اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح (گھونسلوں سے) بھوکے روانہ ہوتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں۔''تو گویا رزق کی ذمہ داری تو خود اللہ لے رہا ہے وہ انسان سے وعدہ کر رہا ہے کہ اس کا رزق اس تک پہنچ کر ہی رہے گا پھر انسان کیوں نہیں سمجھتا ؟ کیا وہ اپنی عقل و طاقت کے بل بوتے پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ رزق حاصل کر لے گا جتنے کا وعدہ اس کے رب نے کیا ہے؟ یقینا نہیں ۔ایک رزق وہ ہوتا ہے جو انسان کے پیچھے بھاگتا ہے ' ایک وہ ہوتا ہے جس کے پیچھے انسان بھاگتا ہے ۔ اور پھر وہ اپنی عقل اور سوچ سے تخلیق کیے رزق کے پیچھے ایسی اندھی آنکھ سے بھاگتا ہے کہ اسے خود کے پیچھے بھاگتا رزق دکھائی ہی نہیں دیتا اور پھر وہ غلاظتوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے ۔ اس مقام پر اب چاہے وہ حلال روزی کمائے یا حرام اسے فرق نہیں پڑتا کیونکہ حلال اور حرام کے درمیان بس ایک ہی چیز حائل ہوتی ہے' زندہ واجاگر ضمیر ۔ جیسے ہی خواہشات ،لالچ و حریص کا منہ زور سیلاب اسے ڈھا دیتا ہے تو پھر حلال و حرام کے درمیان کا فرق مٹ جاتا ہے۔تو ایسے اس نئی جنگ کے چھڑنے کی وجہ انتہائی صاف ہے کہ انسانی حرص بڑھ گئی ہے اس نے اپنی خواہشات کو ضروریات کا درجہ دے دیا ہے اور یہ اتنی لا محدود ہیں کے محدود سی زندگی ختم ہو جاتی ہے مگر یہ بے لگا

drive م گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتی رہتی ہیں۔ تبھی آج کا انسان خواہشات کو drive نہیں کرتا بلکہ خواہشات اسے کرتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ "کامیاب وہ ہے جسے اسلام کی ہدایت مل گئی' ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور وہ اس پہ قانع ہوگیا"۔اور ہم نے قناعت کی بجائے بے لگام خواہشات کو ضروریات کا لیبل لگا دیا ہے ۔اس معاملے کی نسبت حضورپاکﷺ نے فرمایا۔" جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت' اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو' اسے گویا پوری دنیا جمع کرکے دے دی گئی۔" اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم میں سے بیشتر کی صبح اسی حالت میں ہوتی ہے بات تو صرف ماننے اور شکر گزاری کی ہے۔ نبی کریمﷺ کا ارشاد ہے" (دنیامیں) اپنے سے نیچے والے کو دیکھو'اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو' اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھوگے۔" جبکہ ہم دن رات یہی دیکھتے رہتے ہیں اور پھر صبح ہوتے ہی دوبارہ سے نقل شروع کر دیتے ہیں مال میں دوسرے پر.برتری لے جانے کی ریس۔ایسی بیمار سوچ رکھنے والے انسانوں سے جو ایسے میں پھر حرام کماتے ہیں' ہمدردی اوران کے حق میں دعا ہی کی جا سکتی ہے۔کیونکہ وہ رب جس نے انھیں تخلیق کیا رازق تو وہ ہے۔اگر وہ ایک پتھر میں موجود کیڑے کو رزق مہیا کر سکتاہے تو کیا وہ ایک چلتے پھرتے' کوشش کرتے انسان کو رزق نہیں دے گا؟ ارشادِ نبویﷺ ہے۔"امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی' بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔" دولت مند وہ ہے جس کا دل دولت مند ہے ایسا

آدمی تھوڑے سے مال سے اتنی خوشی حاصل کرلیتا ہے جو حریص آدمی کو بہت زیادہ مال سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ پیسہ یقیناً غیر اہم نہیں ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ بجا سہی اعتراض یہ ہے کہ اپنی بے جا فضول و غیر اہم خواہشات کے لیے ایسے راستے اختیار نہ کیے جائیں جو آپ کو گمراہوں میں سے کردیں کہ جسم ڈھانپنے والے کپڑے سے لے کر پکنے والے کھانے تک میں حرام کی آمیزش ہو۔ کیونکہ سب کرنے کہ بعد بھی رازق تو وہ ہی رہے گا، جس نے ہمیں خلق کیا۔ تو پھر اس کے دیئے ہوئے رزق کو چیلنج کرنے کا فائدہ؟؟؟ عقل مندی یہی ہے کہ عطا کردہ وسائل پر قناعت کی جائے اور انھیں بھرپور طریقے سے جیا جائے۔ کیونکہ زیادہ حاصل کرلینے کی خواہش نے ہمیں چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم کردیا ہے اور اسکی جگہ حسد، بغض، کینا، ٹینشن، ڈپریشن اور کمپلیکس نے لے لی ہے۔ ہمیں ایک ہی زندگی عطا کی گئی ہے اسے ان سب کی نظر نہ کریں بلکہ اپنے ایمان اور اللہ کے درمیان تعلق کو مضبوط کیجئے۔ تعلق بھلا کمزور ہو مگر صدقِ دل سے ہو تو سہی۔ ممکن ہے کہ آگاہی کے کسی لمحے وہ تعلق انتہائی مضبوط ہو جائے۔ کیونکہ بندہ جب رب کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے تو وہ دس قدم اپنے بندے کے قریب آجاتا ہے۔ یقیناً وہ جاننے والا، سننے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کتنی سچائی سے اس کی طرف پلٹتے اور اس کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہیں۔ اپنا رابطہ اور امید اس رب سے جوڑ لیجئے۔ ایک دفعہ پوری سچائی اور ایمان کے ساتھ اس پر بھروسہ کیجئے اس کی طرف رجوع کیجئے۔ یقین جانیئے

پھر آپ کو کسی اور بھروسے' یا سہارے کی طرف رجوع کرنے کی حاجت باقی نہیں رہے گی۔ یہاں تک کہ آپ کی تمام مادہ پرستی ایک وقت پر خود ہی دم توڑ جائے گی پھر survival کی اس جنگ سے بھی نجات مل جائے گی۔ آپ کو حرام جیسی لعنت اور

شاعر انسانیت : خادم وسائی پوری

پاکستان کی تعمیر و تہذیب میں ضلع قصور غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس خطے نے علم، سیاست، مذہب، فلسفہ، آرٹ اور سائنس ہر شعبے میں اپنی مردم خیزی کی بے مثال روایت قائم کی ہے۔ جس روایت پر ہم تمام پاکستانیوں کو بجا طور پر فخر ہے۔ یہ روایت اس لیے بھی قابل تحسین رہی ہے کہ اس کی بنیادیں جتنی جدت پسندی اور انقلابی اقدار پر مبنی ہیں، اتنی ہی اس کی جڑیں اپنے وطن کی سرزمین کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ اپنی مٹی اور اپنے عظیم ماضی سے اسی مثبت تعلق نے تمام تر جدت پسندی کے باوجود اس کلچر، آرٹ اور فلسفہ و فکر کو مغربی مرعوبیت سے پاک رکھا۔ خادم وسائی پوری کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے 1954 میں قصور کے ایک علاقے وسائی پورہ میں آنکھ کھولی ، وہیں سے میٹرک کرنے کے بعد انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ انہوں نے شاعری کی طرف پہلا قدم 89ء میں رکھا جب انہوں نے استاد طالب چشتی کی شاگردی اختیار کی ۔ اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا انہوں نے سینکڑوں لافانی گیتوں کو تخلیق کیا ۔ اب تک انہوں 1000 سے زئد گیتوں کو لکھا اور سینکڑوں گلوکاروں نے انہیں ریکارڈ کروایا۔ خادم وسائی پوری نے پہلا گیت ،، مینوں گوددے وچ سیں لوٹاندی ،، نی اک واری بول مائیں ،، لکھا جو کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے ریکارڈ کروایا اس گیت نے بلندیوں

کو چھوا اور اس وقت کے شعراء میں اپنا مقام اپنی شاعری کی بنا پر بنایا۔ خادم وسائی پوری کی شخصیت قدیم وجدید کے اسی حسین امتزاج کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کا دل اگر ماضی کی لازوال اقدار، وراثت کا ترجمان تھا تو دماغ جدید افکار و خیالات کی آماجگاہ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شخصیت زمانہ کی سرحدوں کو پھلانگ کر ایک بین الاقوامی لیجنڈ کا حصہ بن گئی ہے۔ پاکستان کے افق پر خادم وسائی پوری کا نمودار ہونا وقت کا عین تقاضا تھا۔ مغرب کا سیاسی تسلط، غلامی کا سنگین دور، تہذیبی Invasion،، مذہبی احیا پرستی، افکار و عقائد کی کشاکش، قدیم وجدید کی آویزش، علم و ادب کی نئی روشنی، یہ سارے عناصر و عوامل ایک نئے معاشرے کی تشکیل اور اس کی سمت و معیار کے تعین میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ خادم وسائی پوری کے دل میں آقا دوجہاں کیلئے بے پناہ محبت ہے وہ اپنی محبت کا اظہار کچھ اس طرح اپنے شعروں میں کرتے ہیں۔

شان وکھری وکھری سبھناں دی پر مصطفےٰ جیا کوئی ہو سکدا ای نئیں
دھونے امت دے ایہو جئے دھوئے اوہناں، کوئی ہور پیغمبر دھو سکدا ای نئیں
میرے چن دی چمک نورانڑی اے چن سامنے کوئی کھلو سکدا ای نئیں
اوس بندے نے خادم کی لینا اے حب نبیؐ وچ جو رو سکدا ای نئیں

خادم وسائی پوری کی شخصیت اور ان کے ذہن و شعور کی آبیاری میں ان تمام عناصر کے اثرات نے مثبت کردار ادا کیے۔ ان کے عہد کی تمام تر ترشی و شیرینی

محلول ہو کر امرت بانی کا روپ دھار کر ان کی تخلیقات میں سما گئی۔ ان کی شاعری ہر جگہ انسانیت کی آفاقی لو اپنی روشنی بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے خادم وسائی پوری کی شاعری میں ہر طرح کی اپنائیت ملتی ہے۔ چونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ جتنا عمیق اور وسیع تھا، انھوں نے اسی وسیع القلبی سے تمام حسین اور فطری انسانی اقدار کو اپنے دامن دل میں جگہ دی۔ انھوں نے نیک نیتی کے ساتھ انسانیت کے اتھاہ ساگر میں غوطے لگائے اور بحیثیت انسان ہر اس شے کو دل کی گہرائیوں میں اتارا جو انسانی تھی اور جس کی مستقل قدر و قیمت تھی۔ انسان کے دل کی ہر آرزو، حسرت، تمنا، کیفیت، دکھ درد اور خواب ان کے تخیل اور وجدان کا حصہ بن کر ان کی تخلیقات میں رچ بس گئے ہیں۔ انھوں نے جو بھی قبول کیا اس کو اپنا لیا اور اس کو اپنے رنگ میں اتنا رنگ لیا کہ وہ ان کا اپنا ہو کر رہ گیا۔ ان کی تخلیقات میں سچائی کا وہ روپ ملتا ہے جو ذاتی احساس و تجربہ کے بغیر ممکن نہیں۔ خادم وسائی پوری کو اپنی دھرتی اور اپنے وطن سے اٹوٹ محبت ہے۔ اس محبت کی بنیاد اگر ایک طرف محاسن فطرت اور اس سے ان کی بے پناہ انسیت پر ہے تو دوسری طرف اس دھرتی اور مادر وطن کے باسیوں سے اٹوٹ پیار اور جذباتی وابستگی پر قائم ہے۔ مادر وطن اور اپنی دھرتی سے اس قدر ٹوٹ کر پیار کرنے کی نظیر دوسرے ہم عصر شعراء کے یہاں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ مادر وطن اور دھرتی سے وابستہ صبح و شام ہو یا موسم کے سرد و گرم ہواؤں کے مناظر قدرت ہوں، ندی ہوں یا پہاڑ، لہلہاتے کھیت ہوں یا چڑیوں

کی چہچہاہٹ، ایک ایک جزئیات کی جیتی جاگتی تصویر خادم وسائی پوری کی شاعری میں موجود ہے۔ مادر وطن سے ان کی جذباتی وابستگی اور اٹوٹ محبت کی لہران کی شاعری میں اس طرح سرائیت کرتی ہوئی ملتی ہے کہ ان کی فطرت، شعور اور لاشعور کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ حب وطن کا جذبہ ان کی شاعری میں ایک فطری صفت کا روپ دھارتا نظر آتا ہے۔

اکو ماں دے جائے آں پر دولت وتھاں پائیاں نے
سون دیاں برساتاں وانگوں نیناں جھڑیاں لائیاں نے
جیویں ماں ورچوندی اے نکیاں نکیاں بالاں نوں
میں تے اپنے دل دیاں سدھراں خادم انج ورچائیاں نے

خادم وسائی پوری نے اپنے ہم عصر بیشتر وطن پرست ادیبوں اور دانشوروں کے برعکس اپنی وطن پرستی کو تنگ یا محدود نہیں ہونے دیا۔ ان کے یہاں ہم وطنوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کی سرحدیں عالم انسانیت کی تمناؤں اور آرزوؤں سے جا ملتی ہیں۔ انہیں اپنی دھرتی کے باسیوں، اور ہم وطنوں سے محبت اور جذباتی لگاؤ ہے۔ مگر غیر ممالک اور اقوام کے لیے نفرت اور تعصب کا شائبہ تک نہ ہے۔ اپنی دھرتی اور دھرتی باسیوں سے ان کی بے پناہ محبت تمام نبی نوع انسانیت کے لیے یکراں جذبہ محبت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خالص انسانیت کے پجاری ہیں اور بیگانہ پن کے تصور کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کی مشہور گیت بھی

اسی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔انسانیت سے بے پناہ محبت خادم وسائی پوری سے قریب کر دیتی ہے۔ وہ غلامی کی اذیت سے بے قرار تو ہوتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے اندر قومیت کے جذبے کو بیدار کرکے آزادی کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں۔ لیکن اس عظیم مقصد کے لیے تشدد اختیار کرنے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ان کی نگاہ میں چاہے مقصد کتنا ہی پاک و بلند کیوں نہ ہو، وطن پرستی کی کتنی بلند سطح کیوں نہ ہو، انسان کو ایسا عمل نہیں کرنا چاہیے جو انسانی دل اور اعلیٰ قدروں کے خلاف ہو۔ خادم وسائی پوری فطرتاً شاعر ہے۔ اور شاعری ان کی رگ وپے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ بحیثیت شاعر ان کی عظمت کا اعتراف ملکی سطح پر کیا گیا۔ان کا شعری سرمایہ ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تخلیقی عمل کے اس طویل سفر میں ذہنی و جذباتی اعتبار سے خادم وسائی پوری نشیب و فراز کی کئی منزلوں سے گزرے، لیکن ''محبت'' کی مضطرب موجیں شروع سے آخر تک ان کی شاعری میں ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی ہیں۔ان کے تخلیقی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کے پریم کا تصور بھی ذات سے کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں پھیلتا اور قوسِ قزح کی رنگینی بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ غم جاناں سے غم دوراں کی حدود میں پہنچ کر شاعر پوری کائنات اور انسانیت کا ہدی خواں بن گیا ہے۔

دل میرے نوں چھلنی کیتا اے دونیناں دیاں تیراں نیں
مینوں پاگل کرچھڈیا اے ہتھ دیاں چپ لکیراں نیں
رنگ ساک تے سجن ساتھی سارے لوکی دولت دے

مینوں کتے رونا ایں سجنوں میریاں کد جگمیراں نیں

کائنات، فطرت اور انسانیت سے خادم وسائی پوری کا بے پناہ عشق لاشعوری طور پر عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کے تخیل میں مناظر فطرت، انسان اور خالق کائنات تینوں ایک وحدت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کی نظر میں محبت یا پریم ہی خدا ہے۔ بچے کے لیے ماں کی ممتا، ایک انسان کا دوسرے انسان کے لیے قربانی اور ایثار کا جذبہ، عاشق کی اپنے محبوب سے محبت اس عشق حقیقی کا روپ ہیں۔ اس طرح خادم وسائی پوری عشق یا پریم کو محض تصوراتی اور وجدانی شکل میں نہیں دیکھتے بلکہ اس کا عملی روپ عام انسانوں کی روز مرہ کی زندگی میں متشکل ہوتے دیکھتے ہیں اور اسی کو کائنات کے لافانی اور ابدی حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ صوفی شاعری اور تصوف کے رموز سے بھی متاثر ہیں، وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں تخلیق کی ابدیت کو دھڑکتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ مادی کائنات، فطرت اور زندگی سے ان کی محبت اپنے وجود کو جہاں نفس کے ساتھ ضم کر دینے پر مصر ہے وہیں مادی کائنات اور انسان کی ابدیت ان کی شاعری کے بنیادی محور ہیں۔ ان کے یہاں عرفان فطرت، عرفان ذات اور عرفان الٰہی کے مترادف ہے۔ انھوں نے زندگی کے اس تصور کو قبول نہیں کیا جو جسمانی تقاضے اور دنیاوی نعمتوں سے بھرپور لطف اندوزی کی ممانعت کرتا ہے۔ مگر انھوں نے جسمانی عیش و تلذذ کو ہی مقصد حیات نہیں مانا، بلکہ عرفان زیست کے حصول کو زندگی کا نصب

العین گردانا۔ زندگی کو مکمل اور ہمہ گیری کے ساتھ جینے کی آرزو ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے جنت کی پرسکون اور عیش ونشاط کی زندگی پر دنیاوی زندگی کی متحرک صفت اور دکھ سکھ سے بھرپور طرز حیات کو ترجیح دی۔ وہ اپنی شاعری میں ایسے مگن ہیں کہ کہتے ہیں۔

نہ کریا بندیا توں مان پروہنا ایں گھڑی پل دا
تیسوں چھڈنا پینا ایں جہان پروہنا ایں گھڑی پل دا
کالی رات ہنیرے اوتھے،ڈولے گی جند تیری اوتھے
کرنیکیاں ول دھیان پروہنا ایں گھڑی پل دا

خادم وسائی پوری کی شاعری پر گرچہ رومانیت کا شدید غلبہ ہے لیکن ان کی رومانیت حقیقت کی زمین پر ٹکی ہوتی ہے۔ وہ اس فلسفہ جمالیات کے قائل نہیں جو ادب برائے ادب پر اصرار کرتا ہے۔ وہ فن اور حیات کے باہمی رشتے سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے انھوں نے حسن کی جستجو ضرور کی، لیکن زندگی کے مظاہرے کی ہی شکل میں۔ وہ زندگی کی محرومیوں، غم ناکیوں اور اذیتوں کو حسن سے مزین کرنے کی تمنا رکھتے ہیں اور حیات کی زہر ناکیوں میں شیرینی اور مدھرتا گھول دینا چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں بیشتر جگہوں پر تخیل پر تجربہ اور مشاہدہ حاوی نظر آتا ہے۔ ان میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی کی بجائے ان سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ موجود ہے۔ وہ اپنے وطن کی

محبت میں کچھ اس طرح سے بے قرار دکھائی دیتے ہیں۔

تیری سوچ نوں لکھ سلام آکھاں سوہنا پاکستان بنا دتا
ستی ہوئی سی قوم ہنیریاں وچ نعرہ حق دا مار جگا دتا
کیہاں راتاں دے کٹ جگراتیاں نے رام رام توں سانوں بچادتا
سرچکٹ کے جین دا ول خادم سوہنے قائد نے سانوں سکھا دتا

آج ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہے۔ جس میں شادابی اور زندگی کا نام ونشان نہیں ہے۔ ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سر نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ادیب کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر بڑے چھوٹے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض عین ہونا چاہیے۔ قوم سماج اور ادب کی بہبودی کی قسم جب تک ہر انسان نہ کھائے گا اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تمہیں پہلے اپنی متاع کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا کے کسی معاوضے کی تمنا کرو، لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔'' یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جو کھم کا کام ہے۔ حق اور جمال

کی تلاش کرنا ہے تو پہلے، انا، کی کینچلی اتار دو۔ کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے۔ روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔

خادم وسائی پوری کو جاودانی عطا کرنے میں گرچہ ان کی شاعری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، لیکن ان کی اختراعی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بساط کافی وقیع اور ہمہ جہت ہے۔ انھوں نے ایک ہزار سے زیادہ گیتوں کی تخلیق کی۔ اور ان کا نام رہتی دنیا تک اسی طرح چمکتا رہے گا۔ جیسے ان کے لکھے ہوئے گیت اپنا مقام رکھتے ہیں۔

حکومت مہنگائی کم کرنے میں ناکام

جس طرح ہر انسان کو بلا تفریق مذہب و مسلک رنگ و نسل و زبان اس بات کا یقین ہے کہ موت ضرور آئے گی اسی طرح ہر پاکستانی کو اس بات کا بھی یقین ہوتا ہے کہ سالانہ مرکزی بجٹ سے پہلے یا بعد میں قیمتوں میں اضافہ بھی ضرور ہوگا۔ دستور یہ ہوگیا ہے کہ ہر سیاسی جماعت جب تک حزبِ اختلاف میں رہتی ہے تو قیمتوں میں اضافہ اور مہنگائی کو لے کر خوب واویلا کرتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہر سیاسی جماعت کے انتخابی منشور کا اہم نکتہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ہم برسرِ اقتدار آگئے تو ضروری اور غیر ضروری اشیاء کی قیمتیں کم کردی جائیں گی لیکن جب یہی جماعت خود حکومت سنبھالتی ہے تو یہ بھی وہی عمل دہراتی نظر آتی ہے جو سابقہ حکومتیں کرتی رہی ہیں یعنی نہ صرف قیمتوں میں کمی کرنے میں ناکام رہتی ہے بلکہ مزید اضافہ کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ بہر کیف برسرِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی جماعتیں اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جب ہم اس اہم سوال پر کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہر حکومت قیمتوں میں استحکام لانے میں ناکام رہتی ہے۔ سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ صرف دو ہی وجوہات ایسی ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ حکومت قیمتوں میں استحکام لانا ہی نہ چاہتی ہو یا مناسب اقدام کرنے سے قاصر رہتی ہو۔ دوسرے یہ کہ ملک کے اقتصادی

حالات کے پیشِ نظر قیمتوں میں کمی کرنا یا استحکام لانا اس کے بس کی بات ہی نہ ہو۔ پہلی وجہ کو تو ہم اس وجہ سے مسترد کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی سیاسی جماعت جو عوام کے ووٹوں سے برسرِ اقتدار آتی ہے وہ یہ کبھی نہیں چاہے گی کہ عوام متواتر قیمتوں میں اضافہ سے بددل ہو جائیں کیونکہ انتخابات کے موقع پر انہیں ایک بار پھر عوام کے سامنے جانا ہوگا۔ لہٰذا کوئی بھی سیاسی جماعت جان بوجھ کر اپنی ساکھ مجروح نہیں کرے گی۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ہمارا اقتصادی ڈھانچہ ہی کچھ اس طرح کا ہے جس میں متواتر قیمتیں بڑھتے رہنا ایک ایسا عمل ہے، جس پر قدغن لگانا ناممکن ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان ناقابلِ فراموش حالات کے لئے حکومت اپنی بے بسی ظاہر کرنے کے بجائے مختلف تاویلیں پیش کرکے عوام کو بہلاتی رہتی ہیں۔ قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ اور ان پر قابو نہ کرپانے کی وجہ سے عوامی بے چینی کا پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قیمتوں میں عدم استحکام اور اقتصادی نظام کے غیر متوازن ہونے کی وجوہات کا جائزہ مندرجہ ذیل طریقے سے لیا جا سکتا ہے۔ جملہ ماہرینِ اقتصادیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہر چیز کی قیمت کا انحصار اس کی پیداوار اور بازار میں اس کی کھپت پر ہوتا ہے یعنی قیمتوں کے گھٹنے اور بڑھنے کا انحصار پیداوار اور کھپت کے بیچ توازن اور عدم توازن پر ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ اقتصادی نظام میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ پیداوار اور کھپت والے نظریہ کے علاوہ بھی بہت سی ایسی وجوہات ہیں جو قیمتوں میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ ایسا دیکھا گیا ہے

کہ ایک بار جب کسی چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو بازار میں اس چیز کی کتنی ہی افراط کیوں نہ ہو جائے بڑھی ہوئی قیمتیں کم نہیں ہوتیں۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ قیمتیں نہیں بڑھتیں بلکہ کرنسی کی قوتِ خرید گھٹ جاتی ہے۔ ہمارا اقتصادی ڈھانچہ ہی کچھ ایسا ہے کہ کرنسی کی قوتِ خرید متواتر گھٹتی رہتی ہے جس پر قابو پانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے جس کی وجہ ہے کرنسی کا بے تحاشہ پھیلاؤ۔ جسے افراط زر یا INFLATION سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ماہر اقتصادیات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ قیمتوں میں اضافے کا سبب افراطِ زر یعنی INFLATION ہی ہے۔ کرنسی کے پھیلاؤ کا مطلب تو یہی ہوا کہ عام آدمی کی آمدنی میں بھی اضافہ ہونا یعنی قیمتوں کے ساتھ آمدنی میں بھی اضافہ ہو۔ پھر مہنگائی کے اثرات اس قدر نہ ہونے چاہئیں جتنا اس کے خلاف واویلا ہوتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ افراطِ زر کی وجہ سے قیمتوں میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن متوسط طبقہ کی آمدنی اس حساب سے نہیں بڑھتی جس حساب سے INFLATION والی کیفیت کے پیشِ نظر قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ للہذا عوامی بے چینی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ افراطِ زر یعنی INFLATION والی کیفیت کب اور کیسے پیدا ہوتی ہے اور حکومت اس پر قابو پانے میں ناکام کیوں رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ ایک فطری عمل ہے اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جسے کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دیگر بات یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے ذریعہ پیدا ہونے والے

کے بڑھنے اور گھٹنے کی بھی INFLATION نتائج کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔ اس لئے معقول وجوہات کا پایا جانا یقینی ہے۔ افراطِ زر کے متواتر بڑھتے رہنے اور اس پر قابو نہ پانے کی اصل وجہ ہے ہمارا ناقص اقتصادی اور بینکنگ نظام۔ اقتصادیات کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ صرف اتنی ہی کرنسی بازار میں موجود ہو جس کے برابر زرِ مبادلہ حکومت کے خزانے میں محفوظ ہو۔ اور زرِ مبادلہ کا انحصار مختلف ذرائع سے ہونے والی پیداوار پر ہوتا ہے۔ یہ پیداوار یا پروڈکشن چاہے زراعت سے ہو یا کارخانوں سے اور یا قدرتی معدنیات سے اور یا غیر ملکی تجارت سے۔ للہذا تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کسی وجہ سے کمی آجائے اور غیر ملکی زرِ مبادلہ میں بھی کمی آجائے تو مزید اضافی کرنسی بازار میں لانے پر حکومت مجبور ہو جاتی ہے تب کرنسی کے پھیلاؤ میں عدم توازن کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ للہذا بازار میں زر مبادلہ کے مقابلہ میں کرنسی والی کیفیت پیدا ہو جاتی INFLATION کے عدم توازن کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہی ہے اور قیمتوں کا بڑھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کرنسی کے بے جا پھیلاؤ کی ایک وجہ یہ بھی کرتے ہیں اس INVEST ہوتی ہے کہ عوام جو پیسہ بینک یا ڈاکخانوں کی بچت اسکیموں پر کی شکل میں کچھ Interest کے علاوہ بینک جمع شدہ رقومات پر اپنے کھاتہ داروں کو اضافی رقم دیتا ہے بینک اپنے جمع شدہ سرمایہ کو مختلف طریقوں سے تجارت میں وصول کرتا ہے۔ Interest کرکے یا لوگوں کو قرض دے کر ان سے اضافی Invest لیکن اگر بینکوں کے اس نظام پر نظر ڈالی

جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کرنسی کی مقدار میں متواتر اضافہ ہوتے رہنا ایک نہ ختم والی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔(INFLATION) ہونے والا سلسلہ ہے۔ اور افراطِ زر کی جمع شدہ Investers لہٰذا بینکوں اور ڈاکخانوں کی بچت اسکیموں کی وجہ سے رقومات میں اضافہ تو ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ کرنسی کی قوت خرید بھی گھٹتی رہتی ہے اور قیمتوں کے بڑھنے کا نہ رکنے والا عمل چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔ قیمتوں میں عدم استحکام کی ایک اور وجہ ہے ضروری اشیاء کی درآمد اور غیر ضروری چیزوں کا برآمد کیا جانا چاہے یہ قانونی شکل میں ہو یا غیر قانونی طریقوں سے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے میں بازار پر شیئر مارکیٹ اور سٹہ بازار کا کنٹرول متواتر بڑھتا جارہا ہے اور ان کا جلدی جلدی اتارچڑھاؤ بھی قیمتوں میں عدم استحکام کی بڑی وجہ ہے۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قیمتوں کے تواتر بڑھتے رہنے کی اصل وجہ ہے ضروری چیزوں کی پیداوار میں کمی۔ زرِ مبادلہ کا کم ہوجانا۔ کرنسی کا بے جا پھیلاؤ۔ کرنسی کی قوتِ خرید کا گھٹنا، افراطِ زر میں اضافہ، ذخیرہ اندوزی، ضروری اشیاء کی درآمدات اور غیر ضروری چیزوں کی برآمدات کے علاوہ ناقص بینکنگ نظام وغیرہ۔

احکام حج اور اس کی فضیلت

حضرت محمدؐ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے کے بعد سر اطاعت خم کرنے کی پہلی صورت نماز ہے اور آخری صورت حج بیت اللہ ہے۔ حج سابقہ امتوں میں ادا کیا جاتا رہا۔ امت محمدیہ پر حج کی فرضیت 9 ہجری میں ہوئی۔ حضرت محمدؐ نے اپنی حیات طیبہ کا واحد حج 10 ہجری میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہؓ کے ساتھ ادا کیا۔ آپ کا یہ حج "حجتہ الوادع" کہلاتا ہے۔ حج ان تمام عاقل، آزاد اور اہل ثروت مسلمانوں پر عمر بھر میں ایک بار فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کے وسائل رکھتے ہوں۔ حج کی فرضیت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ " اور لوگوں پر اللہ کے لئے لازم ہے کہ جو کوئی بیت اللہ تک آنے کی قدرت رکھتا ہو وہ حج کے لئے آئے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔" ارشاد نبوی ہے۔ " اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ پس تم ضرور حج کرو"۔ یوں تو عبادت کے اور بھی طریقے ہیں مثلاً نماز، روزہ اور زکوۃ مگر حج کی اہمیت یہ ہے کہ نماز اور روزہ صرف جانی عبادات ہیں اور حج جانی مالی دونوں عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ حج کا قصد کرنیوالا خالص حج کی نیت سے نکلے۔ حج کے اخراجات حلال اموال میں سے ہونے چاہئیں۔ حج کرنے والا رب حقیقی سے اپنے گناہوں پر توبہ کے ساتھ ساتھ لوگوں سے اپنی غلطیوں پر معذرت خواہ ہو۔

اہل وعیال کے لئے واپسی تک اخراجات کا انتظام کرے۔ قرض ہو تو اس کی ادائیگی کردے۔ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جن کو دولت اور جوانی اللہ نے دی مگر فریضہ حج کو ٹالتے رہتے ہیں۔۔بڑھاپے میں حج کو جاتے ہیں۔ اس وقت حج کے ارکان ان سے صحیح طریقہ سے ادا نہیں ہوتے۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے جب وسائل مہیا ہوں تو ہر مسلمان کو بلاتاخیر یہ فریضہ انجام دینا چاہیۓ۔ جو شخص خلوص نیت سے سفر حج اختیار کرتا ہے اس کے دل میں محبت الٰہی کی ایسی شمع روشن ہو جاتی ہے جو اس کے قلب کو غلاظتوں سے پاک کرکے ہدایت سے منور کر دیتی ہے پھر وہ محبت و اطاعت الٰہی کے جذبہ کے تحت عملی طور پر قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار نظر آتا ہے۔احرام باندھتے ہی بندے پر کئی ایک حلال اشیاء مقررہ مدت تک حرام ہو جاتی ہیں۔ وہ ان اشیاء کی طرف میلان رکھتے ہوئے بھی حکم الٰہی کے تحت ان سے پرہیز کرتا ہے اور یوں ضبط نفس کا عملی مظاہرہ کرتا ہے۔ اس طرح حج ضبط نفس کے لئے بھی بہترین تربیت ہے۔ حج انسان میں سادگی و اعتدال کی صفات پیدا کرتا ہے اور فضول خرچی اور فخر اور غرور سے بچاتا ہے۔ حج کے اس خاص موقع پر دنیاکے ہر کونے سے آنے والے بندگان الٰہی ایک لباس ، ایک امام اور ایک مقصد کے تحت مساوات کا بے مثال اور لازوال عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسی مثال دنیاکے کسی بھی کونے میں دیکھنا ناممکن ہے۔ خواہ وہ مساوات کے علمبردار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ دین اسلام ہی ہے جس کے ماننے والے رنگ ، نسل، علاقے ،زبان، امیری اور غربت کے مصنوعی امتیازات سے بالاتر ہوتے ہیں اور حج

کے موقع پر اس پر بہترین عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ مقام فکر ہے کہ جب ایک شخص حج بیت اللہ کے لئے گھر سے روانہ ہو تو اس کا دل شرک ' منافرت ' انتشار اور دنیاوی خواہشات سے پاک وصاف ہونا چاہئے تاکہ اس کا حج شرف قبولیت کا باعث بن جائے۔ اگر حج کر لینے کے بعد ایک انسان اپنی نفسانی خواہشات کو ختم نہیں کر سکتا اور نفس کی سر کشی کو دبا نہیں سکتا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ حج پر گیا ہی نہیں۔ حج ایسا کرنا چاہئے کہ انسان کا ضمیر خود مطمئن ہو۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ حج کے بعد نفسانی خواہشات فسق و فجور اور برائیوں سے اجتناب کرنے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے جنم لینے والا معصوم بچہ۔ آپؐ فرمایا کہ حج و عمرہ ادا کرنے والے اللہ کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کی تمام حاجتیں پوری اور دعائیں مستجات ہوتی ہیں۔ قیامت کے دن برائیوں سے اجتناب کرنے والے حاجیوں کی بخشش یقینی ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق ادائیگی حج میں جلدی کی تلقین کی گئی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں تنگ دستی یا مجبوری تمہارا راستہ روک دے۔ ہر اہل مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اسے اسلام کا ایک اہم رکن تصور کرتے ہوئے اسے پورے احترام و عقیدے اور احکام شرعی کے مطابق ادا کرے۔ اس دوران نفس کے خلاف جہاد اور عبادتوں ریاضتوں سے اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرے۔

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

(6 ستمبر کے حوالے سے خصوصی تحریر)

1965 ء کی جنگ 1948ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی دوسری بڑی جنگ تھی۔1948ء کی جنگ کا پس منظر بھی مسئلہ کشمیر تھا۔اور 6 ستمبر 1965ء کو لڑی جانے والی جنگ کے آغاز کا مقصد بھی مسئلہ کشمیر سے پاکستان کی توجہ ہٹانا تھا۔رات تین بجے کے قریب ہندوستانی فوج نے پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لاہور کی طرف پیش قدمی کرنا شروع کردی۔اس اچانک حملے کے لئے افواج پاکستان بالکل بھی تیار نہ تھی۔اس لئے شروع میں ہندوستانی افواج کو زیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑااور وہ بدمست ہاتھی کی طرح آگے بڑھتے رہے۔ان کا خیال تھا کہ اس اچانک حملے سے لاہور پر یقینا قبضہ کرنے میں کامیاب ہوجائینگے ۔ہندوستانی فوج کے جنرل شرمانے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ صبح کا ناشتہ ہم لاہور میں کرینگے۔لیکن شائد دشمن کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ غیور اور بہادر فوج پاکستانی سرحد پر چوکس وچکنا رہتی ہے۔انہیں دشمن کا منہ توڑجواب دینے کے لئے صرف چند منٹ تیاری کے لئے درکار ہونگے۔اور پھر یہی ہوااس وقت ہندوستانی افواج کا خواب اچانک ٹوٹ گیاجب بی آر بی نہر

سے آگے دشمن کو ایک انچ بھی بڑھنے کے لئے اپنے سینکڑوں فوجی موت کے گھاٹ اتارنے پڑے۔اور وہ لاہور شہر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔نہ صرف سرحدوں پر پاک فوج دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی بلکہ ہمارے دیہاتی اور لاہور کے مضافات میں رہنے والے لوگوں کا فوری ردعمل اس قدر دیدنی تھا۔کہ وہ ڈنڈے اور کلہاڑے لے کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے سرحد کی طرف جانے لگے۔پاک فوج نے ان جوشیلے نوجوانوں اور بزرگوں کو یہ سمجھا کر واپس بھیج دیا کہ ابھی پاک فوج کے شیر جوان آپ کی حفاظت کے لئے سرحدوں پر موجود ہیں۔ابھی تم لوگ اپنے گھروں میں جا کر آرام کرو ہم ہیں دشمن کے ناپاک عزائم خاک میں ملانے کے لئے اس کے باوجود زندہ دلان لاہور کے لوگ سرحد پر پاک افواج کے لئے کھانا پہنچاتے اور زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنے میں ان کی مدد کرتے رہے۔دشمن تو شائد یہ بھول بیٹھا تھا کہ جنگ تو مسلمان کی سرشت میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہنستے مسکراتے لڑتے ہوئے شہید ہونا یہ اپنے لئے اعزاز اور اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں۔لاہور کی عوام کی ایک اور دیدہ دلیری عجیب و غریب تھی۔وہ یہ کہ جب ان کی چھتوں کے اوپر سے دشمن کے جہاز گزرتے تو وہ اپنی چھت سے ان کی طرف پتھر پھینکتے۔اور اگر کوئی پاک فوج کا جہاز دشمن کے جہاز کا پیچھا کر رہا ہوتا تو تالیاں بجاتے اور شور مچاتے۔یہ عجیب قسم کا ماحول تھا اور لگتا تھا جیسے لاہور کا بچہ بچہ اس جنگ میں از خود شامل ہے۔نا صرف عام شہری بلکہ سول سوسائٹی کے لوگ ،فلاحی و رفاعی تنظمیں سول

ڈیفنس اور میڈیا سے وابستہ عوام نے بھی پاک فوج کا بھرپور ساتھ دیا۔میڈم نورجہاں کا یہ گیت آج بھی جب کانوں میں گونجتا ہے تو 1965ء کی جنگ کے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔۔۔اے پتر ہٹاں تے نئیں وک دے۔۔اس جنگ کے بعد اس وقت کے صدر اور آرمی چیف ایوب خان نے میڈم نورجہاں کو ملکہ ترنم کا خطاب دیا۔اور میڈم نورجہاں ملکہ ترنم نورجہاں ہوگئیں۔یہ جنگ پاکستان کی مشرقی سرحد پر بڑی شدت سے لڑی جارہی تھی۔اس سرحد پر واقع علامہ محمد اقبالؒ کا شہر سیالکوٹ بھی ہے۔اور دنیا میں لڑی جانے والی جنگوں کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں۔کہ سب سے بڑی جنگ جو ٹینکوں سے لڑی گئی وہ۔۔چونڈہ۔۔کے محاذ پر لڑی گئی تھی۔جب دشمن نے سیالکوٹ کی طرف نظر بد ڈالی تو اس نے اپنے سینکڑوں ٹینک چونڈہ کے محاذ پر پاکستانی سرحد کے اندر داخل کردیئے۔شائد اس وقت تک پاکستانی عوام خودکش دھماکوں سے بے خبر تھی۔مگر اس دور میں آسمان پر چمکتے سورج نے وہ نظارہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا نہ سنا گیا تھا۔پاک فوج کے جوان اپنے جسموں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے اور پھر یوں ہوا کہ دشمن کے ٹینک ہواؤں میں اڑتے ہوئے دیکھے گئے دشمن اپنے ٹینک چھوڑ کر واپس بھاگ گیا اور بہت سے ٹینکوں پر پاک فوج نے قبضہ کرلیا۔جو آج بھی ہمیں لاہور اور سیالکوٹ کے چوراہوں پر کھڑے نظر آئیں گے۔۔یہ جنگ سات روز تک جاری رہی مگر ہندوستانی افواج بی آر بی نہر سے اس طرف نہ آسکی۔پاک فوج کے بہت سے جوان اور آفیسرز شہید ہوگئے۔نہر کنارے لاہور کے ایک

گاؤں برکی کے مقام پر میجر عزیز بھٹی شہید بڑی بہادری سے 6 دنوں تک لڑتے رہے اور دشمن کے ناپاک قدموں کو روکے رکھا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جنھیں بعد میں نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔ سات دن بعد یو این او کی مداخلت سے جنگ روک دی گئی اور ہندوستانی، پاکستانی افواج ایل او سی پر واپس چلی گئیں۔ یہ بے نتیجہ جنگ جو ہندوستان نے پاکستان پر اچانک مسلط کی تھی۔ اس نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے اور اسے دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ جسے وہ کمزور سمجھتا ہے اور نہتا سمجھ رہا تھا وہ کس قدر جری اور بہادر فوج ہے اور نہ صرف فوج اور عوام کے جذبہ، شہادت اور لازوال قربانیوں کی مثال بھی اسے ہمیشہ یاد رہے گی۔ کہ افواج پاکستان تنہا نہیں ہے بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے اس کے سچے مخلص اور وطن سے محبت کرنے والے عوام کی طاقت بھی موجود ہے۔

غربت، کرپشن اور کمر توڑ مہنگائی!

اس وقت سارے ملک پر مہنگائی کا قہر طاری ہے۔ مہنگائی اس وقت محاورۃً نہیں بلکہ صد فیصد عملاً ''کمر توڑ'' ہو چکی ہے۔ آزادی کے بعد شاید ہی کسی دور میں بھی عوام کے مختلف طبقات نے اس قدر تکلیف دہ زندگی کبھی گذاری ہو۔ غریبوں کے غریب تر ہونے کا عمل تیزی سے جاری ہے بلکہ اسے وسیع پیمانے پر فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ملک اس وقت جس صورتحال سے دوچار ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عوام اس وقت جن مشکل حالات سے دوچار ہیں اور جن پیچیدہ مسائل کا ملک کو سامنا ہے ان کا کوئی حل شاید ہی جلد نکل سکے گا۔ حالات جتنے ہی نازک ہوں صورتحال جتنی ہی خطرناک اور پریشان کن ہو یا ملک اور عوام کو درپیش مسائل چاہے جتنے ہی پیچیدہ اور گنجلک ہوں اس کی سب سے بڑی وجہ مسائل کو حل کرنے' حالات کو بہتر بنانے اور مجموعی صورتحال کو سنبھالنے اور سنوارنے سے حکومت کی عدم دلچسپی ہے اس کو معلوم ہے کہ یہ اس حکومت کی آخری باری ہے عوام مرتی ہے تو مرے جائے جہنم میں ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی امریکہ کے ''اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ'' کے راست کنٹرول میں اور زیر اثر ہے اور اس کو ترتیب دینے والے امریکہ کے ساتھ ملک کی تقدیر کو وابستہ کرنے ہی

کو ملک کے مفاد میں تصور کرتے ہیں۔ امریکہ کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان اور چین کے درمیان کسی بھی طرح سے پھوٹ ڈالی جائے ،تاکہ وہ اس کی آڑ میں ایشیاء پر مسلط ہوسکے۔ اس لئے ہماری خارجہ پالیسی اور ساتھ امریکہ ہی کے زیر اثر بھارتی حکمرانوں کی بنائی ہوئی خارجہ پالیسی یعنی دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسی میں ایک دوسرے سے دوستی کا رجحان کم اور تنازعات کو برقرار رکھنے،اور اختلافات کو گہرا کرنے کا عنصر غالب ہے کیوں کہ چین اور پاکستان کے قریبی تعلقات پر امریکہ اثر انداز نہیں ہوسکتا ہے اس لئے پاکستان اور بھارت کے قدیم اور جدید تنازعات کو ہوا دی جارہی ہے۔ اس کشیدہ صورتحال کے سبب جدید اسلحہ کی بڑے پیمانے پر تیاری، امریکہ اور اس کے حلیفوں سے پاکستان اور بھارت کے وسائل اور دولت کا بڑا حصہ ہتھیاروں کی خریداری یا ہتھیار بنانے والے کارخانوں فیکٹریوں اور اسلحہ سازی کے لئے دیگر ضروری خام مال یا ٹیکنالوجی اور سائنس کی مدد سے تیار کی جانے والی مصنوعات اور پرزوں کی خریداری پر صرف ہورہا ہے۔ کثیر دفاعی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حکومت کو نت نئے ٹیکس لگانے اور موجودہ ٹیکسوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے وہ وسائل جو عوام کی فلاح و بہبود اور ان کی زندگی کو آرام دہ اور معاشی صورتحال کو خوشحال بنانے پر صرف ہو سکتے ہیں وہ امریکہ و اسرائیل کے سرمایہ داروں کی تجوریوں میں دولت کا اضافہ کررہے ہیں اور جب سرمایہ دار کی دولت بڑھتی ہے تو غریبوں کی زندگی زیادہ مشکل ہوتی جاتی ہے۔ مہنگائی میں مسلسل اور بھیانک

اضافہ کے سلسلے کو اگر ملک کے دفاعی اخراجات سے جوڑا جائے یا اگر جوڑنے کی کوشش کی جائے تو لاتعداد جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں یہ کڑوی اور واضح حقیقت بتانے والے پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھنے لگیں گی بلکہ اب بھی اٹھتی رہتی ہیں اور حب الوطنی اور قوم پرستی کے دعویدار تو ایسی بات کہنے والے کو غدار کہیں گے بلکہ کہتے رہتے ہیں۔ ایک طرف جو لوگ مسلسل اور تیزی سے بڑھتی مہنگائی کا ذکر کرتے ہیں حکومت کو مطعون کرتے ہیں تو دوسری طرف مہنگائی کو بڑھانے والی حکومت کی اندھی تائید اپنے نام نہاد جذبہ حب الوطنی و قوم پرستی اور وفاداری کے اظہار کے لئے امریکہ و صہیونی سرمایہ داروں کے مفادات کی حفاظت کیلئے ضروری سمجھتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے قطع نظر حکومت کی مجموعی طور پر داخلی حکمت عملی یا مختلف سرکاری محکموں اور اداروں کی اپنی اپنی حکمت عملی، اقدامات اور معیار کارکردگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات نہ صرف آسانی سے بلکہ بڑی جلدی کھل کر سامنے آتی ہے کہ کرپشن کا بے تحاشہ زور اور سرکاری عملے کی ناقص کارکردگی، دوراندیشی اور بصیرت سے عاری منصوبہ بندی کے علاوہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر چوٹی کے سرمایہ داروں کے اثرات (خواہ وہ کسی بھی سیاسی و معاشی نظریہ سے وابستہ ہوں) طاری ہیں۔ گندم کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس کا راست فائدہ تو کسان کو جانا چاہیے مگر غربت، افلاس اور قرضداری سے پریشان کسانوں میں خودکشی کا رجحان بڑھ رہا ہے کرپشن اور ناقص ترین کارکردگی کا حامل سرکاری عملہ سرکاری آمدنی خاص طور پر ٹیکسوں سے حاصل

ہونے والی آمدنی سرکاری تخمینوں کے مطابق سرکاری خزانوں میں جمع نہیں کروا رہے ہیں۔ ہر سال خسارہ کو پورا کرنے اور محصلہ رقومات خاص طور پر مالگزاری اور ٹیکس سے ہونے والی آمدنی کی وصولی میں کمی کے سبب ہر سال ٹیکس بڑھائے جاتے ہیں، جس کا شکار نچلے متوسط طبقات اور خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والی عوام ہو رہی ہے۔ ہاں کالے دھن سے بھری جانے والی تجوریاں بھرتی جاتی ہیں.بڑے سرمایہ داروں کا سرمایہ نہ صرف ملک میں کالے دھن کی صورت میں.بڑھتا ہے بلکہ بیرونی ملکوں کے بینکوں میں جمع ہو رہا ہے اس کے نتیجہ میں ہر چیز کی قیمت.بڑھ رہی ہے۔
قیمتوں میں اضافہ اور مہنگائی میں اضافہ بلاشبہ ساری دنیا میں ہو رہا ہے اس قسم کی باتیں کہنے والوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب ساری دنیا میں مہنگائی.بڑھ رہی ہے قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے تو اگر ایسا پاکستان میں بھی ہو رہا ہے تو اس پر حیرت و تعجب بلکہ احتجاج کیوں کیا جا رہا ہے ؟لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ جن دوسرے ملکوں میں قیمتوں میں اضافہ و گرانی کی شرح میں مسلسل تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ یا تو عرصہ دراز سے عالمی قوت رہے ہیں نیز وہاں فی کس آمدنی پاکستان سے بہت زیادہ ہے اس کے علاوہ ان ممالک میں خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد پاکستان کے مقابلے میں بہت کم ہے اور وہاں کرپشن اگر ہے بھی تو اتنا زیادہ نہیں ہے سرکاری عملہ خود کو صحیح معنوں میں "عوامی خدمت گار" سمجھتا ہے پاکستان میں بے تحاشہ غربت ' کرپشن اور سرکاری ملازمین کی فرعونیت مہنگائی

کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ پاکستان میں فی کس سالانہ آمدنی محسوب کرتے وقت ان سرمایہ داروں کی آمدنی جن کی سالانہ آمدنی لاکھوں نہ سہی ہزاروں کروڑ ہوتی ہے چند ہزار سالانہ آمدنی والوں کی آمدنی میں شامل کرکے سالانہ اوسط نکالا جاتا ہے اگر سرمایہ داروں کی آمدنی ملک کی سالانہ آمدنی میں شامل نہ کی جائے تو پھر جو اوسط سامنے آتا ہے وہ حکمرانوں کے لئے شرمناک ہے۔ (مگر ہمارے حکمرانوں سیاستدانوں اور سرکاری ملازمین کو شرم ہے کہاں؟) قیمتوں میں اضافہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کا سارا بوجھ عوام پر ڈالنے کا آخر مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ سرمایہ داروں کے نفع میں کمی نہ ہو حکومت کی آمدنی میں کمی نہ ہو۔ حکومت جانتی ہے کہ پٹرول کی قیمتوں میں گذشتہ چند ہفتوں میں جو بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ پٹرول کی کمپنیوں کو خسارہ ہے۔ اول تو یہی امر باعث حیرت ہے کہ اب جبکہ عالمی منڈی میں پٹرول کی قیمتوں میں زبردست نہ سہی خاصی کمی ہو گئی ہے تو آمدنی یا نفع میں کمی کا کیا سوال ہے؟ جب خام تیل کی قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے کمپنیوں کو خسارہ والی بات قابل فہم ہے لیکن جب عالمی منڈیوں میں خام تیل کے دام گر چکے ہیں اور ملک میں اس وقت کے مقابلے پٹرول ڈیزل کی قیمتوں میں خاصا اضافہ ہوا ہے تو پھر پٹرول کی کمپنیوں کو خسارہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہے یہ تو کھلا دھوکا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے کہ جس طرح چاہیں جس قدر چاہیں قیمتوں میں اضافہ کرکے عوام کا خون

چوستیں اور ان کو کوئی گرفت کرنے والا نہیں ہے دوسری جانب عوام کا چاہے جو حشر ہو سرمایہ داروں کے نفع میں کمی نہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت کی آمدنی میں بھی حکومت ہرگز کمی کرنا نہیں چاہتی ہے ورنہ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ حکومت ٹیکسوں میں کمی کرتی اور ملک کی اور عوام کی بدتر معاشی حالات کی وجہ سے پٹرول کمپنیوں کو آمدنی میں کمی (خسارہ نہیں) برداشت کرنے دیتی اور اپنی آمدنی میں بھی کمی گوارہ کرتی۔

بددیانت کرپشن میں ملوث وزراء اور عہدیداروں کی وجہ سے بے جا اخراجات کی وجہ سے حکومت کو ہزاروں لاکھوں کروڑوں کا خسارہ ہوتا ہے وہ روا ہے کیونکہ عوام کو راحت پہنچانے کے لئے ٹیکس میں کمی حکومت کو گوارہ نہیں ہے۔ عوام کی خراب حالت بغیر محنت کے لاکھوں کروڑوں کمانے کا رجحان ملک کے ہر شعبہ زندگی پر پڑ رہا ہے۔ اور طرح طرح کی معاشرتی خرابیاں پیدا کر رہی ہے۔ سرمایہ داروں کی یہ سرپرستی خطرناک نتائج مرتکب کر سکتی ہے۔ پاکستان کے عوام احتجاج کے جمہوری طریقوں سے واقف ہیں وہ سڑکوں پر نہیں نکلتے ہیں لیکن اگر یہ حال برقرار رہے تو عوام سڑکوں پر بھی نکل سکتے ہیں۔

DEPRESSIONڈپریشن

آج کل یہ ایک لفظ ہے جس کا استعمال بہت عام ہو گیا ہے ، اور کچھ رواج سا بن گیا ہے کہ جب بھی کسی کو کوئی پریشانی ہوتی ہے، یا کوئی بات بار خاطر ہو جاتی ہے ، یا ماحول ناگوار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ڈاکٹروں کے پاس جائیں تو ڈاکٹر کا جواب ہوتا ہے کہ بس تھوڑے ڈپریشن DEPRESSION کی وجہ سے آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا ہے۔ کسی کو ہارٹ اٹیک ہو...... وجہ...... ڈپریشن

گھر میں یا آفس میں کوئی سر پکڑے بیٹھا ہو......وجہ ......پوچھیں۔

کچھ نہیں ......بس ذرا سا ڈپریشن ہے۔

دراصل اس حالیہ زمانہ کے لوگ زیادہ ڈپریشن میں نہیں ، لیکن وہ خود کو زیادہ ڈپریشن میں سمجھتے ضرور ہیں۔ فی زمانہ ڈپریشن کا لفظ بذات خود ایک روگ بن گیا ہے۔ جس سے کسی فرد کو فرار نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ پتا چلانا مشکل ہے کہ ڈپریشن کیوں اور کیسے ہوتا ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے بھی لوگ بیمار پڑتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں ڈپریشن کی اصطلاح اتنی عام نہیں تھی۔ دراصل ! ڈپریشن ایک جسمانی کیفیت کا نام ہے جو مخصوص حالات کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ دماغی و اعصابی اعتبار سے انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ

ہے۔ اسلئے اس میں جذبات کی کیفیات اور جذباتی تلاطم زیادہ ہوتا ہے۔ جس کو وہ برداشت بھی کرتا ہے۔ دیگر جانداروں کی طرح فوراً حملہ نہیں کر بیٹھتا۔ یہی کیفیت جس میں مصیبت کو برداشت کرنا پڑے ڈپریشن DEPRESSION کہلاتا ہے۔ ڈپریشن کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ موسم کی سختی سے لے کر بچوں کی بیماری تک ،اسباب خورد نوش کی کمیابی سے لیکر شریک حیات کی سر گرانی تک۔ لوگ تیز رفتار اور تن آسان زندگی کے عادی ہو گئے ہیں، اور اس کے علاوہ ہمارے اپنے تضادات ہیں، جو ہمیں سخت ڈپریشن میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ڈپریشن کے اثرات ہر شخص کے مزاج و پس منظر کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان سے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے مزاج کی ساخت استطاعت اور حالات کے لحاظ سے زندگی گذارنے کے لئے اپنا لائحہ عمل تجویز کرے۔ اگر آپ خاتون خانہ ہیں اور اپنے سسرال والوں سے علیحدہ نیوکلیر فیملی کی ممبر ہیں تو صبح بہ یک وقت کتنے ہی کام اکٹھے آپ کو کرنے پڑ جاتے ہیں ، جلدی بیدار ہونا ، بچوں کو اسکول کے لئے تیار کرنا ، شوہر نامدار کے لئے چائے ناشتہ وغیرہ ، پھر ان کے جانے کے بعد گھر میں ہر طرف بکھرا سامان ، کچن میں گندے برتنوں کا ڈھیر ،اور یہ فکر کہ دوپہر کے کھانے میں کیا پکائیں ، یہ سب امور دل و دماغ میں ایک کھچڑی پکا کر آپ کو شدید دباؤ میں مبتلا کر سکتے ہیں یہ ایک دن کا نہیں بلکہ روز روز کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح اگر آپ مرد ہیں تو آفس میں آپ کی ٹیبل پر رکھی ہوئی فائلوں کا انبار اور گاہے گاہے بگڑا ہوا باس (BOSS) بگاہے باس

پھٹکار آپ کو یقینی ڈپریشن کا مریض بنا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کم آمدنی، زیادہ اخراجات، بچوں کی تعلیم و تربیت، بیماریاں، خاندانی جھگڑے، ایسے لاتعداد امور ہیں جو آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ڈپریشن کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے، کیوں کہ اس مرض میں ذہن مزاج، بدن، عادات واطوار، رویہ سب متاثر ہوتے ہیں۔ نیند میں کمی، تھکن کمزوری، بے چینی، یادداشت میں خلل، فیصلے کرنے میں دشواری، خوردونوش کی طرف کم توجہ، بے ربط خیالات کی آمد، خصوصاً بلند فشار خون، امراض قلب، خلل اعصاب، السر معدہ، یہ سب ڈپریشن کے زیر اثر رونما ہو سکتے ہیں، اور بعض اوقات ہارٹ اٹیک اور خودکشی کا سبب بن جاتے ہیں۔ بحر حال!

ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ یہ، DEPRESSION، ڈپریشن نہیں کہ اس سے آنکھیں بند کر لی جائیں، بلکہ اس سے نمٹنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ڈپریشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے نبرد آزمائی کی جائے۔ اس بیماری میں مبتلا لوگوں کی وسیع پیمانے پر تحقیق و تفتیش کی گئی ہے۔ ہر طبقہ خیال اور شعبہ زندگی کے لوگوں کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ وہ سب کے سب کسی اندرونی بیماری میں مبتلا نہیں تھے۔ بلکہ احساس تنہائی، کسی پریشانی، غصہ، جھنجھلاہٹ، ہیجان، داخل کشمکش یا زندگی کی سختی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار تھے۔ اس تکلیف میں مردوں سے زیادہ خواتین مبتلا ہوتی ہیں، عمر رسیدہ لوگوں سے زیادہ جوان العمر، ان پڑھ لوگوں سے زیادہ تعلیم یافتہ۔ دست کاروں سے زیادہ دماغی کام کرنے

والے۔ ڈپریشن میں مبتلا لوگ زیادہ تر ایک خاص شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی فطر تاحساس ، باریک بین ، بے حد محتاط ، جذئیات کا از حد خیال رکھنے والے۔ ڈپریشن ایک ایسا روگ ہے جسے ہم جڑ سے تو ختم نہیں کر سکتے، لیکن مختلف ذرائع اور طریقوں سے اس کو کم ضرور کر سکتے ہیں۔اس لئے جب بھی آپ کو محسوس ہو کہ ڈپریشن کا شکار ہو رہے ہیں تو فوراً کسی ماہر معالج سے رجوع کرنا چاہئے ، اور اس کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے ،تاکہ آپ فوری طور پر ڈپریشن کا تدارک کر سکیں۔ ڈپریشن دور کرنے والی دواؤں اور علاج سے 80 فیصد افراد کو فائدہ ہوتا ہے۔ آج کل متعدد دافع ڈپریشن اور بحالی مزاجی ادویہ دستیاب ہیں۔ لیکن سب سے پہلے تو ڈپریشن کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ آپ اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھیں۔ خود بھی خوش وخرم رہیں۔ اور اپنے ارد گرد والے لوگوں اور خاندان والوں کو بھی خوش وخرم رکھیں۔ آپ کے دوست احباب بھی ڈپریشن کے سد باب اور ازالے کے لئے ضروری ہیں۔ رشتہ داروں دوستوں کی اعانت اور مثبت رویہ ہو تو نہایت صحت افزا اثر ہوتا ہے۔ آج کل ڈپریشن ایک بڑی وجہ ہمارے آپس ہمیں رفقاء اور اقرباء کے درمیان کمیونیکیشن گیپ [Communication Gap] ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اندر ہی اندر الجھ کر زندگی گذارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کوشش کرکے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گذارنے کے لئے وقت نکالیں۔ قرآن الکریم میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 36 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔اور اللہ کی عبادت کرو ، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک

نہ بناؤ، والدین سے اچھا سلوک کرو، نیز قریبی رشتہ داروں سے۔ یتیموں، مسکینوں، رشتہ داروں، ہمسایوں، اور اجنبی ہمسایوں، اپنے ہم نشین اور مسافر، ان سب سے اچھا سلوک کرو۔ (القرآن)

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

کرپشن، یعنی بد عنوانی اور رِشوت ستانی پر اِس وقت پورے ملک میں گفتگو جاری ہے۔ ماضی میں بھی ہو رہی تھی اور مستقبل میں بھی ہوتی رہے گی۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ گاؤں کا ایک غریب اور مفلوک الحال شخص جب الیکشن جیت کر ایم این اے یا وزیر بنتے ہی راتوں رات تعمیر و ترقی کے فنڈز کے لاکھوں روپے اپنی صوابدید پر خرچ کرنے کا مکلّف ہو جاتا ہے اور کوئی عقیدہ و تصور اور عملاً قانون اُس کی راہ میں حائل نہیں ہو پاتا ہے تو آسمان سے اچانک ٹپکے ہوئے اس خزانے کے ایک بڑے حصے کو وہ اپنی شخصیت اور عزیز و اقارب پر صرف کرنے سے کیوں گریز کرے؟ اِسی طرح جب ایک صوبائی یا مرکزی وزیر کی جنبشِ قلم پر کروڑوں نہیں اربوں روپے رقص کرتے ہوں تو وہ ان میں سے اپنا معقول حصہ نکال کر اپنی کئی پُشتوں کا نظم کیوں نہ کر لے؟ اس کو معلوم ہے کہ انتہائی فن کاری سے انجام دِیے گئے اس کام کی اوّلاً تو کسی کو کانوں کان بھنک نہیں لگے گی اور کچھ ہوا بھی تو چند اخباری خبروں اور سرسری تحقیقات کے بعد معاملہ خود ہی سرد خانے میں چلا جائے گا۔ اتنے بڑے ملک میں بہت تیزی سے مسلسل سامنے آنے والے بدعنوانی کے بے شمار واقعات میں اُس کا واقعہ کس کو یاد رہے گا! وقتی طور پر کابینہ سے علیحدگی ہو بھی گئی تو اگلی کابینہ

میں وزیر بننے سے اس کو کون روک سکے گا؟ اور فرض کیجیے قسمت نے تھوڑی دیر ساتھ نہ دیا اور چند مہینے جیل میں بھی گزر گئے تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ رِہائی کے بعد اس کو ہار پھول پہنا کر سر پر بٹھانے والے حواریوں کی کب کمی ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی حکمت و دانائی سے جو کئی ہزار، کروڑ روپے اس نے جمع کر لیے ہیں انھیں حکومت یا عدالت اُس سے واپس تھوڑے ہی لے پائے گی۔

پنچایت سے پارلیمنٹ تک کا ذکر تو بس نمونے کے طور پر کیا گیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تن ہمہ داغ داغ شد''--- کی کیفیت ہے اور کوئی شعبہ زندگی ایسا ملنا ناممکن سا ہے'' جہاں بدعنوانی، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ نہ ہو۔ گاؤں سرپنچ سے لے کر مرکزی وزیر تک، چپڑاسی سے لے کر اعلیٰ ترین افسر تک، آٹو رکشا والے سے لے کر ہوائی جہاز کے پائلٹوں تک۔ بس کنڈکٹر سے لے کر ریلوے کے ٹی ٹی تک، دودھ گھی تیار کرنے اور فروخت کرنے والوں سے لے کر دوا سازوں اور دوا فروشوں تک، ملک کے بارڈروں اور ہوائی اڈوں پر متعین کسٹم ملازمین سے لے کر ملک کی سرحدوں کی حفاظت پر مامور افواج تک، کرپشن اور بدعنوانی سے کون کتنا پاک ہے یہ کہنا مشکل ہے! یہ نہ سمجھا جائے کہ اس فہرست میں جن بے شمار کاموں پیشوں اور شعبوں کے نام درج نہیں کیے گئے ہیں وہ سب بڑے پاکباز اور انتہائی دیانت دار ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس پر حیرت ہے کہ کرپشن کی فہرست

میں پاکستان کو تو مقامِ اول پر ہونا چاہیے، ہمارا نمبر اتنا نیچے کیسے ؟ کیا ہم سے زیاد کرپٹ بھی کوئی ملک ہو سکتا ہے ؟ کرپشن کے پہلو سے ملک کی جو تشویش ناک صورت حال ہے، اُس پر تحریک انصاف کے قائد عمران خان جس طرح سے سرکار اور اہل وطن کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے ہیں، یہ اپنے آپ میں بہت غنیمت ہے، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ مرض اتنا مہلک اور معاشرے کے رگ و پے میں ایسا سرایت کیے ہوئے ہے کہ کسی بھی عام علاج سے اس کا خاتمہ آسان نہیں ہے۔ بات بہت سادہ سی ہے کہ جب کسی بڑی محنت و جد و جہد کے لاکھوں کروڑوں روپے اور بے حد و حساب جائیداد ہاتھ آ رہی ہو تو کوئی بھی شخص اس سے منہ کیوں موڑے ؟ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن کی زندگیاں ہمارے سامنے ہوں تو امید کی جا سکتی ہے کہ ہماری روحوں تک میں بسیرا کیے ہوئے اندھیرے کافور ہو سکتے ہیں اور ہم بدعنوانی و کرپشن کے اس تاریک غار سے سچائی و دیانت کے نور سے روشن شاہراہ پر آ سکتے ہیں۔ مدینہ کی گلیاں تھیں، رات کی تاریکی تھی، ہر طرف سنّاٹا تھا، صبح ہونے کے قریب تھی۔ گھر کے اندر سے کسی ماں کی آواز آ رہی تھی: ’’بیٹی اٹھ جا، اُٹھ جا، صبح ہو رہی ہے، اٹھ جا دودھ میں پانی ملا دے ! بیٹی نے کہا: امی یہ گناہ ہے ! امیر المومنینؓ نے اعلان کرایا ہے کہ دودھ میں کوئی ملاوٹ نہیں کی جائے گی ! ماں نے قدرے بلند آواز سے کہا: یہاں کہاں ہیں امیر المومنینؓ ! اُٹھ جا دودھ میں پانی ملا دے ! بیٹی نے ادب سے عرض کیا: ماں ! امیر المومنینؓ نہ سہی، اللہ تو موجود ہے ! امیر

المومنینؓ نہ دیکھیں، وہ تو دیکھ رہا ہے!'' اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس گفتگو کے بعد بھی ماں نے دودھ میں پانی ملانے پر اصرار کیا ہوگااور رات کے سناٹے میں بھی خدا کے اپنے گھر میں موجود ہونے کا یقین رکھنے والی بیٹی نے دودھ میں پانی ملا دیا ہوگا؟ نہیں، ہرگز نہیں! تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اس کے ساتھ یہ دلچسپ واقعہ ہوا کہ اپنے عوام کی خبرگیری کے جذبے سے راتوں کو مدینے کی گلیوں کا گشت لگانے والے امیر المومنین حضرت عمرؓ خود ہی گلی میں کھڑے ہوئے ماں بیٹی کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ آپ معصوم لڑکی کے جذبہ ایمان اور حسن کردار سے ایسے متاثر ہوئے کہ صبح ہونے پر اس لڑکی کو اپنی بہو بنالیا۔۔۔ یہی امیر المومنین حضرت عمرؓ مدینہ کی مسجد نبوی میں مسلمانوں کو خطاب فرمارہے تھے۔ مجمع سے ایک صاحب اٹھے اور کہا کہ ہم آپ کی بات نہیں سنیں گے، جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ آپ نے یہ لمبا کرتا کیسے سلا لیا؟ یعنی بیت المال سے تو ہر مسلمان کو صرف ایک ایک چادر تقسیم ہوئی تھی (ایک ہی چادر آپ کو بھی ملی تھی، اور ایک چادر میں آپ جیسے دراز قد شخص کا قمیض تیار ہونا ممکن نہیں ہے) حضرت عمرؓ جن کے نام سے قیصر وکسریٰ کی حکومتیں کانپتی تھیں، فرمایا کہ اس اعتراض کا جواب میرا بیٹا عبد اللہ دے گا۔ بیٹے نے کھڑے ہو کر وضاحت کی کہ بیت المال سے جو چادر میرے حصے میں آئی تھی وہ میں نے والد محترم کو پیش کردی تھی (اس طرح دو چادریں ملا کر امیر المومنینؓ کا کرتا تیار ہوا ہے) اعتراض کرنے والے شخص نے مطمئن ہو کر کہا کہ ٹھیک ہے، اب

آپ کا خطاب سنیں گے۔ اِنھیں حضرت عمرؓ کی اگلی نسلوں کے ایک عزیز عمر بن عبد العزیزؒ بھی خلیفہ ہوئے تو دل کی دنیا اور زندگی کی کیفیت تبدیل ہو گئی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سرکاری کام میں مشغول تھے کہ بیت المال کی امانت کے طور پر رکھے ہوئے سیب کے ڈھیر میں سے اُن کے چھوٹے سے معصوم بیٹے نے ایک سیب اٹھالیا۔ خلیفہ نے بیٹے کے ہاتھ سے سیب لے کر امانت میں ڈال دیا تو بچہ روتے ہوئے گھر چلا گیا۔ کام ختم کرکے جب وہ خود گھر پہنچے تو بیوی نے شکایت کی کہ آپ نے بیٹے کے ہاتھ سے سیب چھین لیا اور وہ خالی ہاتھ روتے ہوئے واپس آگیا۔ خلیفہ وقت نے کہا کہ وہ سب بیت المال کی امانت تھی (اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں) بیٹے کو سیب چاہئے تو میں اپنے پیسے سے بازار سے لا دیتا ہوں ! یہ چھوٹے چھوٹے تین تاریخی واقعات اِس بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ اگر اللہ کے ہونے پر کامل ایمان ہو، آخرت کا یقین اور وہاں ہر چھوٹے۔بڑے نیک و بد عمل کی جواب دِہی اور جزا و سزا کا احساس تازہ رہے اور دُنیوی اعتبار سے بھی رحمت عالم حضرت محمد مصطفیؐ کا یہ قول مبارک پیش نظر رہے کہ اگر محمدؐ کی بیٹی بھی چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیا جاتا تو ملک میں موجود کرپشن کی موجودہ صورت باقی نہ رہتی۔ جہاں نہ خدا کا خوف ہو، نہ آخرت میں جواب دہی کا احساس، نہ دنیا میں بھی جرم کی سخت سزا کا اندیشہ اور کیفیت یہ ہو کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" وہاں کرپشن کا دریا بہنے اور بہانے سے کیسے اور کس طرح روکا جاسکتا ہے؟ اس کو مستحکم عقیدے اور

مؤثر قانون اور اس کے بے لاگ نفاذ سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ کیا ہم اس کیلئے تیار ہیں؟

صوفی ازم ایک حقیقت

میرے کچھ دوست اکثر مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ میں صوفیت کی اس قدر شدت سے کیوں وکالت کرتا ہوں جبکہ بیشتر مسلمان نہ صرف اسے مسترد کرتے ہیں بلکہ اسلام سے انحراف بھی کہتے ہیں۔ لیکن میرا انہیں ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ صوفی حضرات اللہ سے محبت کرتے ہیں اللہ سے خوف نہیں کھاتے۔ان کے لیے محبت ہی ان کا اصل بنیادی اور مرکزی عقیدہ ہے۔ داتا علی ہجویریؒ، بلھے شاہؒ، بابا غلام فریدؒ جیسے صوفیوں نے ایک مذہب کو دوسرے سے جدا کرنے والی دیواریں گرا کر پیار و محبت کو تمام بنی نوع انساں کے لیے ان کے مذاہب کی بنیاد بنایا۔ ابن عربی نے تو یہاں تک کہہ دیا'' حبی دینی و شریعتی ''یعنی محبت ہی میرا دین اور میری شریعت ہے۔ یہ ان حضرات کے لیے بڑی بامعنی بات ہے جو پوری انسانیت میں یقین رکھتے ہیں اور نفرت پر نہیں بلکہ محبت کی بنیادوں پر انسانی تہذیب کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ محبت نہ صرف رواداری کی جانب لے جاتی ہے بلکہ انتہا پسندی، شدت پسندی اور خارجی سچ کی بنیادوں پر تحریکوں کو بھی پسپا کرتی ہے۔ جو شخص پوری انسانیت سے محبت کرتا ہے ہمیشہ داخلی فکر و سوچ اختیار کرتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ سب کچھ خارجی گروہ کی اجارہ داری نہیں ہو سکتا۔اس حیثیت سے صوفی اپنی کثرتی سوچ کے باعث کہیں زیادہ جمہوری ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ہی رنگارنگی پیدا کی

ہے اور ہمیں اللہ کی تخلیق کے طور پر رنگا رنگی کا احترام کرنا چاہیے۔وہ شخص جو مسلکی یا نظریاتی سوچ کا حامل ہے وہ اختصاص اور امتیاز میں یقین رکھتا ہے اور تنوع کو حقیر گردانتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک رنگا رنگی کسی ایک گروہ کی سچائی کی اجارہ داری کے تصور کی نفی کرتا ہے۔اور اگر سچ کی سچائی پر خصوصی اجارہ داری نہیں ہے تو کسی بھی فرقہ کو سچ کا علمبردار یا سچائی کا حامل ہونے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔مزید.بر آں صوفیت گہری روحانی فکر پر مبنی ہے اور ہر شخص کے رگ و پے میں رچی بسی اور پنہاں ہے۔روحانیت ایک بحر اور سمندر کی طرح ہے اور تنگ نظر اصول و قواعد ایسے چھوٹے دریاؤں کی مانند ہیں جو ساحلوں سے گھرے ہیں اور ان کا دھارا پہلے ہی سے متعین ہوتا ہے۔اس طرح روحانیت کہیں زیادہ جامع ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایسے کئی دریاؤں کا سنگم ہے جس میں تمام خصوصیات و خوبیاں بے خودی میں مدغم ہو جاتی ہیں۔اور صرف سمندر باقی رہ جاتا ہے۔جب مولانا روم سے استفسار کیا گیا کہ ان کی پہچان کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ محبت ، کیونکہ محبت تمام شناختوں کا مجموعہ ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محبت ہے کیا؟اکثر ہم غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جسے ہم چاہتے ہیں وہ ہمارے پاس ہو۔ حقیقت میں اس قسم کی سوچ محبت کے قطعی منافی ہے۔ ہم جسے چاہتے ہیں ہمیں اس شخص کی عزت و وقار اور اخلاقی بلندی کا احترام کرنا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس شخص کو مکمل آزادی دیں۔ جبکہ جہاں اس پر اپنی اجارہ داری قائم

کرنے کا جذبہ ہو تو وہاں ہم اس شخص کی آزادی سلب کرتے ہیں۔اس طرح اگر ایک شخص سمجھتا ہے کہ وہ ایک عورت سے محبت کرتا ہے تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اسے مکمل آزادی نہ دے اور اس کی دیانتداری کا احترام نہ کرے۔اسی طرح صوفیائے کرام بھی انہی اصولوں کی بنیاد پر انسانیت سے محبت کرتے ہیں اور وہ ہر مذہب کا احترام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں محبت اس وقت تک پر خلوص، صاف ستھری اور اصلی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں خلوص شامل نہ ہو۔اس محبت میں دور دور تک خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو۔ محبت کو خالص بنانے کے لیے تمام نفسانی خواہشات چھوڑنا پڑتی ہیں اسی لیے صوفیائے کرام ترک دنیا کے قائل ہیں۔ اور اس ترک کی اعلیٰ قسم کو ترک ترک بتایا گیا ہے یعنی وہ اپنی محبت کا کوئی صلہ طلب نہ کرے۔ وہ قطعی طور پر برضا و رغبت اور ہنسی خوشی ترک ہونا چاہیے۔

اس طرح ہر صوفی محض اللہ کی خاطر، جس سے کہ وہ بے پناہ محبت کرتا/ کرتی ہے اپنا مادی آرام و آسائش اور خواہشات نفسانی کو ترک کر دیتا ہے۔ سرمد شہید، جن کا اورنگ زیب نے اس لیے سر قلم کر دیا تھا کہ انہوں نے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ (نہیں ہے کوئی سوائے اللہ کے) پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور صرف لا الہ (نہیں ہے کوئی اللہ) پڑھا تھا۔جب ان کا سر تن سے جدا کرنے کے لیے ان پر تلوار تان کر یہ معلوم کیا گیا کہ الا اللہ (سوائے اللہ کے) کیوں نہیں کہا تو

انہوں نے جواب دیا کہ میں الااللہ کیوں کہوں جبکہ ابھی تک میرے دل میں خواہشات کے بہت سے خدا ہیں۔ اس طرح سرمد نے یہ ثابت کیا کہ جب میرے دل میں خواہشات کے اتنے خدا ہیں تو اللہ سے میری محبت میں خلوص کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک سچے مومن یا ایک اللہ سے محبت کرنے والے کو اپنے دل میں بسے خواہشات کے خداؤں سے اپنے دل کو پاک کرکے اپنی تطہیر کرنا ہوگی۔ اس طرح خود غرضی کی خواہشات سے آلودہ محبت کی سب سے نچلی سطح ہے اور محبت کی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ تمام خواہشات دل سے نکال پھینکی گئی ہوں۔ اس طرح صوفی حضرات جو تمام خواہشات کو مار دیتے ہیں محبت کی خالص قسم پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ صوفی اسلام کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں ذاتی خواہشات اور اغراض کی تکمیل اور دفع پریشانی و مصائب کے لیے ان صوفیوں سے فریاد کی جاتی ہے یا ان کے وسیلہ سے خدا سے مانگا جاتا ہے۔ لیکن میرا اس شفاعت اور مدد کے لیے التجا کرنے اور ان سے فریاد کرنے کے معاملہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو ہر رنگ و نسل اور ذات کے جذبے سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت سے بے غرض و بے لوث اور پورے خلوص و نیت کے ساتھ سچی محبت کرنے کے اصول پر کاربند ہونے کا درس دینے کی وجہ سے صوفیت کو پسند اور قبول کرتا ہوں۔

جنت و جہنم

اکثر و بیشتر میرے دوست مجھ سے معلوم کرتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ کہیں موجود ہیں بھی جن میں انسان اپنے اچھے اور برے اعمال کے مطابق سزا و جزا کے لئے بھیجا جائیگا؟ یا یہ صرف قرآن میں علامتی طور پر بیان کئے گئے ہیں؟ کیا یہ وہ مقامات ہیں جہاں انسان ابد تک اپنے پورے ہوش و حواس میں مقیم رہے گا؟ در حقیقت یہ سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ لوگ پیغمبر اسلام محمد ﷺ سے قیامت کے بارے میں معلوم کیا کرتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دیگر صحیفوں کی طرح قرآن بھی وضاحتی سے زیادہ علامتی ہے۔ کوئی بھی صحیفہ ابدی رہنے کے لئے محض وضاحتی نہیں ہو سکتا۔ علامتیت اسے ہمیشہ ہمیشہ عمل پیرا رہنے کے ساتھ ساتھ معنوی اعتبار سے کئی پرتی بنا دیتی ہے۔ صحیفے عوام الناس اور عالموں دونوں کے لئے یکساں قابل فہم ہونے چاہئیں۔ اگر کوئی صحیفہ صرف عالموں کے لئے ہی قابل فہم ہے تو وہ صحیفہ عام انسان پر بے اثر رہے گا اور اگر وہ صرف سیدھا سیدھا بیان ہے اور اس میں معنویت یا کسی بات کے کئی معنی نہیں ہیں تو اس سے کسی عالم میں بھی کوئی جوش یا تحریک پیدا نہیں ہوگی۔ اس طرح قرآن جنت و جہنم کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کرتا ہے وہ عام آدمی اور عالم دونوں کے ہی لیے جوش پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اسی لیے ہم جنت و جہنم کو

وضاحتی اور علامتی دونوں شکل میں دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک اور پہلو بھی ہے جس سے سبھی کو باخبر رہنا چاہئے اور صوفی حضرات اس پر کافی زور دیتے ہیں۔ صوفیوں کا خیال ہے کہ لالچ یا خوف یعنی جزا و سزا کے لیے کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔اس کے لیے رابعہ بصری سے موسوم واقعہ صحیح نشاندہی کرتا ہے۔ایک بار لوگوں نے دیکھا کہ رابعہ بصری عالم جذب میں بصرہ کی گلیوں میں دوڑی چلی جارہی ہیں اور انکے ایک ہاتھ میں پانی سے بھری بالٹی اور دوسرے ہاتھ میں دہکتی مشعل ہے۔جب لوگوں نے روک کر دریافت کیا کہ یہ آپ کیا کرنے جارہی ہیں تو رابعہ بصری نے جواب دیا کہ اس آگ سے جنت کو جلاؤں گی اور اس پانی سے جہنم کی آگ ٹھنڈی کروں گی تاکہ لوگ اس معبود حقیقی کی عبادت جنت کی لالچ یا جہنم کی آگ کے خوف سے نہ کریں بلکہ بندوں کی عبادت کا مقصد محض اللہ کی محبت بن جائے۔ قرآن پاک علامتی اور سیدھے سادھے انداز کی وضاحتی زبان کے حوالے سے بڑا متوازن ہے۔ اس کو ایک عام آدمی بھی پڑھ کر اتنا ہی سمجھ سکتا ہے جتنا کہ ایک عالم دین اسے پڑھ کو سمجھ سکتا ہے۔ عقلیت پسند بھی قرآن کو اتنا ہی مفید سمجھتے ہیں جتنا گہری عقیدت رکھنے والے محسوس کرتے ہیں لیکن اس کو سمجھنے کے تعلق سے ان دونوں میں کافی اختلاف ہے۔آیات کے مخفی معنی میں یقین رکھنے والے صوفی حضرات قرآن کو ظاھریوں سے مختلف انداز میں سمجھتے ہیں۔جہاں تک ظاھریوں کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک جنت و جہنم کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ وہ ایسا مقام ہے جہاں ابدی باغات ہوں گے جن میں دودھ و

شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جہنم میں ایک آگ دہک رہی ہوگی جس میں جلنے والے کو زبردست عذاب ہو رہا ہوگا۔ اور کوئی اسے اس آگ سے نجات نہیں دلا سکے گا۔ دونوں ہی ابدی ہیں۔جنت کے بارے میں وضاحت بڑی دلکش اور ترغیب دینے والی ہے جبکہ جہنم کا نقشہ خوف سے لرزہ طاری کر دیتا ہے۔تاہم جو عالم ہیں وہ اسے بہت زیادہ علامتی مانتے ہیں اور اس کی معنویت کی گہرائی تک پہنچنے میں لگ جاتے ہیں۔

قرآن جنت کو امن و سکون اور سلامتی کا مقام کہتا ہے اور قرآن میں مذکور ہے: جو متقی ہیں وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا ان میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ۔اور ان کے دلوں میں جو کدورت ہوگی ان کو ہم نکال کر صاف کر دیں گے گویا بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے ساتھ بالمشافہ بیٹھے ہوں گے۔نہ ان کو وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔(سورۃ 15 آیت 45 تا 48) ۔پہلی بات تو یہ کہ جنت ایک ایسا مقام ہے جہاں ایک مومن مکمل امن و سلامتی محسوس کرے گا۔ جہاں شک، بے آرامی و بے چینی اور خوف کا رتی برابر احساس نہ ہوگا۔ ایک یقین کامل رکھنے والا مومن یا مومنہ ہی ایسا محسوس کرے گا۔ لیکن منکرین اور وہمی و شکی لوگ جن کے اعتقاد مضبوط نہیں ہیں وہ دلی طور سے خود کو محفوظ و مامون اور پر سکون محسوس نہیں کر سکتے۔صوفی حضرات انسان کامل یعنی مکمل انسان کے قائل ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش انسان کامل بنانے کی ہوتی ہے اور ایسے لوگ خود مکمل طور پر پر سکون ہوتے ہیں۔ مکمل ہونے یا تکمیل کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں اور ہر

شخص کمال کے اونچے سے اونچے درجہ پر پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جنت آرام اور سیر تفریح کا مقام ہے۔ اس سے قطع نظر یہ ایک وہ مقام ہے جو تکمیل کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے کی جہد مسلسل ہے۔ اس طرح قرآن کہتا ہے: لیکن جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں اور ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا وعدے کے خلاف نہیں کرتا (سورۃ 39 آیت 20)۔ اس طرح جنت ایک ابدی آرام گاہ یا مقام سیر و تفریح نہیں بلکہ کمال کے مزید مرحلے طے کرنے کی روحانی کوششوں اور اعمال صالحہ کے لیے ہے۔ اس لیے یہ ان معنوں میں مستقل اور پائیدار ہے کہ اس میں عمل پیہم اور متواتر کوششیں ہیں۔ اور جب کوئی شخص تکمیل کا ایک مرحلہ طے کر لیتا ہے تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا اور پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور ایسی کوششوں میں اسے بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔ جتنی زیادہ کوششیں کرے گا اتنا ہی سکون اور راحت محسوس کرے گا۔ اسی طرح علما کے نزدیک جہنم بھی ایک ایسا مقام ہے جس میں نہ صرف کمزور ایمان والے اور نامکمل لوگ بلکہ ہمیشہ شک میں مبتلا رہنے والے اور ریاکار لوگ جائیں گے۔ اور وہ وہاں انتہائی کرب کے عالم میں رہیں گے۔ یہ شک اور ریاکاری و منافقت کی آگ ہی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جس طرح جنت میں درجات بلند ہوں گے اسی طرح جہنم میں دوزخی پستی در پستی گرتا جائے گا۔ اور جتنی زیادہ پستی میں گرے گا اتنا ہی زیادہ اذیت ناک عذاب میں مبتلا رہے گا۔ لیکن قرآن توبتہ

النصوح کی راہ دکھاتا ہے جو اسے اس اذیت سے بچالیتی ہے۔ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ تکمیل کے اعلیٰ وارفع مقام کی جانب بڑھنا چاہتا ہے یا پستیوں کے عمیق گڑھے میں گرنا چاہتا ہے۔

! دعا

دعا ہمارے اوراللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی وضاحت کرتی ہے۔ ہم مانگتے ہیں اور وہ دیتاہے. ہم میں سے بہت سے لوگ اس شک کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں کہ ان کی دعائیں خدا کی طرف سے قبول کی جارہا ہیں یا نہیں ، نعوذ باللہ (ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)ایسا اس لئے ہے کیونکہ بسااوقات ہمیں وہ چیزیں نہیں ملتی ، جن کیلئے ہم دعا گوہوتے ہیں. اللہ "سب جاننے والا" ہے اس لئے یہ بھی جانتاہے کہ ہمارے لیے کیا اچھاہے اور کیا.برا۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں مناسب وقت اور مناسب صورت میں وہ چیزیں عطا کی جاتی ہیں جو ہمارے لئے بہتر ہوں۔ للہذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم نماز پڑھتے رہیں اور رب العزت سے اس کی مہربانیوں کی درخواست کرتے رہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ ” کسی بھی مومن کی دعا بیکار نہیں جاتی ۔ اسے اس کا اجر یا تو اسی دنیا میں مل جاتا ہے یا آخرت میں بشرط یہ کہ وہ صابر ہو۔“حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا مندرجہ بالا بیان ہمارے لئے ایک چشم کشا حقیقت ہونا چاہئے اور اسے فائدہ مند سمجھ کر ہمیں اس یقین کے ساتھ خود کو دعاؤں میں مشغول رکھنا چاہیے کہ اگر اس دنیا میں نہیں تو آخرت کی زندگی میں اس کا اجر ضرور ملے گا (سبحان اللہ) جو اس

زندگی سے زیادہ اہم اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دعا ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے. یہ ایک ایسا بندھن ہے جو خدا کی ذات سے ہمارے ایمان کو مضبوطی کے ساتھ باندھے رکھتا ہے. ہم خدا کو سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے اور عبادت کرتے ہر وقت یاد کرتے ہیں کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ کہ صرف وہی ایک ایسی ذات ہے جو شر سے اور شرپسندوں سے ہماری حفاظت کر سکتا ہے۔ ہمارے مبلغین کو چاہیے کہ ہمیں دعا، کی اہمیت اور اس کے تکمیل کے متعلق کچھ بتائیں۔ مبلغین کو چاہئے کہ وہ ہماری حوصلہ افزائی کریں اور ہمیں یقین دلائیں کہ کوئی دعا بیکار نہیں جاتی اس لے ہمیں زیادہ سے زیادہ دعا مانگنی چاہے۔. کیوں کہ یہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور قبول کر لی جاتی ہے۔ مبلغین کی طرف سے بار بار دعا کے لیے قائل کرنے کی کوشش امت کے لئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہوگی۔ مسلمانوں کو درپیش تمام مصائب کا خاتمہ کرنے کے لئے، دعا کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کرنے کہ علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے. دعا امت میں ایک اچھی عادت یہ پیدا کر دے گی کہ ہر مسلمان پاکیزگی کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوگا. تقویٰ ایمان کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اللہ کے بندے دنیاوی مفادات کے لیے خدا سے تعلقات زیادہ استوار کرتے ہیں . یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اسے قبول نہ کرے۔ دنیاوی آرام و آسائش کا مطالبہ کرنا بھی اچھی بات ہے یہ منع نہیں ہے۔اور یہ بھی اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول ہے۔ لیکن ہمیں ہمارے

چھوٹے۔بڑے، جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر کیے گئے گناہوں کی بخشش طلب کرنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہمارے گناہ معاف کر دیے گئے تو ہمارے روز مرہ کے مسائل یا تو حل ہو جائیں گے۔یا بالکل واقع ہی نہیں ہونگے ، انشاء اللہ.

لہٰذا اگر دعا کی اہمیت پوچھی جائے ۔تو اللہ اپنے بندوں پر سب سے زیادہ مہربان اور نظر عنایت کرنے والا ہے اور ہمیشہ اپنے بندوں کو معاف کرنے کے لئے تیار ہے۔اس لیے کہ اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اللہ تمام مخلوقات سے زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں یا کسی بھی حالت میں ہوں اسکی رحمت اور محبت ہمارے ساتھ ہوتی ہے، ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہماری فریادوں کی سنوائی ابھی نہیں تو بعد میں ورنہ آخرت میں تو ضرور ہو گی۔ اللہ ایک صورت حال پیدا فرماتا ہے اور شدید غیر متوقع صورت میں مدد بھیجتا ہے۔ یہ ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ کس طرح ہمیشہ اس کی رحمت اسکی رحمت و شفقت نے ہمیں بے چینیوں سے نجات دلائی ہے۔ یہ طرز عمل ہمیں اسکا شکر گذار بنا دیگا۔ اسکے بدلے ہمیں مشروع طریقہ سے شکر گذاری اور احسان مندی کا اظہار کرنا چاہئے۔ ہم سب یہ بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ ہمیں پکارتا ہے کہ (ہے کوئی مجھے پکارنے والا کہ میں اس کی درخواست قبول کروں) ہماری خواہشیں پوری کرنے کیلئے۔ خدا سب جانتا ہے کوئی بھی چیز اس

سے چھپی نہیں ہے۔وہ آپ کی جائز ضروریات کو جانتا ہے۔ وہ آپ کی خاموشی کی آواز کو سنتا ہے اور آپ کے آنسوؤں کی زبان کو سمجھتا ہے۔اس سے مانگتے رہیں انشاء اللہ ہماری خواہشیں اور دعائیں ضرور پوری ہونگی۔اسلام میں 'مایوسی' کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اسلئے کہ ناامیدی کفر ہے۔اور جو نعمتیں تم کو میسر ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں۔ پھر جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (16:53)اسی کے آگے چلاتے ہو ہم انسانوں کواللہ ہر طرح کا سکون ، مہربانی ، مدد اور رحمت عطا فرماتا ہے۔ ہم دنیاوی آرام حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش کرتے ہیں۔لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے یہ تمام مہربانیاں اس دعا کی وجہ سے ہیں۔ جو ہم کرتے ہیں اور خدا اسے قبول کرتا ہے۔اور اگر کسی بھی قسم کی تکلیف، شر، یا بدقسمتی ہمیں پہنچتی ہے توخدا سے مدد حاصل طلب کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ وہ خود ہمیں اس کی مدد چاہنے کی ترغیب دیتا ہے .ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے یقیناً ہمیں اس کے سامنے جھکنا چاہئے اور مدد طلب کرنی چاہئے۔اس لئے کہ دعا ہر قسم کی مصیبت کے لئے امرت ہے۔دعا کومزید مؤثر بنانے کے لئے، ہمیں کبھی دعا نہیں چھوڑنی چاہئے۔اوراللہ کی ذات سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہئے اسلئے کہ اللہ کی رحمتیں اور عنایتیں لامحدود ہیں۔ " رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''ضرورت کے دوران اللہ سے مدد طلب کرو۔اور ہر طرح کی تکلیف اور دکھ میں اس کی پناہ چاہو۔'''' عاجزی کا اظہار کرو اور اسے پکارو،یہی دعا کا منشاء اور لب لباب ہے۔جب بھی کوئی مومن

دعا کرتا ہے تو مندرجہ بالا صورتوں میں اسکی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔یا تو اسکی دعا اسی
دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے۔یا پھر اسکا اجر اسے آخرت میں ملے گا۔یا پھر اسکے گناہوں
"کو اس طرح چھپا دیا جاتا ہے جیسا کہ اس نے ایک بھی گناہ کیا ہی نہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرھندیؒ

خالق کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا یعنی تمام مخلوقات میں انسان کو اولیت دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو اس طرح بہترین اور پسندیدہ مذہب قرار دیا۔ دین اسلام کے پیروکار مسلمان کہلائے اور اس کے بعد ان مسلمانوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے درجہ بندی فرمادی۔ یہ درجہ بندی تقویٰ اور پرہیزگاری ایثار قربانی مخلوق خدا سے شفقت اپنے نفس پر کنٹرول اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بلا چون وچرا بجالانے کی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنے ان نیک اور صالح بندوں کو بلند مقام عطا فرماتا ہے۔ جو اس مالک حقیقی کی رضا کے لئے اپنا تن من دھن سب قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ ہر عمل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا و خوشنودی کو مقدم رکھتے ہیں۔ دنیا کی محبت، حرص وجاہ، ذخیرہ اندوزی، ظلم وزیادتی، بدسلوکی، تکبر، سرکشی اور بخل وبزدلی جیسی بیماریوں سے ان کا دامن پاک وصاف ہوتا ہے۔ صبر، شکر اور انصاف پروری جیسے اوصاف حسنہ سے ان کی ذات مزین وآراستہ ہوتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی ان تمام اوصاف حسنہ سے مزین وآراستہ تھے۔ آپ وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں جنہوں نے برصغیر میں اسلام کے

احیاء،فروغ اور سر بلندی کے لئے وہ کارنامے سرانجام دیئے جن کو رہتی دنیاتک یاد رکھا جائے گا۔حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی کی ولادت.بروز جمعہ 14 شوال 1971ھ بمطابق 26جون 1556ء سرزمین پنجاب قصبہ سرہند میں ہوئی۔آپ کااسم گرامی احمد رکھاگیا۔آپ کالقب بدرالدین کنیت ابوالبرکات تھی۔آپ کا شجرہ نسب 29 سلسلوں سے امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطابؓ سے ملتاہے۔آپ کے والد محترم شیخ عبدالاحد اپنے وقت کے ایک بہت.بڑے عالم باعمل تھے۔جن کے مرشد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔حضرت شیخ عبدالاحد کا وصال 27 جمادی الآخر 1007ء کو 80.برس کی عمر میں سرہند میں ہوااور وہیں مدفون ہیں۔حضرت مجدد الف ثانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد.بزرگوار حضرت شیخ عبدالاحد سے حاصل کی۔آپ نے قرآن پاک تھوڑے ہی عرصہ میں حفظ کر لیا۔اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔وہاں مولانا کمال الدین کشمیری اور شیخ محمد یعقوب کاشمیری جیسے.بزرگوں سے پڑھ کر سند حاصل کی۔آپ نے بالغ ہونے سے قبل تمام ظاہری علوم سے فراغت حاصل کر لی۔وہاں علماء دین سے ملاقات کی،اورآپ آگرہ چلے گئے ان دنوں وہاں علماء کی بہت شہرت تھی۔وہاں علمائے دین سے ملاقات کی وہ آپ کی قابلیت اور ذہانت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔یہی وجہ ہے بہت سارے علماءآپ کی مجلس درس میں حاضر ہوئے۔والد محترم کی وفات کے بعد حج بیت اللہ اورزیارت روضۂ رسول کے ارادے سے گھر سے روانہ ہوئے۔دہلی پہنچ کرایک دوست شیخ حسن کشمیری سے حضرت

خواجہ باقی باللہ کے کمالات باطنی کا ذکر سن کر شوق زیارت پیدا ہوا۔ جب ملاقات کو پہنچے تو حضرت باقی باللہؒ نے فرمایا کہ آپ ایک مبارک سفر پر جا رہے ہیں لیکن اگر چند روز فقیر کی صحبت میں رہیں تو کیا اچھا ہوگا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒحضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خواہش کے احترام میں جو خلوص و محبت پر مبنی تھی رک گئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے آپ کو طریقہ خواجگان کی تعلیم شروع کی اور تھوڑے عرصہ میں آپ کو علوم باطنی سے مالا مال کر دیا اور حضرت مجددؒ نے مقام تکمیل حاصل کر لیا۔ آپ کو سلسلہ نقشبندیہ کی اجازت عطا فرمائی اور خرقہ شریف سے مشرف فرمایا۔ حضرت باقی باللہؒ آپ کا بہت احترام کرتے اور فرماتے کہ میں حضرت شیخ احمدؒ کو نسبت نقشبندی کی امانت دے کر بری الذمہ ہو گیا ہوں اور فرمایا شیخ احمد ایک آفتاب ہیں اور ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہو جائیں گے۔ بچپن کے زمانے میں آپ کے والد بزرگوار شیخ عبدالاحد اس زمانے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ کمال کھیتلی کی خدمت میں لے گئے۔ آپ نے جب نظر عنایت بچے پر فرمائی تو آپ نے فرمایا۔ اے عبدالاحد یہ بچہ آپ کے گھر میں بہت نیک عالم با عمل پیدا ہوا۔ اس کے فیض سے ہندوستان میں تمام گمراہیوں اور تاریکیوں کا خاتمہ ہوگا۔ کچھ دیر بعد شاہ صاحب نے اپنی شہادت کی انگلی بچے کے منہ میں دے دی۔ بچہ انگلی چوسنے لگا۔ کچھ دیر بعد شاہ صاحب نے منہ سے انگلی نکال کر فرمایا۔ اس بچے نے قادریہ سلسلہ کی تمام نعمتیں ہم سے لیں۔ حضرت شاہ کمال کھیتلیکئی دفعہ سرہند

شریف تشریف لائے۔ جب آپ سرہند آتے آپ بہت ہی شفقت سے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ملتے اور کہتے عنقریب یہ بچہ بہت بلند مرتبہ پر ہوگا۔ حضرت شاہ کمال کھیتلیؒ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا خرقہ مبارک جو ان کے پاس امانت تھا اپنے پوتے شاہ سکندر کو دے کر فرمایا یہ خرقہ مبارک حضرت مجدد الف ثانیؒ کو دے دینا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دور حیات میں ہندوستان پر اکبر بادشاہ کا راج تھا۔ بادشاہ اکبر کو اپنی عقل اور فہم پر بڑا ناز تھا۔ یہاں اپنی من مانیوں کی وجہ سے لوگوں کو گمراہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ شریعت اسلام کو بالکل اہمیت نہیں دیتا تھا۔ دربار میں خوشامدی مصاحبوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگ اس کو سجدہ کرنے لگے تھے۔ بادشاہ اکبر اپنے آپ کو ظل الہی کہلواتا تھا اور دین الہی کے نام سے اپنا ایک الگ دین قائم کیا تھا۔ اکبر بادشاہ کے دین الہی کو مٹانے کے لئے اللہ تعالی نے اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کی شریعت محمد ﷺ کو بچانے کے لئے ہندوستان کی سرزمین قصبہ سرہند میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ظہور فرمایا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ خلعت مجددیت 1009 میں اللہ تعالی کی طرف سے عطا ہوئی مجدد کے معنی ہیں۔ شروع کرنے والا۔ الف یعنی ہزار ثانی یعنی حبیب خدا احمد مصطفٰے ﷺ کے ایک ہزار سال بعد یعنی دوسرے ہزار کے شروع میں حضرت مجدد الف ثانی سرہند کا ظہور ہوا اس لئے آپ کو مجدد الف ثانی کالقب حاصل ہوا۔ حدیث مبارک ہے فرمایا حضور پاک ﷺ نے اللہ تعالی اپنی امت کی اصلاح کیلئے ہر صدی کے سرے پر ایک مجدد ایسے بندے کو بھیجتا رہے گا

جو اس دین کو از سر نو تازگی بخشے گا الف ثانی اس نازک اور تاریک دور میں شریعت محمدی ﷺ کے چمن میں بہار لائے۔ آپ نے کافی تکلیفوں کا سامنا کرنے کے باوجود اپنے فرض کو بخوشی انجام دیا۔ اس لئے آپ کو ساری دنیا مجدد الف ثانیؒ کے نام سے پکارتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات 63 سال کی عمر میں 28 صفر 1034 ہجری سرہند شریف میں ہوئی ہر سال آپ کا عرس مبارک 28 صفر سے شروع ہوتا ہے۔ عرس مبارک میں شرکت کے لئے زائرین اپنے ملک کے علاوہ بیرونی ملک سے آتے ہیں۔

اللہ سے محبت فرضِ منصبی

جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے، اُنھیں اللہ کا منکر کہا جاتا ہے۔ اگر چہ دُنیا میں کھلے طور پر علی الاعلان اللہ اور آخرت کا انکار کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی کثیر آبادی زندگی کو اس انداز سے گذار رہی ہے کہ اُس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی زندگی میں اللہ اور آخرت کی حیثیت ایک رسمی عقیدہ سے بڑھ کر نہیں۔ درحقیقت اللہ اور آخرت کا عقیدہ انسان کو حد درجہ سنجیدہ، محتاط، حسّاس اور باشعور بناتا ہے۔ یہ عقیدہ اگر رسمی نہ ہو، بلکہ ایک زندہ عقیدہ ہو تو وہ انسان کے شعور اور احساس کو بیدار کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ یہ عقیدہ ہر قسم کے زیادتی و ظلم وفساد وگناہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اور امن و سلامتی و عصمت و عفّت وحق وانصاف کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو نیکیوں کے لئے اکسانے والا اور بُرائیوں وگناہوں سے بچانے کا محرک فراہم کرتا ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے انسان کی زندگی سے ظاہری بُرائیوں مثلاً چوری، ڈکیتی، قتل، زنا، شراب نوشی وغیرہ اور باطنی بُرائیوں مثلاً حسد، جلن، بغض، کینہ وغیرہ کا خاتمہ ہوجانا کوئی عجیب بات نہیں۔ ایسا عقیدہ رکھنے والا انسان دن تو کُجا رات کے اندھیرے میں بھی گناہ کرنے کو

ہتھیلی پر آگ رکھنے جیسا سمجھتا ہے کیونکہ ایک طرف اس کا عقیدہ یہ کہتا ہے کہ حاظر ناظر اللہ اُسے دیکھ رہا ہے تو دوسری طرف آخرت میں جواب دہی کا احساس اُسے گناہ سے باز رکھتا ہے۔اس کے برخلاف اللہ اور آخرت کے عقیدہ سے خالی انسان جانور کی سطح پر زندگی گذارتا ہے کہ جس طرح جانور کو روٹی دکھائی جائے تو وہ قریب آتا ہے اور ڈنڈا دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ ایسے انسان کا ہوتا ہے کہ ظاہری فائدہ چاہے جس طرح سے حاصل ہو، وہ اُس کو حاصل کرنے میں حلال وحرام اور اچھے بُرے کی تمیز کھو دیتا ہے اور قانون کے ڈنڈے کو دیکھتے ہی بھاگ اٹھتا ہے۔ باالفاظ دیگر ایسا انسان ظاہر پرستی میں جیتا ہے۔ اس قسم کے انسانوں سے تشکیل کردہ معاشرہ ایک قسم کے فکری و عملی تضاد کا شکار ہوجاتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اچھے قانون قاعدوں وضابطوں کی دھوم دھام ہوتی ہے اور دوسری طرف اُس سے بچ نکلنے کا راستہ بھی تلاش کرلیا جاتا ہے ، کبھی طاقت وقوت کے زور پر، کبھی خوبصورت اور بناوٹی الفاظ کے ہیر پھیر سے ،اور کبھی دولت کی افراط سے۔للہذا یہ کہنا درست ہوگا کہ خدا پرستی اور آخرت میں جوابدہی کا احساس ہی واحد راستہ ہے جس کی بنیاد پر انسانیت اور قانون کے احترام کا جذبہ انسانوں کے اندر پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہوسکے۔ دنیائے انسانیت کو ایک اللہ کی ضرورت کل بھی تھی، آج ہے اور کل بھی رہے گی۔ مسلمانانِ عالم خواہ حاکم ہوں یا محکوم ، اللہ کی ضرورت کا احساس دنیا کے دیگر خدا

فراموش انسانوں کو پاک وصاف وصالح معاشرہ کے عملی نمونہ سے باآسانی کروا سکتے ہیں۔ اسی میں ان کی دوجہاں کی کامیابی ہے، یہی ان کا مقصد حیات ہے، یہی اُن کا وظیفہ حیات ہے، یہی ان کا فرضِ منصبی ہے۔

جہاد یا قتل عام

مغرب سمیت دنیا کے بعض دوسرے حصوں میں اسلام فوبیا کی صورت حال گزشتہ چند سالوں کے درمیان کافی شدت اختیار کرچکی ہے۔اسلام اور مسلمانوں سے نفرت و عداوت کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں۔یہ بلاشبہ افسوس ناک واقعہ ہے اورا سلام اور مسلمانوں کے حق میں اس کے نقصانات واضح طور پر نظر آرہے ہیں۔تاہم ہمارے لیے غور خوض کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن سے اسلام سے خوف کھانے اور مسلمانوں کو عفریت کی حیثیت سے دیکھنے والی نفسیات کو تقویت حاصل ہورہی ہے؟کیا ان اسباب میں بعض وہ اسباب بھی شامل ہیں جو خود مسلمانوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں؟اگر غیر جانب داری اور خود احتسابی کے جذبے کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی مذہبی سیاسی فکر وعمل کی بعض کمزوریاں بھی اس کا ایک بڑا سبب بن رہی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ مسلم سیاسی فکر کا وہ حصہ جو اجتہاد وقیاس پر مبنی ہے موجودہ دور میں اس کی معنویت باقی نہیں رہی اس پر از سر نو غور وفکر کی ضرورت ہے۔لیکن ایک بڑے طبقے کی طرف سے اس کی حقانیت پر بے جا اصرار سے مسائل پیدا ہورہے ہیں۔حالاں کہ اصولی طور پر اجتہادی مسائل میں ہمیشہ غور وفکر کی ضرورت رہتی ہے۔ان نظریات میں سے ایک جہاد کا روایتی نظریہ ہے جس کے تحت

مسلم اہل فکر و عمل کے ایک طبقے نے ہر قسم کی تشدد پسندی کو موجودہ دور میں جواز فراہم کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اسلام اور اسلامی شریعت کو موجودہ دور کے سر پر لٹکتی ہوئی خطرے کی تلوار تصور کیا جانے لگا ہے۔

ہمارے لیے اس صورت حال پر غور کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک داعی قوم کی حیثیت سے دنیا میں دعوت کے امکانات کی بقا اور توسیع ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ یہ نہایت حوصلہ افزا امر ہے کہ پچھلی چند دہائیوں میں اسلام یورپ اور امریکا میں اپنی مضبوط جگہ بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ متعدد اعداد و شمار کے مطابق اس وقت اسلام ہی وہاں کا سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ امریکا میں سات ملین اور یورپ میں بیس ملین مسلمان آباد ہیں جن میں سے ایک بڑی تعداد وہاں کی شہریت اختیار کر چکی ہے۔ ایسے میں اگر اسلام فوبیا کی صورت حال اسی طرح سنگین سے سنگین تر شکل اختیار کرتی رہی تو بلاشبہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اس کے زبردست نقصانات مرتب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے وہاں کے مسلمانوں کا حکمت پسند اور دوررس فکر رکھنے والا طبقہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کے مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ چنانچہ فرانس میں مسلمانوں کی سنجیدہ کوششوں سے حکومتی سطح پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ ملک میں اسلام فوبیا کی صورت حال واقعتاً تشویش ناک ہے جس سے نمٹنا ضروری ہے۔ اسی طرح لاہائی، ہالینڈ کے

ایک میوزیم میں ماضی کی بعض اہم مسلم شخصیات کو محض مفروضاتی سطح پر ہم جنس کی حیثیت سے پینٹ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی متعلقہ اتھارٹی کے ساتھ سنجیدہ گفت وشنید کے نتیجے میں ایسی پینٹنگز کو ہٹا لیا گیا۔ اسی طرح ڈنمارک میں پیغمبر اسلام کے اہانت آمیز خاکے کی ایک نئے سلسلے کو اشاعت سے روک دیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب میں ایسے سنجیدہ اور مستقیم الفطرت لوگوں کی کمی نہیں ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات کے قیام میں مضبوطی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں مغرب کی حکومتوں اور وہاں کے عوام میں فرق کرنا چاہیے۔ حکومتوں نے اپنے سیاسی مقاصد اور مفاد کے تحت عوام کو گمراہ کرنے اور گم راہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے عوام کو حکومت کے ساتھ بریکٹ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام فوبیا کے تناظر میں مسلمانوں میں پائے جانے والے جہاد کے تصور کو سامنے رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلی چیز خود یہی جہاد کا تصور ہے۔ جہاد ایک جامع لفظ ہے۔ اسکی تین قسمیں ہیں: ظاہری دشمن کے ساتھ جہاد، شیطان کے ساتھ جہاد اور نفس کے ساتھ جہاد۔ نفس کے ساتھ جہاد کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے کہ: ''اللہ تعالی کے معاملے میں بھرپور جہاد کرو (جاہدوا فی اللہ حق جہادہ۔ الحج: 178) لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ موجودہ زمانے میں جہاد کا تصور قتال کے ساتھ منسلک ہو کر رہ گیا ہے۔ حالاں کہ قتال جہاد کی ایک استثنائی صورت ہے جو دشمن کے ساتھ دفاع کے آخری مرحلے میں جب کہ کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو، اختیار کی جاتی

ہے۔جہاد کے تعلق سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایک دفاعی عمل ہے، نہ کہ اقدامی یعنی محض کفر کے استیصال یا اس کی شوکت کو توڑنے کے لیے جہاد کا کوئی جواز عقلاًاور شرعاً معلوم نہیں ہوتا۔قرآن میں کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو (البقرہ:190) لیکن جہاد الطلب یا اقدامی جہاد کا جو تصور اسلام کے دور عروج میں بعض سیاسی مصلحتوں اور عہد وسطی کے اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق اسلامی دنیا میں پروان چڑھا، وہ اسلام کی سیاسی فقہ کا اٹوٹ جزو بن کر رہ گیا اور اس پر سرے سے نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ظاہر ہے اگر اقدامی جہاد کے روایتی فقہ کے اس تصور کو قبول کرلیا جائے کہ دشمن کی بغیر پیشگی جارحیت کے اسلامی حکومت کی توسیع، کفر کی طاقت کے خاتمے اور اس کی حکومت کو اپنے زیر نگیں کرنے کے لیے کسی بھی غیر مسلم حکومت کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے تو پھر مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان خوش گوار تعلقات کا تصور بھی کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ اس طرح تو ان غیر مسلم حکومتوں پر بھی اقبال کا وہی مصرعہ، جو انھوں نے مسلمانوں کے تعلق سے کہا تھا، صادق آئے گا کہ: ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔اسی طرح اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کی شہریت کا مسئلہ اور اسی طرح بہت سے وہ مسائل ہیں جنہوں نے موجودہ دنیا کو ان اسلامی تحریکات سے، جو سیاست کو اپنے ایجنڈے میں سب سے اوپر رکھتی ہیں، خوف زدہ کردیا ہے۔ پچھلی دو تین دہائیوں کے دوران مختلف اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں میں جو احیائیت پسند تحریکیں ابھر

کر سامنے آئیں وہ اسلامی دانش و بصیرت سے خالی تھیں۔ ان کی نفسیات دراصل مغرب کی استعماری اور امپریل طاقتوں کے مسلم ممالک پر جارحانہ حملوں اور قبضوں کے رد عمل کی اساس پر تیار ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے اسلامی آکٹوزم میں جہاد و قتال کے ذریعے دشمن سے انتقام کو اولیت دی۔ اس وقت مغرب کے قلب میں حزب التحریر اور اس کے سیاسی عقیدے کی حامل ایسی جماعتیں اور تنظیمیں موجود ہیں جو خود وہاں بھی اسلامی حکومت و خلافت کے قیام اور شرعی قوانین کے نفاذ کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ ایسے میں اسلام فوبیا کے مظہر کا پیدا ہونا اور اس کی صورت حال میں شدت کا آنا کوئی بہت زیادہ حیرت کی بات نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب میں اسلام فوبیا کے مظہر پر قابو پانے کے لیے خود مسلم مذہبی سیاسی فکر پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ جہاد کے نام پر پاکستان سمیت بعض دوسرے ملکوں میں جو فساد برپا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی علما و اہل فکر کی طرف سے واضح مذمت اور اسی کے ساتھ ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کے اقدامات کے بغیر یہ توقع کرنا مشکل ہے کہ اسلام فوبیا کی صورت حال پر قابو پایا جا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فوبیا کی نفسیات کے تحت مسلمانوں کے خلاف ساری دنیا میں برپا دار و گیر کا ماحول اور جہاد کے عنوان سے مختلف ممالک میں ہونے والی سرگرمیاں، جن میں اسلامی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے، یہ دونوں مظاہر ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم بن کر رہ گئے ہیں۔ عالمی سطح پر امن کے قیام اور

بین تہذیبی تعلقات کو مستحکم بنیادوں پر فروغ دینے کے لیے دونوں حلقوں کی طرف سے اپنے فکری و عملی رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر''

اللہ تعالٰی نے ہر انسان کے اندر ایک نگراں رکھا ہے، جسے ضمیر کہا جاتا ہے۔ ضمیر جب تک جاگتا رہتا ہے، سب کچھ ٹھیک رہتا ہے، مگر اس کے مردہ ہوتے ہی اعضائے جسم اچھے برے کی تمیز کھودیتے ہیں اور انسان نفس کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ ضمیر کے بیدار رہنے یا مردہ ہونے کا کوئی موسم نہیں ہوتا، بلکہ معاشرے میں جب بھی برائی ،بدعنوانی یا ناجائز کاموں کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے یا برے انسان کی جھوٹی شان و شوکت کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے، اس وقت انسان کا ضمیر شیطانی روپ اختیار کرلیتا ہے اور وہ معاشرے میں منفی کردار انجام دینے لگتا ہے۔ آغاز میں وہ اس فعل بد اور منفی کردار کو چیلنج کے طور پر لیتا ہے۔ مثلاً وہ سوچتا ہے کہ جب دوسرے لوگ ایسا کرکے معاشرے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں تو پھر وہ کیوں نہ ایسا کرے۔ چنانچہ وہ اپنی محنت اور کوشش کو تیز کردیتا ہے، جب تک اسے اس فعل کے برے انجام کا احساس ہوتا ہے، تب تک وہ اس دلدل میں دھنس چکا ہوتا ہے، جس سے نکلنے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور غربت کا خوف اسے اس دلدل میں مردہ زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ جھوٹ،
رشوت، چوری، قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کردیتا ہے، جس سے معاشرہ بے چینی اور بدامنی کا شکار ہوجاتا ہے۔ مثلاً رشوت خوری ایک بہت برا فعل ہے۔ حق دار سے حق چھین

کر غیر مستحق کو حقدار بنانے کے لیے یہ فعل بد انجام دیا جاتا ہے۔ ضمیر کے بیدار رہنے یا مردہ ہونے کا کوئی موسم نہیں ہوتا، بلکہ معاشرے میں جب بھی برائی، بد عنوانی یا ناجائز کاموں کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے یا برے انسان کی جھوٹی شان و شوکت کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے، اس وقت انسان کا ضمیر شیطانی روپ اختیار کرلیتا ہے اور وہ معاشرے میں منفی کردار انجام دینے لگتا ہے۔ آغاز میں وہ اس فعل بد اور منفی کردار کو چیلنج کے طور پر لیتا ہے۔ مثلاً وہ سوچتا ہے کہ جب دوسرے لوگ ایسا کرکے معاشرے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں تو پھر وہ کیوں نہ ایسا کرے۔ اس فعل میں رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں ملوث ہوتے ہیں، کیوں کہ ایک شخص اگر وہ حقدار نہیں ہے تو کیوں دوسرے کا حق لینے کی کوشش کر رہا ہے، پھر یہ جانتے ہوئے کہ اس میں صاحب حق کی حق تلفی ہوگی، رشوت لینے والا اس غلط کام کی اور ناجائز طریقے سے اس کی مدد کر رہا ہے، اسی لیے دونوں گنہگار ہوں گے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی کی مدد کرتے وقت اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاکر اس کے عوض مال کا مطالبہ کرے یا لاچار شخص اس کو پیسہ دینے کے لیے مجبور ہو۔ قرآن کریم میں یہ صفت یہودیوں کی قرار دی گئی ہے: ”یہ لوگ جھوٹ کو سننے والے اور حرام کا مال کھانے والے ہیں۔“ رشوت کا طریقہ نہ صرف مشکلات پیدا کرتا ہے، بلکہ زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ مثلاً آج مکانات تیار کیے جاتے ہیں، تو ان میں اس قدر پیسہ نہیں لگتا، جس قدر اس کے بیچنے والے اپنا بھاؤ رکھتے ہیں۔ یا دیگر اشیاء

جوانسانوں کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہیں، مگرجب بلڈر یا تاجر سے اس سلسلے میں معلوم کیاجاتاہے، تووہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں ان چیزوں کی تیاری میں بہت زیادہ رشوت دینی پڑتی ہے ، اس کے بغیر ہم انھیں تیار نہیں کر سکتے۔ ایسے تاجراپنی مصنوعات کی قیمت کو مناسب رکھنے کے لیے رشوت میں تو کمی نہیں کرپاتے، کیوں کہ وہ ان کے بس میں نہیں ہوتا، مگروہ میٹریل میں کمی کردیتے ہیں ، جس سے وہ مکان یا سامان، انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتاہے۔ آئے دن اس طرح کے واقعات اخباروں میں پڑھنے کو ملتے ہیں، جب کہ رشوت کا یہ مال سفید پوش سرمایہ کاروں کی جیب میں جاتاہے۔اولاً توایسے واقعات کی چھان بین نہیں ہوتی، اگر عوام کے احتجاج کے نتیجے میں کچھ کارروائی ہوئی بھی ، توصرف وہ لوگ گرفت میں آتے ہیں جو رشوت دینے والے ہوتے ہیں، مگرپس پردہ رہنے والے سفیدپوش سرمایہ داروں کاکچھ نہیں بگڑتا۔اس طرح رشوت اوربدعنوانی کا عام رواج ہوجاتاہے۔پھر اندرونی طورپراس کاربدکی مدح سرائی یا اس کومزے لے لے کربیان کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتاہے، تب یہ رویہ ان کے ارد گرد رہنے والے عام لوگوں میں اس برائی کو پیداکرنے کا محرک بن جاتاہے جومعاشرے کے لیے ناسورثابت ہوتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص، جواپنے بچے کواس کی ذہانت کے سبب بڑاڈاکٹریا انجینئر بنانا چاہتاہے ،تاکہ معاشرے میں اس کی تحسین ہو اوروہ لڑکا آئندہ اس کے لیے بڑے بینک کا اے ٹی ایم ثابت ہو، جس میں ہروقت روپے بھرے ہوں۔ تو وہ اس کے لیے ڈونیشن کے طورپر لاکھوں، روپے خرچ

دیتا ہے۔ پھر جب یہ بچہ بڑا ہو کر اپنی تعلیم مکمل کرلیتا ہے تو اپنے باپ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے اپنے ضمیر کا سودا کرتا ہے اور رشوت کا کھیل شروع کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں ایسی ہی تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے، جو رشوت خوری کی بنیاد پر کھڑی ہو۔ایسے میں دوسرے لوگ اس میدان میں پیچھے کیوں رہیں، اس میں عزت بھی ہے اور پیسہ بھی۔ایسا ہی کچھ معاملہ ملک کے ان حکمرانوں کا بھی ہے جو انتخاب میں کامیابی کے بعد ملنے والے بے حساب پیسوں کے لیے لاکھوں، کروڑوں روپے انتخابی مراحل میں بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔یہی حال تمام معاملات میں ہے،شاید ہی کوئی جگہ ہو جو اس سے خالی ہو۔ معاشرہ افراد سے بنتا ہے، اس کی تعمیر و ترقی یا اس کے برعکس تخریب و تنزلی کا معاملہ بھی اس میں رہنے والے افراد کے کارناموں سے ہی وجود میں آتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ پرامن اور خوشحال رہے، تو ہمیں 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔ ورنہ معاشرے کے افراد بڑی تعداد میں جرائم میں ملوث ہوں گے اور اسباب تعیش کے حصول، مال و اسباب کے غرور میں چور ہو کر وہ دوسروں کو بھی اس مایا جال میں پھنسانے پر مجبور کریں گے۔ ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اسلامی احکام کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ ہمہ وقت یہ تصور ذہن میں بٹھانے کی ضرورت ہے کہ دنیا کی زندگی ایک عارضی زندگی ہے، اس کی چمک دمک محض ایک دھوکہ ہے اصل زندگی آخرت کی ہے۔ جب ہم اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں گے،

اور مضبوطی سے اس پر ثابت قدم رہیں گے، تو پھر ہمارا ضمیر ہمیشہ بیدار رہے گا اور ہم احساس کمتری کا شکار ہو کر عارضی دنیا کو ترجیح دینے کے بجائے آخرت کی دائمی زندگی، اس کی راحت اور وسکون کو فوقیت دیں گے۔

لبیک، اللہم لبیک، حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں

دیار حرم کی طرف حج کا قافلہ رواں دواں ہے، آپ بھی سفر حج کے لئے رخت سفر باندھ چکے ہیں، اللہ آپ کے حج کو شرف قبولیت سے نوازے، روانگی سے قبل ان باتوں پر غور کرلیں، کیا آپ اپنا حج کر رہے ہیں یا کسی دوسرے کی جانب سے حج بدل کرنے جارہے ہیں؟ اگر آپ اپنا حج کرنے جارہے ہیں تو کیا آپ حج افراد کرنا چاہتے ہیں، یا تمتع یا قران کرنا چاہتے ہیں؟ یہ سارے حج کے اقسام ہیں۔

حج کے اقسام:

حج افراد۔ حج قران۔ حج تمتع۔

(1)۔ حج افراد کا مطلب یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھا جائے، عمرہ کی نیت نہ ہو اور صرف حج کے اعمال مکمل کئے جائیں۔ اس حج کو حج افراد کہتے ہیں اور اس قسم کے حج کرنے والے کو مفرِد کہا جاتا ہے۔ (2) دوسری قسم حج قِران ہے، اس میں حج وعمرہ دونوں ادا کرنے کی نیت سے اکٹھے احرام باندھا جاتا ہے، حاجی مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کرتا ہے، عمرہ سے فراغت کے بعد احرام نہیں کھولتا ہے، بلکہ حالت احرام میں باقی رہتے ہوئے حج کے ایام آنے کے بعد حج کرتا ہے۔ اس قسم کے حج کرنے والے کو قارِن کہا جاتا ہے۔ (3) تیسری قسم حج

تمتع ہے۔اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حج کے مہینوں میں میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے اور مکہ مکرمہ آکر عمرہ کا عمل مکمل کرکے احرام کھول لیا جاتا ہے، پھر بغیر احرام کے مکہ میں قیام رہتا ہے اور حج کے ایام شروع ہونے پر از سر نو حج کا احرام باندھ کر حج کے اعمال کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے حج کرنے والے کو متمتع کہا جاتا ہے۔حج کی یہ تینوں قسمیں جائز ودرست ہیں۔

اگر آپ حج بدل کرنے جارہے ہیں تو جن کی طرف سے حج کرنے جارہے ہیں، ان سے یا ان کے ورثا سے حج تمتع کرنے کی اجازت حاصل کرلیں۔

: قابل لحاظ چند باتیں

حج کا ایک اہم عمل طواف ہے، طواف مسجد احرام کے اندر کیا جاتا ہے، اس لئے جن (1) عورتوں کو حج کے ایام میں ماہواری شروع ہوجانے کا خوف ہو، ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ حیض روکنے والی دوائیاں استعمال کریں اور اگر حج کے دوران خون آنا شروع ہوجائے تو وہ حج کے تمام اعمال دیگر حاجیوں کی طرح کرتی رہیں ،صرف طواف نہ کریں اور جب طواف زیارت کا وقت آجائے اور خون بند نہ ہو تو سفر کی تاریخ آگے بڑھانے کی کوشش کریں اور اگر کوشش کے باوجود تاریخ نہ بڑھ سکے تو اسی حالت حیض میں طواف کرلیں ،اور ایک بڑے جانور کی قربانی بطوردم

جنایت حدود حرم میں دیں، حج کا پروگرام معلوم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ آٹھویں ذی الحجہ کو مکہ آئے ہوئے پندرہ دن ہو جائیں گے تو آپ اپنے گھر والوں کو تاکید کر دیں کہ آپ کی طرف سے عید الاضحیٰ کی قربانی پچھلے سالوں کی طرح امسال بھی کریں، کیونکہ آپ منی میں جو قربانی کریں گے وہ حج کی قربانی ہوگی اور چونکہ آپ منی میں مقیم ہو چکے ہوں گے ،اس لئے آپ کو دو قربانی کرنی ہوگی :ایک حج کی اور دوسری بقر عید کی، لہٰذا یا تو آپ دونوں قربانی منی ہی میں کریں، یا بقر عید کی قربانی گھر پر کروائیں اور حج کی قربانی منی میں کریں۔ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اب عرفات، منی اور مزدلفہ ،مکہ کے ہی حصے ہو چکے ہیں۔اسلئے اگر حج کے ایام پورے ہونے تک پندرہ دن ہو جائیں تو اپ مقیم ہو جائیں گے، جبکہ دیگر حضرات کی رائے یہ ہے کہ تینوں مستقل الگ الگ شہر ہیں،اسلئے اگر آٹھویں ذی الحجہ کو پندرہ دن پورے ہو جائیں تب آپ مقیم ہوں گے،اس لئے بہتر یہ ہے کہ بہر دو صورت قربانی کریں ایک حج کی اور دوسری بقر عید کی۔ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی ہیں،اور آسانی کی خاطر عورتیں اپنی صفوں میں جانے کے بجائے مردوں کے ساتھ ہی نماز پڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حنفی مسلک کے مطابق مرد اور عورت کے ایک ساتھ نماز پڑھنے سے تین مردوں کی نماز فاسد ہو جاتی ہے،، عورت کے دونوں طرف کھڑے ہونیوالے مرد اور عورت کے پیچھے کھڑے ہونے والے مرد کی نماز نہیں ہوتی ہے، اس لئے مردوں کو چاہئے کہ عورتوں کو ان کے صفوں میں بھیجنے کی کوشش

کریں۔ احرام کی حالت میں خیموں میں جاتے اور آتے ہوئے چہروں سے کپڑے لگ جاتے ہیں، بعض لوگ چہرہ پوچھتے ہیں یا کپڑا اتر کرکے چہرہ پر پھیرتے ہیں ان تمام باتوں سے بچنا چاہئے، حالت احرام میں چہرہ اور سر سے کپڑا لگنا مکروہ ہے، البتہ اس کی وجہ سے دم یا صدقہ واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح احرام کی حالت میں جوں وغیرہ مارنے سے بچنا چاہئے، جوں کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ تین سے کم ہوں تو کچھ صدقہ کردے، کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے اور تین یا اس سے زائد ہوں خواہ ان کی مقدار کتنی بھی ہو تو صدقہ فطر کے بقدر گیہوں یا اس کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے۔

:احرام سے متعلق ضروری مسائل

آپ اللہ کے مقدس گھر کی طرف جارہے ہیں، اس لئے پہلے اپنے بدن کی صفائی کرلیں، پھر احرام کی نیت سے غسل کریں اگر غسل کرنا ممکن نہ ہو تو وضو کرلیں، یہ غسل بدن کو آلائش و میل کچیل سے صاف وستھرا کرنے کے لئے ہے (اس لئے وہ عورتیں جو حائضہ ہیں یا جن کو بیماری کی وجہ سے خون آرہا ہو وہ بھی غسل کرکے اپنے بدن کو گندگی سے صاف کرلیں) اب صاف وشفاف ہو کر احرام کے کپڑے پہن لیں، اور خوشبو لگائیں۔
حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے کپڑے اتارے اور احرام باندھنے کے لئے غسل فرمایا (جامع ترمذی) اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو احرام کے لئے احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگایا کرتی تھی (بخاری کتاب الحج حدیث: 9341)۔ دو رکعت نفل نماز احرام کی نیت سے پڑھیں، نماز سے فارغ ہو کر دل میں نیت کرنے کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی کرلیں اور اللہ سے مدد کے خواستگار ہوں اللہ ارشاد فرماتا ہے: "صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ سے مدد طلب کرو۔ اگر آپ نے صرف حج کا احرام باندھا ہے تو ان الفاظ میں نیت کریں: (اے اللہ میں حج کی نیت کرتا ہوں/ کرتی ہوں اسے میرے لئے آسان کر دیجئے اور اس حج کو قبولیت سے نواز دیجئے) اور اگر حج وعمرہ دونوں کے ارادے سے احرام باندھا ہو تو یہ پڑھیں: (اے اللہ میں حج وعمرہ دونوں کرنا چاہتا ہوں/ چاہتی ہوں ان کو سہل فرمادیجئے اور قبول فرمالیجئے) اگر عربی الفاظ یاد نہ ہوں تو اردو ہی میں کہہ لیں۔ اگر دوسرے شخص کی طرف سے حج کر رہے ہوں تو جس کی طرف سے حج کر رہے ہیں ان کی طرف سے نیت کیجئے، جو عورتیں حائضہ ہیں یا جن کو بیماری کی وجہ سے خون آرہا ہو وہ غسل یا وضو کرکے احرام باندھ لیں اور قبلہ رو ہو کر نیت کریں اور تلبیہ پڑھیں۔
پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: حالت نفاس اور حیض والی عورت غسل کرے گی اور احرام باندھے گی اور حج کے تمام اعمال ادا کرے گی، صرف بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گی جب تک کہ پاک نہ ہوجائے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اور عورتیں آہستہ آواز سے تین مرتبہ تلبیہ پڑھیں: "لبیک، اللھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعم لک والملک لاشریک لک" (حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں، آپ کا کوئی

شریک نہیں ہے، میں حاضر ہوں اور سب نعمتیں آپ ہی کی عطا کی ہوئی ہیں اور ملک بھی آپ ہی کا ہے اس میں آپ کا کوئی شریک نہیں)، یاد رکھیں تلبیہ یا ان کی جگہ حمد وتعظیم کے دوسرے الفاظ کہنا ہرگز نہ بھولیں، کیونکہ ایک مرتبہ ان چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا پڑھنا واجب ہے، تلبیہ پڑھ لینے کے بعد آپ حالت احرام میں آگئے، حج کا تحریمہ آپ نے باندھ لیا، اب احتیاط سے رہیں جن چیزوں سے بچنا ضروری ہے ان سے بچیں اور جتنا زیادہ ہوسکے تلبیہ پڑھتے رہیں، البتہ طواف اور سعی کے درمیان دوسری دعائیں واذکار کریں۔

درج ذیل چیزوں سے بچیں: پورے بدن یا بدن کے کسی بھی حصہ کو ایسے کپڑے سے نہ چھپائیں جو سلا ہوا ہو یا سلنے کی ہیئت پر بنایا گیا ہو، چنانچہ قمیص، کرتا، بنیان، عمامہ پاجامہ اور دستار جیسی چیزیں نہ پہنیں، سر اور چہرہ کھلا رکھیں، پاؤں میں ایسا جوتا یا، چپل بھی نہ پہنیں جو پاؤں کے اوپر کی ہڈی کو چھپادے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: نہ قمیص پہنو، نہ عمامہ، نہ پائجامہ، نہ ٹوپی، نہ خف (موزہ) اگر کسی کو چپل نہ ملے تو موزے اس طرح پہن لے کہ اسے ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے اور ایسا کپڑا نہ پہنو جس میں کچھ زعفران یا (خوشبو) ملی ہوئی ہو اور عورتوں کا احرام یہ ہے کہ صرف اس کا چہرہ کھلا رہے، بقیہ سارا جسم سر سمیت ڈھکا رہے گا۔ عورتیں سلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں، ہاں یہ یاد رہے کہ سر ڈھکنا وجوب ستر اور پردہ کے لئے ہے، احرام کے لئے نہیں ہے، اس لئے عورتیں بھی پردہ کی رعایت کرتے

ہوئے وضو کے وقت سر کا مسح کریں گی، نیز عورتوں کو اجنبی مردوں کے سامنے چہرہ کھولنا منع ہے، اس لئے کوئی چیز پیشانی کے اوپر اس طرح لگالیں کہ کپڑا اس پر ڈال سکیں، کپڑا چہرہ کو نہ لگے۔ احرام باندھ لینے کے بعد اب ضروری ہے کہ جسم میں خوشبو نہ لگے، میل کچیل ختم نہ کی جائے اور حسن وزیبائش کا اظہار نہ ہو، کیونکہ اب عاشقان خدا کو یہ ہوش نہ ہونا چاہئے کہ جسم کیسا ہے اور لباس کیسا، بال وناخن کیسے ہیں؟ چنانچہ اب بدن کے کسی حصے سے بھی بال نہ کاٹیں، ناخن نہ تراشیں، تیل نہ لگائیں، صابن نہ لگائیں، خوشبو نہ سونگھیں، کیونکہ ایک شخص نے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا حاجی کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کے بال پراگندہ بکھرے ہوئے ہوں اور جسم سے خوشبو نہ آتی ہو۔ البتہ ٹھنڈا یا گرم پانی سے غسل کر سکتے ہیں، لیکن میل وغیرہ دور نہ کریں، صابن وشیمپو نہ لگائیں، اسی طرح سر اور چہرہ کے علاوہ دیگر بدن پر چادر یا رومال وغیرہ ڈال سکتے ہیں۔ اور موذی جانوروں کو مار سکتے ہیں مثلاً سانپ، بچھو، چھپکلی، کھٹمل، مچھر اور مکھی وغیرہ (معلم الحجاج:211)۔

:کفارہ

اول: اگر آپ نے کسی عذر مثلاً بیماری یا کسی عمل کی تکلیف کی وجہ سے کوئی ایسا عمل کر لیا جس سے احرام کی حالت میں بچنا ضروری تھا، مثلاً بال کٹانا منع ہے، لیکن سر میں جوئیں تکلیف دہ بن گئی ہیں اور اس تکلیف سے نجات پانے

کے لئے بال کٹالیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ آپ ان تین چیزوں میں سے کسی ایک چیز کے ذریعہ کفارہ دیں: یا تو ایک جانور کی قربانی حرم میں دیں، یا چھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلائیں یا تین دن روزے رکھیں۔ دوم: اور اگر آپ نے بغیر کسی عذر کے جان بوجھ کر یا بھول کر کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرلیا ہے تو جس درجہ کا جرم ہوگا اس پر لازم ہونے والے کفارہ کی صورت بھی اسی کے مطابق ہوگی، مثلاً کسی ایسے کپڑے کو پہن لیا جن کا پہننا احرام کی حالت میں منع ہے، یا سر ڈھک لیا یا عورت نے اپنے چہرہ کو اس طرح ڈھک لیا کہ کپڑا اس کے چہرہ سے لگ گیا اور ایسی حالت میں پورا دن یا پوری رات گزر جائے تو ایک جانور (بکرا) کی قربانی کرنی ہوگی، اگر پورے دن یا پوری رات سے کچھ کم یہ حالت رہے تو اس کا کفارہ نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو کا صدقہ ہے نصف صاع ایک کلو پانچ سو نوے گرام کے برابر ہے)، اس مقدار میں گیہوں یا اس) کی قیمت کسی ایک فقیر کو دیدیں، اگر کئی فقیروں کو دیدیا تو یہ فدیہ کی طرف سے کافی نہ ہوگا، اور اگر صرف تھوڑی دیر ایسی حالت رہی تو ایک مٹھی گیہوں کا صدقہ کفارہ کے طور پر دینا ہوگا۔

:خوشبو لگالینے کا کفارہ

خوشبو اگر بدن کے کسی ایک مکمل عضو جیسے سر یا ہاتھ یا پنڈلی پر لگائی ہے تو ایک قربانی کرنی ہوگی، یا ایک نشست بیٹھک میں پورے بدن پر لگایا ہے تو

بھی ایک ہی قربانی واجب ہوگی اور یہ بھی ضروری ہوگا کہ خوشبو فوراً ختم کردی جائے، اگر خوشبو باقی رہی تو پھر دوسری قربانی لازم ہوجائے گی، اگر ایک عضو سے کم میں خوشبو لگائی ہے تو جرم کم ہونے کی وجہ سے صرف صدقہ (نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو) لازم ہوگا اور اگر کپڑے میں تھوڑی سے خوشبو لگا لی تو ایک مٹھی گیہوں صدقہ کرنا واجب ہوگا، نیز یہ بھی ضروری ہوگا کہ کپڑے سے خوشبو کو اس طرح زائل کریں کہ ہاتھ میں خوشبو نہ لگ سکے۔

:بال و ناخن کاٹنے کا کفارہ

وضو کرنے یا بال و داڑھی کھجانے کے دوران خود سے تین بال گر جائیں تو ایک مٹھی گیہوں صدقہ کرنا ہوگا اور اگر خود اکھاڑے تو ہر بال کے بدلے ایک مٹھی اور تین بال سے زیادہ اکھاڑے تو نصف صاع صدقہ کرنا ہوگا (معلم الحجاج 293)۔ اور دونوں ہاتھوں کے ناخن یا دونوں پاؤں کے ناخن کاٹنے پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔پانچ انگلیوں کے ناخن سے کم کاٹنے کی صورت میں نصف صاع صدقہ واجب ہوگا، البتہ ٹوٹے ہوئے ناخن کو توڑنے سے کچھ واجب نہ ہوگا (معلم الحجاج: 204)۔

:طواف قدوم

اب اللہ کے گھر پہنچ چکے ہیں، لہٰذا اگر صرف حج کرنے کا یا حج وعمرہ دونوں

کرنے کا احرام باندھ رکھا ہے، یعنی حج افراد یا حج قِران کرنے کی نیت سے احرام باندھا ہے تو آپ کے لئے سنت ہے کہ اللہ کے گھر جا کر فوراً آنے کی حاضری بجالایئے اور طواف قدوم کیجئے، تمتع کرنے والوں کے لیئے یہ طواف سنت نہیں ہے، طواف کرتے وقت ان چیزں کا خیال رکھیں: طواف کے دوران آپ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اور آپ نے ابھی چونکہ احرام باندھ رکھا ہے، اس لئے حجر اسود کو چومنے کی کوشش نہ کریں، کیونکہ حجر اسود پر خوشبو لگا ہوتا ہے اور احرام کی حالت میں خوشبو چھونا حرام ہے، جب احرام کھول لیں اور طواف کریں تو بھی کسی کو دھکہ دیکر حجر اسود کو چومنے اور ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کریں، کیونکہ حجر اسود کو چومنا اور ہاتھ لگانا اس وقت مسنون ہے جب کسی کو آپ سے تکلیف نہ پہنچے اور سنت کی وجہ سے کسی مسلمان کو تکلیف دینا حرام ہے۔ حجر اسود اور بیت اللہ کی چوکھٹ کے علاوہ کہیں اور بوسہ نہ دیں، نیز احرام کی حالت میں کعبہ کے پردہ کے نیچے اس طرح کھڑے نہ ہوں کہ کعبہ کا پردہ سر کو یا چہرہ کو چھو جائے۔اور جب ایک طواف یعنی سات چکر مکمل کرلیں تو دوگانہ نماز ادا کریں اور یہ دھیان رکھیں کہ ہر طواف یعنی سات چکر کے بعد بغیر دو رکعت نماز پڑھے دوسرا طواف شروع نہ کریں، ایسا کرنا مکروہ ہے، الا یہ کہ آپ ایسے وقت میں طواف کر رہے ہوں کہ اس وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے تو پھر دوسرا طواف کر سکتے ہیں، لیکن مکروہ وقت کے ختم ہوتے ہی جتنے طواف آپ نے کرلیے ہیں ہر طواف کے بدلے دو دو رکعت نماز ادا کریں۔ ہر طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا

واجب ہے۔ (معلم الحجاج 104)۔

:سعی

سعی کرنا واجب ہے، اور طواف کے بعد کرنا سنت ہے، چنانچہ بغیر عذر کے سعی کرنے میں تاخیر نہ کریں، طواف قدوم کے بعد اگر آپ نے سعی نہیں کی اور وقوف عرفہ کرلیا تو اب طواف زیارت کے بعد سعی کریں۔

:(یوم الترویہ (8 ذی الحجہ

آج ہی کے دن سے حج کے اعمال کا آغاز ہوتا ہے، آج سورج طلوع ہونے کے بعد مکہ سے منی کے لئے روانہ ہوں اور منی میں قیام کریں، یہاں ظہر، عصر، مغرب، عشا اور نویں ذی الحجہ کی فجر کی نمازیں پڑھی جائیں گی، آج کوئی خاص عمل نہیں کیا جائے گا، اس لئے تلبیہ وتسبیح وتہلیل ودعا میں مشغول رہیں۔

:یوم عرفہ نویں ذی الحجہ

حج کا سب سے اہم دن یہی ہے، عرفات ایک میدان کا نام ہے، اس میدان میں ٹھہرنا فرض ہے، خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے ہو، اگر یہ چھوٹ گیا تو حج فوت ہوگیا، نیز اس بات کا خیال رکھیں کہ عرفات میں ایک وادی ہے جس کا نام بطن عرنہ ہے، یہ عرفات میں داخل نہیں ہے، اس لئے یہاں نہ ٹھہریں، یہاں ٹھہرنے

سے وقوف عرفہ نہیں ہوگا

:مزدلفہ میں آمد

عرفہ میں جب سورج غروب ہوجائے تومزدلفہ کی طرف نکل پڑیں، یہاں مغرب کی نماز نہ پڑھیں ،آج مغرب اور عشا کی نماز مزدلفہ میں ایک ساتھ پڑھی جائے گی کہ یہی مشیت خداوندی ہے، جب مزدلفہ پہنچ جائیں اور عشا کا وقت ہوجائے تو اذان کے بعد تکبیر کہیں اور مغرب کی نماز ادا کی نیت سے پڑھیں، مغرب کی فرض نماز سے فراغت کے فوراً بعد بغیر تکبیر کہے عشا کی نماز پڑھیں، عشا کی نماز سے فراغت کے بعد مغرب اور عشا کی سنتیں اور وتر پڑھیں، پھر ذکر ودعا میں مشغول ہوجائیں، فجر کی نماز آج یہیں مزدلفہ میں پڑھنی ہے، یہاں وقوف کا وقت صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ہے،اس لئے صبح صادق سے پہلے ہر گزنہ جائیں ،ورنہ دم واجب ہوگا،الا یہ کہ کوئی معذور ہو یا عورتیں ہوں تو صبح صادق سے پہلے یا صبح صادق کے بعد منی جانے کی گنجائش ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد ہی منی کے لئے روانہ ہوں (معلم الحجاج ص: 61، مناسک ملا علی قاری 291)۔

یوم النحر: (دسویں ذی الحجہ)مزدلفہ سے فجر کی نماز پڑھ کر سورج نکلنے سے پہلے منی کے لئے روانہ ہوجائیں، منی پہنچ کر چار اعمال انجام دینے ہیں:

جمرہ عقبہ کی رمی، پھر قربانی، پھر سر کے بال کٹوانا، پھر مکہ آکر طواف زیارت کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعمال اسی ترتیب سے انجام دیئے تھے (ابو داؤد کتاب

المناسک)، اس لئے اسی ترتیب سے انجام دینا واجب ہے، نیز خود سے رمی کرنا واجب ہے، اس لئے خود سے رمی کی کوشش کریں، اگر ازدحام کی وجہ سے رمی کرنے کی طاقت آپ میں نہیں ہے تو مسنون وقت کے بجائے وقت جواز یا وقت کراہت میں رمی کرلیں، عذر کیوجہ سے کراہت ختم ہوجائے گی، ہاں جو حضرات جمرات تک چل کر جانے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں یا بہت کمزور یا مریض ہیں تو وہ کسی کو اپنا نائب بنادیں۔ آج یعنی دسویں تاریخ کو رمی کا مسنون وقت سورج نکلنے سے لیکر زوال تک ہے، زوال سے غروب تک وقت مباح ہے، غروب کے بعد سے لیکر پوری رات یعنی گیارہویں کے صبح صادق سے پہلے تک مکروہ وقت ہے (معلم الحجاج: 71)، رمی کے بعد خود سے قربانی کرنے کی کوشش کریں یا کسی ایسے معتبر آدمی کے ذمہ یہ کام سپرد کریں جو آپ کی رمی کے بعد قربانی کرکے آپ کو مطلع کردے، تاکہ اس کے بعد آپ سر کے بال کٹوا کر حلال ہوجائیں، بینک وغیرہ کے ذمہ کرنا بہتر نہیں ہے اور اگر اس احتیاط کے باوجود ان اعمال میں ترتیب قائم نہ رہ سکی تو دم وغیرہ واجب نہ ہوگا۔ قربانی کے بعد سر کے بال مونڈوالیں یا کتروالیں، چوتھائی سر کے بال منڈانا یا کٹانا واجب ہے، مستحب یہ ہے کہ سارے

سر کے بال منڈوائیں۔ عورتیں چوتھائی سر کے بال ایک انگلی کے بقدر کٹوالیں، ان کے لیے مستحب یہ ہے کہ سارے سر کے بالوں سے ایک انگل کے بقدر بال کتروائیں، سر کے بال آپ خود سے بھی کاٹ سکتے ہیں، دوسرے حاجی سے بھی کٹوا سکتے ہیں، اسی طرح دوسرے حاجی کے سر کا بال آپ بھی کاٹ سکتے ہیں (معلم الحجاج: 174)۔طواف زیارت: رمی، ذبح اور سر کے بال کٹوانے کے بعد طواف زیارت کریں، یہ طواف فرض ہے، طواف زیارت کا وقت دسویں تاریخ کے صبح صادق سے شروع ہوجاتا ہے، البتہ سنت یہ ہے کہ دسویں تاریخ کو رمی، ذبح اور بال کٹوانے کے بعد طواف زیارت کریں طواف زیارت قربانی کے ایام ہی میں کرلینا واجب ہے (مناسک ملا علی قاری: 232)۔

طواف زیارت کے بعد منی واپس ہوجائیں، منی پہنچ کر گیارہویں اور بارہویں کو رمی کریں، گیارہ اور بارہ تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کی جائے گی، رمی سے فارغ ہونے کے بعد آپ چاہیں تو مکہ واپس آجائیں، البتہ بہتر ہے کہ تیرہ ذی الحجہ کی رمی کرکے مکہ واپس آئیں۔ گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو رمی کا مسنون کا وقت زوال سے غروب آفتاب تک ہے، غروب آفتاب سے صبح صادق تک مکروہ وقت ہے، معذور شخص مکروہ وقت میں بھی رمی کرسکتا ہے، اس کے عذر کی وجہ سے یہ کراہت بھی ختم ہوجائے گی۔

طواف وداع رخصتی کا طواف:

اب آپ حج سے فارغ ہوگئے، وطن واپس جانے کی تیاری کر رہے ہیں، تواب طواف وداع کریں، طواف سے فارغ ہو کر دوگانہ نماز پڑھ کر اپنے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے دعائیں مانگیں۔

توبہ کیجئے، سچے دل سے

اپنے پچھلے گناہوں اور فریب کاریوں سے بھری زندگی کا احساس پرویز صاحب کو جب ہوا توانھوں نے حج کا ارادہ کیا اور انہیں کسی قسم کی رکاوٹ اور پریشانی کا سامنا بھی نہیں ہوا۔ دولت ان کے پاس بہت تھی۔ سرکاری اور پرائیویٹ دفتروں سے آج کل اپنے کام کس طرح کرائے جاتے ہیں، اس طریقے سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ کہتے تھے کہ دفتروں میں رشوتیں نہیں دوگے توکام کبھی نہیں ہوں گے۔ جب کام نہیں ہوں گے تو روپیہ کس طرح کمایا جائے گا اور پھر بال بچوں کا پیٹ کس طرح بھرا جائے گا؟ ان کی پرورش اور تعلیم کس طرح ہوگی ؟ بوڑھے ماں باپ اور بیوی کی بیماریوں کا علاج کس طرح ہوگا؟ ملک کی بڑی اقلیت یعنی میرے بھائی اسی لیے تو مفلس، بے روزگار اور پچھڑے ہوئے ہیں کہ وہ رشوتیں نہیں دیتے اور لیتے ہیں، چار سو بیسی اور دھوکا دھڑی نہیں کرتے ہیں، دوسروں کا حق نہیں مارتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ بڑی اقلیت کے لوگوں کے پاس رشوتیں دینے کے لیے روپیہ ہی نہیں ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ غلط طریقے اور غلط پیشے اپنا کر روپیہ جمع کرو۔ اُن سے پھر کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں تو پولیس ان پر خاص نظر رکھنے کی وجہ سے فوراً دبوچ لیتی ہے اور ذرا سے جرم کو بڑھا کر اتنا بڑا کر دیتی ہے کہ ان کا انکاؤنٹر کر دیتی ہے یا

پھانسی پر لٹکوادیتی ہے یا عمر قید کروادیتی ہے، تو وہ کہتے ہیں، تو پھر کیا بھیک مانگوں، مجھے بھیک مانگنا گوارہ نہیں ہے، اس لیے چار سو بیسی، دھوکا دہی اور نقلی دھندہ کرتا ہوں۔ اپنے انھیں نظریات کے سبب انہیں ویزا بآسانی مل گیا تھا۔ ان کا حج پر جانے کا نمبر بھی جلدی آگیا تھا۔ نمبر اور ویزا آتے ہی پرویز صاحب نے اپنی داڑھی بڑھانا شروع کردی تھی۔ ملک میں آج کل بڑھتی قیمتوں کی طرح ان کی داڑھی بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ چند ہفتوں میں ان کی داڑھی ایک مشت ہوگئی۔ تین ماہ بعد ان کی فلائٹ تھی۔ اس درمیان ان کی داڑھی ایک بالشت بھر ہوگئی تھی۔ کئی بار وہ داڑھی کی تراش خراش کرواچکے تھے۔ اب وہ داڑھی پر فخریہ انداز میں ہاتھ پھیرتے رہتے تھے۔ روانگی کا وقت قریب سے قریب آتا جارہا تھا۔ جس روز روانگی تھی، اس دن ان کا بنگلہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ مہمانوں سے ہر کمرہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہ سبھی مہمانوں سے انتہائی تپاک اور خوش مزاجی سے مل رہے تھے۔ شام کو ایک شاندار اور پر تکلف دعوت کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ہار پھولوں سے لدے پرویز صاحب سبھی کی مبارکباد قبول کررہے تھے۔ انہیں بار بار خیال آرہا تھا کہ اب واپسی پر ان کے نام سے پہلے حاجی کا اضافہ ہوجائے گا۔ وہ اس اضافے پر دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ایسی شاندار دعوت دی گئی تھی کہ لوگ حیران اوران سے مرعوب سے ہورہے تھے۔ دوسرے روز ہار پھولوں سے لدے پھندے پرویز صاحب ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوگئے، جس جگہ حاجیوں کا ایک بڑا قافلہ

روانگی کے لیے تیار تھا اور لوگ سبھی سے الوداع ہونے کے لیے مصافحہ کر رہے تھے۔ ہر طرف انسانوں کا جم غفیر دور دور تک نظر آ رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد جہاز کی پرواز کا آغاز ہوا اور پرویز صاحب اسی روز اپنے دیگر ہم سفروں کے ساتھ کچھ گھنٹوں کی ہوائی جہازی مسافت کے بعد سرزمین عرب پر اتر گئے۔ اب وہ احرام باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کیا اور رہائش گاہ کی طرف ڈیلکس بس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ حج کے ارکان وہ ترتیب سے روز بروز ادا کر رہے تھے۔ فرض، سنت اور نفل نمازیں پابندی سے ادا کر رہے تھے۔ نفل نمازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر روز بلاناغہ بعد نماز عشاء کچھ دیر کے لیے اپنے وطن میں بذریعہ موبائل گھر والوں اور نمبر دو کے کاروبار کے حالات ضرور معلوم کرتے تھے۔ اپنی خیریت اور حج کے مناظر خوش ہو کر وہ سب کو بتاتے تھے اور ان سب کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ واپسی کے وقت خریداری کے لیے بچوں اور دیگر متعلقین کی فرمائش کی فہرست ان کی جیب میں بحفاظت رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہاتھ سے ٹٹول کر فہرست کے موجود ہونے کی تصدیق کی اور جیب کے اوپر سے ہاتھ ہٹا کر وہ مطمئن ہو گئے۔ نماز پنجگانہ کے وطن میں وہ پابند کبھی نہیں رہے۔ کبھی نماز پڑھی کبھی نہیں پڑھی، لیکن جب سجدہ کرتے تو ماتھے پر خوب زور دیتے اور اسے آہستہ آہستہ صف پر رگڑتے تاکہ سجدے کا نشان ماتھے پر بن جائے اور واقعی ان کے ماتھے پر سجدے کا نشان بن گیا تھا۔ حج کے آخری ایام میں اپنے گروپ کے ساتھ پرویز صاحب منیٰ پہنچے،

کنکریاں مارنے کے لیے سبھی دوڑ رہے تھے اور بے تحاشہ دوڑ رہے تھے۔ پرویز صاحب کے ہاتھوں میں سات کنکریاں تھیں۔ وہ سبھی کے ساتھ دوڑنے لگے۔ ایک کنکری پوری قوت سے انہوں نے پتھر کے بنے اس نشانے پر ماری، جہاں پہلی بار شیطان نے حضرت ابراہیم کو خدا کی نافرمانی کے لیے ورغلایا اور بہکایا تھا۔ کنکری پتھر کے نشان کی طرف گئی اور ہوا ہی میں پلٹ کر ان کی طرف تیزی سے آئی اور زور سے ان کے لگی۔ وہ حیران وپریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے کہ کس شخص نے ان کے کنکری ماری ہے؟ اسی وقت ان کے اوپر فضا میں ایک زور دار قہقہہ گونجا۔ انہوں نے جلدی سے اوپر دیکھا، لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ اسے اپنا وہم سمجھ کر پرویز صاحب نے دوسری کنکری ماری۔ کنکری ہوا میں گئی اور تیزی سے پلٹ کر پھر ان کے آکر زور سے لگی۔ اس کے فوراً بعد زور کا قہقہہ اوپر فضا میں گونجا۔ انہوں نے بے اختیار اوپر دیکھا اور پھر اپنے دائیں بائیں لوگوں کو دیکھنے لگے، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کیا کنکریاں ان لوگوں کے بھی آکر لگ رہی ہیں؟ اور کیا وہ لوگ بھی قہقہے کی آواز سن رہے ہیں، لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ میری پھینکی ہوئی کنکریاں ہی واپس آکر میرے لگ رہی ہیں۔ صرف میں ہی اوپر فضا میں گونجنے والے قہقہے کو سن رہا ہوں۔ وہ بہت زیادہ فکر مند ہوگئے۔ ''کیا شیطان میری پھینکی ہوئی کنکریوں کو واپس کرکے مجھے ہی مار رہا ہے؟'' ان کے ذہن میں سوال ابھرا۔ پرویز صاحب کے ہاتھ میں اب آخری کنکری تھی۔ تذبذب، کشمکش، الجھنیں، ستے ہوئے غمگین چہرے اور کانپتے دائیں

ہاتھ سے زور لگا کر اس کنکری کو آخری نشان کی طرف پھینکا، لیکن وہی کنکری تیزی سے واپس آئی اور زور سے ان کے لگی۔ فوراً ہی ایک کم وقفے کے لیے فضا میں قہقہہ گونجا اور آواز آئی'' کیوں پرویز ! تو بھی مجھے کنکریاں مار رہا ہے۔ تو تو مجھ سے بھی بڑا شیطان ہے، تو اشرف المخلوقات ہے، ریاکاری، مکاری، کینہ پروری، اللہ کی نافرمانی، دغا، دھوکہ، حق تلفی، اپنے مفاد کے لیے قتل کرا دینا تو مجھ سے بھی زیادہ تجھ میں ہے۔ تیرے دل میں اب بھی ہے کہ وطن جا کر یہی سب کچھ پھر کروں گا۔ تو اپنے نام کے آگے صرف حاجی لکھنا اور کہلوانا چاہتا ہے۔'' یہ سن کر پرویز صاحب نے جلدی سے اپنے دائیں بائیں لوگوں کو دیکھا کہ کوئی اور تو یہ جملے سن نہیں رہا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ سب رمی جمارات میں مصروف تھے۔ انہوں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا ''میں اپنے حالات سے مجبور تھا۔ تو نے مجھے ورغلایا میں تیری باتوں میں آگیا۔ تیرے سبز باغ دکھانے میں آگیا۔'' اس کے بعد پھر آواز آئی ''جھوٹ ! مجھ سے زیادہ خود تیرا نفس ذمہ دار ہے۔ تو اپنے بگڑے ماحول اور حالات سے ہجرت بھی کر سکتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ ہجرت تو ملک سے باہر ہی کرتا، ملک کے اندر ہی ہجرت کی جا سکتی تھی، سارے ملک کے حالات تو بگڑے ہوئے نہیں ہیں۔'' شیطان اور اپنے جاگتے ہوئے ضمیر کی آواز ایک ساتھ سن کر پرویز صاحب کو چکر آگیا اور وہ دھڑام سے اژدھام کے درمیان گر پڑے۔ ان کے ارد گرد لوگ بے اختیار جھکے اور ایک شخص نے انہیں اٹھا کر اپنے کاندھے سے لگا لیا اور چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد

پرویز صاحب کو ہوش آگیا۔ انہیں ایک طرف بٹھا کر پانی پلایا گیا۔ پانی پیتے ہی وہ بے اختیار وہیں سجدے میں گر گئے اور صدق دل سے اللہ سے توبہ کی۔ وہ توبہ ان کی توبہ النصوح یعنی سچی توبہ تھی، پھر سجدے سے اٹھ گئے اور لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی توبہ قبول ہوئی ہے یا نہیں، لیکن انہیں اللہ کی ذات سے قوی امید تھی کہ ان کی صدق دل سے کی گئی یہ توبہ اللہ رب العزت ضرور قبول فرمالے گا۔

بھارتی ٹی وی ڈرامے، نوجوان نسل کی تباہی

عام طور پر ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ جو مغربی تہذیب کو بہت ساری برائیوں کی جڑ سمجھتا ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ صنف نازک نے جب سے گھر کی دہلیز کے باہر بازار میں قدم رکھا ہے، صنعت و تجارت کو زینت بخشی ہے، یہ اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں رہا کہ وہ برائیاں جو کبھی کبھار دیکھنے اور سننے کو ملتی تھیں، اب اس نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی ہے۔پہلا سوال یہ ہے کہ عورت کیوں پردے میں رہے اور کیا واقعی اس کے باہر آنے سے اس کی عزت و آبرو خطرے میں رہتی ہے۔دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ خود اپنی مرضی سے باہر آنا چاہتی ہے۔پہلے سوال کا جواب ہمیں ہر منٹ اور ہر گھنٹے اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے ذریعے مل رہا ہے، دوسرے سوال کا جواب یہ کہ اس کائنات کے مالک نے عورت اور مرد دونوں کی فطرت میں شرم و حیا داخل کر دی ہے اور وہ خود بے حیائی اختیار نہیں کرنا چاہتے۔مثال کے طور پر آدم اور حوا کو اگر یہ پتہ ہوتا کہ شجر ممنوعہ کے پھل کو استعمال کرنے کے بعد اپنے لباس سے محروم ہو جائیں گے، تو وہ کبھی یہ غلطی نہیں کرتے، مگر جب ابلیس کے بہکاوے میں آکر ایسا کر بیٹھے، تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔چونکہ جو غلطی آدم سے جنت میں ہوئی ،وہی غلطی بنی آدم سے زمین پر بھی ہونا لازمی تھی۔ اسی لئے اللہ

تعالیٰ رسولوں اور الہامی کتابوں کے ذریعے آدمی کو آگاہ کرتا رہا کہ اے بنی آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ایک بار پھر تمہاری شرمگاہوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔انسان کی اسی بشری کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطانی طاقتوں نے دنیا میں شجر ممنوعہ کے پھل بودیے ہیں جسکی وجہ سے امریکہ اور بھارت ہمارے گھروں تک گناہوں کے باغات خوب بورہے ہیں اور اپنے زہریلے اثرات سے دنیا میں بے سکونی افراتفری پھیلارہے ہیں۔فرق یہ ہے کہ آدم کے لئے جنت میں گناہ کے جواز تھے، مگر گناہ کے ذرائع نہیں تھے۔اس لئے آدم اور حوااس تباہی اور گناہ سے بھی بچ گئے اور معاف بھی کردیے گئے۔اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں شجر ممنوعہ ہے کیا؟ یہ آزادی کا خوبصورت تصور ہے،جس کا نشہ ہر آدمی اور عورت کے ذہن پر طاری کردیا گیا ہے اور پھر اپنی اس آزادی کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس نشے اور گناہ کی طرف راغب کئے جاتے ہیں، جسے عام مفہوم میں سیکس یا جنسی تسکین کا نام دیا جاسکتا ہے،جو آسانی کے ساتھ ہر قیمت پر بازار میں دستیاب ہے۔اور اس منافع بخش تجارت میں دنیا کی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنا بہت بڑا سرمایہ لگایا ہوا ہے۔مگر دنیا کی ایک بہت بڑی اکثریت بین الاقوامی ثقافتی اداروں کی اس سازش کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہے، جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ انسانی حقوق کی بازیابی ،جمہوریت کی بحالی ،سماجی عدل وانصاف اور آزادی نسواں کے قیام جیسے پرفریب نعروں کے ذریعے دنیا کی تمام دیگر مذہبی تنظیموں اور تہذیبوں

کو فرسودہ قرار دیکر انہیں صرف اپنے بارے میں سوچنے کیلئے مجبور کردیں اور وہ خود اپنے قدیم روایتی مذہبی اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔

کتاب ''گلوبلائیزیشن اور دنیا کی تشکیل نو'' میں لکھا ہے کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں منظور کی جانے والی تجاویز کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ ہوگا کہ ان کا مقصد معاشرے کو ہر طرح کے اخلاقی و خاندانی بندھنوں سے آزاد کرکے عریانیت، فحاشی، جنسی بے راہ روی اسقاط حمل کا قانونی جواز، تعیش پسندی، شادی کے بغیر جنسی خواہشات کی تکمیل جیسی، انسانیت سوز عادات کو معاشرے میں عام کرنا ہے، جس کے بعد انسانوں اور جانوروں کی اجتماعی زندگی میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ جائے گا۔امریکہ جو اس پوری تہذیب کا معمار اور موجد ہے، وہاں کی ہالی ووڈ فلم انڈسٹری پوری دنیا کیلئے ہر سال 12 لاکھ گھنٹوں پر مشتمل مختلف قسم کے لٹریچر اور ٹی وی پروگرام تیار کرتا ہے، جس میں بلیو فلم سے لیکر موسیقی جیسے پروگرام شامل ہوتے ہیں اور پھر یہاں سے ایک اچھی قیمت کے عوض دنیا کے دیگر ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں۔امریکہ کی یہ فلمی صنعت پوری دنیا کی فلمی صنعت کی آمدنی کے پچاسی فیصد حصے پر قابض ہے اور 1994 کے دوران امریکہ نے اپنے تفریحی پروگراموں کی فروخت سے چالیس اعشاریہ دو ملین ڈالر حاصل کئے، جو کہ امریکہ میں تیار کی گئی دیگر مصنوعات کی فروخت سے بھی زیادہ ہے۔امریکی طرز آزادی اور ثقافت کے حامی بورہوس فرڈریک کا کہنا ہے کہ آزادی اور شرافت ایک قسم کا فریب اور

دھوکہ ہے ،اقوام عالم کو چاہئے کہ وہ امریکی ثقافت کو قبول کرلے ،مگر جو ملک اور حکومت اس کی مخالفت کریں ان کے معاشرے میں جوا، شراب ، موسیقی اور رقص کی شکل میں تفریح کے ایسے جدید ترین وسائل کو عام کردیا جائے کہ باآخر مخالف طبقات بھی اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہو جائیں یا خاموشی اختیار کرلیں۔ہم دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک طبقہ جو اس برائی سے کسی طرح الگ ہے تو بھی اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس کے خلاف آواز بھی اٹھاسکے۔میڈیا جو کہ شوق و سنگار کے سامان بنانے والی کمپنیوں اور فلم انڈسٹری سے کروڑوں اربوں روپے کی منافع بخش تجارت کررہا ہے، وہ پوری طرح عورت مرد کے اختلاط اور جنسی بے راہ روی کو ترقی کی علامت بناکر پیش کررہاہے اور اپنے اسی مقصد کے فروغ کیلئے ان کمپنیوں نے حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے عنوان سے ایسی مختلف تنظیموں کو سرمایہ فراہم کررہی ہیں جو عالمی اور ملکی پیمانے پر فحاشی بے حیائی اور بدکاری کے رجحانات کو عام کرنے کیلئے ہر ماہ کہیں نہ کہیں کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔اس کا اثر بھی دیکھا جاسکتا ہے آج سے قبل جہاں معاشرے میں شرابی،زانی اور بد کردار افراد کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی، انہیں اب عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس فعل کے معترف سلمان رشدی،تسلیمہ نسرین ،ارشاد مانجی اسریٰ نعمانی اور وی ایس نائیپال جیسے بد کردار مصنفوں کو نوبل انعام سے نوازا، جانا۔جب ہم کتاب گلوبلائزیشن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کس طرح مغربی طرز کے قائل

تعلیم یافتہ افراد برائیوں کی ایجاد کرتے ہیں اور اس برائی کے پھیلاؤ سے شہر دیہات اور معاشرے کے پسماندہ جاہل اور مزدور قسم کے طبقات بھی برابر سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں جو فحش لٹریچر بازار میں دستیاب ہے، اس نے عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کے وہ تمام راز فاش کردئے ہیں، جسے حقیقت میں اسی طرح پہرے میں رہنا چاہئے تھا۔مادیت کے پرستار نام نہاد مہذب دنیا کے با اثر ممالک ان جوہری اسلحوں کے تباہ کن نتائج سے تو واقف ہیں، مگر جو دھماکہ انسان کے شہوانی جذبات اور جنسی خواہشات کو آگ لگا کر کیا جارہا ہے، اس نے زندہ انسانوں کو جانور ہی نہیں درندہ بنادیا ہے اور اس کی اس یلغار سے پانچ سال کی معصوم سے لیکر اسی سال کی بوڑھی عورت کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مرد خود اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے جواز پیدا کر رہا ہے، عورتیں بھی فائیو اسٹار ہوٹلوں اور بیئر بار کا رخ کررہی ہیں۔ فحش تہذیبی یلغار سے یکساں طور پر معاشرے کا ہر ذہن متاثر ہوا ہے فرق اتنا ہے کہ جو تعلیم یافتہ اور دولت مند ہے جو نہ صرف اس برائی کا خاکہ تیار کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی اس خواہش کو آپس کی رضامندی یا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پورا کرلیتا ہے یا جو سیدھا سادھا ایک مزدور قسم کا طبقہ ہے، شہر کے قحبہ خانوں میں اپنے آپ کو مطمئن کرلیتا ہے۔مگر اسی معاشرے میں ایک شریر اور بدمعاش قسم کا طبقہ بھی تو رہا ہے جو عام طور پر کسی اچھی تعلیم وتربیت سے گذرا ہی نہیں اور جو کسی

قانون اور پولیس کی زیادتی سے بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اس کی نظر میں ماں ، بیٹی بہن ، بھتیجی اور معصوم بچی کے مقدس رشتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو، مگر جنسی ، خواہشات کی آگ سے وہ بھی سلگ رہا ہے۔ وہ ایسے مواقع کو کیسے ضائع ہونے دے گا، جہاں اسے کسی بھی پولیس اور قانون کا کوئی خوف نہیں رہتا۔

عریانیت اور جہیز

جو عریانیت مغربی کلچر سے شروع ہوئی ہے اس کا سایہ اسلامی معاشرے پر بھی پڑنے لگا ہے۔ پوری دنیا اس مغربی کلچر کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ عمل کا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ عریانیت اپنے دامن کو پھیلائے جا رہی ہے۔ جسم پر کپڑے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ شرم وحیا نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ اسلام میں جسموں کو پردے میں رکھنے کا حکم ہے۔ نا محرموں کی نظر نہ پڑے نقاب اور چادر سے پورے جسم کو ڈھکا جائے۔ ہم کہاں تک رسول اکرم ﷺ کی پیروی کر رہے ہیں اس کا اندازہ لگائیں۔ اسلام مذہب میں جہیز لینا سخت منع ہے۔ اسی لئے تو پیغمبر اسلام نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی دختر حضرت فاطمہ کو جو جہیز دیا ہے وہ آج تک تاریخ کے اوراق پر سنہرے حرفوں سے تحریر ہے۔ جو آج بھی مسلم معاشرے کے لئے عبرت کا پیغام دے رہی ہے کہ اے اسلام کے ماننے والو! جہیز فاطمی سے سبق حاصل کرو۔ یہ تمہارے لئے نصیحت ہے۔ پیغمبر اسلام کی زوجہ حضرت خدیجہ الکبریٰ دولت لے کر رسول اکرم ﷺ کے گھر آئی تھیں۔ وہ جہیز نہیں تھا۔ وہ حضرت خدیجہ الکبریٰ کے کاروبار کی آمدنی تھی۔ حضرت علی نے اپنی بیٹی جناب زینب کی شادی جناب عبداللہ سے کی ہے لیکن تاریخ میں کہیں جہیز کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دونوں صاحبزادے حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی شادی

کی ہے لیکن جہیز نہیں لیا ہے۔ جناب زہر بانو ایران کے بادشاہ کی بیٹی تھیں اور دوسری زوجہ ام رباب، یہ بھی بہت امیر ترین تھیں۔ اپنی خواہش سے جو ہوا وہ لے کر آئیں۔ جہیز کے نام پر کچھ نہیں مانگا گیا۔ خلفائے راشدین نے بھی جہیز لینے کے لئے منع کیا ہے۔ ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ جہیز ہمیں تباہی کے دہانے پر لے جارہا ہے۔آپ غور کریں سوچیں اس گرانی کے دور میں زندگی گزارنا مشکل ہے۔ انسان کس طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ شادی کے تمام انتظامات میں کافی خرچ ہے۔ پھر فرمائشی جہیز کہاں سے دیا جاسکے گا۔ غریبی کی وجہ سے جہیز کی فرمائش سے لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی ہے۔ کتنے پھول مرجھا گئے۔ کتنے والدین نے جان گنوادی۔ اگر لڑکی جہیز لے کر نہیں جاتی ہے تو سسرال والے طعنہ مارتے ہیں۔ زندگی بھر جہیز کے لئے اسے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ کہیں انہیں جہیز کی خاطر آگ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اسلام میں انسانیت پر بہت روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلام میں انسانیت ہی سب کچھ ہے۔ لیکن آج مسلم معاشرے سے انسانیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ جہیز کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ پورا معاشرہ تباہی کے دہانے پر جارہا ہے۔ جس کے پاس بہت بڑی رقم ہے وہ جہیز دے کر اپنی بیٹی کی شادی کر دیتا ہے اور جو غریب ہیں وہ کہاں سے دولت لائیں گے۔ ان کی بیٹیوں کا کیا ہوگا۔ کیا وہ کنواری رہ جائیں گی۔ ضرورت ہے کہ ہر کوئی جہیز سے پرہیز کرے اور جہیز لینے اور دینے دونوں پر پابندی لگائے تاکہ ہمارا معاشرہ تباہی سے بچ جائے اور ہم سے دنیا عبرت حاصل کرے

اور سب لوگ خوشی سے زندگی بسر کریں۔

معاشرے کا بدترین مرض، رشوت

معاشرے میں جہاں دیگر متعدد عیوب و قباحتیں صالح اقدار و روایات کو روند کر پروان چڑھ رہی ہیں وہیں رشوت جیسا مہلک اور بدترین کینسر بھی عام ہوگیا ہے، شرعی طور پر اس مرض کو جتنا بڑا گناہ کہا گیا ہے اس کی حیثیت کے علاوہ اس کے نتائج خود دنیا میں بھی نہایت خوف ناک اور تباہ کن صورت میں سامنے آرہے ہیں بلاشبہ رشوت خوری سے مال و دولت اور رزق میں بجائے اضافہ کے جو پستی اور تنزلی اور بے برکتی پیدا ہوتی ہے اس سچائی سے خود رشوت دینے والے بھی آشنا ہوں گے، مگر طلب زر اور وقتی منافع کی طمع میں انجام کار کی اس ناجائز آمدنی کے مسموم اثرات سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں بالآخر اس پاپ کے خمیازے میں انسان دنیاوآخرت سے غافل ہوجاتا ہے۔ وہ معاوضہ جو کسی فرضی منصبی یا واجب کام کے لیے ناحق ناواجب اور ناجائز کام کے صلہ میں نقد، قیمتی اشیاء یا حسین لڑکیوں کی شکل میں وصول کیا جائے رشوت کہلاتا ہے،اس کے علاوہ وہ ناجائز مفاد جو اپنے اعزاز، منصب کی بناء پر بلا استحقاق جائز حاصل کیا جائے جس کا بلا عہدہ حاصل ہونا دشوار ہو رشوت ہے وہ مشاہرۂ غداری ہے جو معاہدۂ ملازمت کی خلاف ورزی کرکے حکومت کے وقار، مفاد، اور خزانہ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے دیا جائے نیز صنعتی تجارتی اور غیر ملکی اداروں سے

مقررہ مشاہرہ یا کمیشن کی صورت میں وصول کیا جائے وہ رشوت ہے رشوت کی تین قسمیں ہیں: ذاتی، ادارتی، سیاسی، علاوہ ازیں سبھی محکموں میں رشوت کو بنیادی حقوق کا درجہ حاصل ہے اس کا رشتہ ذات سے نہیں منصب سے ہے غرض آج سرکاری غیر سرکاری کوئی محکمہ رشوت کی زد سے بری نہیں کہا جاسکتا، سینئر افسران کے عتاب سے بچنے کے لیے جونیئر افسران اپنی آمدنی سے ایک خطیر طے شدہ رقم اپنے سینئر کو ادا کرتے ہیں، صنعتی اور تجارتی ادارے رشوت خور حکام وملازمین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی مصنوعات کی فہرستوں میں قیمتیں درج کرتے وقت ان کا کمیشن بھی ادا کرتے ہیں اورفروخت شدہ مال کی قیمت وصول کرنے کے بعد بلاطلب وتقاضا ان افسران کا حصہ بھی پیش کرتے ہیں، ملک کی معروف کمپنیاں فرمیں اور ملوں کے مالکان گراں قدر تنخواہوں پر خاص افسران کی نظر کرم سے ان عہدوں کے نام مختلف اداروں میں مختلف ہوتے ہیں ان کا کام صرف وقتاً فوقتاً اعلیٰ افسران کی کوٹھیوں کا طواف کرنا ہوتا ہے انھیں دعوتیں پارٹیاں دے کرخوش رکھنا ہوتا ہے، بے قاعدگیاں بے ضابطگیاں کرنے والے، سنیما گھروں،اداروں، کارخانوں اوردکانداروں کی جانب سے متعلقہ افسروں یا انسپکٹروں کا ''ماہانہ'' مقرر ہوتا ہے جو انھیں تسلسل کے ساتھ ملتا رہتا ہے، غرض آج اعلیٰ ملازمتی ذہن رشوت جیسے طاعون سے قطعاً محفوظ نہیں ہیں، یہ چند مستقل اور تباہ کن صورتیں ہیں جن سے رشوت کا کاروبار عین قانون کی نظروں کے سامنے نہایت خوش اسلوبی اور سرعت سے جاری ہے،اسی لیے یہ معاشرے

میں عیب نہیں سمجھا جاتا، رشوت جہاں قانوناً جرم، اخلاقاً ظلم ہے وہیں شرعاً حرام بھی ہے چناں چہ اسلام چوں کہ فطری مذہب ہے اس نے انسانی زندگی اور اس کے معاشرے کی مکمل طور پر پاکیزگی اور شفافیت کا خیال رکھا ہے لہٰذا پندرہ سو برس قبل محسنِ انسانیت حضرت محمد ﷺ نے اس فعلِ قبیح کی ممانعت فرمادی تھی ارشاد نبوی ہے: ''رشوت دینے لینے والوں کا ٹھکانہ جہنم میں ہے'' باری تعالیٰ بھی اس کی سخت ممانعت فرماتے ہیں: ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو! کیا تم یہ جان کر بھی امانتوں میں خیانت کروگے''۔

نظام حکومت میں برائیوں اور کرپشن کی بنیاد غلط بخشیوں ناجائز تقرروں اور جھوٹی سفارشوں سے پڑتی ہے انہی سے رشوت کا باب کھلتا ہے یہی اساسی خرابیاں نہ صرف حکومتی سطح پر باعث لعن وطعن بنتی ہیں بلکہ عوامی اعتماد کو بھی توڑتی ہیں یہی وجوہات معاشرے میں تیزی سے ہیجان واضطراب کو بڑھاتی ہیں، رشوت خوری کے بظاہر کتنے ہی اسباب نظر آئیں مگر اس کا بنیادی سبب فقط ایک ہے، ''معیار زندگی کا غلط تصور'' ماضی میں معاشرے میں وہی معزز ومحترم سمجھا جاتا تھا جو صاحبِ کردار واخلاق ومعاملات ہوتا تھا نیز دیانت وامانت داری کا حامل ہوتا تھا، مگر یورپین کلچر نے رومانی، اخلاقی اور پاکیزہ قدریں یکسر منہدم کردیں ہیں آج لائف اسٹینڈرڈ، مادّی، سائنسی اور تکنیکی ہے،

اوراب ہر شخص دولت مند بننے کی دوڑ میں شامل ہے وہ ہر قسم کی عیش اور جیبوں میں کیش چاہتا ہے، اس لیے بلاتاخیر وہ ناجائز ذرائع ووسائل یعنی رشوت ستانی ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، قمار بازی، جعل سازی، ملاوٹ کا کام شروع کردیتا ہے تاکہ بہت جلد وارے نیارے ہوجائیں اسی تگ ودو میں وہ اپنا ذہنی سکون واطمینان کھوبیٹھتا ہے اور بے چینی وٹینشن کا شکار بن جاتا ہے۔اللہ تعالٰی ہر حال میں اپنی مخلوق کی بہتری چاہتے ہیں وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتے کہ انسان کو دنیا وآخرت یا دونوں میں کوئی تکلیف وپریشانی لاحق ہو، اسی لیے اللہ تعالٰی نے ہر اس شے کو انسانوں کے لیے حلال قرار دیا ہے جو لطیف، لذیذ، مفید اور عین انسانی فطرت کے مطابق ہو اور ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو انسان کے لیے روحانی، جسمانی طور پر مضر ومہلک ہے، قرآن کریم میں ان چیزوں پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اللہ تعالٰی فرماتے ہیں کہ ’’جو رزق ہم نے تم کو دے رکھا ہے اس میں سے کھاؤ پیو‘‘دوسری جگہ یہ وضاحت بھی کردی کہ اگر تم رزق حلال پر اکتفانہ کروگے اور حرام کی جانب رجوع کروگے تو شیطان کا اتباع ہوگا۔(ترجمہ) زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ چیزیں موجود ہیں ان میں سے کھاؤ پیو اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تمھیں (ہمیشہ) برے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں نہایت بلیغ وجامع الفاظ میں رشوت کی ممانعت فرمائی ہے۔اسلام چوں کہ امن وآشتی کا ضامن اور فتنہ وفساد کا دشمن ہے اس لیے وہ معاشرے میں کسی

قسم کا جھگڑا و فساد برداشت نہیں کرتا دنیا کے دیگر مذاہب واقوام میں سب سے بڑا و سنگین جرم قتل ہے مگر اسلام نے فتنہ کو قتل سے کہیں زیادہ شدید قرار دیا ہے ”فتنہ تو قتل سے بھی سخت ترین ہے“۔ بلاشبہ قتل سے ایک یا چند جانوں کا نقصان ہوتا ہے مگر فتنہ سے پورا معاشرے ہلاکت کی لپیٹ میں آجاتا ہے قرآن کریم اور تاریخ کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ جن امتوں اور قوموں پر جو عذابِ الٰہی نازل ہوا ہے اس کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ ان میں عدل وانصاف کی جگہ ظلم وزیادتی ، ناپ تول میں کمی اور رشوت کا چلن عام ہوگیا تھا حلال وحرام کا فرق ختم ہوگیا تھا، حکام صریحاً عوام کی حق تلفی کرتے تھے اور ایمان ویقین کی خرید وفروخت کی جاتی تھی چوں کہ رشوت کے سلسلے کا آغاز مسند اختیارات واقتدار سے ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بے مثل فرمان میں جگہ جگہ رشوت کے متعلق حکام ہی کو موضوع سخن بنایا ہے، عہد حاضر میں انسان کی بڑھتی ہوس مال نے اس کی زندگی سے چین وسکون چھین لیا ہے غرض وہ ناجائز ذرائع اور مشاغل اختیار کرکے دنیا وآخرت تباہ کررہا ہے۔ اسلام پوری دنیا کے لیے قابل تقلید ہے اس کی نظر وہاں تک گئی ہے جہاں تک انسان سوچ بھی نہیں سکتا، بہر حال رشوت ستانی کے انسداد کے لیے قانونی اور حکومتی سطح سے بھرپور کوششیں جاری ہیں مگر ع

”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“

تشخیص اگر صحیح ہو اور علاج غلط ہو تو مرض میں افاقہ کے بجائے اضافہ ہو گا حکومتی سطح
پر ان خرابیوں کے سد باب کے لیے قانون در قانون وضع کئے جا رہے ہیں مگر آئین اس
وقت تک نہ تو کسی کی اصلاح کر سکتا ہے اور نہ ہی جرائم کی روک تھام۔ جب تک دیانت
و امانت کے جذبات و فکریات اس کی پشت پناہی نہ کریں یہ جذبات تبھی پیدا ہوں گے
جب اخلاقی سماجی تعلیم و تربیت کا نظم کیا جائے گا مگر عصری تعلیم گاہیں ان علوم سے یکسر
خالی ہیں ان میں صرف موضوعاتی نصاب شامل ہے یہی وجہ ہے کہ معاشرتی اخلاقی
خرابیاں عروج پر ہیں، ان تمام علوم کا سر چشمہ دراصل دینی تعلیمات میں موجود ہے
جس کو مذکورہ تعلیمی ادارے قبول نہیں کر سکتے بہر کیف اہل اسلام تو ان باتوں پر عمل
پیرا ہو سکتے ہیں اور اپنے آپ کو سدھار سکتے ہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

"قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

ہر سال اسلامی کیلنڈر کے پہلے مہینے محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی تمام دنیائے اسلام شہدائے کربلا کو یاد کرتی ہے۔ کروڑوں مسلمان عظیم ہستیوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جنھوں نے عزم واستقلال اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ ترین روایات قائم کیں۔ یہ وہ عظیم واقعہ ہے جس نے تاریخ انسانیت پر نہایت گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ کسی المناک حادثہ پر نسل انسانی کے اس قدر آنسو نہ بہے ہوں گے جس قدر اس عظیم حادثے پر بہہ چکے ہیں کم وبیش 1400 سو سال کے اندر 1400 سو مرتبہ محرم گزر چکا ہے اور ہر محرم اس حادثے کی یاد تازہ کرتا رہا۔ محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو جو جانیں اللہ کی راہ میں کرب وبلا کے تپتے ہوئے صحرا میں قربان کی گئیں تاریخ عالم ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔امام اعلیٰ مقام کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی شہادت کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرئیل علیہ السلام نے مجھے اطلاع دی ہے کہ میرا نواسہ سرزمین فرات میں شہید کیا جائے گا۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے

کہاان کی قتل کی مٹی لا کر دکھاؤ۔ پس یہ مٹی وہاں سے لائے پھر وہ مٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو دے دی اور فرمایا جب یہ مٹی خون بن جائے گی تو وہ میرے نواسے کے قتل کا دن ہوگا۔ام المومین ام سلمہؓ نے اس مٹی کو شیشی میں ڈال کر رکھ دیا۔ جب امام علی مقام ارض کربلا میں شہید ہوئے وہ مٹی مدینہ پاک میں خون بن گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باخبر ہوتے ہوئے ایک بار بھی یہ دعا نہیں کرتے کہ یا اللہ میرے نواسے حسین علیہ السلام کو امتحان سے دور فرما۔ بلکہ آپ دعا کرتے ہیں یا اللہ حسین علیہ السلام کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھ۔ یہی دعا حضرت فاطمہ الزہرا اور مولا علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں۔ وقت گزرتا گیا اور کربلا کی مہیب وادیاں قریب آتی گئیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے میدان کربلا میں اپنے ساتھیوں کو یوں مخاطب کیا۔ اے لوگو! اگر تم تقویٰ پر ہو تو حق کو پہچانو۔ یہ خدا کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ معاملے کی جو صورت ہو گئی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ دنیا نے اپنا رنگ بدل لیا حق سے منہ پھیر لیا ہے۔ زمین نیکی سے خالی ہو گئی ہے۔ حقیر سی زندگی باقی رہ گئی ہے۔ ہولناکیوں نے احاطہ کر لیا ہے۔ افسوس تم دیکھتے ہو کہ حق پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ باطل پر اعلانیہ عمل کیا جا رہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے وقت آگیا کہ حسین حق کی راہ میں یہ خواہش کرے میں شہادت کی موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ شہادت حسین کا واقعہ تخت خلافت کے دو دعویداروں کی باہمی جنگ کی پکار

نہیں بلکہ حق و باطل کی پکار ہے۔یزید ظلم واستبداد کا پیکر بن چکا تھا۔ خلافت کی گاڑی کو ملوکیت کی پٹری پر چڑھا دیا گیا ہے۔ خلافت کا چاند ملوکیت کے سائے میں آ کر گہنا گیا تھا۔ بیت المال بادشاہ کا خزانہ بن چکا تھا۔ عدل و انصاف کی جگہ ظلم و ستم تھا۔ خدائی قانون کی بجائے شاہی قانون چلنے لگے تھے۔ آزادی و حریت کی جگہ حاکیت و آمریت نے لے لی تھی۔ عسکری قوتیں جہاد کے بجائے ظلم وستم اور قتل وغارت گری کے لئے استعمال ہونے لگی تھیں۔ حاکم وقت کو ظلم سے روکنے کے لئے اور خدائی حدود کی حفاظت کے لئے آپ نے میدان کربلا میں یہ عظیم الشان قربانی پیش کی۔ حق و انصاف کا پرچم سربلند رکھنے کے لئے لہو سے ایسے چراغ جلائے جن سے ملت اسلامیہ تا قیامت روشن رہے گی۔ بے سروسامانی کے عالم میں قافلہ حسین کے جانثاروں نے بیداری ضمیر کے وہ ستون ایستادہ کئے جو صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے ہدایت و رہنمائی کا مینار بنے رہیں گے۔ حق و باطل کی پکار۔ ظلم و مظلوم کی کشاکشی حق و انصاف کے حصول کے لئے ظالم سے جنگ روز اول سے جاری ہے۔ ظالم طاقتیں اپنے مکمل ساز وسامان اور جاہ و حشم سے لیس بے سروسامان مظلوموں کے قافلوں پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ ظالم و مظلوموں کے یہ معرکے تاریخ انسانیت کا نہ ختم ہونے والا باب ہیں۔ یہی وہ معرکے ہیں جن میں انسانی عظمت و سربلندی نکھر کر پوری تابندگی سے ظاہر ہوئی۔ یہ وہ سنگ میل ہے جو انسانیت کو عظمت و رفعت کی راہ دکھاتے رہیں گے۔ لیکن کربلا کا سانحہ ان سب

سے منفرد اہمیت کی حامل اور اس کی انفرادیت اور عظمت یہ ہے کہ شہید کربلا نے خود ہی اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا بلکہ اپنے تمام خاندان اور رفقاء کو قربان کر دیا اور وہ بھی اپنی آنکھوں کے سامنے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو ہر طرح سے لالچ دیئے گئے اور ہر طرح کے حربے استعمال کئے گئے کہ وہ حق اور اسلام کو پس پشت ڈال کر یزید وملوکیت کے ظالمانہ مکروہ نظام پر مہر تصدیق ثبت کر دیں اور وہ ایک ایسی حکومت کو تسلیم کرلیں جو اسلام کی حقیقی جمہوریت کے قطعاً خلاف تھی اور جس کی بنیاد جبر و استبدار پر رکھی گئی تھی۔ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے موقف سے دستبردار ہو جاتے اور دنیاوی عیش اور جاہ جلال کو راہ حق کی سختیوں پر فوقیت دے دیتے تو تاریخ اسلام کا دھارا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتا۔ مقصدیت کی یہ سچائی اور حق پر یہ یقین محکم جب دشت کربلا میں ظلم و استبداد کے مقابلے میں آیا تو زمین و آسمان لرز اٹھے۔ فرشتے حیران ہیں کہ یہ انسان کتنا عظیم ہے کہ اسلام کے دفاع کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہے۔ ایک دفعہ وہ پہلے بھی حیران ہوئے تھے جب اللہ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلا رہے تھے۔ لیکن آج حسین علیہ السلام اس دین محمد ﷺ کی حفاظت کے لئے اپنے سارے خاندان کی گردنیں پیش کر رہے ہیں۔ غرض حق و باطل خیر و شر، انصاف وظلم اور حسین اور یزید کا مقابلہ میدان کربلا میں کیا ہوا کہ انسانیت کی

رہنمائی کی تفسیر بن گیا۔

مؤمن تو سب بھائی ہیں

موجودہ دور میں اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو ہمیں ایک چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں نے دو پیمانے بنا رکھے ہیں۔ایک پیمانہ اپنے لیے اور دوسرا پیمانہ دوسروں کے لیے۔وہ اپنے لیے بہتری کی خواہش رکھتے ہیں اور دوسروں کے لیے برا چاہتے ہیں۔ اپنے لیے تو یہ پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، لیکن وہ خود دوسروں کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتے۔وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کا خوب خیال رکھیں لیکن وہ خود دوسرے لوگوں کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں رکھتے اور ان کے ساتھ رواداری اور خندہ پیشانی کے ساتھ بالکل پیش نہیں آتے۔یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں لوٹ کھسوٹ، رشوت، بددیانتی، جھوٹ، فریب اور جعل سازی وغیرہ کی اخلاقی بیماریاں عام ہیں۔ اسلام نے ایک صالح اور پرامن معاشرے کے لیے یکساں رویے کو ضروری قرار دیا ہے اور اسے ایمان کا نمایاں وصف قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسروں کے لیے بھی وہی چیز نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“ (متفق علیہ) آج مسلم معاشرہ کا یہی حال ہو گیا ہے۔ مسلمان خود تو چاہتے ہیں کہ انھیں کسی طرح کا نقصان یا گزند نہ پہنچے مگر وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے میں کوئی

کسر نہیں چھوڑتے۔جب ہم اپنے لیے نقصان.برداشت نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں دوسروں کے نقصان کی بھی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ایک مثل مشہور ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڈھا کھودتا ہے وہ خود گڈھے میں گرتا ہے۔چوں کہ آج ہمارا معاشرہ اس گندی حرکت کا شکار ہے لہٰذا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ پریشانیوں اور مصیبتوں کا شکار ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی شکایت اور.برائیاں بیان کرتے ہیں،ہر کس وناکس کو.برا بھلا کہہ دیتے ہیں،دوسروں کی عزت وناموس کا بالکل خیال نہیں رکھتے اوران کی کمزوریاں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں جب کہ وہی لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ ان کی.برائیاں بیان کریں۔شیخ سعدی نے ایسے موقع کے لیے.بڑے پتے کی بات کہی ہے:

"جو شخص تمہارے سامنے کسی کی.برائی کر رہا ہوتا ہے،وہ یقیناً کسی اور کے سامنے تمہاری بھی.برائی کرے گا۔"

تین چیزیں معاشرے کی بہتری اور افراد کو زیور اخلاق سے آراستہ کرنے سے یا یوں کہیں کہ حقوق العباد سے متعلق ہیں۔غریبوں کو کھانا کھلایا جائے،ان کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا جائے،ان کی مزاج پرسی کی جائے۔سلام کو عام کیا جائے اور صلہ رحمی کا رواج ہو،اس لیے کہ اس سے امت آپس میں گھل مل کر رہے گی اور مضبوط بنیاد کی طرح ہوگی۔چوتھی بات یہ کہی گئی کہ رات کے آخری حصے میں نماز (تہجد) کا اہتمام کرو،تاکہ اللہ سے قربت اور لگاؤ میں اضافہ ہو،ساتھ ہی

دیگر امور (عبادات اور معاملات) میں خلوص ونیت پیدا ہو جائے، جس سے توکل علی اللہ کی کیفیت پیدا ہو۔ آخر میں اس کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تم ایسا کروگے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤگے۔ ایک مومن کا رشتہ دوسرے مومن سے بھائی چارگی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے باجود مومن کا رشتہ بھی ایسا مضبوط ہونا چاہئے کہ آدمی اپنے مؤمن بھائی کی تکلیف کو خود اپنی تکلیف محسوس کرتا ہے، اس کی جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت اس پر ظلم گویا خود اپنے اوپر ظلم تصور کرتا ہے اور یہی ایمان کی کیفیت اوراس کا تقاضا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''مؤمن توسب بھائی بھائی ہیں۔'' (الحجرات:01) ایک مسلمان کو اپنی ہی طرح دوسرے مسلمان کی حفاظت کرنی ہے اوراس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہے۔ اس طرز عمل میں بھی خود اس کا فائدہ ہے، کیوں کہ اس کے بدلے میں اللہ تعالی اس کا خیال رکھے گا۔ اگر وہ دوسروں کا خیال رکھے گا اوراس کی عیب جوئی کے بجائے، پردہ پوشی کرے گا تو خدا بھی اس کی پردہ داری فرمائے گا۔ اگر انسان اپنے اوپر اپنے مسلمان بھائی کو ترجیح دینے لگے گا یا کم از کم اپنی ہی طرح اس کی بھلائی بھی چاہے گا تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر کی بہت سی خرابیاں اور اخلاقی کمزوریاں خود بہ خود ختم ہو جائیں گی۔ ایسا شخص اپنے معاشرے میں چلتا پھرتا عملی نمونہ ہوگا جسے دیکھ کر لوگ بھی اپنے رویے میں تبدیلی لائیں گے جسے اصلاح امت کا کار عظیم سمجھا جائے گا۔

جانوروں سے حسن سلوک

اسلام دین رحمت ہے، اس کی رحمت انسان کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر ذی روح پر محیط ہے۔ اس کے ابر کرم نے جہاں عالم انسانیت کو سیراب کیا ہے، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال فرمایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جانوروں کے ساتھ حسن سلوک پر اجر وثواب کی خوشخبری بھی سنائی گئی۔ ایک صحابی رسول اکرم ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ میں نے بطور خاص اپنے اونٹوں کے لیے ایک حوض بنا رکھا ہے، اس پر بسا اوقات بھولے بھٹکے جانور بھی آجاتے ہیں، اگر میں انہیں بھی سیراب کردوں تو کیا اس پر بھی مجھے ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’(ہاں) ہر پیاسے یا ذی روح کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے ثواب ملتا ہے‘‘۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث: 3686) اسلام نے جانوروں کو بھی چین سے جینے کا حق دیا ہے۔ اس کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ نہ خود تکلیف اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو تکلیف پہنچاؤ: ’’لا ضرر ولا ضرار‘‘ (ابن ماجہ: 340) دوسروں کو تکلیف دینا چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ ہو اسلام کے نزدیک درست نہیں ہے۔ حضرت ربیع بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ اپنی حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئے۔ ہم نے ایک سرخ پرندہ دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا، تو وہ فرط غم سے ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے میں نبی

کریم ﷺ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا :اس پرندے سے اس کے بچوں کو چھین کر کس نے اسے رنج پہنچایا ؟اس کے بچوں کو لوٹادو،اس کے بچوں کو لوٹادو''۔ (ابوداؤد: ۔بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور انسانوں کے لیے فائدہ(2675 پہنچاتا ہے اس کی قدر کی جانی چاہیے۔جانوروں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف پسندی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالٰی نے جس جانور کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اس سے وہی کا م لیا جائے ، اس سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اس سے دوسرا کام لیتا ہے تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ مثلاً: اللہ نے بیل کو کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے گدھے کی طرح بوجھ ڈھونے کا کام لیتا ہے تو اسلام کے نزدیک یہ ظلم ہے۔ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا : ''اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ(یعنی جانور سے اسٹیج کا کام نہ لو) ، اللہ نے انہیں تمہارا فرماں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات پر آسانی سے پہنچادیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے۔ تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے ، اپنی ضرورتیں اس سے پوری کرو''۔ (ابوداؤد: ۔ جن جانوروں سے خدمت لی جاتی ہے،یا جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے ، ان(2567 کے تعلق سے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان کے آرام وراحت کا پوراپورا خیال رکھا جائے ، انہیں بر وقت کھلایا پلایا جائے۔اگر وہ بیمار ہوں تو ان کا علاج معالجہ کرایا جائے ، ان سے تکلیف کی حالت میں کام نہ لیا جائے ، ان کے رہنے سہنے کا مناسب بندوبست کیا جائے اور ان سے اتنا ہی

کام لیا جائے جس کے وہ متحمل ہوں، ان سے اس وقت تک کام لینا جب تک کہ وہ بری طرح تھک کر آگے کام کرنے کے لائق نہ رہ جائیں، یا ان کی حالت قابل رحم ہونے کے باوجود مار مار کر ان سے کام لینا، یا انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر کام لینا یہ سراسر ظلم ہے۔ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ایک اونٹ کو دیکھا جس کی پیٹھ اس کے پیٹ سے لگی ہوئی تھی۔آپ نے فرمایا''ان بے زبان جانوروں کے معاملے میں اللہ سے خوف کھاؤان پر ایسی حالت میں سواری کرو جب کہ یہ اس کے قابل اور صحت مند ہوں اور انہیں اچھی حالت ہی میں (تھک کر چور ہونے سے پہلے) چھوڑو''۔ جس طرح اپنے ماتحت انسانوں کو بھوکا پیاسا رکھنا گناہ ہے، اسی طریقے سے جانوروں کو بھوکا پیاسا رکھنا گناہ ہے اور یہ سنگ دلی اسے جہنم تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا''ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں ڈالی گئی، اس نے اسے باندھ رکھا تھا۔ نہ تو اس نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے آزاد کیا کہ وہ (چل پھر کر) حشرات الارض میں سے کچھ کھالیتی''۔چہرہ جسم کا نہایت لطیف اور حساس مقام ہے۔ اس عضو کو پہنچنے والی معمولی اذیت بھی بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اہل عرب چوپایوں کے چہروں پر داغ لگاتے تھے اور بسا اوقات چہروں پر مار بھی دیا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سنگ دلی کو دیکھا تو سختی سے روکا۔ (ابوداؤد: 2564) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چہرے پر مارنے اور اسے داغ دینے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ (مسلم:5551)۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے

روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر ایک دفعہ ایک گدھی کے پاس سے ہوا، جس کے چہرے کو داغا گیا تھا۔آپ نے دیکھا تو فرمایا: اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اسے داغا ہے''۔ (مسلم:5552)۔ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں چیونٹیوں کا بل تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے پوچھا' یہ چولہا یہاں کس نے جلایا ہے'۔ان صاحب نے کہا: یا رسول اللہ ! میں نے !آپ نے فرمایا'اسے بجھاؤ، اسے بجھاؤ' (ابوداؤد:2675) (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو اور کہیں وہ جل نہ جائیں۔ عربوں کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا کہ وہ جانوروں کو آپس میں لڑاتے اور اس تماشے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔اس میں جانور گھائل اور زخمی ہو کر بے حد تکلیف اٹھاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس درندگی کو دیکھا تو سختی کے ساتھ اس سے روکا ہے۔ (ابوداؤد:2562)اسلام میں جانوروں کے حقوق کے سلسلے میں یہ واضح تعلیمات تھیں، جن سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام نے جانوروں کو کس قدر ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ: ان تعلیمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم اور'' کس قدر رحم وکرم سے بھرا ہوا ہے''۔دنیا کو سب سے پہلے ''حقوق حیوان'' سے آشنا کرنے والا ''اسلام'' ہی تھا، ورنہ اس سے پہلے ''حقوق حیواں'' کا تصور دنیا میں نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ جس دنیا

میں ''حقوق انسان'' ہی کے لالے پڑے ہوں وہاں ''حقوق حیوان'' کا تصور ناممکن ہی تو تھا۔ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے نام لیوا اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو دنیا کے روبرو پیش کریں اور اس کا بے داغ اور صاف وشفاف آئینہ دنیا کے سامنے رکھ دیں، کہ دنیا اس کی امن پسند تعلیمات کا مشاہدہ کرسکے۔

ہم اور اسلام

اسلام امن، رواداری اور بقائے باہم کا درس دیتا ہے لیکن یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے مذہب کو پر تشدد، عدم روادار اور متعصب خیال کیا جارہا ہے۔اس جھوٹے تصور اور مفروضہ کے ذمہ دار خود ہم مسلمان ہیں۔ دیگر مذاہب کے لوگ قرآن و حدیث کو نہ سمجھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہے اور وہ کیسا برتاؤ کرتے ہیں ان کا کردار کیا ہے جس سے اسلام کی منفی تصویر پیش ہوتی ہے۔یہ بھی بہت بد قسمتی کی بات ہے کہ معاشرے میں جھوٹ، دھوکا فریب، نقلی ادویات، منشیات، تشدد، دہشت گردی، انتہا پسندی، اغوا، زنا، جبری شادیاں، بناوٹی و نقلی شادیاں اور بد اخلاقی جیسی جتنی بھی برائیاں ہیں وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ مسلمانوں میں ہی ہیں۔یہاں یہ بات کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ ساری خراب عادتیں اور برائیاں صرف مسلمانوں میں ہی ہیں تاہم ان میں سے زیادہ تر برائیاں مسلم معاشرہ میں ہی ہیں۔ نیز کچھ یورپی ملکوں میں خاص طور پر جنوب ایشیائی ملکوں کے مسلمانوں میں جرائم کی شرح کافی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔میں عیدالفطر کے دوسرے دن ایک مقامی دکان پر گیا۔اس دکان کا مالک ایک عیسائی ہے۔اس کا انداز انتہائی دوستانہ ہے۔ وہ ہم سب سے بڑی محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے اور کافی احترام کرتا ہے۔ جیسے ہی میں اس دکان

میں داخل ہوا ایک نوجوان ملازم نے مجھے عید کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ''انکل : عید مبارک میں نے جواباً مسکراتے ہوئے شکریہ کہا اور کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ دکان مالک نے کہا ''بھائی صاحب : آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو عید مبارک''۔ اس کے بعد اس نے مجھے کچھ چاکلیٹ دیں جو اس نے عید کی خوشی میں اپنے تمام گاہکوں خاص طور پر مسلمانوں کو پیش کرنے کے لیے ایک ٹرے میں سجا رکھی تھیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک چاکلیٹ لے لی۔ اس نے ہمارا مقدس مہینہ رمضان شروع ہوتے ہی اس کی بھی مبارکباد دی تھی اور پھر عید الفطر کی بھی مبارکباد دی۔ ہم مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی اپنے مذہبی تہوار مناتے ہیں۔ لیکن کچھ علماء دین ہم سے یہ کہتے ہیں کہ عیسائیوں کو کرسمس مبارک نہ کہو اور غیر مسلموں کے مذہبی ایام میں ان کی خوشیوں میں شامل نہ ہو۔ اپنے فلسفے کی دلیل میں وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر میں کسی عیسائی کو کرسمس مبارک ہو کہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کے مذہب میں اس دن کی اہمیت کا اقرار و اعتراف کر رہا ہوں۔ میں اس تشریح و توضیح سے اتفاق نہیں کرتا۔ جب کوئی عیسائی مجھے یا کسی اور مسلمان کو عید مبارک کہتا ہے تو وہ توحید کا اور حضورؐ کے آخری نبی ہونے کا اقرار تو نہیں کرتا۔ اسی طرح جب میں کسی عیسائی پڑوسی کو کرسمس مبارک کہتا ہوں تو نہ تو میں عیسائی مذہب کو قبول کرتا ہوں اور نہ ہی کرسمس کو، جو عیسائی مذہب کی رو سے خوشیوں کا تہوار ہے، مذہبی حیثیت و اہمیت کا اعتراف کرتا ہوں۔ اسلام اور اس کے اثرات

کی اس مسخ شدہ تشریح کی وجہ سے ہی میں غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں کی خوشیوں میں شامل نہیں ہوتا اور اس وقت تو مجھے بہت ہی پشیمانی اور شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے جب وہ میرے مذہبی تہوار پر بڑے جوش و خروش اور محبت کے ساتھ لپک کر مجھے عید کی مبارکباد دیتے ہیں اور ساتھ ہی مٹھائی اور چاکلیٹ بھی پیش کرتے ہیں۔ میں عیسائی دوستوں اور پڑوسیوں سے اس روز ملاقات نہیں کرتا جس دن ان کے تہوار ہوتے ہیں کہ کہیں میں انہیں ان کے تہوار کی مبارکباد دے کر گنہگار نہ بن جاؤں۔ تاہم ان کے تہوار کے دوسرے دن میں ان سے یہ ضرور معلوم کرتا ہوں کہ انہوں نے تہوار کا کیسا لطف اٹھایا۔ کیونکہ ایسا کہنا مبارکباد دینا یا انہیں خوشیوں کی دعائیں دینا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے کوئی گناہ لازم ہوتا ہے۔ میرا دل و دماغ اسے تسلیم نہیں کرتا اور میں اندر سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسا سلوک اور درس غلط ہے کیونکہ اس سے ہم مسلمان غیر سماجی اور بد اخلاق سمجھے جاتے ہیں۔ مزید برآں اس سے ایک ہی شہر و علاقہ میں رہنے اور معاشرے کا ہی ایک حصہ ہونے کے باوجود مسلمان باقی لوگوں کے لیے اجنبی بن کر رہ جاتا ہے۔ دوسری جانب حضور ﷺ نے فرمایا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں یعنی حسن اخلاق سے پیش آتا ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی تعلیم دی کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کا احترم کرو اور امن و ہم آہنگی کو فروغ دو۔ اگر کوئی غیر مسلم مجھے عید کی مبارکباد دیتا ہے تو وہ اپنے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے اور میری خوشیوں میں شامل ہوتا ہے۔

بحیثیت مسلم اور اچھا انسان ہونے کے ناطے مجھے اس کا جواب اور بھی اچھے اخلاق اور عمدہ سلوک سے دینا چاہئے۔ لیکن انہیں مبارکباد نہ دے کر میں کس بات کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ کیا میں یہ پیغام نہیں دے رہا کہ ہم مسلمان سماجی نہیں ہیں اور سول سوسائٹی کی قدروں اور طرز عمل کو پسند نہیں کرتے۔ ہم ایسا مظاہرہ کرکے کیا یہ باور نہیں کرا رہے کہ مسلمان نسل پرست ہے اور ہم دیگر مذاہب والوں کے ساتھ ہنسی خوشی اور امن وامان کے ساتھ رہنے کی صلاحیتوں اور فن سے عاری ہیں کیا ہم یہ پیغام نہیں دے رہے کہ ہمارا مذہب اور ہماری ثقافت دونوں ہی اتنے کمزور ہیں کہ وہ دیگر مذاہب سے بری طرح متاثر ہو جائیں گے اور نتیجہ میں ہم اپنے مذہب اور نوجوانوں کے تحفظ کے لیے ایک ہی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی نسل پرستی کو فروغ دے رہے ہیں؟ نسل پرستی کا یہ رویہ غلط فہمیوں اور نفرت کو جنم دے رہا ہے۔ اور یہ پیغام جا رہا ہے کہ اسلام بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام امن، رواداری اور بقائے باہم کا علمبردار اور داعی ہے اور معاشرہ میں تقسیم وانتشار کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ درحقیقت یہ واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ خاندانوں اور معاشرہ میں پھوٹ ڈالنا اور انتشار پھیلانا شیطان کا کام ہے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ عام طور پر کسی بھی متنازعہ موضوع پر لکھنے سے قبل خوب چھان پھٹک کرنے کی عادت کے باوجود اس موضوع پر میں نے کوئی ریسرچ نہیں کی ہے اس لیے اس موضوع پر میری معلومات وسیع اور مکمل نہیں ہیں، اور میری خواہش ہے کہ کوئی میری

رہنمائی کرے تاکہ میں اپنے خیالات و نظریات میں مناسب تبدیلی کر سکوں۔ کیا کوئی عالم و فاضل مجھے اور دوسروں کو اس موضوع پر معلومات بہم پہنچا کر ہمیں روشنی دکھا سکتا ہے۔

خواتین کی معاشرتی ذمہ داریاں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ جاہلیت میں خواتین کا مرتبہ صرف ایک گھریلو سامان کی حیثیت سے زیادہ نہ تھا، جن کی جانوروں کی طرح خرید وفروخت ہوا کرتی تھی اور ان کے حقوق کا گھلا گھونٹا جاتا تھا۔ تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتی تھیں، وہ اپنے حقوق بھی نہیں مانگ سکتی تھیں اور اگر اپنے حقوق یا کسی بھی شے پر آ واز اٹھاتی، تو موت کے گھاٹ اتار دی جاتی۔ مگر مذہب اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، وہ جج بن سکتی ہیں۔ اسلام نے انہیں صحیح آزادی کا تصور دیا ہے جو دیگر مذاہب میں قطعی نہیں تھا۔ اگر یوں کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ آج کے دور میں خواتین کے لیے ایک بیداری مہم چلانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ مگر پہلی بات، مغرب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس نے دنیا کو جمہوریت اور سیکولرازم کا تحفہ دیا ہے، جس میں ہر شخص کو اظہارِ خیال کی اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ رہنے کی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور کسی پر کوئی رائے تھوپی نہیں جاسکتی۔ عالم اسلام پر اس کا دباؤ ہے کہ وہ اپنے یہاں خواتین کو اپنے خیال کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیں، ہر

گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اختیار دیں اور اس میں جبراً، زور زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر مغرب میں شاید آزادی کا حقیقی مقصد انسان کو اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد کرنا ہے، نہ کہ آزادی سے ہمکنار کرنا۔ اسی لیے مغرب مسلمانوں کو ان کی مذہبی شناخت سے محروم کرنے اور مسلمان خواتین کو نقاب سے روکنے کی نہ جانے کیسی کیسی مہم چلاتا رہتا ہے۔ واضح ہو کہ فرانس میں اسکول اور سرکاری اداروں میں سکھوں کے لیے پگڑی، مسلمان خواتین کے لیے 'اسکارف' یہودیوں کے لیے ان کی مخصوص 'ٹوپی' اور عیسائیوں کے لیے صلیب رکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، جس کا وبال پوری دنیا میں گونجا تھا۔ افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ کچھ خواتین بھی خواتین کے لیے پردہ کرانے کو غلط بتاتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ یہ جمہوری تصور کے مغائر ہے، جس میں تمام لوگوں کو یکساں حقوق دینے کا اور اپنی سوچ کے مطابق عمل کرنے کا حق دینے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن ذرا سوچیے ! کیا سیکولرازم کا مطلب یہی ہے کہ ایک شخص کو جانوروں کی طرح بے لباس ہونے کی تو اجازت ہو ؟لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور خواہش سے لباس پہننا چاہیں تو اس پر پابندی لگا دی جائے ؟اللہ کا نظام ہے کہ جو چیز اہم بھی ہوتی ہے اور نازک، اسے حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ پاؤں پر کوئی حصار نہیں رکھا گیا، لیکن دماغ کو سخت ہڈیوں والی کھوپڑی کے اندر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا تحفظ ہو سکے۔ دل کی جگہ سینے کی لچک دار ہڈیوں کے بیچ رکھی گئی تاکہ زیادہ

سے زیادہ اس کی حفاظت ہو سکے۔ آنکھوں پر پلکوں کا پہرہ بٹھایا گیا۔ یہ ان اعضاء کی حفاظت کے لیے ہے۔ نباتات ہی کو دیکھئے اگر آم پر دبیز چھلکوں کا لباس نہ ہوتا تو کیا مکھیوں اور بھرنڈوں سے بچ کر وہ انسان کے ہاتھ آ سکتا؟ اگر چاول اور گیہوں کے دانوں پر ان کی حفاظت کے لیے چھلکے نہ ہوتے تو انسان انہیں اپنی خوراک نہیں بنا سکتا تھا۔ خود انسانی معاشرہ میں دیکھئے، ملک کا ایک عام شہری کھلے عام ہر جگہ آمد و رفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ سیکورٹی گارڈ ہے نہ اس کی رہائش گاہ پر پہرے دار ہے، جبکہ اہم شخصیتوں کے لیے تحفظ کا خصوصی نظم کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں میں عورتوں کی حفاظت کی زیادہ ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خدا نے انہیں مردوں کے لیے وجہ کشش بنایا ہے، اس لیے ان کی تراش و خراش میں حسن کاری اور لطافت کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر کسی کا لڑکا شہر جائے تو اسے شام کے 4 بجے آ جانا چاہیے تھا، لیکن وہ رات کے 10 بجے لوٹے تو اس سے گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر یہی واقعہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آ جائے تو دل کا قرار چھن جاتا ہے اور ماں باپ کی کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں۔ اسی کو دیکھئے کہ پوری دنیا میں اور پاکستان میں بھی مردوں اور عورتوں کے تناسب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اللہ نے ان دونوں صنفوں کو ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے تاکہ دونوں طبقات کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ 100 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اہل مغرب عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینے کا نعرہ لگا رہے ہیں، لیکن اس کے

باوجود آج بھی عورتیں حقوق مانگتی ہیں اور انہیں وہ حقوق واختیارات پوری طرح نہیں دیے جاتے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں امریکہ و روس میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی؟ اور یورپ میں مارگریٹ تھیچر کے علاوہ کوئی خاتون وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر نہیں پہنچ سکی۔ یہ ظلم و حق تلفی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ قانونِ فطرت کا فیصلہ ہے۔ قدرت نے خود دونوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اور صلاحیتوں کے لحاظ سے دائرہ کار متعین کیا ہے۔ پردہ بھی اسی فرق کا ایک حصہ ہے۔ جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اور شہوانی جذبات رکھتے ہیں، لیکن ان کی فطرت لباس کے تصور سے عاری ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریانیت سے بچائے اور لباس زیب تن کرے۔ وہی فطرت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ مردوں کے مقابلے عورتیں زیادہ ڈھکی چھپی ہوں۔ فرض کیجئے دو لڑکیاں راستے سے گزر رہی ہیں، ایک لڑکی کا لباس چست اور شوخ ہو، اس کا سر کھلا ہو، اس کے بازو کھلے ہوں، اس کا پیٹ نگاہِ ہوس کو دعوت نظارہ دیتا ہو اور اس کا کسا ہوا لباس جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرتا ہو اور دوسری لڑکی سرتاپا نقاب میں ہو یا کم سے کم ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر دوپٹہ ہو تو اوباش قسم کے لڑکے ان میں سے کس کو چھیڑنے کی کوشش کریں گے؟ ہوس ناک نگاہوں کا تیر کس کی طرف متوجہ ہوگا؟ برائی کے جذبات ان میں سے کس کے تئیں دلوں میں کروٹ لیں گے؟ یقیناً بے پردہ لڑکی اس کا نشانہ بنے گی۔ پردہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو نہایت واضح ہیں ہی، قرآن مجید

نے عورتوں کو پورے جسم کے علاوہ چہرے پر بھی گھونگھٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ خواتین کے لیے اللہ کے رسول نے مسجد میں پیچھے کی صف رکھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ خواتین کے لیے شریعت نے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں مقرر کیں جو اندرون خانہ کی ہیں اور انہیں شمع محفل بننے کی بجائے گھر کی ملکہ بنایا۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے۔ بائبل میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ جو کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں بلکہ بعض وہ ہیں جو پردہ کی وجہ سے پہچانی نہیں گئیں۔آج بھی حضرت مریم کا جو فرضی مجسمہ بنایا جاتا ہے اس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ حالانکہ رومن تہذیب اور اس کے بعد یورپ میں عورتوں کے عریاں مجسمے بنانے اور جسم کے ایک ایک نشیب وفراز اورخدو خال کو نمایاں کرنے کا رواج عام ہے۔ گویا جو لوگ عریانیت اور بے پردگی کے مبلغ ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں کا تقدس باپردہ رہنے میں ہی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بہت سی باکمال خواتین پیدا ہوئی ہیں جن کے حالات پر کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں۔

اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہوسکتی ہیں، طبیب ہوسکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کرسکتی ہیں، کارِ افتاء انجام دے سکتی ہیں، وہ حدود قصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات کی جج بن سکتی ہیں۔یعنی مردوں کی طرح حدود میں رہتے ہوئے ہر کام کرسکتی ہیں۔کاش اہل مغرب اور پردے کے مخالف حضرات عورتوں

کے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے دکھ کا مداوا کر سکیں۔ یہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مریم ایک مقدس ترین شخصیت کی مالک ہیں بلکہ بعض تو انہیں عیسائی عقیدہ کے مطابق تین خداؤں میں ایک خیال کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ کنواری تھیں۔ انہیں کسی مرد نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی حکم کی بنا پر وہ حاملہ ہوئیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جس عورت کو اتنا بڑا رتبہ دیا گیا ہو، آج انہی پر ایمان رکھنے والی عیسائی قوم دامن عفت تار تار کرنے کو بے قرار ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جب سے کائنات وجود میں آئی ہے تب ہی سے اس پہ بسنے والے ذی روح کو ہر دور میں کسی رہنما کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔جو انھیں صحیح راہ دکھا سکے ان کی رہنمائی کر سکے اور پیدا ہوتے بگاڑ کو روک سکے۔ تبھی تو جب بھی کسی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو یہ رہنما و ہمدرد کسی مشعل کی صورت اپنا کردار ادا کرتا ہوا اندھیروں میں بھٹکے ،جہالت کی تاریکیوں میں دم توڑتے انسانوں کو بصیرتِ شعور بخشتا ہے اور کسی طبیب کی مانند ان کے درد کا درماں کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو آج کے دور میں بھی ایسے رہنما موجود ہیں جو معاشرے اور سسٹم میں موجود بگاڑ کو درست کرنے کے لیے ہر وقت مصروفِ جہد رہتے ہیں اور ملک و قوم کی اصلاح کے لیے اپنا نایاب کردار ادا کرتے ہیں۔ میں جس رہنماو ہمدرد کی بات کر رہا ہوں اسے اگر پاسبانِ قلم کہہ کر مخاطب کروں تو میرے خیال سے غلط نہیں ہوگا۔ یہ پاسبانِ قلم اپنے قلم کی طاقت سے قوموں کی سوچ اور ان کے اندازِ فکر کو نئی راہ دکھاتے ہوئے ان کی اصلاح کرتا ہے۔ان کے لیے غور وفکر کے نئے و روشن در کھولتے ہوئے بوسیدہ و زنگ آلود ذہنوں کو آبِ علم و شعور سے سیراب کرکے انھیں نکھار بخشتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اندھیرا، جہالت حد درجہ ہو

جائے تو انسان اپنے رہنما کی تلاش میں نکلتا ہے۔ پھر اس اندھیرے سے چھٹکارہ پانے تک اور بوسیدہ و ناتواں شعور کے توانا ں ہونے تلک یہ تلاش حدِ نگاہ تک وسیع موج بے کراں کی مانند دنیا کے اس لا محدود سمندر میں جاری رہتی ہے۔ ہاں اگر خیالات میں پاکیزگی، پختگی اور ارادے صادق ہوں تو یہ تلاش رنگِ حنا کی مانند صفحہ قرطاس پر اُمنڈ آتی ہے اور دنیا کا یہ بے کراں سمندر ایک کوزے میں سمٹ آتا ہے۔ لیکن اگر رہنما خود چل کر پاس آ جائے اور پلک جھپکنے میں ہر تاریکی کو شعورِ روشن میں بدل دے تو یہ کم ظرف انسان کس طرح ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے متبرہ ہو جا تا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کس طرح یہ رہنما اس کے لیے شعور کی کرنیں بکھیرتا ہے، اسے تاریکی سے آزادی دلواتا ہے،اسے دیدہ واری بخشتا ہے اور بدلے میں اسے تسلی و تشفی کے دو بول تک نہیں ملتے۔ حد درجہ افسوس و رنج کے ساتھ اگر پلٹ کے دیکھیں تو اس کے تمام تر بے لوث جذبات کے بدلے اس کے حصے میں اپنوں ہی کی بے رُخی آتی ہے۔ ہمارے درمیان ایسے بے شمار پاسبانِ قلم موجود ہیں جن سے ہمارا بد نصیب معاشرہ مکمل طور پر فیض یاب نہیں ہوتا۔ پاسبانِ قلم کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار ایسے بہت سے نام ہیں جو میرے شعور میں شور مچاتے ہیں۔ جنھیں وہ عزت نہیں دی گئی جس کے وہ حق دار ہیں اور تھے۔ حساس دل رکھنے والے ان پاسبانِ قلم کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے یہ حق دار ہیں۔ ہر غیر اخلاقی اور نا قابلِ قبول

پر قلم اٹھانے والے، معاشرے اور آگاہی کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنے issues والے یہ قلم کے پاسباں کیا اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں سراہا جائے؟ جبکہ اکثر سچ کا پرچار کرنے کے عوض انھیں بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور بعد از انتہائی حا پر لانے کے جرم میں جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے screen لات میں انھیں سچ کو ہیں۔ مگر ہر طرح کے ایثار کے بعد بھی انھیں وہ تحفظات فراہم نہیں کیے جاتے جو ان کی ضرورت ہوتے ہیں۔ حتیٰ کے جن سہولیات کے وہ اہل ہوتے ہیں وہ بھی انھیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ مگر اس سب کے باوجود بھی اگر وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں تو یقیناً وہ پھر عزت کے قابل ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کے ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جا ئے۔ورنہ ایسے معاشرے جو اپنے رہنماؤں کی عزت و تکریم نہیں کرتے تاریخ کبھی بھی انھیں سنہری حروف میں رقم نہیں کرتی۔معاشرے کو ایسے دیدہ وروں کے لیے برسو ں انتظار کرنا پڑتا ہے جو برائی کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے غلط نظریات رکھنے والوں کی اصلاح کرتے ہیں اور انھیں حقیقت سے روشناس کرواتے ہیں۔ یہ پاسباں ہر وقت معاشرے کی تراش خراش میں مصروفِ عمل رہتے ہیں تاکہ وہ ایک بہترین ہیرے کی صورت اختیار کرلے۔عام لوگوں سے ہٹ کے یہ اپنا وقت ملک و قوم کی بہتری کے لیے وقف کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور پھر لوگوں کو آگاہی کی روشنی سے منور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً عام نہیں ہوتے بلکہ ان کی قدرو قیمت

قدر کرنے والے ہی جان سکتے ہیں جو عقل و شعور رکھتے ہیں اور اس بات سے آگاہ ہیں کہ یہ لوگ ہمارے معاشرے کے لیے کتنے اہم و ملزوم ہیں کہ ان کے بغیر کبھی بھی صحت مند معاشرے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ قرآنِ کریم میں بھی اللہ پاک فرماتا ہے کہ ''علم رکھنے والے اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے'' ۔ لہٰذا اس آیت مبارکہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پاسبانِ قلم ہمارے معاشرے کا کوئی عام کردار نہیں جسے (for gurranted) لیا جائے بلکہ یہ وہ اہم کردار ہے جو چاہے تو پورے کے پورے سسٹم کو بدل دے، نئے فکر و راموز اجاگر کر دے اور صاحبِ شعور، سمجھ رکھنے والوں کی وسعتو ں کو انتہائی وسیع کر دے کہ اس کے ارد گرد علم و شعور کا اجالا ہی اجالا پھیل جائے اور وہ مکمل طور پر اس میں نہا جائے۔ اس لیے میری تمام پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ اس رواج کو ہمارے معاشرے کا المیہ نا بنایئے جہاں قلم کے پاسبانوں کو دیدہ واری بخشنے کے باوجود بھی زمین پر رینگنے والے کیڑے کی مانند سمجھا جائے کہ جسے جب چاہا کسی بھی رقیبِ حق نے اپنے پاؤں تلے روند دیا اور اسے protect کرنے والا معاشرہ تصویرِ حسرت بنا تماشا دیکھتا رہے۔ میری گزارش ہے تمام شعور رکھنے والوں سے کہ خدارا ان کی عزت کیجیے ان کی حوصلہ افزائی کیجیے۔ ان کا احترام ہم سب پر لازم ہے۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دوام بخشتے ہیں۔ جو اپنا سب کچھ ہار کر زندگی کے سرور کو تروتازہ رکھتے ہیں۔ جو زمانے

کی سختیوں کو اپنے شفیق وجود میں قید کر لیتے ہیں اور ہمارے لیے علم و شعور کی شمعیں روشن رکھتے ہیں۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

''ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
مرے درد کی دوا کرے کوئی''

اس معاشرے میں کچھ اندھے اور کچھ آنکھ والے ہیں۔ جب تک معاشرہ آنکھ والوں کے پیچھے چلا، اندھے بھی گرنے سے بچے۔ کیونکہ آنکھ والوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ خود بھی نہیں گرتے اور دوسروں کو بھی گرنے سے بچاتے ہیں۔ یہ اندھے عقل کے بھی اندھے ہوتے ہیں اور فکر کے بھی۔ عقل اور فکر کے اندھوں نے بحثیں تو بہت کی ہیں ، لیکن حل نہیں دیا۔ جبکہ عقلمندوں نے ہمیشہ معاشرے کو ایک حل دیا ہے، مسئلہ میں الجھایا نہیں۔ یہ دنیا کا دستور ہے کہ جب اللہ نے انسانوں کو دنیا کے وسیع و عریض سمندر میں زندگی کی کشتی پر سوار کیا تو اکیلا نہیں چھوڑا، بلکہ عقل کو رہبر بنا کر ساتھ کیا اور زندگی کے اصول و ضوابط سے روشناس کرایا،اور یہ بتانے کی بھی کوشش کی کہ نہ جاننا عیب نہیں ہے، جاننے کی کوشش نہ کرنا عیب ہے۔اس معاشرے میں اچھے لوگوں نے مذہب کے قانون کو ایسے دیکھا، جیسے وہ پیاسے ہوں اور ان کے سامنے صاف پانی بھی موجود ہو اور ان کی جان ایک گھونٹ پانی پی لینے کے لئے لمحے گن رہی ہو، تاکہ پیاس کی شدت میں کمی آئے اور دل کو سکون حاصل ہو لیکن ایک ڈاکٹر ہے، جو اپنے اوزار کے ذریعہ پانی کی جانچ کرتا ہے اور اس میں الگ الگ اقسام کے مہلک جراثیم کی خبر دیتا

ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ اس پانی کو استعمال کرنے سے پہلے اس کو صاف کر لو، ابال لو، تاکہ تمہاری پیاس بجھ جائے اور زندگی کو کوئی نقصان بھی نہ ہو۔اس لئے اس معاشرے کے اچھے لوگوں نے اپنے مذہب کو بھی مانا اور مذہب کی بھی مانی۔آج جو معاشرے میں خواتین کے لئے باتیں ہو رہی ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہ تو کبھی پاکستانی معاشرے نے خواتین کو بے عزت رکھنے یا کرنے کی اجازت دی ہے اور نہ اسلام نے کبھی عورت کے احترام کو ختم کیا۔اسلام نے عورت کو انسانی معاشرے میں سب سے اعلیٰ درجہ پر بٹھایا، لیکن شرط یہ رکھی کہ وہ عورت بھی صرف ایک عام عورت نہ ہو، بلکہ مریم جیسی ہو، تاکہ دی ہوئی عزت کے ساتھ انصاف ہو سکے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عورت اپنی عزت میں مریم ہو تو معاشرے کے مردوں میں اس کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں، کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا یہ میں نہیں ،قرآن کہہ رہا ہے۔قرآن پاک میں سورۃ مریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''مریم کے برابر مردوں میں کوئی نہیں'' اس آیت سے خواتین کی عزت و احترام کیا ہے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں خواتین میں ایک عظیم نام بی بی مریم کا ہے، مریم کا مطلب پاکیزہ ہوتا ہے۔ یعنی پاکیزگی، مریم کو ہمارے ملک کے عیسائی اور تقریباً تمام فرقہ کے لوگ بڑی عزت اور احترام سے جانتے ہیں۔اسلام میں توان کی بڑی اہمیت ہے، چاہے بدتر ہوں یا بہتر جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ایک معاشرہ بنتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کو انسانوں کے لئے اور انسانوں کو اپنے لئے بنایا ہے۔اللہ تعالیٰ نے

فرمایا کہ دنیا کو بنانے یعنی انسانوں کو پیدا کرنے،اور دنیا کی ترقی میں مرد، عورت کا محتاج ہے،اور اسی اللہ نے مریم کی کوکھ سے حضرت عیسیٰ کو پیدا کرکے عورت کی عظمت وطاقت دکھائی کہ عورت مرد کی محتاج نہیں ہے۔اسی لئے عورت کو آج ہم عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم ترقی کے مخالف نہیں ہیں، ہم مغربی تہذیب کے خلاف ہیں۔ کوئی بھی دنیا عورت کے بغیر ادھوری ہے۔ یعنی چل ہی نہیں سکتی۔آپ عورت کے جذبۂ ایثار وقربانی کا اندازہ لگائیں۔اس کا شوہر نکاح کے وقت نان ونفقہ یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کی ذمہ داری اٹھانے کا خود وعدہ کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت یہ نہیں مانگتی کہ اسے تیار کپڑا اور پکی پکائی روٹی چاہئے حالانکہ وہ یہ سب کچھ مانگ سکتی ہے۔ وہ چولہے کی آگ کی گرمی کو محسوس کرتی ہے، تبھی اپنا ہاتھ خود جلاتی ہے، لیکن وہ یہ برداشت نہیں کرتی کہ ان زحمتوں میں اپنے شوہر کو بھی اپنے ساتھ شامل کرے۔ حالانکہ وہ چاہے تو اسلامی قاعدوں کے مطابق تیار کھانا مانگ سکتی ہے۔ پھر بھی اپنے شوہر کی ذمہ داریوں میں بھی شانہ بشانہ حاضر رہتی ہے۔اسی طرح مختلف حلقوں میں عورت نے بڑے بڑے اہم کردار ادا کئے ہیں، جنہیں قطعی بھلایا نہیں جا سکتا۔جنگ آزادی سے لے کر آج تک پاکستان کی بنیادوں کو مضبوط بنانے میں خیالی اور عملی طور پر عورتوں کا بڑا ہاتھ اور تعاون رہا ہے۔اگر مذہب کی عزت اس کے دل میں ہے تو وہ جانتی ہے کہ اسے کہاں ہونا ہے اور کہاں نہیں۔وہ جہاں کہیں بھی مذہب کے ساتھ ہے، مذہب کی عزت ہے اور اگر بغیر مذہب کا مان

رکھے وہ گھر میں بیٹھی ہے تو وہ مذہب کے لئے بے عزتی کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر عورت مذہب کے بارے میں جانتی ہے، خود کو معاشرے میں محفوظ سمجھتی ہے اور خود کو محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتی ہے، تو اسے مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر ملک اور معاشرے کی ترقی میں حصہ داری سے کوئی نہیں روک سکتا۔ چاہے کسی بھی قسم کا علم ہو کوئی بھی شعبہ ہو ہر جگہ عورتوں کی موجودگی تعظیم و مبارکباد کے لائق ہے۔اسلام نے عورت سے صرف ایک ہی چیز مانگی ہے، وہ یہ کہ تم کہیں بھی رہو،قرآن نے تمہیں جو زندگی جینے کی تہذیب اور اصول دیئے ہیں، وہ یاد رہیں، یعنی قرآن کے دائرے کے اندر رہو۔قرآن کی آیتوں کے سائے میں رہو۔میں یہاں ایک خوبصورت واقعہ بتانا چاہتا ہوں۔امریکہ کے سابق صدر مسٹر ریگن ایران میں آئے اسلامی انقلاب کے زمانہ میں اپنی پارلیمنٹ میں کہا کہ ایران میں عورتوں کی بہت بری حالت ہے۔ انہیں جانوروں کی طرح پردے میں بند کر دیا گیا ہے، تو آیت اللہ خمینی نے تہران میں کہا کہ میں مسٹر ریگن کو دعوت دیتا ہوں۔ ہم ساتھ جنگل میں جاتے ہیں۔اگر جنگل کے جانور پردے میں ہیں تو ہم اپنے معاشرے میں بہتری کر لیتے ہیں اور اگر جنگل کے جانور ننگے ہوں تو وہ اپنے معاشرے میں بہتری کر لیں۔ ایران میں عورتوں کو پردے کی روایت کے ساتھ ہر میدان میں شانہ بشانہ رہنے کی اجازت دی ہے۔ایرانی صدر خاتمی کے وقت میں پچاس فیصد خواتین کا ریزرویشن بل پاس ہوا اور آج وہاں کے اہم عہدوں پر خواتین کام کر رہی ہیں اور ان کی خدمات سے ملک کی ترقی ہو رہی ہے۔ہم مغربی

تہذیب کی بات نہیں کرتے، لیکن ہماری پرانی تہذیب اور مغربی تہذیب میں خاصا فرق ہے۔ وہ یکسانیت کی بات کرتے ہیں اور ہم برابری کی بات کرتے ہیں ، ہم یکسانیت کی بات اس لئے نہیں کرتے کہ ہر معاشرے اور ہر مذہب میں ہر کام عورت سے نہیں لیا جا سکتا جیسے مسلمان عورت مرد کو قبر میں نہیں اتار سکتی، کیونکہ اللہ نے اس کے دل کو ممتا سے بھرا ہوا بنایا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کام کو انجام دینے میں کہیں خود ہی نہ مر جائے اس طرح اسلام میں عورت کے لئے یکسانیت نہیں ،برابری کی بات کہی گئی ہے۔ اس لئے ہم یکسانیت میں نہیں، بلکہ برابری میں یقین کرتے ہیں۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے، ''جو جتنا گناہوں سے بچتا ہے، اتنا ہی اللہ کے نزدیک ہے۔ چاہے وہ عورت ہو یا مرد''۔ ایک چیز جو بہت ضروری ہے، وہ یہ کہ عورتوں کا استحصال نہ ہو اور ہر میدان میں شانہ بشانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے سخت قوانین بھی ہوں، جن میں ان کی عزت وآبرو کی حفاظت ہو۔ ان کی حفاظت کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنایا جا سکے اور ہوس کے وہ درندے، جو عورتوں کا استعمال واستحصال کرتے ہیں، انہیں سخت سے سخت سزا مل سکے۔ اس سے عورتوں کو محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے اور باآبرو بھی۔

ہم امن کے حامی یا دہشت کے؟

زمین اور آسمانوں کا خالق اور رب ایک ہی اللہ ہے جس نے پہلے انسان آدم کو پیدا کیا۔ اسی نے آدم سے حوا کی تخلیق کی۔ اس کے بعد دنیا کے تمام انسانوں کے والدین آدم اور حوا کہلائے۔ کائنات اور انسان کی حقیقی تاریخ کا مصدقہ علم قرآن مجید سے ہوتا ہے جس کا حرف حرف کلام اللہ 'word of Allah' ہے۔ اس مقدس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے جبکہ خالق کائنات نے دنیا کے تمام انسانوں کے لئے اسے رہنمائی اور ہدایت کا منبع و سرچشمہ قرار دیا۔ تاہم ہدایت یافتہ وہی ہو سکتا ہے جو اللہ رب العالمین کی چند شرائط کو دل سے تسلیم کرتا ہو اور اس پر عمل کرنے کو تیار ہو۔ یہ عظیم اور مقدس کتاب اپنے علم و عرفان کو اس وقت منکشف کرتی ہے جبکہ اس کے حصول کا خواہشمند شعوری طور پر اس دن پر یقین رکھتا ہو جس دن خالق کائنات اگلے پچھلے تمام انسانوں کو پھر سے زندہ کرے گا اور اس کے ہر عمل کی پوچھ گچھ ہوگی۔ اس وقت دنیا کا ماہر سے ماہر سراغ رساں اور حکمراں بھی عام انسانوں کی طرح بے یار و مددگار کھڑا ہوگا اور اس کی گذری ہوئی زندگی کا ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے ویڈیو فلم کی طرح گردش کر رہا ہوگا۔ اس دن نہ کوئی بادشاہ ہوگا اور نہ ہی کوئی حکمراں۔ ہر کوئی اللہ رب

العزت کا بندہ ہوگا اور اس کے حضور سر جھکائے حیران و پریشان اپنے کرتوتوں کے ایک ایک ذرے کا احتساب کر رہا ہوگا۔ اس دن غیب کے پردے اٹھا دیئے جائیں گے۔ عام نظر سے پوشیدہ رہنے والے فرشتوں کے غول کے غول نظر آنے لگیں گے۔ ہماری زبانیں گنگ ہو سکتی ہیں لیکن ہمارے جسم کے اعضا و جوارح میں پوشیدہ چپس ہمارے ہر عمل کی روداد بیان کر رہی ہوگی۔ وہ دن اتنا سخت ہوگا کہ اس دن کی ہولناکی اور بے بسی کی تصویر کشی اللہ رب العالمین نے اپنی عظیم اور مقدس کتاب میں یوں کی ہے: ترجمہ: آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی۔ اس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی'' ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے، ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔'' دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا: ترجمہ: ''وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے بہت دور ہوتا۔ اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔'' 'آل عمران: 03.' کرہ ارض کے سارے انسان ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ اللہ بھی ایک ہی ہے۔ وہ صرف مسلمانوں کا ہی خدا نہیں بلکہ ہندوؤں، عیسائیوں، یہودیوں، سکھوں اور دنیا کی ہر قوم و نسل کا خدا ہے۔

تفریق توانسانوں میں ہے کہ اس نے قوموں کے ساتھ ساتھ خدا کو بھی بانٹ رکھا ہے۔ اللہ توانسانوں کا بہترین خیر خواہ ہے اور اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ اس کی رحمت اگر جوش میں آتی ہے تو کسی انسان نے پہاڑ کے برابر بھی گناہ کیا ہو ''سوائے شرک کے'' اسے پل بھر میں معاف کردیتا ہے اور اپنی رحمت کے سائے میں لے لیتا ہے بشرطیکہ انسان سچے دل سے اور پھر کبھی گناہ اور ظلم نہ کرنے کے ارادے سے اپنے رب کے حضور حاضر ہوجائے اور اسی کا ہو کر رہے۔ یہی پیغام دنیا کی ہر اس کتاب میں ملتا ہے جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ الہامی یا مقدس کتابیں ہیں۔

انسان کی رگوں میں دوڑنے والا خون بھی ایک ہے پھر یہ تفریق کیسی؟ جب انسان ایک دوسرے کا نسلی بھائی ہے تو وہ ایک دوسرے کا دشمن کیوں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کرہ ارض پر انسانوں کے ساتھ شیطان کی آمد نے انسانوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بوئے ہیں اور اس کا یہ عمل اللہ کے اِذن سے قیامت تک جاری رہے گا۔ اللہ رب العزت دراصل یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انسانوں میں کون اس کا وفادار ہے اور کون شیطان کا۔ شیطان نے یہی حرکت حضرت آدم کے ساتھ کی تھی اور ان کو جنت سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ لہٰذا اللہ نے جو اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے واضح طور پر متنبہ کردیا ہے۔ ''اے بنی آدم، ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کردے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروائے تھے تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ 'شیطان' اور اس کے

ساتھی ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔'' الاعراف : ۲۷ 'قرآن مجید کی اس مصدقہ اطلاع سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی اصل حقیقت اور اس کی تاریخ کیا ہے اور فی الحقیقت انسان کا دشمن کون ہے جو اسے ہر اس کام کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے جس سے دنیا فساد سے بھر جائے، یہاں کا امن و چین درہم برہم ہو جائے۔ سب سے بڑا فساد تو درحقیقت روحانی و ذہنی فساد ہے کہ انسان اپنے مالک، خالق اور رب کو چھوڑ کر شیطان اور اس کے حواریوں کی پیروی کرے۔ خالق کائنات کے تمام برگزیدہ پیغمبروں اور خاتم النبیین ﷺ کے بعد دنیا میں جو بھی روحانی و مذہبی بزرگ پیدا ہوئے انہوں نے ہمیشہ امن و سلامتی کی بات کی اور لوگوں کو امن و سلامتی ہی کی دعوت دی۔ کیونکہ انسان کی حقیقت یہی ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کا تحفظ اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے رب کی خواہش کے مطابق اسی کا بندہ بن کر رہے، دنیا میں ظلم نہ کرے، بے قصوروں اور نہتوں کی جان نہ لے، جنگ کی خواہش نہ کرے، امن کا دلدادہ ہو، ایک دوسرے کی خدمت کو اپنا شعار بنائے، جس زمین میں وہ پیدا ہوا ہے اس سے محبت ہی نہ کرے بلکہ اسے امن و سلامتی کا گہوارہ بنادے اور اپنے خالق و رب العالمین کی تخلیق کردہ فطرت سے بغاوت نہ کرے۔ انسان صرف اپنے جیسے انسانوں کا ہی دوست نہ ہو بلکہ روئے زمین کا ہر ذی روح ''جملہ حیوانات و نباتات'' انسانوں کی دوستی اور ہم نشینی پر فخر محسوس کرے۔ آج

پوری دنیا میں '' دہشت گردی'' کا جو ماحول بنا ہوا ہے اس کا محرک انسانوں کا وہ گروہ ہے جس نے شیطان کو اپنا محبوب بنا رکھا ہے۔ انسانیت کو تباہ کرنے والی، دہشت گردی دنیا کے خواہ کسی بھی خطے میں ہو ہر حال میں قابل مذمت ہے اور اسے روکنے کے لئے عملی اقدام کی شدید ضرورت ہے۔ انسانوں کے اس گروہ میں نام نہاد مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور وہ لوگ بھی جنھوں نے خود کو ایک خدا کی بندگی سے آزاد رکھا ہے اور دنیا میں اپنے ہی جیسے انسان بھائیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے میں حظ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ظلم و فساد کا دور لمحاتی ہوتا ہے۔ ان کی حرکتوں کو خالق ریکارڈ کر رہا ہے اور وہ ذرے ذرے کا حساب لینے والا قادر مطلق ہے۔ انسانی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ دنیا کا جابر سے جابر حکمراں بھی مٹی ہو گیا۔ لہٰذا ہمارا پیام یہی ہے کہ ظلم و فساد کے راستے کو ترک کرکے دنیا کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنائیں اور منافقت کی روش کو اختیار نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی امن و سلامتی کی راہ پر چلنے والوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ شیطان کا مکر و فریب سب سے برا ہوتا ہے وہ انسان کو انسان ہی کے ہاتھوں ہلاک کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے لہٰذا ہم شیطان کی چالوں سے ہمہ دم چوکنا رہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں جنگ کی لامتناہی چکی میں پیس کر دور بیٹھا ہوا قہقہا لگاتا رہے اور ہم تباہ و برباد ہو جائیں پھر شاید ہمارا کوئی پرسان حال بھی نہ ہوگا۔

سقوط ڈھاکہ۔۔۔۔۔۔بلوچستان

ون یونٹ کا خاتمہ ہی صوبائیت اور علیحدگی پسند تحریکوں کی پہلی وجہ بنا جس کے زمہ دار اس وقت کے آرمی چیف اور صدر جنرل ایوب خان تھے۔بنگال کے سیاسی و مذہبی راہنماء صرف اور صرف اپنے حقوق کا تحفظ اور شناخت چاہتے تھے مگر ان کے مطالبے کے جواب میں انہیں کیا ملتا تشدد اور موت،1971ء کے انتخابات کے نتائج کو اگر مان لیا جاتا تو شائد بنگال بنگلہ دیش نہ بنتا اور آج بھی پاکستان کی ایک اکائی ہوتا۔لیکن مشرقی پاکستان کے خود سر اور نشے میں دھت رہنماء بنگالیوں کو حقارت سے دیکھتے اور انہیں بھوکے بنگالی کہہ کر پکارتے بنگالیوں کا کہنا تھا کہ مغربی بنگال کو بھی وفاق کے بجٹ سے اتنا ہی حصہ دیا جائے جتنا کہ آبادی اور مسائل کے لحاظ سے لاہور اور کراچی کو دیا جاتا مگر اس طرف کے آقاؤں کو یہ بات گوارا نہ تھی۔اور نعرہ لگا دیا گیا،،ادھر تم ادھر ہم،،اگر کسی کی آزادی اور حقوق کو سلب کیا جائے تو پھر کیا ہوگا۔وہی ہوگا جو بنگالیوں نے کیا علیحدگی کی راہ لی اور ہتھیار اٹھا لئے۔کچھ ایسا ہی کھیل ان دنوں بلوچستان میں کھیلا جا رہا ہے۔عام بلوچی کو جاہل واجڈ سمجھ کر بات کرنا گوارا نہیں کی جاتی اور اگر کوئی سردار ہے تو اسے دلال سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر بلوچ

چاہتا کیا ہے۔ویسی ہی ترقی جیسی لاہور،اسلام آباد اور کراچی میں ہو رہی ہے یا پھر وہی مراعات و سہولیات جیسی ان خوبصورت اور جدید شہروں کو دی جارہی ہیں۔بلوچ عوام کو کھانے پینے کی اشیاء دوسرے صوبوں سے زیادہ مہنگے داموں ملتی ہیں۔ذرائع آمدورفت کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔سوئی کے مقام سے گیس نکلتی ہے مگر مقامی لوگوں کو یہ سہولت میسر نہیں۔کہ اسے استعمال کر سکیں انڈسٹری کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے بہت سے علاقوں میں بجلی ہے نہ پانی سڑکوں کا جہاں جال بچھا ہونا چاہئے تھا وہاں بڑے شہروں کو ملانے والی چند سڑکوں کے علاوہ کوئی نئی سڑک نہیں بنائی گئی اک گوادر پورٹ سے ترقی کی امید لگائی گئی تھی اسے بھی 40 سال کے لئے سنگاپور کو دیدیا گیا ہے بلوچستان معدنیات سے مالا مال صوبہ ہے رب تعالیٰ کی خاص عنائتیں ہیں۔اس صوبے پر یہاں سے سوئی گیس نکالی جاتی ہے سونا ہے خام تیل ہے قیمتی پتھر ہیں۔اور سب سے اہم بحر ہند پر واقع ہونے کے باعث پورے مڈل ایسٹ کے لئے ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔جسے عالمی تجارتی روٹ بنا دیا جائے تو کروڑوں ڈالر راہداری کی مد میں اکٹھے کئے جا سکتے ہیں۔مگر اب سوچنے والی بات یہ ہے کہ یہ سب انعامات الٰہیہ ہونے کے باوجود بلوچستان پسماندہ کیوں ہے۔اور وہاں علیحدگی کی تحریکیں تیزی سے جڑ کیوں پکڑ رہی ہیں۔اس کی بڑی وجہ ہماری اسٹیبلشمنٹ اور سیاسی گماشتوں کی ریشہ دیوانیاں ہیں۔ہم اپنے فیصلے خود کرنے کی بجائے تیسری طاقت کے اشاروں پر ناچنے والی قوم بن چکے ہیں۔جب سے اکبر بگٹی کو قتل کیا گیا

اس کے پوتے براہمداغ بگٹی پہاڑوں میں چھپ گیا اور غیر ملکی آقاؤں سے مل کر پاکستان سے علیحدگی کی تحریک کو مضبوط کرنے میں مصروف ہوگیا۔اکبر بگٹی کے قتل کا واقعہ نیا نہیں ہے۔اس سے قبل ذوالفقار بھٹو کے دور میں عطاء اللہ مینگل کے بیٹے اسداللہ مینگل کو مارا گیا۔بلوچستان میں جاری علیحدگی پسند تحریکوں کی قیادت پانچ گروہوں یا جماعتوں کے پاس ہے۔جن میں بلوچستان لبریشن

آرمی، جنڈولہ، پاداری، نیشنل لبریشن فرنٹ،اور پاپولر فرنٹ شامل ہیں۔ان جماعتوں کو منظم و متحرک کرنے میں جن سیاسی جماعتوں کا عملی کردار ہے ان میں بلوچستان نیشنل پارٹی، جمہوری وطن پارٹی، نیشنل پارٹی، بلوچستان نیشنل موومنٹ، بلوچ ریپبلکن پارٹی، بلوچ نیشنل فرنٹ، بلوچ پیپلز پارٹی،قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی، بلوچستان سٹوڈنٹ آرگنائزیشن،اور عوامی پارٹی شامل ہیں۔ان تحریکوں نے اپنے عسکری یا مسلح گروپ بھی تشکیل دیئے ہوئے ہیں۔اور جن بلوچ رہنماؤں کی قیادت ان تحریکوں کو حاصل ہے ان میں براہمداغ بگٹی، گل خان بلوچ،غلام محمد بلوچ، عبدالحئی

بلوچ، حمید بلوچ، میر نورالدین مینگل، پرنس کریم آغا خان، یوسف

عزیز مگسی، شیر محمد مری، اختر مینگل،اور عطاء اللہ مینگل شامل ہیں۔1948ء

میر احمد یار خان نے علیحدگی کی پہلی تحریک چلائی اس کے بعد شیر محمد بجرانی، نواب خیر بخش مری، نواب اکبر بگٹی اور آخر میں میر بلوچ مری نے 2004ء میں علیحدگی کی تحریک چلائی۔ عاصمہ جہانگیر نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے سینکڑوں بلوچی اپنے گھروں سے غائب ہیں جن کا آج تک کچھ اتا پتا نہیں ہے اسی طرح ایک بڑی

تعداد کو گولیوں کا نشانہ بنا کر مار دیا گیا۔ایف سی بلوچستان میں بلیک واٹر کا کردار ادا کر رہی ہے۔ چلیں مان لیا کہ فراریوں کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جا سکتے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مطالبات کی فہرست بھی طویل ہو گئی ہے۔اور اب وہ سرے سے پاکستان کے جھنڈے کے ہی خلاف ہو چکے ہیں۔ مگر پھر بھی ان سے مذاکرات کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔تاکہ غیر سندھی اساتذہ، وکلاء، اور سٹوڈنٹس کو بہیمانہ موت مرنے سے بچایا جا سکے۔آمنے سامنے بیٹھ کر بلوچی سرداروں اور سیاسی جماعتوں کی بات سنی جائے تاکہ کسی بہتر حل کی طرف جایا جا سکے۔ ورنہ بلوچستان میں جو علیحدگی کے نعرے لگ رہے ہیں۔ بہت جلد ان کے سچ ہونے کی آوازیں بھی آنے لگیں گی۔اور سقوط ڈھاکہ کے بعد بلوچستان کی علیحدگی کا عمل ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔اس کے بعد پاکستان کے مزید ٹکڑے ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ تمام ایجنسیوں اور حکمرانوں سے التجا ہے کہ بلوچستان کو دوسرا مغربی پاکستان ہونے سے بچایا جائے۔ ورنہ تاریخ کے چہرے پر ایک اور بدنما داغ لگ جائیگا۔

اے اللہ! ہم پر جہنم کی آگ کو حرام فرمادے

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور آپ کی انسیت کے لیے حضرت حوا کی پیدائش کا نظم کیا، اور ان دونوں کو جنت میں ٹھکانا دیا، باوا آدم کی ایک غلطی کی وجہ سے آپ کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا گیا اور انسانوں کو اپنی حقیقی اور اصلی آماجگاہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایک شرط رکھی گئی کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے تمام احکام بجالائیں، اسی صورت میں ان کے لیے جنت میں دوبارہ جانا ممکن ہے، ورنہ جہنم کی آگ کا ایندھن بنایا جائے گا۔اب سوال یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قرآن اور حدیث میں ہم مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کو جہنم سے کیوں ڈرایا ہے؟ اور جہنم ہے کیا چیز کہ اس سے خوف محسوس کیا جائے؟ اور اس کے ایندھن کون بننے والے ہیں؟ ایندھن کے لفظ سے آپ لوگوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ جہنم آگ سے بنائی گئی ہے، یہ آگ دنیا کی آگ کے مثل نہیں ہوگی، بلکہ اس کی تپش دنیا کی آگ سے ہزاروں گنا زیادہ ہوگی، حالانکہ ہم لوگوں کو دنیا کی آگ کو برداشت کرنا ناممکن ہے اور تھوڑی دیر میں انسان اس دنیاوی آگ میں جل کر بھسم ہوجاتا ہے، جہنم کی آگ کو کروڑوں اور اربوں سال سے جلا کر رکھا گیا ہے اور روز بروز اس کی تپش میں اضافہ ہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے سورہ واقعہ میں جہنم کی منظر کشی اس طرح کی ہے۔" وہ لوگ آگ میں

ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھویں کے سایے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش'' آگے اللہ تعالیٰ جہنمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ '' اے گمراہ جھٹلانے والو! زقوم کے درخت سے کھانا ہوگا'' (زقوم کا درخت کانٹے دار ہوتا ہے، اسی کو دوسری جگہ اللہ نے شیطانوں کے سروں سے تشبیہ دی ہے کہ زقوم کے درخت کے کانٹے شیطانوں کے سروں کے مانند ہوں گے) پھر اسی زقوم کے درخت سے پیٹ بھرنا ہوگا، پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا، پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کے مانند، یعنی جو جہنم میں جائے گا وہ بہت ہی زیادہ پیاسا ہوگا اور پیاس کی شدت کی وجہ سے اس کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آئے گا اور گھٹا گھٹ کھولتا ہوا، منہ اور حلق کو جلانے والا پانی پئے گا، اس سے اس کی پیاس بجھنے کے بجائے پورا چہرہ، منہ اور حلق جھلس کر رہ جائے گا۔ جہنمیوں کی غذا میں اس کا بھی تذکرہ آتا ہے کہ ان کو خون اور پیپ کھانا پڑے گا، کھائے بغیر چارہ نہیں ہوگا، فرشتے کوڑے لیے ہوں گے اور ان کے سروں، سینوں اور جسم کے ہر حصے پر ماریں گے، ایسی مار جو فرشتوں کی ہوگی، ایسی مار جس کو ہاتھی بھی برداشت نہ کرسکے، ہر طرف زہریلے بچھو اور سانپ ہوں گے جو ہر وقت اور ہر لمحہ جہنمیوں کو ڈسیں گے، اوپر سے آگ، نیچے سے آگ، دائیں سے آگ اور بائیں سے آگ، اس کے علاوہ ہر قسم کا موذی جانور، کیڑے مکوڑے اس کو تکلیف دے رہے ہوں گے، کوئی لمحہ تکلیف سے خالی نہیں ہوگا، ایسی تکلیف جو کسی کے بھی برداشت میں نہیں ہوگی، حدیث میں سب سے ہلکی سزا یہ

بتائی گئی ہے کہ آگ کے دو جوتے پہنائے جائیں گے، جن سے دماغ کھولنے لگے گا، ہر ایک جرم کی الگ الگ سزا احادیث میں بیان کی گئی ہے، جن کی تفصیلات کی یہ جگہ نہیں ہے، خلاصہ کلام یہ کہ کسی بھی طرح کا تھوڑی دیر کے لیے بھی، بلکہ ایک سکینڈ کے لیے بھی سکون اور امن نہیں ہوگا۔ جہنمیوں کو ان سزاؤں کے ساتھ جنتیوں کی نعمتیں بھی دکھائی جائیں گی تاکہ ان کی تکلیف میں اور زیادہ اضافہ ہو، اور ان کو ہر لحہ اپنی دنیاوی زندگی پر افسوس ہو اور کاش کاش پکارتے رہیں، سزا ایک عذاب ہوگا اور نعمت سے محرومی کا احساس دوسرا عذاب ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ عذابِ الٰہی کے مظہر یعنی جہنم کا ایندھن کون بنیں گے، اللہ تعالی سورہ بقرہ میں فرماتا ہے کہ "ایسی آگ سے بچو جس کے ایندھن آگ اور پتھر ہوں گے، جس کو ناشکروں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔" اللہ تعالی سورہ آل عمران میں فرماتا ہے کہ "بیشک جن لوگوں نے ناشکری کی ان کا مال اور ان کی اولاد ہرگز ہرگز اللہ کی طرف سے کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر پائیں گے، وہی لوگ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔" اور ایک جگہ سورہ تحریم میں مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ "اے ایمان والو! خود کو اور اپنے گھر والوں کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہاں مضبوط اور سخت فرشتے ہوں گے" (جو ہر وقت جہنم میں موجود لوگوں پر کوڑے برسائیں گے) اللہ ان کو جو بھی حکم دیتا ہے وہ نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے بجالاتے ہیں۔ جہنم کا ایندھن وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے احکام کو چھوڑ کر دوسروں کے

احکام کی پیروی کریں گے۔ اور اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے دعا
ہے کہ وہ ہمیں ہر وقت اور ہر لمحہ جہنمی اعمال اور اللہ کو ناراض کرنے والے کاموں
سے محفوظ رکھیں اور ہم پر جہنم کی آگ کو حرام فرمادے۔ آمین۔

دہشت گردی لمحہ فکریہ!

نیا سال شروع ہوتے ہی ایسا لگتا ہے کہ دہشت گردی نے بھی زور پکڑ لیا ہے صرف چند ہفتوں میں ہی پاکستان میں سیکڑوں افراد دہشت پسندوں کا شکار بن گئے۔ کراچی میں مختلف مقامات پر ٹارگٹ کلنگ میں کئی افراد کی ہلاکت نے ایک بار پھر یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ آخر یہ دہشت گردی کہاں جا کر تھمے گی اور اس کا کوئی انت ہے بھی یا نہیں۔ تشدد اور دہشت گردی گرچہ یکساں زمرے میں آتے ہیں لیکن اول الذکر کو عدم تشدد کے فارمولے سے روکا جا سکتا ہے لیکن دہشت گردی کی روک تھام کے لئے لفظ عدم کا استعمال کہیں نہ سننے میں آتا ہے نہ استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا مطلب ہی دہشت پھیلانا ہے۔ لیکن اگر یہ کسی کی جان لئے بغیر محض دہشت پھیلانے کی حد تک ہی محدود رہتا تو آج دنیا کے بیشتر ممالک خاص طور پر افغانستان، پاکستان اور عراق اس کا شکار ہو کر کمزور نہ پڑتے۔ وہاں کی حکومتیں آئے روز ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوتیں اور دشمن عناصر اس لفظ دہشت گردی کا استعمال کرکے اپنا الو سیدھا نہ کرتے۔ دہشت گردی کا نہ تو کوئی مذہب ہے نہ ہی اس کی کوئی قومیت اور نہ ہی اس کی کوئی نسلی ،
لسانی، علاقائی ،مذہبی یا مسلکی شناخت ہے۔ البتہ اس کی کئی قسمیں ضرور ہیں جو آئے روز نت نئے انداز میں سامنے آتی ہیں اور دہشت گردی کے ایک سے ایک نیا روپ

پاکستان

میں سب سے پہلے دیکھنے کو ملتا ہے اگر بارودی سرنگ کی تکنیک صدیوں پہلے چین نے ایجاد کی اور اسے ایل ٹی ٹی ای نے استعمال کیا تو پاکستان نے ٹارگٹ کلنگ کی شکل میں نئے انداز کی دہشت گردی سے دنیا کو متعارف کرایا ہے جسے آج وہاں سرگرم انتہا پسند کراچی میں خوب استعمال کر رہے ہیں۔ حالیہ دہشت گردی سے پہلے کہیں یہ آئرش دہشت گردی سے جانی جاتی تھی تو کہیں تامل ٹائیگروں اور خالصتان حامیوں کی دہشت گردی سے جانی جاتی تھی لیکن یہ تمام دہشت گردیاں افہام و تفہیم اور مذاکرات کے بعد ختم ہو گئیں مگر آج دہشت گردی بین الاقوامی سطح پر اسلامی دہشت گردی سے جانی جارہی ہے جسے پاکستانی انتہا پسند تنظیمیں اور القاعدہ و طالبان اور کئی مختلف اسلامی ناموں سے سرگرم دہشت گرد تنظیموں کی وجہ سے اسلامی دہشت گردی کا عنوان دے دیا گیا ہے کیونکہ اس وقت پوری دنیا القاعدہ، طالبان، لشکر طیبہ، حزب اللہ اور حزب المجاہدین سمیت نہ جانے کتنے اسلامی ناموں سے چلائی جانے والی تنظیموں کے دہشت گردوں سے پریشان ہے جس نے نہ صرف مغربی ملکوں کی حکومتوں کو تشویش میں اور عوام کو دہشت میں مبتلا کر دیا ہے بلکہ جن ملکوں میں یہ سرگرم ہیں ان ملکوں کی سرزمین کو اسی کے باشندوں کے خون سے رنگ رکھا ہے۔ کہیں دہشت گردی شہری حقوق کے حصول کے لئے تھی تو کہیں علیحدہ ریاست کے قیام کے مطالبہ پر زور ڈالنے اور کہیں کسی غاصب اور ظالم و جابر حکمراں سے نجات حاصل کرنے کے لئے مسلح تحریک کی شکل میں تھی جس نے ایسا زور پکڑا اور یہ ایسا منفعت بخش

کاروبار بناکہ بے روزگاروں یا پست کردہ طبقات کے نوجوانوں کو اس میں کسی ڈگری یا قابلیت و صلاحیت کے بغیر ہی اچھے معاوضے پر کام ملنا شروع ہو گیا اور دہشت گردی کے پس پشت کارفرما ذہن یا لابی کو اور کیا چاہئے تھا اس نے ان نوجوانوں کے جوش اور ان کی مالی کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کا ایسا استعمال شروع کیا کہ وہ انسانیت کو ہی بھول بیٹھے اور اپنے آقاؤں کے اشاروں پر بم پھینکنے، اندھادھند فائرنگ کرنے، ٹرینوں یا بسوں میں بم دھماکے کرنے، بارودی سرنگیں بچھانے اور یہاں تک کہ سرفروشی کے جذبہ سے سرشار ہو کر جسم پر بم باندھ کر کسی بھی جگہ گھس کر خود کو دھماکے سے اڑانے کو ایسا کار خیر سمجھنے لگے جو انہیں ایسا کرتے ہی داروغہ جنت کو ان کے لئے فوراً جنت کے دروازے کھول دینے پر مجبور کر دے گی۔ آخر اس دہشت گردی کا مقصد کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دہشت گردی ان کے خون میں رچ بس گئی ہے اور ان کی رگ و پے میں ایسی سرایت کر گئی ہے کہ ان کا خمیر صلہ رحمی اور عفو و درگذر سے عاری ہو چکا ہے اور پر امن بقائے باہم کے تصور کی رمق بھی ان کے ذہنوں میں نہیں ہے۔ آخر بے قصوروں کا خون بہانے سے ان کو کیا حاصل ہو رہا ہے۔ یہی دہشت گرد ان ماؤں سے پوچھیں جن کی گودیں انہوں نے اجاڑ دیں اس باپ سے پوچھیں جسے ان دہشت گردوں کی انسانیت سوز حرکت سے اپنے بوڑھے کندھوں پر جوان اولاد کا جنازہ اٹھانا پڑا اور ان کمزور عورتوں کے دلوں کا حال پوچھیں جن کے سہاگ انہوں نے بیدردی سے لوٹ لئے۔ شائد کہ مذہبی تعلیم سے نہ سہی ان

لوگوں کے رنج و غم اور آہ و بکا دیکھ کر ہی یہ دہشت گردی سے توبہ کر لیں۔ جس طرح ہر سوال کا کوئی جواب اور ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے اسی طرح دہشت گردی بھی کسی عمل کا رد عمل یا جواب ہو سکتی ہے لیکن رد عمل اور جواب، جو وقتی اور فوری ہوتا ہے، کے برعکس یہ ایک ایسا مسلسل عمل بن گئی ہے جو ایک روز خود ان افراد، تنظیموں، اداروں اور ملکوں کے لئے ایسی آفت مسلسل بن جائے گی کہ وہ خود اس کا شکار ہو جائیں گے۔

مذاکرات یا آپریشن

پاکستان میں دہشت گردی کی لہر نیو یارک میں جڑواں ٹاور پر 9/11 دہشت گردانہ حملہ اور اس کے بعد افغانستان پر امریکی قیادت میں غیر ملکی حملہ و فوجی کارروائی کے بعد سے ہی شروع ہوئی ہے۔ جس سے اب تک پاکستان میں 40 ہزار افراد ہلاک، سیکڑوں ہزار معذور اور لاکھوں بے گھر ہو گئے ہیں، شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پورا ملک دہشت گردی کی آگ میں جل رہا ہے۔ گذشتہ 13 سال کے دوران پاکستان نے دہشت گردی کی ہر وہ قسم دیکھ لی جس کا پر امن دنیا میں شاذ و نادر ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس دہشت گردی نے صرف مسلمانوں کو ہی نشانہ نہیں بنایا بلکہ بلا امتیاز سبھی اس کا نشانہ بن رہے ہیں۔ مسجدیں چاہے شیعہ مسجد ہو یا سنی مسجد، مندر، چرچ، انتہائی گھنی آبادی میں واقع رہائشی اپارٹمنٹس، ہوٹل، عوامی مقامات، اسکول، تھانے اور فوجی ہیڈ کوارٹرز غرضیکہ سبھی دہشت گردوں کا نشانہ بنے ہیں۔ لا تعداد مذہبی رہنما، دانشوران، علماء، مصنفین، صحافی، پروفیسرز، ڈاکٹرز، سوشل ورکرز، اسکولی بچے، سیاح، سیاستداں، ممبران پارلیمنٹ، پولیس و فوج کے اعلیٰ افسران سے لے کر ادنی اہلکار مارے جا چکے ہیں۔ جیلوں پر حملہ کر کے القاعدہ اور طالبان کے بہت سے خطرناک انتہا پسندوں کو آزاد کرا دیا گیا۔ دہشت گردی کی ان وارداتوں کی پاکستان کی کالعدم انتہا پسند تنظیمیں اور طالبان

کے مختلف گروہ متواتر اور کھلم کھلا ذمہ داریاں لیتے رہے۔ اور دوسری جانب حکومت پاکستان، غیر فوجی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں، نیم فوجی طاقتیں اور فوج دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ وصولی، تاوان، اجتماعی جنسی زیادتی اور لوٹ کی وارداتوں پر قابو نہ پا سکیں۔ ہر مہلک حملے اور ہلاکتوں و خونریزی کے بعد اعلیٰ وزراء اور حکام جائے وقوعہ پہنچتے ہیں، روایتی ٹسوے بہاتے ہیں، ہلاک شدگان کے لواحقین اور زخمیوں کو معاوضہ کے اعلان کے ساتھ تعزیتی کلمات کہہ کر چلتے بنتے ہیں۔ لیکن وہ اعلان کردہ معاوضہ ہلاک شدگان کے پسماندگان یا زخمیوں کو شاید ہی کبھی دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور کراچی کے عباس ٹاؤن میں واقع گارمنٹس ٹاؤن فیکٹری میں آتشزدگی، جس میں 300 افراد ہلاک ہوئے،، کوئٹہ میں ہزارہ قبیلہ کے افراد کی خونریزی، پشاور کے بازار میں بم دھماکہ اور نہ جانے کتنے حادثات و وارداتوں میں ہلاک ہونے والوں کے لواحقین اور زخمیوں کو آج تک معاوضہ نہیں ملا۔ وہ انتہائی بدقسمت غریب متاثرین آج تک معاوضہ کے انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کب ملے کہ وہ اپنا اور اپنے مکلفین کا پیٹ پال سکیں اور سر چھپانے کا ٹھکانہ کر سکیں۔ پاکستانی عوام کی قسمت اب دہشت گردوں کے رحم و کرم اور پاکستانی حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ سلسلہ جنرل پرویز مشرف کے دور اقتدار کے خاتمہ کے بعد قائم ہونے والی غیر فوجی حکومت کے قیام کے بعد سے ہی جاری ہے۔ ابھی تک کوئی بھی دہشت گرد نہ تو پکڑا گیا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دی گئی کہ دوسرے دہشت گردوں کو سبق ملتا۔ اس کے

بجائے حکومت اور حزب اختلاف پانچ سال سے جاری اس دہشت گردی کا ٹھیکرہ مشرف حکومت کے سر پھوڑ رہے ہیں۔پاکستان کے عوام بڑے بد قسمت ہیں اور محسوس کر رہے نہیں کہ وہ جہنم میں رہ رہے ہیں اور کوئی انہیں اس جہنم سے نجات دلانے والا نہیں ہے۔سب سے زیادتکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ صدر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ سے لے کر وزیر داخلہ تک کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ عوام میں آ کر "معذرت" لفظ کہیں اور اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مستعفی ہو جائیں۔انہوں نے مغربی دنیاکے بینکوں میں لاکھوں ڈالر جمع کر رکھے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں پر تعیش رہائش گاہیں حاصل کر رکھی ہیں۔بدقسمتی سے نہ صرف سارا نظام بد عنوان ہے بلکہ حکومت بھی عوام کی زندگیوں اور ان کی عبادت گاہوں، اسکولوں، اسپتالوں، بازاروں، اور مکانات کو تحفظ بہم پہنچانے میں مکمل ناکام ہو گئی۔یہ حملے ایک منصوبہ کے تحت ان طاقتوں نے کیے یا کرائے ہیں جو امریکہ اور یورپ کے لیے افغانستان اور عراق کی طرح پاکستان میں بھی فوجی کارروائی کا جواز پیدا کر رہے ہیں۔یہ ملک دشمن عناصر پاکستان اور بیرون پاکستان ہو سکتے ہیں۔یہ پاکستان کے استحکام کے لیے انتہائی خطرناک اور بہت سنگین اشارہ ہے۔پاکستانی قوم کو اپنے نسلی، طبقاتی، مسلکی اور مذہبی اختلافات فراموش کرکے باہمی اتحاد ویکجہتی کا زبردست مظاہرہ کرنا پڑے گا۔انہیں دہشت گردوں اور ان کی دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا پڑے گا۔انہیں اپنی حکومت پر دباؤ ڈالنا ہوگا کہ ان دہشت گردوں اور جرائم

پیشہ عناصر سے نہ کوئی رعایت برتی جائے اور نہ ہی ان سے کوئی سمجھوتہ کیا جائے اور پاکستانی فورسز ان کی سرکوبی کے لیے جس حد تک ہو سکے اتنی طاقت سے ان کے خلاف فوجی کارروائی کریں۔پاکستانی فورسز پر سرکاری خزانہ کا 70 فیصد حصہ لٹا دیا جاتا ہے لیکن اتنا خزانہ لٹانے سے کیا حاصل اگر وہ دہشت گردوں سے ہی نہ نمٹ سکیں۔

اسلام میں خواتین کے حقوق و فرائض

اگر عورت اچھی ہے تو ریاست بھی اچھی ہو گی۔ اگر وہ خراب ہے تو ریاست بھی خراب ہو گی۔ جس طرح ستون کو دیکھ کر کسی عمارت کی مضبوطی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اسی طرح معاشرہ میں عورت کی حیثیت کو دیکھ کر قوم کی عظمت اور سربلندی کا اندازہ باآسانی کیا جاسکتا ہے۔ معاشرہ کا یہ ستون اگر مضبوط ہے تو اس پر قوم کے امن وعافیت کی چھت ڈالی جاسکتی ہے۔اس وقت یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اگر عورت کا معاشرے کو بنانے اور بگاڑنے میں اتنا اہم رول ہے تو اس کو وہ اہمیت کیوں نہیں دی جاتی جس اہمیت کی وہ مستحق ہے۔ اگر عورت ہی معاشرے کی بنیاد ہے تو اس بنیاد کو مضبوط کرنے پر توجہ کیوں نہیں دی جاتی۔ ظہور اسلام سے پہلے عورت کی زبوں حالی سے ہر ایک واقف ہے کہ اس کی حیثیت پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں تھی۔ پھر ایک روشن زمانہ آیا۔ اسلام نے کہا کہ اس مطہر اور مقدس مخلوق 'عورت' کو خرید و فروخت کا سامان مت بناؤاور موت کے بعد اسے اس طرح مت تقسیم کرو جس طرح تم وراثت کی دیگر چیزیں تقسیم کرتے ہو۔ اگر یہ ماں ہے تو اس کے قدموں تلے اپنی جنت تلاش کرو،اگر یہ بیٹی ہے تو اس کی بہترین پرورش کے عوض تمہیں جنت کی بشارت دی جاتی ہے۔ اگر یہ بہن ہے تو اس کے باعث تم صدقہ وجہاد کے ثواب کو حاصل کروگے اور اگر یہ بیوی ہے تو یہ تمہارا لباس ہے، تمہیں

ڈھانپ لینے والی اور تمہاری تمام ترکجیوں پر پردہ ڈال کر تم سے محبت کرنے والی۔اسلام ایک ایسا دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو زندگی گزارنے کا ایک نقشہ دیتا ہے۔اپنے ماننے والوں کے حقوق بھی وہ صاف صاف بتاتا ہے اور فرائض بھی۔ قرآن مجید جس طرح مردوں کو مخاطب کرتا ہے اسی طرح عورتوں کو بھی ہدایات دیتا اور ان سے مطالبات کرتا ہے۔ اسلام کی رو سے دین کے معاملے میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اِنسانی مرتبے میں عورت اور مرد برابر ہیں۔ جسمانی اعتبار سے اور دائرہ کار کے لحاظ سے اگرچہ دونوں میں فرق ہے مگر بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔اسلام نے عورتوں کو جہاں ان کے حقوق سے روشناس کرایا وہیں انہیں ان کی ذمے داریوں کا احساس بھی دلایا۔ ہم یہاں پر خواتین کے حقوق اور ان کے فرائض پر الگ الگ روشنی ڈالیں گے۔اسلام نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ کسی عورت کے ساتھ صرف عورت ہونے کی بنیاد پر ناانصافی نہ ہونے پائے۔نہ اس کی صلاحیتیں کچلی جائیں اور نہ اس کی شخصیت کو دبایا جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوشش کی کہ اسلام نے انسانوں کو جو حقوق دیے ہیں ان سے مرد بھی واقف ہوں اور عورتیں بھی۔ دونوں اپنے حقوق حاصل کریں اور اپنے اپنے فرائض کو اپنے دائرہ اختیار میں بخوبی ادا کریں۔ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ ”عورتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ کے حضور میں ہمیشہ مردوں کا ہجوم رہتا ہے اس طرح ہم خاطر خواہ آپ سے استفادہ نہیں کرپاتیں۔ چنانچہ آپؐ ایک وقت متعین

کرکے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں نیک کاموں کا حکم دیا۔ پھر آپؐ نے مسجد میں عورتوں کے لیے الگ وقت مقرر کیا جس میں عورتیں آپؐ سے آکر مختلف مسائل پر گفتگو کرتیں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو مسجد میں آکر نماز ادا کرنے کی اجازت دی اور فرمایا کہ ''مسلمان عورتوں کو مسجد میں آنے سے مت روکو۔'' اسلام نے مرد اور خواتین کو باہم ایک دوسرے کے ولی اور نیکی کے کاموں میں معاون قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے: ''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔ اچھے کام کی تلقین کرتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں، جن پر اللہ رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔'' (سورہ توبہ: 9) آج اسلام کو بدنام کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین کو ان کے حقوق سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ انہیں جانیں۔ آج خواتین کا دین اور شریعت کے سلسلے میں علم بہت محدود ہے اس لیے عائلی مسائل کھڑے ہوگئے ہیں اور اسی وجہ سے خواتین کا استحصال ہوتا ہے۔ عورت کو اسلام نے مختلف امور میں جو حقوق دیے ہیں ان کی فہرست طویل ہے البتہ مختصر طور پر ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔ اسلام کی رو سے وراثت میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کا بھی حق ہے۔ قرآن مجید میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ ماں باپ کی وراثت میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے۔ اس طرح عورت بیٹی، بیوی، ماں وغیرہ مختلف حیثیتوں سے میراث میں حصہ

دار قرار پاتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں اسلام میں عورت کو جائیداد کو خریدنے اور بیچنے کا پورا اختیار ہے نیز پیسہ کمانے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا بھی پورا حق حاصل ہے۔اسلام شادی کے معاملے میں مرضی، پسند، محبت اور مفاہمت کو آخری حدتک اہمیت دیتا ہے اور صحیح معنوں میں میاں بیوی کو رفیق زندگی اور شریک زندگی کا درجہ دیتا ہے۔قرآن مجید میں عورتوں کو مردوں کی کھیتی کہا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں مگر اس کی حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ وہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام عورت کو صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین سمجھتا ہے۔ جب کہ عورت کو مرد کھیتی کہنے کی حقیقت یہ ہے کہ کسان کو کھیتی سے والہانہ عشق ہوتا ہے، وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، اس کو ہر آفت سے بچاتا ہے۔ ہر وقت اس کا دل کھیتی اور اس سے متعلق کاروبار میں پڑا رہتا ہے نیز وہ صرف اپنی ہی کھیتی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے دوسرے کی کھیتی سے اسے کوئی واسطہ اور مطلب نہیں ہوتا۔اسلام چاہتا ہے کہ جو تعلق کھیتی اور کسان کے درمیان ہوتا ہے وہی تعلق میاں اور بیوی کے درمیان بھی ہونا چاہیے ،ویسا ہی عشق اور لگاؤ ہونا چاہیے۔ اپنی بیوی اور شریک حیات کے علاوہ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اسلام بار بار اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں اور دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور وفاداری کا حق ادا کریں۔ذرا غور کریں کہ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان اس قدر محبت ہو تو اس گھر کے جنت ہونے میں کس کو انکار ہو سکتا

ہے۔ محسن نسواں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمام جائز کاموں میں مجھے سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق ہے۔ طلاق کو اس حیثیت سے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے کہ اسلام کے مزاج میں رشتوں کو جوڑنا اور رشتوں میں محبت اور مٹھاس پیدا کرنا ہے، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہوسکے اور شوہر بیوی کے ایک ساتھ رہنے میں زندگی اجیرن ہونے لگے تو طلاق ہی احسن بن جاتی ہے اور اسلام اس کے لیے احسن طریقہ بیان کرتا ہے، جو تفصیل سے سورہ طلاق میں موجود ہے۔اسلام نے جس طرح مردوں کو طلاق کا حق دیا ہے اسی طرح عورتوں کو خلع کا حق دیا ہے۔ اگر شوہر اور بیوی کو اندیشہ ہو جائے کہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حقوق اور واجبات ادا نہیں ہو سکیں گے تو باہمی رضامندی سے ایسا ہو سکتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔ قرآن کہتا ہے: ”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ دونوں اللہ کی حدوں پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت کچھ دے کر شوہر سے علیحدگی حاصل کر لے۔ یاد رکھو یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیاں ہیں۔ پس ان سے باہر قدم نہ نکالو اور اپنی حدوں کے اندر رہو۔ جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدبندیوں سے نکل جائے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں۔“ (البقرہ:922) عورت چاہے تو اپنے نکاح نامے میں کچھ شرطیں رکھ سکتی ہے کہ ان کے پورے نہ ہونے کی صورت میں وہ شوہر سے طلاق حاصل کر لے۔اس طرح بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے قدم قدم پر

عورت کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ اسلام سے پہلے بیوہ کو بڑی ہی گری ہوئی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بھارت میں بھی قدیم زمانے میں بیوہ کو منحوس قرار دیا گیا تھا۔ آج کے معاشرے میں بھی بیوہ کی بے چارگی کا حال سب کو معلوم ہے۔ اسلام کا عورت کے اوپر یہ احسان ہے کہ اسے اس بیچارگی کی حالت سے نکالا۔ اسلام میں بیوہ کی شادی کی نہ صرف یہ کہ اجازت ہے، بلکہ حکم ہے کہ ان کو شادی کرنے سے نہ روکو اور ان کی دوسری جگہ شادی کرنے میں مدد کرو۔ اسلام پوری انسانیت کے لیے، بطور خاص کمزور طبقے کے لیے، انصاف اور امن و آشتی کا پیام لے کر آیا ہے۔ یہ وہ دین ہے جس نے کھول کھول کر انسانی زندگی کے لیے احکامات دیے ہیں۔ خاص طور سے عورت کی زندگی کے لیے ایسے احکامات دیے ہیں جن سے اس کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور معاشرہ میں اس کا درجہ بلند ہو۔ وہ اس میں آرام و سکون کی زندگی گزار سکے۔ قرآن کریم میں درج ہے کہ: "... اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں اور پھر ان بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو اپنی اچھی چیزیں کھانے پینے کو دیں۔ (سورہ النحل: 27) صرف تخلیق انسانی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی اچھائی اور برائی عورت کی گود سے جنم لیتی ہے۔ تمام اخلاقی اقدار، تعلیمات، کردار اور اسلاف کی روایات کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔ عورت ایک چلتا پھرتا ادارہ ہوتی ہے اور نیکی و طہارت کے سارے خوشے اسی کے وجود سے نکلتے ہیں، جنہیں وہ شعوری طور پر نئی نسل میں منتقل کرتی ہے۔ نیک اور متقی عورت اگر اپنی اولاد کی تربیت اخلاق کے

بہترین اصولوں پر کرتی ہے تو گویا ایک پورے معاشرے کی اصلاح کا کام انجام دیتی ہے۔ہر انسان کی زندگی کے ابتدائی پچیس تیس سال بہت ہی قیمتی سال ہوتے ہیں۔ انہی ایام میں اخلاق و کردار کا سانچہ تیار ہوتا ہے۔ انہی ایام کو وہ اپنی ماں کے سایہ عاطفت میں بسر کرتا ہے۔ماں جس طرح چاہتی ہے خون سے سینچتے ہوئے اس پودے کی آبیاری کرتی ہے۔ذرا غور فرمایئے کہ اگر تربیت میں کھوٹ ہوگا یا عورتیں کندہ ناتراش ہوں گی تو پھر کسی بھی انسان کے بھٹک جانے اور گمراہ ہو جانے کے امکانات کتنے شدید ہو جائیں گے۔دراصل نیکی اور بدی کے راستے متوازی طور پر چلتے ہیں۔ عورت کا بنیادی فرض یہ ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت و تعمیرِ کردار کا کام اس حسن و خوبی سے انجام دے کہ اسے زندگی کے ہر موڑ پر نیکی اور بدی کی تمیز رہے۔ہم جانتے ہیں کہ اطمینان وسکون کی ساری لہریں گھر کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔آج عورت کو اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ معاشرہ کس غلط نہج پر جارہا ہے اور اسے اخلاقی واسلامی اصولوں کے تحت کس طرح استوار کیا جاسکتا ہے۔اپنی نسلوں کی تربیت کس طرح کی جائے کہ وہ اسلاف کی روایات کا منہ چڑائے بغیر آگے بڑھ سکیں۔ جس طرح ماں بچے کی بھوک اور پیاس کا بہت خیال رکھتی ہے، اس کی صحت کا بھی خیال رکھتی ہے اور اس کے جسم کے اندر پیدا ہونے والی بیماری کو اُس کے چہرے مہرے سے پہچان لیتی ہے اور اُس کے علاج کے لیے بے چین اور پریشان ہو جاتی ہے اسی طرح اس کے اندورن کی ان بیماریوں کو بھی بھانپنا ہوگا اور ان کے علاج کی جستجو کرنی ہوگی جن کے مضر

اثرات معاشرہ پر پڑ رہے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ معاشرہ کے اندر ساری خباثتیں محض اس لیے پائی جاتی ہیں کہ لوگ قرآن مجید سے دور ہیں اور اس کو سمجھ کر نہیں پڑھتے ہیں۔ خواتین تو اس معاملے میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ جب ایک عورت یہ جانتی ہی نہ ہوگی کہ قرآن مجید نے اسے کیا ذمے داری سونپی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت قرآنی نہج پر کرسکے گی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی جذبہ عورت کے اندر مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ خواتین قرآن فہمی میں بہت پیچھے ہیں۔ اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ خواتین ہر میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں اور مغرب زدگی میں پھنس کر استحصال کا شکار ہو رہی ہیں اِن خواتین کو قرآن فہمی کے میدان میں بھی آگے آنا ہوگا تاکہ اپنے حقوق کو پہچان سکیں، اپنے آپ کو غلط کار مردوں کے استحصال سے بچا سکیں اور نئی نسل کی اخلاقی اصولوں پر تربیت کرکے ایک صالح معاشرے کی تعمیر میں اپنا رول ادا کرسکیں۔

نظریہ پاکستان کیا ہے؟

میرے دادا حضور تحریکِ پاکستان کے قصے ہم بہن بھائیوں کو سناتے اور بتاتے تھے کہ ہندوستان میں تحریک پاکستان کی جدو جہد کے دوران بچے ،بڑے، خواتین، بزرگ سب کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا'پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اِلا اللہ۔ایک اندازہ کے مطابق 20 لاکھ افراد نے اس نعرہ اور اسکے پیچھے نظریہ پاکستان کی خاطر اپنی جانیں نثار کردیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ سچے شہید تھے جن کے خون کے نذرانوں کو اللہ تعالی نے قبول کیا اور دنیا کے افق پر ایک اسلامی ریاست پاکستان وجود میں آئی۔آج پاکستان کے وجود کے 66 سال بعد بڑے بڑے مفکر، دانشور، سیاسی پنڈت اور صحافی حضرات ٹی وی مناظروں میں بیٹھ کر یہ بحث کر رہے ہیں کہ قائدِ اعظم نے پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنایا تھا یا اسلامی ریاست۔ یہ دیکھ کر ایک چیز تو ثابت ہو رہی کہ پاکستان سے نظریہ پاکستان کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ سیکولرازم وہ فلسفہ ہے جو کسی بھی مذہب کو ریاست کے کاروبار میں مسترد کرتا ہے اور پاکستان کے تو آئین میں درج ہے کہ پاکستان کا نظام قرآن اور سنت کے مطابق ہوگا اور بانی پاکستان نے تو صاف کہا تھا کہ پاکستان کا آئین تو 14 سو سال پہلے حضور اکرمؐ نے عطا کر دیا۔ اور اگر سیکولرزم کی بات کی جائے تو دنیا میں کوئی بھی ملک سیکولر

نہیں، پاکستان کی ریاست کا نظام سیکولر ہونا چاہیے یا اسلامی۔ پاکستان کو بنے ہوئے ابھی 25 سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اس کا ایک بڑا حصہ جدا کر دیا گیا۔ آج بھی یہ وہی سوچ اور اس سے جنم لینے والا نظام اور اسکے طاقتور لوگ ہیں جن کے چنگل میں ریاست کا نظام یرغمال بنا ہوا ہے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ نظریہ پاکستان کا بھی خاتمہ کیا جائے تاکہ اپنی موروثیت پاکستان کے نظام کا مستقل حصہ بنا دیا جائے جس طرح سے عرب ریاستوں میں یہ نظام رائج ہے۔ یہ جاگیردار، سرمایہ دار، بدعنوان افسر شاہی، مفاد پرست سیاسی ٹولہ اور منافق مذہبی ٹھیکیدار پاکستان کو چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کی طرز پر چلانا چاہتے ہیں کیونکہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اِن سب سے آقا وہی مغربی طاقتیں ہیں جن کا یہ ایجنڈہ صرف کرتے ہیں اور بدلے میں اپنے مقاصد کی تکمیل پاتے ہیں۔ آج پاکستان کا مطلب ریاست کو چلانے والی اِن طاقتوں نے اپنے اپنے مفاد کے حساب سے نکال لیا ہے۔ مذہب کے ٹھیکیدار مولویوں کے لئے پاکستان کا مطلب سنی، شیعہ، وہابی، اہلِ حدیث وغیرہ وغیرہ اور انکے پیروکاروں کے لئے فرقہ کے نام پر ایک دوسرے کی جان لینا کوئی گناہ نہیں۔ آج پاکستان میں کتنی فرقہ پرست مذہبی جماعتیں ہیں جو فرقہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو تقسیم کئے ہوئے ہیں اور پاکستان کی سیاست میں اپنے حصہ کو بنیادی حق سمجھتی ہیں۔ آج پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے! سیاستدانوں کے لئے پاکستان کا مطلب ہے اپنی پارٹی اور اپنے مفاد کا تحفظ

جس کے لئے اچھے برے، سچ جھوٹ اور قول و فعل کی کوئی قید نہیں۔ لوگوں سے سرے عام جھوٹے وعدہ کرو، ملک کے خزانے کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر ہڑپ کر جاؤ اور اگر کوئی خطرہ ہو تو اپنے آقاؤں کے دیس دبئ، لندن یا نیو یارک میں بیٹھ کر سیاست گیری کرو۔ شخصیت اور موروثیت کے نام پر اپنی سیاسی پارٹی میں اپنی اجارہ داری قائم رکھو اور لوگوں کو جمہوریت کا سبق پڑھاؤ۔ آج ہر محب وطن اور درد مند پاکستانی کا دلِ خون کے آنسو روتا ہے جب وہ یہ دیکھتا کہ جو ملک کو توڑنے میں شریک جرم تھے آج شہید اور قائدِ عوام کہلاتے ہیں۔ جن کی جدی پشتی انگریزوں کی غلامی کرتی چلی آئی اور ان سے انعام و اکرام لیکر جاگیردار اور قبائل بن گئے آج ان کی نسل بڑے فخر سے پاکستان کی حکمرانی اپنا حق سمجھتی ہے۔ بے گناہ خون کسی کا بھی بہایا جائے نا قابلِ معافی ہے مگر بے گناہی کی حقیقت بھی آئینہ کی طرح شفاف ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی اپنے کارناموں، سازشوں یا سیاسی دشمنی کی وجہ سے قتل کر دیا جائے یا ہو جائے تو وہ پاکستان کے لئے کس طرح شہید ہو سکتا ہے۔ آج پاکستان کا مطلب یہی کچھ رہ گیا ہے کہ اپنے مفاد اور اقتدار کی خاطر بیرونی طاقتوں سے ساز باز کرو اگر اقتدار مل گیا تو وارے نیارے اور اگر مہم میں مارے گئے تو شہید اور پھر انکی قبروں پر سیاست کرو، مظلومیت اور شہادت کے گن گاؤ، اپنے ہاریوں اور غلاموں کو جلسہ گاہوں میں اکٹھا کرو، برسی کے موقع پر اسٹیج پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرو، مونیٹر پر لکھی تقریر پڑھو اور لوگوں کو دھوکہ دو کہ کتنا قابل

بچہ ہے اور کتنی اچھی اردو سیکھ لی ہے۔ یہ سب خاندانی فراڈیہ ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے ہر شعبہ اور طبقہ میں اِن فراڈیوں کے خریدار موجود ہیں۔آج پاکستان کا خزانہ خالی ہے اور ملک کا کاروبار چلانے کے لئے بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے بھیک مانگی جارہی ہے۔ اور یہ بھیک مانگنے والے وہ حکمران ہیں جنھوں نے اپنے اثاثہ، کارو بار اور بینک بیلنس ریاست پر موجود قرض سے کہیں زیادہ بنا لیے ہیں۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان نے اپنے تازہ اعداد و شمار جاری کئے ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کو 40 کروڑ روپے چندہ سے وصول ہوئے۔ جس ملک کے عام آدمی کے پاس اِس وقت تین وقت کی روٹی کے پیسے نہ ہوں تو نواز شریف اینڈ فیملی کو کروڑوں روپے کا چندہ کس نے دیا۔ یہ پیسہ ان سیٹوں کی فروخت سے آیا ہے جس کے خریدار آج قومی اسمبلی میں عیاشیاں کر رہے ہیں اور نواز شریف اینڈ فیملی اس کے بدلے پاکستان کے مالک بنے بیٹھے ہیں ! اور پھر بات کرتے ہیں عوامی مینڈیٹ کی۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔۔۔۔افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ لوگ قائدِ اعظم کا نام عزت سے تو لیتے ہیں مگر قائدِ اعظم کی مسلم لیگ کو اپنی مسلم لیگ بنا کر اس کے نام پر پاکستان کو مسلسل لوٹ رہے ہیں۔ پچھلے 40 سالوں میں نواز شریف اینڈ فیملی کے کاروبار میں اتنی ترقی ہوئی ہے کہ اگر وہ ترقی پاکستان کی جھولی میں ڈال دی جاتی تو ملک خوشحال ہو جاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فوجیوں کے دورِ حکومت میں فوج کی سرپرستی سے سیاست میں آئے اور آج ایک فوجی

جنرل پر کوئی نہ کوئی کیس بنا کر اُس کو صرف اِس لیے ذلیل کرنا چاہتے ہیں کہ اِس سے فوج ذلیل ہوگی اور اگر فوج ذلیل ہوگی تو اقتدار میں آنے کی ہمت نہیں کریگی تو پھر اِن کی لوٹ کھسوٹ جاری رہے گی۔ان کے اپنے اربوں روپے کا کاروبار دوسرے ملکوں میں ہیں اور بیرونِ ملک سے سرمایہ داروں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ ملکر ملک کی بچی کچی دولت کا بھی صفایا کیا جاسکے۔باقی سیاسی پارٹیوں کا بھی حال اسی طرح کا ہے کوئی پیر بنا بیٹھا ہے تو کوئی بھائی ، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تمام سیاسی مداری ایک سلسلہ وار مجرمانہ کاروائیوں کے ذریعہ پاکستان کے نظریہ کو، پاکستان کے فلسفہ کو، پاکستانی سوچ کو اور محبِ وطن پاکستانیوں کو ختم کرنے کی مہم پر لگے ہیں تاکہ ان کی بادشاہت زندہ رہے۔یہی ان سیاسی پنڈتوں کا مشن ہے تاکہ یہ اپنے اپنے حصہ لیکر عربوں کی طرح شیخ بن کر لوگوں پر حکمرانی کریں اور اپنے بیرونی آقاؤں کے سایہ تلے عیاشیاں کرتے رہیں۔اب سوال یہ ہے کہ اِن سب چیزوں کا انجام کیا ہوگا اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ کیا میرے جیسے لکھنے والے اسی طرح سے لکھ کر لوگوں کو اور دلِ برداشتہ کرتے رہیں گیاور مایوسی پھیلاتے رہیں گے ؟ تو اِس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ اللہ کرے وہ وقت آئے جب مجھے ایسا نہ لکھنا پڑے اور کبھی ایسا دور آئے کہ میں پاکستان کے لئے فخریہ اور دلِ کو محظوظ کرنے والی باتیں قلم بند کرتے ہوئے فخرااور سکون محسوس کروں۔ مگر یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہے؟ تو اس کا جواب

یہ ہے کہ مایوسی حرام ہے، پاکستان میں عام آدمی کو نکلنا ہوگا پاکستان کے گلے سڑے نظام کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ سچی اور قومی لیڈرشپ کو لانا ہوگا۔ جمہوریت کے نام پر دھوکہ دہی کے اِس نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اِن وڈیروں، جاگیرداروں، فرقہ پرست مولیوں، بدعنوان افسر شاہی اور دھوکہ باز سیاسی مداریوں اور انکی جماعتوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ہوگا۔ پاکستان میں نظریہ پاکستان کو واپس لانا ہوگا۔ پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک عام آدمی کی فلاحی ریاست بنانا ہوگا جہاں کوئی ذات.برادری، زبان،فرقہ اور صوبہ کے نام پر کسی کی تفریق نہ کرسکے۔ پاکستان میں تمام ایسی جماعتوں پر پابندی لگانی ہوگی جو فرقہ، ذات.برادری اور صوبائیت کے نام پر سیاست بازی کرتی ہیں۔پاکستان کے اداروں کو مضبوط کرنا ہوگا۔ پاکستانی فوج اور خفیہ اداروں کی عزت کرنی ہوگی۔ عدلیہ کے نظام کو نچلی سطح سے ٹھیک کرنا ہوگا اور عدلیہ کو حکومت اور سیاست سے الگ کرنا ہوگا۔ ایسا نظام ہو جہاں لوگوں کو سستا اور فوری انصاف ملے۔ بدعنوان افسر شاہی کے نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ تعلیم کو بہتر بنانا ہوگا۔ ایک عام آدمی کو اسکے بنیادی حقوق ریاست کو دینے ہونگے اور یہ یقینی بنانا ہوگا کہ ایک آدمی کا حق اِس پاکستان پر سب سے زیادہ ہے۔ عام آدمی کو روزگار میسیر ہو، تین وقت کی روٹی نصیب ہو، تعلیم، صحت، آمدورفت کا سستا نظام میسر ہو۔ قانون کی بالادستی بغیر کسی تفریق کے نافذ کرنی ہوگی جس کے لئے پولس کے نظام کو یکسر تبدیل کرنا ہوگا۔ تاکہ ایک

عام آدمی کی زندگی کو تحفظ فراہم ہو۔ مجرموں کو فوری اور عبرتناک سزائیں دینی ہونگی۔ ملک سے افسر شاہی کلچر ختم کرنا ہوگا، بدعنوان افسروں کا سر عام عبرتناک سزائیں دینی ہونگی۔ ٹیکس کا مربوط نظام نافظ کرنا ہوگا۔ عام آدمی پر سب سے کم ٹیکس اور امیر آدمی پر سب سے زیادہ کی طرز پر ٹیکس کا نظام نافذ کرنا ہوگا۔ ٹیکس کے محکمہ میں موجود بدعنوان افسروں کی فوری چھٹی کرنی ہوگی۔ سرکاری دفاتر سے سیاسی کلچر اور سیاسی بنیادیوں پر کی جانے والی تقرریوں پر سختی سے پابندی لگانا ہوگی۔ہاں یہ سب کچھ ممکن ہے اگر پاکستان کی عوام چاہیں تو۔۔۔۔

سندھ فیسٹیول، سندھی ثقافت کا جنازہ

جس شہر میں روزانہ بیس سے تیس لوگ دہشت گردی میں مارے جارہے ہوں، جہاں نہ قانون نافذ کرنے والے اہل کار محفوظ ہوں ، نہ علما، نہ صحافی اور دانشور اور نہ استاد وہاں میلے یا فیسٹیول کی بات کرنا ان لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں تو اور کیا ہے جن کے پیاروں کو بغیر کسی قصور کے موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہے۔''اپنی ثقافت پہ ناز کرو، پاکستان سے پیار کرو" یہ کہنا ہے پاکستان پیپلز پارٹی کے نومولود چیر مین بلاول بھٹو زرداری کا، سندھ فیسٹیول کی مقبولیت کے لئے نشر کئے جارہے ویڈیو اشتہار میں۔ کیا اچھا ہوتا اگر نوجوان بلاول زرداری پاکستان کی یکجہتی کے لئے کوئی فیسٹیول کا انعقاد کرتے اور اس کی مقبولیت کے لئے یہ کلمات فرماتے۔ جو خود مغربی معاشرہ کی پرورش کی پیداوار ہوں، جو سندھ کی شاہراہوں پر بغیر محافظ کے چل پھر نہیں سکتے ہوں اور جن کو خود سندھ کی زبان، تہذیب و تمدن کا پتہ نہ ہو وہ آج سندھ کی ثقافت کے فروغ کی بات کر رہے ہیں یہ سندھ کے لوگوں کے ساتھ مذاق اور سندھ کی ثقافت کی توہین نہیں تو کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سیاست کا بیڑا اٹھایا تھا اور صیح جمہوریت ملک میں نافذ کرنے کا وعدہ کیا تھا، پچھلے 50 سالوں میں نہ تو ملک میں صاف ستھری سیاست کر سکے اور نہ ہی

شفاف جمہوریت نافذ کرکے اور چلے ہیں سندھ کی ثقافت کو فروغ دینے۔آخر پاکستانی قوم سے یہ مذاق کب تک جاری رہے گا؟ایک طرف تو سندھ کے دارالخلافہ اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کو دہشت گردوں نے دارالقتل اور مذبح اورطالبان نے دہشت گردی کا فیسٹول بنادیا ہے وہیں دوسری طرف بلاول زرداری کواِسی شہر میں سندھ فیسٹیول کا رنگا رنگ پروگرام سجانے کا جنون سوار ہے۔ہاں سمجھا جا سکتا ہے کہ بلاول کی عمرانکو اِس قسم کی رنگینیوں کے لئے اکسا سکتی ہے کیونکہ موجودہ حالات میں اِس طرح کی رنگین محفلیں، ثقافتی ناچ گانا اور فن کا مظاہرہ کا انعقاد دلِ کو لبھانے کا ساز وسامان تو ہو سکتاہے مگراس کی بحالی یا فروغ میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا، یہ چیزیں ایک خوشحال اور پرسکون معاشرہ کی صحتمند سرگرمیاں ہوتی ہیں ،اور پھر ثقافت کی نشوونما یا فروغ کے لیے کوئی سیاسی نعرہ یا حکمتِ عملی وضع نہیں کی جاتی بلکہ یہ تو معاشرہ کے مسلسل رہن سہن اور سماجی ضروریات سے جنم لیتی ہیں اور پھر وقت اور حالات کے ساتھ اِس میں تبدیلیاں اور تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ بلاول زرداری سندھ کی کس ثقافت کی بات کر رہے ہیں کیونکہ اپنے والد محترم آصف علی زرداری کی طرف سے تو یہ بلوچ ہیں۔ تبدیلی، فروغ یا بحالی سب سے پہلے گھر سے شروع ہوتی ہے ، کیا بلاول زرداری سمیت بھٹو خاندان کا کوئی بھی فرد یہ بتا سکتا ہے انہوں نے سندھ کی زبان، لباس، تاریخ اور ثقافت کو کتنا اپنایا ہے۔ بلاول زرداری صاحب کو چاہیئے کہ پہلے سندھ کی

ثقافت اپنے آپ پر نافذ کریں۔ سندھ دھرتی نے سرزمینِ عرب سے آئے محمد بن قاسم سے لیکر ترکی، افغانستان، کردستان، بلوچستان، سرحد، پنجاب اور خطہ کے مختلف علاقوں سے آئے لوگوں کو اپنے اندر بسایا۔ کلہوڑا، آفندی، سومرو، بھٹو، تالپور، زرداری، مغل، مرزا، قریشی سب مختلف دور میں سندھ میں مختلف جگہوں سے آئے اور سندھ کی تغیر پذیر ثقافت کا حصہ بنے۔ پچھلے ساٹھ سالوں میں سندھ کی ثقافت میں ایک بڑا تغیر آیا ہے۔ پاکستان کے بعد سے سندھ کی ثقافت بہت زیادہ کثیرالثقافت ہو چکی ہے۔

یہاں پاکستان کی ہر زبان بولنے والا بستا ہے۔ سندھی اور اردو زبان بولنے والوں کی اپنی اپنی ثقافت ہیں لہٰذا سب سے پہلے تو سندھ اور سندھ کی عوام کو امن اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ پھر سندھ میں کثیرالثقافت پروگرام منعقد کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ ایک مخصوص کمیونٹی کو ٹارگیٹ کرکے مزید سیاست کرنے کی۔ میلے یا فیسٹیول ایک خوشحال معاشرہ کی سرگرمیاں ہوتی ہیں کسی سیاسی جماعت کا ایجنڈا نہیں ہوتے۔ کیا پاکستان، سندھ اور بالخصوص کراچی میں ایسے حالات ہیں کہ یہاں ثقافت کے فروغ کے لئے محفلیں سجائی جائیں۔ کراچی میں تو لوگ شام ہونے سے پہلے اپنے گھروں کو خیریت سے پہنچنے کی فکر کرتے ہیں، تاکہ کہیں کسی دہشت گردی کا شکار نہ ہو جائیں۔ کیا سندھ کی عوام کو یہاں پر حکومت کرنے والوں نے ذہنی طور پر اس قابل چھوڑا ہے وہ ثقافتی پروگرام منعقد کریں یا اس میں شریک ہوں۔ ثقافت کسی کے کہنے یا ایک دو فیسٹیول کرانے سے فروغ نہیں پاتی۔ ایک پُر

سکون اور خوشحال معاشرہ میں یہ خود بخود فروغ پاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کراچی سمیت سندھ کے ہر شہر میں بڑے بڑے ادبی، ثقافتی پروگرام، مشاعرے، اور رنگا رنگ تقاریب ہوا کرتی تھیں۔ کراچی اور حیدرآباد میں تھیٹر چلا کرتے تھے، جن کے ذریعہ سے پاکستان میں بڑے بڑے فنکار پیدا ہوئے جنھوں نے پاکستان کے فنون لطیفہ کو ساری دنیا میں اعلیٰ مقام بخشا۔ آج نہ وہ پروگرام ہیں اور نہ وہ فنکار۔ سوال یہ ہے کہ بلاول زرداری کو آخر صرف سندھ فیسٹیول کا خیال ہی کیوں آیا؟ کیونکہ سندھ سے بڑا صوبہ تو پنجاب ہے اور پنجاب کی ثقافت کا اثر تو پورے پاکستان پر ہے۔ اسی طرح سے بلوچستان اور خیبر پختون خواہ بھی صوبے ہیں جو اپنی تاریخ، ثقافت، تہذیب و تمدن رکھتے ہیں۔ بلاول زرداری نے پنجاب فیسٹیول کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ جبکہ پیپلز پارٹی تو ہمیشہ وفاق کی جماعت اور وفاق کی علامت کا دعویٰ کرتی ہے۔ پھر یہ حقائق بھی سامنے آنے چاہییں کہ اِس سندھ فیسٹیول پر کتنے پیسہ خرچ کئے جارہے ہیں اور یہ پیسہ کہاں سے خرچ ہوگا۔ اگر یہ حکومت سندھ کے خزانے سے خرچ ہوگا تو بلاول زرداری یہ کس طرح خرچ کر سکتے ہیں کیونکہ نہ تو بلاول پارلیمانی نمائندے ہیں اور نہ ہی انکی حکومت میں کوئی حیثیت ہے۔ اِس سلسلے میں قومی احتساب کے ادارہ کو فوری طور پر تفتیش کرنی چاہیئے۔ دراصل یہ بلاول زرداری اور انکے پیچھے ہدایت کاروں کے صرف اور صرف ڈرامے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹائی جاسکے اور کسی نہ کسی طرح سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دیا جاسکے۔ ورنہ زمینی

حقائق اور سیاسی تاریخ اِس کے برعکس ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کا تعلق صوبہ سندھ سے رہا ہے مگر ذوالفقار علی بھٹو سے لیکر آصف علی زرداری نے مرکز میں حکومت کرنے کے لئے سندھ کا کارڈ استعمال کرکے پنجاب کا سہارا لیا۔ 1970 میں جب پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو پاکستان کے دو حصہ تھے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو پاکستان کی اکائی اور اتحاد کی علم بردار کہنے والے پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو نے کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ پیپلز پارٹی کو مشرقی پاکستان میں متعارف کراتے ، وہاں کے مقامی بنگالیوں کو پی پی پی میں شامل کرتے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے اتحاد کے لئے کام کرتے۔ پھر 1971 میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہونے کے بعد پی پی پی کو صوبہ پنجاب نے ایک بڑی پارٹی بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا مگر بھٹو خاندان نے پی پی پی کو بھٹو فیملی کی جماعت بنا کر چلایا اور پی پی پی کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد، لاہور یا کراچی کے بجائے اپنے خاندانی شہر لاڑکانہ کو بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آصف علی زرداری جن کا تعلق بھٹو خاندان سے نہیں ، اپنے بیٹے بلاول کو بھٹو کہلوانے پر مجبور ہو گئے تاکہ بلاول کو پی پی پی کی موروثی سیاسی گدی نشینی مل سکے۔ لہٰذا اگر آج بلاول زرداری مرسوں مرسوں سندھ نہ دیسوں کے نعرہ لگاتا ہے اور پھر ساتھ ہی مصلحتاً پاکستان زندہ باد کا نعرہ بھی لگاتا ہے تو یہ اسکے نانا ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی حکمتِ عملی تھی کہ پاکستان کا نام استعمال کرکے

سندھ کے نام پر اپنی سیاسی اہمیت اور طاقت کو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ سے منواؤ اور اقتدار حاصل کرو۔ اِن ہی حرکتوں کی وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی بتدریج سکڑتی جا رہی ہے اور اب حکومت کا دائرہ صرف سندھ تک رہ گیا ہے جہاں اب اور بھی دعوے دار سیاسی طاقت بن چکے ہیں۔ بلاول زرداری ابھی نوجوان ہیں اِن کو چاہیئے کہ اپنے بڑوں کی غلطیوں سے سبق سیکھیں نہ کے ان کے پیروکار بنیں ورنہ انجام بھی پھر انہی جیسا ہوگا۔ سندھ فیسٹیول یا سندھ کے نعرے لگانے سے سندھ کے حالات اچھے ہونگے اور نہ ہی پاکستان کے۔ دوسرے یہ کہ اب دور بدل گیا ہے۔ یہ 70، 80 یا 90 کے عشرے کی سیاست نہیں اور نہ ہی اس وقت کے سیاسی کارڈ اب چلیں گے۔ آج کراچی سے لیکر پشاور تک لوگ اِس طرح کے سیاسی حربے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ بلاول زرداری کے لئے اچھا ہوگا کہ اگر انہوں نے ایک کامیاب اور سچے سیدھے سیاسی لیڈر کی حیثیت قوم سے منوانی ہے تو کھلے ذہن سے کام کریں۔ پاکستان کے تمام طبقوں، صوبوں، شہروں اور دیہی علاقوں کو برابر کی اہمیت دیں۔ بحیثیت چئیرمین پاکستان پیپلز پارٹی، اپنی جماعت کی از سر نو تعمیر کریں، قابل سچے اور صحیح افراد کو میرٹ پر آگے لیکر آئیں۔ پی پی پی سے کرپشن کی مہر کو صاف کریں۔ ورنہ پاکستان سے سمٹ کر پی پی پی سندھ کی جماعت رہ جائے گی اور پھر بی وہ ڈگر نہ چھوڑی اور اسی طرح کی حرکتیں جاری و ساری رہیں تو اگلے الیکشن تک وہ لوگ بھی ووٹ نہیں دیں گے جو آپ کی زمینوں پر کام کرتے ہیں۔

قوم اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگے

آج پاکستان کے معماروں اور محب وطنوں کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔ مفاد پرست اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں سے نکل کر بڑے بڑے محلات میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ متعصب، مفاد پرست اور کرپٹ ٹولہ نے ملک کا کنٹرول سنبھال لیا ہے اور گنے چنے محب وطن رہنماؤں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ شریف آدمی اپنی عزت اور عزتِ نفس بچانے کی جدوجہد میں خودکشی پر اتر آیا ہے تو دوسری طرف قوم و ملک کی دولت لوٹنے والے عیاشیاں کر رہے ہیں۔ بددیانتی، فریب اور مکر کی ایسی مثالیں نظر آتی ہیں کہ ایک باضمیر پاکستانی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ آج پاکستان کی باگ دوڑ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو جھوٹے ہی نہیں بلکہ ان میں غیرت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ دوسری جانب قوم اپنی کمزوریوں، غفلتوں اور بے راہ روی کے ہاتھوں بے ضمیر حکمرانوں کے آگے بے بس نظر آتی ہے۔ بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے پاکستان کو نقصان پہنچایا۔ جنھوں نے فرنگیوں اور آمروں کی گود سے جنم لیا، جن لوگوں نے بے دردی سے قومی دولت کو لوٹا پاکستانی قوم نے آج بھی انہیں لوگوں کو ایوانوں میں اور وزارتوں پر بیٹھا رکھا ہے اور وہی لوگ جمہوریت کے نام پر پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ ملک کو غیر ملکی قرضوں میں اتنا ڈبو دیا گیا ہے کہ بس یوں لگتا ہے وہ وقت دور نہیں جب یہ

دارالخلافہ کو گروی رکھ کر خود اپنے آقاؤں کے ملک میں بھاگ جائیں گے۔ عوام کا یہ حال ہے کہ پڑھے لکھے لوگ ایک سے زیادہ سم والے موبائلوں پر تو گھنٹوں باتیں کرتے ہیں، غیر مہذب ویڈیوز دیکھ کر وقت خراب کرنے میں لگے ہیں، بے ہودہ لطیفے ایک دوسرے کو موبائلوں پر بھیج کر اور آن لائن سوشل نیٹ ورکس پر فضول کی بحث کرکے وقت برباد کر رہے ہیں۔ جس ٹیکنالوجی کو استعمال کرکے مہذب معاشرہ میں لوگ اپنا معیار تعلیم بڑھا رہے ہیں ،اعلیٰ ایجادات کر رہے ہیں، بیرونی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں اور قومیں معاشی انقلاب برپا کر رہی ہیں اسی ٹیکنالوجی سے آج پاکستان کی نئی نسل ذہنی بیماریوں، معاشرتی خرافات اور برائیوں کا شکار ہے۔آج ہمارے سامنے ایک عام آدمی سے لیکر ذمے دار عہدہ پر بیٹھا افسر بھی شارٹ کٹ مارنے کے چکر میں بے اصولی زندگی گزار رہا ہے۔ غرض کہ پاکستانی قوم کا یہ حال ہے کہ اب اگر کرپشن اور مسائل کی بات کی جائے تو سوچنا پڑتا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کیا کیا بیان کیا جائے۔ اچھائیاں ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔ ہمارے سامنے ویتنام، انڈونیشیا، تائیوان اور بنگلادیش جیسے ممالک کی مثالیں موجود ہیں جو کچھ عرصے پہلے تک پاکستان سے ترقی کے ہر میدان میں بہت پیچھے تھے۔ عبرت کا مقام یہ ہے کہ آج پاکستانی عوام ٹیلی وژن کے کمرشل ٹاک شوز پر بھانڈ نما سیاسی بازیگروں کی بے ہودہ اور اخلاق سے گری ہوئی گفتگو سن کر لطف اندوز ہوتی ہے۔ یہ ٹاک شوز ٹیلی وژن کے پروگراموں کی ریٹنگ اور مارکیٹنگ میں تو اضافہ کر دیتے ہیں

مگر کیا پاکستانی عوام ان سے کوئی سبق سیکھ رہی ہے۔ کیا قوم ان سیاسی بازیگروں کے پیچھے چھپے ہوئے ان کے کارناموں کو جاننے کی کوشش کرتی ہے؟ کیا قوم اپنے ملک کے مفاد کی خاطر اور اپنا قومی فریضہ سمجھ کر یہ جاننے کی کوشش کرتی ہے کہ ان سیاسی بازیگروں نے ماضی میں کیا کیا تھا ان کے بڑوں نے کیا گل کھلائے تھے۔ مطالعہ کی بات تو دور، آج پاکستان کے شہروں اور قصبوں سے لائبریریوں کو ختم کر دیا گیا۔ لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا کوئی شوق نہیں اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ آج پاکستان کے تعلیمی اداروں میں نوجوان ہر امتحان نقل کی زور پر پاس کرتے ہیں۔ آج ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے اور محکمہ جاتی کرپشن کے نام پر اساتذہ سے لیکر تعلیمی افسران بھی کرپشن میں ملوث نظر آتے ہیں۔ ملک کے کچھ محب وطن دانشور، سماجی شخصیات، ادیب نقاد اور صحافی چلا چلا کر قوم کو جگانے اور آنے والی بربادی کا پیش خیمہ کر رہے ہیں مگر ان کی سننے والا کوئی نہیں۔ روپے کی قیمت ہر روز گرتی جا رہی ہے کیا کسی کو اِس بات کی پرواہ ہے کہ اگر اسی طرح روپے کی قیمت گرتی رہی تو اگلے ایک دو سالوں میں سرکاری خزانے کا کیا ہوگا، بیرونی قرضوں کا کیا حال ہوگا۔ ملک کی درآمد کا کیا ہوگا۔ نہ ملک میں بجلی ہے نہ گیس، قتل و غارت گری عام ہے، اغواء اور عصمت دری کی وارداتیں معمول بن گئی ہیں۔ ایک ایک کرکے پاکستان کے تمام بڑے قومی اداروں کو تباہ کر دیا گیا۔ آج ملک میں موت سستی ہے اور آٹا مہنگا۔ اور دوسری جانب حکمرانوں کا رویہ ایسے جھوٹ اور

فریب پر منحصر ہے کہ جس کی نظیر کم سے کم مجھے تو نہیں ملتی۔کیا یہ ہے پاکستان کا وقار؟ کیا یہ ہی ہے وہ پاکستان جس کے لئے بانیِ پاکستان نے کہا تھا کہ پاکستان دنیا کے لئے ایک عظیم اور باوقار اسلامی ریاست بن کر ابھرے گا۔ مہذب قوموں میں اگر کسی سیاسی رہنما کا ایک چھوٹا سا اسکینڈل ذرائع ابلاغ میں آجاتا ہے تو عوام اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک وہ اپنے لیڈر کو مجبور نہ کردیں کہ وہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہو جائے۔ مگر آج پاکستانی قوم کا یہ حال ہے کہ ہر روز نئے سے نیا ملک کو لوٹنے اور کرپشن کا واقع رونما ہو رہا ہے مگر عوام ہیں کہ بس اپنی دھن میں مگن ہیں۔ اور سمجھ سے بالاتر بات یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ سوشل میڈیا پر، ٹیلیفون پر اور اپنے ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر ان سیاسی مداریوں کے وہ قصیدے پڑھتے ہیں اور ان کی حمایت میں ایک دوسرے سے اِس طرح جھگڑتے ہیں جیسے ان سیاسی مداریوں نے ان کو تنخواہ پر اِس لئے رکھا ہے کہ یہ ان کے قصیدے پڑھتے ہیں۔آج پاکستانی عوام مجرم ہیں بابائے قوم محمد علی جناح اور ان لاکھوں شہیدانِ پاکستان کے جنھوں نے اس ملک کو بے مثال قربانیوں کے بعد بنایا۔ آج پاکستان کو بچانے کا ایک ہی راستہ نظر آتا ہے کہ پاکستانی قوم اللہ کے حضور اپنے جرائم کی معافی مانگیں اور پاکستان کو بچانے کے لئے بلاخوف وخطر کھڑے ہوجائیں۔اپنے آپ کو ان تمام موجودہ سیاسی پارٹیوں اور انکے سیاسی پنڈتوں سے علیحدگی کریں یا پھر خود ان کا احتساب کریں۔ پاکستان کے نام پر سیاست کرنے اور ملک کو لوٹنے

والے حکمرانوں کو انکے محلوں اور ایوانوں سے نکالیں۔ ان کو چوراہے پر لا کر ایسی عبرتناک سزا دیں کہ ان کی نسلیں یا تو کبھی ملک کی سیاست میں آنے کا سوچیں نہیں اور سوچیں تو صرف ملک و قوم کی خدمت کو اپنا مشن بنائیں۔ آج پاکستان کو اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر خطرہ ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت جس کا ماضی یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے کوئی انتہائی اقدام کرنے سے نہیں چوکتا، آج پاکستان میں اپنے نہ صرف پیر جمانے پر تلا ہے بلکہ پاکستان کے جغرافیہ کو بھی تبدیل کرنے کے ناپاک عزائم رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے اندر ایسے بے ضمیر لوگ موجود ہیں جن کے ہاتھوں میں پاکستان کی باگ دوڑ بھی ہے اور جو اپنے مفاد کی خاطر پاکستان کا سودا کرنے سے بھی نہیں ڈریں گے کیونکہ انھوں نے نہ صرف اپنے اثاثے پہلے ہی دوسرے ممالک میں بنا رکھے ہیں بلکہ شہریتیں بھی لے رکھی ہیں۔ للہذا اگر پاکستانی قوم نے اب بھی اپنی اجتماعی ذمہ داری کو محسوس نہ کیا تو یاد رکھیں جو قوم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتی وہ خود تاریخ بن جاتی ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے

آج کے دور میں تعلیم کی اہمیت جتانا ضیاع وقت ہے مگر لڑکیوں کی تعلیم و تحصیل کی وکالت اہم ہے، حقیقت یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم بھی نہایت ضروری ہے کیوں کہ فی زمانہ بغیر پڑھے لکھے مرد کا گزارہ ہے، نہ بغیر پڑھی لکھی عورت کی کوئی اہمیت و حیثیت ہے ،آج تعلیم کے بغیر انسان چاہے مرد ہو یا عورت ادھورا ہے ، وہ حقیقتاً خود شناس ہے نہ خدا شناس ، اور اگر ان پڑھ شخص غریب بھی ہے تو پھر دوہری مصیبت ہے، ان پڑھ غریب واقعتاً بہت بے چارہ اور مظلوم ہے جب کہ تعلیم غریب شخص کو بھی بارتبہ بنا دیتی ہے اور اس کی فطری لیاقتوں کو نکھار کر قابل عمل بناتی ہے، تعلیم ہی وہ ہے کہ جس کی بدولت ایک انسان (consume) ہی نہیں بلکہ موجد (invento) بھی ہو سکتا ہے ، اس لئے ایسی ضروری چیز سے عورتوں کو محروم نہیں رکھا جا سکتا۔اس سلسلے میں بعض ان پڑھ سادہ لوح لوگوں کا یہ ضابطہ قطعاً ناقابل تسلیم ہے کہ فی زمانہ لڑکیوں کو تھوڑا بہت ہی پڑھانا صحیح ہے کیوں کہ فی زمانہ تھوڑی بہت تعلیم کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، اس حدتک تو خود معاشرہ بھی بیدار ہے، آج اسکول جائے بغیر لوگ ہلکی پھلکی اردو بلکہ انگریزی بھی جان لیتے ہیں اور اگر لڑکیوں کی ہلکی پھلکی تعلیم کی وکالت کرنے والے بعض اعلی دینی یا دنیوی تعلیم یافتہ حضرات ہیں تو ہماری گزارش یہ ہے کہ ذرا وہ خود

اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ اگر وہ خود بہت کم پڑھے لکھے ہوتے اور صرف نام لکھنا اور نام پڑھنا جانتے تو کتنی بڑی نعمت سے محروم ہوتے اور غیر شعوری طور پر کتنی بدنصیب زندگی گزار رہے ہوتے، ہمارا خیال ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ پڑھا لکھا شخص اپنے آپ کو خالی از علم تصور کرکے ہی کانپ اٹھے گا اور اپنے اچھے پڑھے لکھے ہونے پر فوراً اللہ کا شکر بجا لائے گا اور جب سچ یہ ہے تو پھر کسی ایک لڑکی یا خاتون کے لئے نہیں بلکہ پوری آدھی نسل انسانی کے حق میں یہ روح فرسا اور نہایت جابرانہ ضابطہ کیسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مذہب و تہذیب سے حیلہ پکڑنے کی بات ہے تو اہل علم بتائیں کہ وہ خود تحصیل علم و دانش سے قبل مذہب و تہذیب کو کتنا جانتے تھے اور جب خود تعلیم کے بعد بیدار ہوئے ہیں تو پھر یا تو اپنی اس بیداری کو ایک برے کام کا برا نتیجہ قرار دیں اور تسلیم کریں کہ انہوں نے حصول علم کرکے غیر ارادی خطا کی ہے، ورنہ دیدہ و دانستہ عورتوں پر ظلم نہ کریں اور انہیں ایک خیر کثیر سے محروم رکھنے کی سعی سے باز آئیں، حقیقت یہ ہے کہ تہی از علم کے نزدیک مذہب و تہذیب کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، جو پڑھا لکھا نہیں، اسے نہیں پتا کہ مذہب واقعتاً کیا ہے اور تہذیب حقیقتاً کس پرندے کا نام ہے، ان پڑھ شخص کی محدود ذہنی دنیا بس یوں ہی ہوتی ہے جیسے پوری دنیا میں رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہو اور اس میں اس کے بے حیثیت شعور کا ایک بے حد معمولی سا بلب دس بیس قدم تک روشنی کے نام پر صرف ایسا دھندلکا تخلیق کرلے کہ جس میں صرف کھانے

کمانے اور سونے جاگنے جیسے چند موٹے ٹوٹے تصادمات زندگی کے محض بے سلیقہ مادی مفاہیم ہی واضح ہو سکیں، جب کہ قدرے لطیف دلالتیں تازیست بعدی از گرفت احساس رہیں، غرض ان پڑھ شخص اس دنیا کو کچھ نہیں سمجھ پاتا اور عموماً یوں ہی آ کر یوں ہی چلا جاتا ہے۔ خواتین کو تعلیم سے روکنے میں مذہب و تہذیب سے دلیل پکڑنا اس لیے بھی غلط ہے کہ اسلام کی بنیادی کتاب قرآن مجید ہر انسان سے دنیا و مافیہا میں غور و خوض کی سخت تاکید کرتی ہے اور یہ تاکید مرد و عورت دونوں سے ہے اور ظاہر ہے قرآن مجید کا مطلوبہ غور و خوض کسی جاہل اور ان پڑھ کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید اصلاً کتاب ہدایت ہے اور اس کی ہدایت کسی ایک جہت میں محدود نہیں بلکہ ہمہ جہت ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ، تہذیب، سائنس، قانون، اقتصاد، سیاست، معاشرت، ادب، اخلاقیات، جیسے نہ جانے کتنے بنیادی علوم و فنون کو نہ صرف کامل نظریاتی انداز میں بلکہ حقیقتاً قابل عمل نظام و ضابطے کی شکل میں پیش کرتا ہے، تو جب یہ قطعی ہے کہ قرآن مقدس کے زیادہ سے زیادہ پڑھنے اور سمجھنے کے استحقاق میں خواتین بھی برابر کی حصے دار ہیں اور جب انہیں یہ قطعی حق ہے کہ وہ اللہ کی اس مقدس کتاب کو پڑھ سمجھ کر دنیائے دین و دانش میں انسان کی ہم جہت رہ نمائی کریں تو وہ کیوں قرآن کے مشمولہ مضامین کو نہ سمجھیں اور کیوں نہ سیکھیں رہی یہ بات کہ عصری اداروں میں یہ علوم قرآنی منہج سے نہیں پڑھائے جاتے تو یہ اعتراض مردوں کے حق میں بھی موجود ہے، غرض جو قرآن اور اس کا

مذہب اسلام بلا تفریق صنف، انسان کو زبردست حصول علم پر ابھارتا ہے وہ دوسرے ہی لمحے عورتوں کو محض امی رہنے کی تلقین ہر گز نہیں کر سکتا۔ نیز کیا ہمیں نہیں پتا کہ مذہب کی تعلیم عورتوں پر بھی فرض ہے ورنہ محض جہل و لاعلمی کی صورت میں یہ ہوگا کہ عورتیں دوسروں کی سنی سنائی باتوں پر اپنے کمزور ایمان کی بنیاد رکھیں اور معاشرے کی دیکھا دیکھی چند نیم مذہبی رسموں کو اپنا کر ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں، جب کہ حقیقتاً اسلام کے نزدیک یہ نا قابل برداشت ہے، ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھیں کہ بڑے بڑے اہل علم اور کبار صحابہ کرام تک قرآن و حدیث کے مسائل کی جان کاری آپ سے حاصل کرتے تھے اور آپ انہیں مسائل بتاتی تھیں، تو اصل یہ ہے کہ خواتین کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی کوئی تہذیبی یا مذہبی تحدید نہیں، البتہ تحدید حالات کے اعتبار سے کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک پیشہ ورانہ علوم کی بات ہے تو ان میں بھی متعدد علوم ضروری ہیں، ورنہ یہ مذہب کشی اور تہذیب سوزی ہی ہوگی کہ ہماری مائیں اور بہنیں نا محرم مرد ڈاکٹروں سے اپنے ہر طرح کے امراض کا علاج کرائیں اور طبّی تفتیش کے نام پر انہیں اپنے بدن کے کسی بھی حصے کو دیکھنے اور چھونے کی اجازت دیں، تو جب تک خواتین اعلی تعلیم حاصل نہ کریں گی تو وہ ڈاکٹر کیسے بنیں گی اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے والی مسلم طالبات کے لیے خواتین معلّمہ کیسے بنیں گی، اسی طرح اور بہت سے شعبہ جات ہیں جہاں عورتوں ہی کا پیشہ ورانہ اعلی تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے، آج کچھ لوگ

کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی لڑکیوں سے نوکری نہیں کروانا ہے کہ انہیں اعلیٰ تعلیم دلائیں، نہ ہمیں اپنی بیویوں کی کمائی کھانا ہے۔ لیکن سوال نوکری اور کمائی کا نہیں، سوال انہیں انسان بنا کر خوش شناسی و خود اعتمادی عطا کرنے کا ہے اور حقیقتاً یہ حق باپ کو بھی نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو جاہل و بے خرد ہی پیدا کرے اور تقریباً اسی حالت میں مہد سے لحد تک کا نہایت قیمتی سفر پورا کروا کر انہیں حوالۂ قبر کر دے اور اس طرح عورتیں ہنڈیا روٹی کرتے کرتے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں، حقیقت یہ ہے کہ عورتیں صرف مردوں کی روٹی پکانے اور انہیں راحت بدن پہنچانے ہی کے لیے نہیں پیدا ہوئیں بلکہ ان کی زندگی بھی مردوں کی طرح اہم اور بامقصد ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو اس لیے عصری تعلیم نہیں دلانا چاہیے کہ اس سے ان میں برہنگی اور بے راہ روی پیدا ہوتی ہے، مگر اس پر اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعی عصری تعلیم کے مضامین کے اندر اس طرح کی تعلیم سے لڑکوں کو بھی کنارہ کش رکھنا ضروری ہے، کیوں کہ جنسی بے راہ روی اور بے حیائی مردوں کے لیے بھی قطعاً ناجائز و حرام ہے، کہنا یہ ہے کہ جب اسباب مشترکہ ہیں تو احکام بھی مشترکہ ہونا چاہئیں، جب لڑکے اور لڑکیاں دونوں غلط اور فاسد مضامین پڑھ رہے ہیں تو بیک وقت دونوں کو روکا جانا ضروری ہے، صرف لڑکیوں کو بے تعلیم گھر بیٹھائے رکھنا اور لڑکوں کو بگڑنے کے لیے بے مہار چھوڑ دینا انصاف و دیانت کے جذبے سے ہم آہنگ فیصلہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ بے تعلیم مسلسل گھر رہنے کی حالت ہو یا

تعلیم کے لیے ریگولر عصری اداروں میں جانے کی صورت ، ہر دو شکلوں میں عموماً وہ اولادیں ہی زیادہ بگڑتی ہیں جن کا اپنا کوئی مضبوط قابل احترام مذہبی یا تہذیبی بیک گراؤنڈ نہیں ہوتا یا جن کی تربیت پر گھر والوں کی طرف سے غیر ضروری لاپروائی برتی گئی ہوگی ہے، یاد رہے۔ تہذیب یا تادیب وتربیت سے مراد معاشرے یا گھر والوں کا ظلم و جبر نہیں بلکہ معاشرے میں گھر یا خاندان کی وہ متوارث عزت یا مسلمہ شرافت ہے کہ کس کے خلاف کچھ کرتے وقت گھر یا خاندان کے کسی بھی فرد کو لازماً حیا آئے، پھر گھر یا خاندان کے لوگ اسی متاع حیا کو اپنے مسلسل پاکیزہ کردار و عمل کے ذریعے بغیر جبر و اکراہ، اپنی اولادوں تک منتقل کردیں، تو عموماً یہ چیز برائیوں سے تصادمات کے وقت ان صالح اولادوں کو اپنے حصار میں کرلیتی ہے اور کسی طرح کی بے راہ روی کو بآسانی ان تک پہنچنے نہیں دیتی، لہٰذا گھر میں صالح ماحول کی تشکیل اور بچوں کی شروع ہی سے پاکیزہ تربیت ضروری ہے، کیوں کہ ایک بچہ گھر کی تربیت اور بالعموم اس دنیا سے بہت کچھ سیکھتا اور حالات کے مطابق اپنی عادتیں تشکیل دیتا ہے، تو کیوں نہ ہم اپنی اولادوں کی عادتیں خیر پسند اور فطرتیں مثبت بنائیں۔

سچ کی تلاش

وہ سچ کی تلاش میں تھا۔ اس نے آنکھ ایسے ماحول میں کھولی جس کی تمنا دوسرے کئی برس سپنوں کی طرح کھلی آنکھوں میں بساتے ہیں۔ مگر جن میں مایوسی لوڈ شیڈنگ کے اندھیروں سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے۔ معاشرہ سے کٹ کر ضرورت صرف معاش رہ جاتی ہے۔ پھر انسان بھی انس آن نہیں رہتا۔ رشتوں کے ٹوٹنے کی آواز سوکھی لکڑی کے تنے سے الگ ہونے جیسی ہوتی ہے مگر سنائی نہیں دیتی۔ اپنے پن سے جدا ہونے کا درد محسوسات سے خالی کبھی نہیں ہوتا۔

اس کا یہی درد پیشانی پہ پڑی سلوٹوں سے عیاں تھا۔ ہر سوال کے آخر میں کیوں اور پھر ایک نئے سوال کی ابتداء۔ یوں نہ تو وہ سوال سے اپنے آپ کو روک پایا اور نہ ہی جواب سے تسلی۔" کیوں "نے اس میں گھبراہٹ کا سایہ پھیلا رکھا تھا۔ سایہ اتنا گہرا ہو گیا کہ مایوسی کے اندھیرے میں اسے روشنی کی تلاش نے بے چین کر دیا۔ باپ سے سوال کرتا تو وہ دوسری بیوی اور اس کے پہلے بچوں کے معاملات میں الجھنے کی وجہ سے اسے پہلی غلطی کی سزا نظر آتا۔ اس کی پہلی بیوی دوسرے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے اس کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئی اور دوسری بیوی اپنی پہلی اولاد کے ساتھ ساتھ اس کی بچی پر بھی اپنا حق جتاتی۔

ہمسائے اس سے نالاں ، دوست اس سے کنارہ کرتے ،مذہب میں اسے پناہ نہ ملتی۔وہ الجھتا چلا گیا۔نشہ کی بجائے اس نے دوا کا سہارا لیا۔ جس سے خیالات کچھ دیر ستا لیتے مگر آنکھ کھولتے ہی اسے بے رحم سوالوں کے تھپیڑے آ لیتے۔وہ سوالوں کی گٹھڑی کندھوں سے اوپر دماغ میں سجائے سوالی بنا پھرتا۔آخر اسے کس کی تلاش تھی۔ کہیں رشتوں سے فرار کا راستہ ڈھونڈنے کے لئے سہارے کی تلاش میں تو نہیں مارا مارا پھرتا رہا۔ملاقات دوسری بار سوال پہلے والا۔اسے ایسی کتاب کی تلاش کیوں جس کے ایک ایک لفظ پہ سچائی لکھی ہو۔ بندے پہ جس کا اثر تو ہو مگر دسترس و اختیار سے اوپر ہو۔ جن کی نظریں اپنے چاروں اطراف.برپا ہنگامہ خیزی سے دوچار ہوں۔ دماغ کے تندور میں خیال کے پیڑے سے اختلاف کی روٹی پکانے کا عمل جاری و ساری ہو۔ وہاں قلب میں میوے انتظار میں ہی سوکھ جاتے ہیں۔جو زندگی آنکھوں اور کانوں سے بسر کرتے ہیں زندہ قلب سے نہیں رہتے۔ جو لفظ پڑھنے یا سننے سے ذہن میں سما جائیں مگر قلب میں نہ اتر پائیں تو.برین واش تو ہو جاتا ہے مگر قلب صفائی سے محروم رہ جاتا ہے۔دروازے پہ دستک گھر کے مکین سے تعلق کی غماز ہوتی ہے۔ مکین سے محبت ہو تو دستک ملائمت احساس سے بھری ہو گی۔ دوسری صورت میں ہاتھ کی ضرب آنے والے کے ارادے کا ڈھنڈورا پیٹے گی۔اللہ سبحان تعالی کے فرمان تک پہنچنے کے لئے ذہن کے دریچے بند کر کے قلب کی سیڑھی سے سچائی کی رسی تک رسائی ممکن بنائی جا سکتی ہے۔ اگر جینے میں کیوں ، کیا، کیسے کے حروف اضافی کی تکرار ہو تو سوالوں کی

بھرمار کے وزن سے پیشانی پہ سلوٹیں بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ چاند پر پڑتی سورج کی شعائیں اسے گھٹا بڑھا کر تاریخوں میں بدل دیتی ہیں۔ یہی شعائیں زمین پر دن رات کی تمیز کرتی ہیں۔ اس سے آگے کا علم نہیں۔ کہیں مفروضے تو کہیں کہانیاں ہیں۔ زمین میں ننھے بیج کے دبانے سے خوشبو اور مہک میں لپٹنے تک پھل اور پھول ایک وقت کی حقیقت کے عکاس ہیں۔ پل بھر کے چکھنے کی داستان نہیں۔ جو ابر کے کرم کے محتاج ہیں۔ جو اتاریں نہ جا سکیں تو خود ہی اتر کر زمین سے لپٹ کر فنا ہو کر پھر نئی زندگی بن جاتے ہیں۔ رب العالمین کا تصور کرنے کے لئے بند کمرے سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آنا ہو گا۔

نعمتوں کا تصور باغوں و بہاروں سے جدا ہو کر رنگ نہیں دکھا پائے گا۔ مہتاب کو اپنا کہہ دینے سے کسی کی ناراضگی کا اندیشہ نہیں رہتا۔ کیونکہ زمین کے عشق میں وہ خود دیوانہ وار جھومتا ہے۔ ہوائیں زندگی کی محبت میں بستر سے لپٹی سانس تک آمدورفت جاری رکھتی ہے جو زرد پتوں کو گرا دیتی ہیں اور آندھی بن جائیں تو اڑا دیتی ہیں۔ خیالات کی زمین پر جب شک کی پنیری لگائی جائے گی۔ تو اختلاف کی فصل کو کاٹنا بہ امر مجبوری بن جائے گا۔ دوسروں کا احتساب کرنے سے پہلے اپنا محاسبہ ضروری ہے۔ ترازو میں تولنے والا ایک طرف ہمیشہ اپنے پاس باٹ رکھتا ہے۔ جس کے وزن کا پورا ہونا تول کی گارنٹی ہے۔ نئے ماڈل کی کار، پوش علاقے میں مہنگے بنگلے خواہشات کے غلاموں کی امارت کی منڈیوں میں نیلام ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جسے پانے کے لئے آزادی کے پروانے اپنی جانوں پر کھیل جاتے

ہیں۔ باتیں تو پرانی تھیں اسے نہ جانے کیوں نئی محسوس ہوئیں۔ شاہد اسے دنیا میں جینے کے لئے جینے کا ڈھنگ ہی بتایا جاتا رہا۔ مگر سچ تو قلب میں ایسے اترے جیسے پھل میں رس اترتا ہے۔ کلام کا اثر قلب کے پاک ہونے سے بڑھ جاتا ہے۔ علم تو معلم کا محتاج ہو سکتا ہے۔ عقیدتِ عشق، محبوب کے وصل سے وابستہ نہیں۔ خوشنودی کے لئے رضا بھی درکار ہوتی ہے۔ زیادہ سوالات کبھی گتھیاں سلجھانے کی بجائے خود ہی اُلجھ جاتے ہیں۔ جس سے طالب متعلّم ہو جاتے ہیں اور فیصلے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو علم کی معراج تو بن جاتے ہیں مگر عمل کی میراث نہیں۔ برسہا برس کی دھول چند لمحوں میں قلب سے دھل جائے تو شکریہ کا ہار الفاظ کے گلے میں نہیں ڈالا جائے گا۔ بلکہ اس قلب کو پہنایا جائے گا جو سچائی کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا تھا۔ لفظوں کو موتیوں کی مالا بنا کر جس نے پرو لیا۔

بسنت یا قتل عام؟

بسنت کا نام سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بار بار توجہ اس نتائج پر جاتی ہے تو اہل وطن کی اس انسیت پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔آپ کہیں گے کہ ہم جو مرضی کریں آپ جانیں اور آپ کا دل..... مگر شائد آپ کے ضمیر کی اتھاہ گہرائیوں میں ایمان کی روشنی آج بھی بقعہ نور بن کر چمک سکتی ہے کہ جب ہم ان امور کو سمجھنے لگیں جو ہماری دنیا و آخرت دونوں میں معاون ہیں۔ہمارے ہاں جس چیز کی سب سے بڑھ کر کمی ہے وہ ہے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔اکثر لوگ عیش و عشرت اور رنگینیوں میں کھو جانے کے بعد تباہی کے دھانے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں تو انہیں ہوش آتا ہے لیکن پھر سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔اگر سوچا جائے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہماری طرز زندگی ہمیشہ غیر مسلموں سے مختلف ہونی چاہیئے۔ہمارا اولین دین اور دیگر معاملات انفرادیت رکھتے ہوں تو یہ عظمت انسانیت کی دلیل بن سکتی ہے۔مگر جب ہم مسلمان کہلانے کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب کا دین اپنانے کے باوجود غیر مسلموں کی روش اختیار کریں۔انہیں کی طرز معاشرت اپنالیں تو مسلمانی کیا ہوئی ایک مسلمان کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ شان خداوندی یا اس کے پیارے محبوب کی بارگاہ میں بے ادبی کی جائے اور ان کو اذیت دی جائے

مگر یاد رکھیں جب ہم قرآن و حدیث کے احکامات کو پس پشت ڈال کر اپنے نفس کی پیروی میں لگ جائیں تو یہ بھی ادب کے خلاف ہے کہ جن کا نام لیتے ہیں ان ہی کی باتوں پر عمل کرنے سے کتراتے ہیں اور کفار و منافقین کے قدموں سے قدم ملاتے ہیں۔

حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔

من تشبہ بقوم فہو منہ:

جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی میں سے ہوتا ہے۔ذرا غور کریں کون سا" کام ہم اپنے دین اور دینداروں کی طرز پر کرتے ہیں اور کون کون سے کفار و یہود کی پیروی میں کرکے انکی مشابہت اختیار کر رہے ہیں؟؟؟ اگر آپ نے غور کیا تو معلوم ہوگا کہ زندگی بھر صبح سے شام تک سوائے چند افراد کے جو نماز روزہ کرلیتے ہیں باقی سب کا حال یہ ہے کہ نہ صبح خیزی کی عادت' نہ نماز و عبادت دنیا کی رنگینیوں میں کھونا' دیر سے سونا' فحش اور غیر شرعی اعمال نہ صبح اچھی نہ شام کا حال' کیا ہم اسی مقصد کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟ کیا ہماری نسلوں کے خون میں صرف شیطان کا اثر ہونا چاہئے؟ کیا ان کی نگہداشت و تربیت میں ہماری ذمہ داری ختم ہوچکی ہے؟ ان سب باتوں پر غور کریں اور توجہ سے سوچیں کہ "بسنت" کیا ہے؟ یہ کہاں سے چلی ہے؟ اور لوگ اس کے پس پشت اپنی جانوں پر کتنا ظلم کیے جاتے ہیں؟ بنیادی طور پر بسنت ہندوؤں کا تہوار ہے۔ یہ انہیں کی رسم اور کھیل ہے۔ مگر حیرت ہے ان لوگوں پر جنھوں نے دین

اسلام میں پناہ لے رکھی ہے اور مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر مشابہت اسی قوم کی اختیار کرتے ہیں جن سے بچنا چاہیے۔بڑے بڑے سیاستدانوں جاگیردار اور نیکی کے دعویدار اس رسم کے دلدادہ ہیں اور سرکاری سطح پر بھی ''بسنت میلہ'' کا اہتمام خوب کیا جاتا ہے وہ لوگ جو چند منٹ کے لیے بارگاہ خداوندی کی حاضری کا وقت نہیں نکال سکتے۔میوزک کی آواز اور لغویات کے سائے میں سارا سارا دن گزار دیتے ہیں۔وہ لوگ جو راتوں کو عبادات و ریاضت کو فضول سمجھتے ہیں اور زندگی بھر قیام سے محروم رہتے ہیں ''بسنت نائٹ'' بڑے شوق سے مناتے ہیں۔آہ یہ مسلمان ہیں انہیں دیکھ کر شرمائیں یہود، یہ پتنگ تو کاٹ رہے ہیں مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا رابطہ اللہ اور اس کے حبیب سے کٹ رہا ہے۔یقیناجب انکی نافرمانی کے ذریعے پاس ادب نہ کریں گے تو رابطہ منقطع ہوگا ہی۔اتباع سنت کا راستہ چھوڑ کر اتباع الشیطان کی جاتی ہے اور دن رات شوروغل سے طوفان بدتمیزی اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔بسنت نہ صرف غیر اسلامی تہوار کی نقل ہے بلکہ کروڑوں روپے اس پر ضائع کیے جاتے ہیں۔مگر ہر شخص یہی کہتا نظر آتا ہے کہ یہ تو چند روپوں کا کھیل ہے۔ارے تمام لوگ چند روپے خرچ کرتے ہیں مگر لاکھوں افراد کے چند روپے کروڑوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ایک غریب آدمی بھی اپنے لڑکے کی خوشی کے لیے آٹا دال پوری کرنے کے بجائے پتنگ پر رقم صرف کرتا ہے۔یہ اس کی ظاہر تو اولاد سے محبت ہے کہ ان کی خوشی حاصل کر رہا ہے مگر حقیقتاً اپنی اولاد کی جان و اخلاق کا دشمن ہوگیا ہے۔دیکھو وہی بچہ چھت

پر شرارت کر رہا ہے دوسرے بچے گالیاں دے رہے ہیں اور وہ بھی سیکھ رہا ہے اسلام میں گالی دینا سخت گناہ ہے مگر یہاں گالیاں سکھائی جارہی ہیں۔ دوسری طرف لڑکے آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں اور چند روپوں کی پتنگ جان لے جاتی ہے پھر یہی نہیں آئے روز کتنے ہی لوگوں کے لخت جگر بجلی کا کرنٹ لگنے یا چھت سے گر کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ مگر نشہ ہے کہ بڑھتا ہے اور ہر سال اس طوفان بدتمیزی کی نگہداشت کی جارہی ہے ایک بات جو بہت ضروری ہے عرض کرتے چلیں کہ جس کاغذ سے پتنگ بنائی جاتی ہے اور دھاگہ جو ڈور کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے دونوں باہر کی غیر مسلم ممالک خصوصاً بھارت سے منگوائے جاتے ہیں اور بھارت کو اس قبیح کام کے لیے کروڑوں روپے کی آمدن دی جاتی ہے آہ آج ہم کشمیر کا رونا روتے ہیں لیکن شاید کشمیریوں سے سچی محبت نہیں رکھتے۔ ورنہ بھارت کو کسی بھی انداز میں آمدن کا ذریعہ پیدا نہ کرنے دیتے کہ انہیں پتنگوں کو بیچ کر اس کی رقم سے گولیاں اور پتنگ خریدے جاتے ہیں جو کشمیری مسلمانوں پر برسائے جاتے ہیں۔ کاش ہم مسلمان ہو کر اہل کشمیر اور دنیا کے دیگر مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی جتلانے کی بجائے پہلے اہل کفر کو پہنچنے والی امداد کے راستے بند کرتے اور ان کے معاون نہ بنتے مگر ''بسنت میلہ'' تو منانا ضروری ہے چاہے جان جائے یا کشمیر جائے ؟؟؟ اے مسلمانوں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اپنے اسلاف کی تعلیمات کو اور بزرگوں کی روایات کو چھوڑ کر کس راہ پر چل نکلے ہو؟ جان لو یہ بسنت نہیں بلکہ اس کی آڑ میں کشمیریوں پر ظلم ہے تمہارے مال و دولت کس کا پیٹ

بھر رہے ہیں۔ تمہاری طرف سے ملنے والی آمدن سے غیر مسلم قومیں پلتی ہیں۔اور تمہاری طرف توپوں کا رخ کرکے تمہاری ہی جانوں کا خون کرتی ہیں۔آہ آج ہم سب جاننے کے باوجود بھارت کو کتنی امداد دے رہے ہیں یہ امداد ویڈیو کیسٹوں اور ڈور کے دھاگے کی آڑ میں مسلسل دی جاتی ہے۔انہیں کے اداکاروں کی زبان سے لغو اور فحش گائے جانے والے گانے تمہاری زبانوں کی بھی زینت بن رہے ہیں۔وہ زبانیں جو یاد خداوندی میں تر ہونا تھیں بوکاٹا بوکاٹا کی صدائیں اور گانے گانے میں مصروف ہیں۔آج کشمیر کا ذرہ ذرہ پکار رہا ہے کہ شہیدوں کے لہو سے بے وفائی مت کرو۔اس دیس کی پاک مٹی پر ناپاک کام چھوڑ دو۔شراب و جواء جو کہ تم پر حرام ہیں۔انہیں اپنا کر اپنی عاقبت و صحت تباہ کر رہے ہو۔اور اپنی زندگی کی ساعتوں کو ناکارہ کرنے میں مصروف ہو۔فحاشی و عریانی کا بازار اتنا گرم ہوتا جا رہا ہے کہ بسنت میلہ کی آڑ میں پاک وطن سے ٹیلی ویژن و ریڈیو بھی مختلف فحش انگیز پروگرام پیش کر رہے ہیں۔جس اسلامی معاشرے میں عورت گھر کی زینت اور باپردہ ہونی چاہیے۔ٹی وی پر ننگے سر اور ننگے منۂ فیشن میں لت پت اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑا رہی ہیں اور گانے باجے سن سنا رہی ہیں۔

آہ اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

بسنت منانے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ رسم یا کھیل کسی فائدہ کا باعث نہیں

ہر سال سینکڑوں جانیں ضائع ہو رہی ہیں کیا آپ سب اس بات سے باخبر ہیں؟؟کیا کسی نے جان سے بچ جانے کا سرٹیفکیٹ لے رکھا ہے آج قانون کی نظر میں بھی بسنت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے تو کیا اگر یہ مذہب سے علیحدہ ہے تو اسی پر اصرار ضروری ہے؟اور یقیناً جو بات مذہب سے لاتعلق ہونے کی دلیل ہے۔وہ دوسروں کو بھی مذہب سے قطع تعلق ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔آؤ اس نافرمانی سے باز آنے کا اعلان کریں۔یہ جان و ایمان کا دشمن کام ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی بے شمار چیزوں کے لیے نقصان دہ ہے۔وہ ڈور جو کٹنے کے بعد زمین کی طرف لپکتی ہے راہ گیروں کی گردن پر پھر جاتی ہے جس سے ایک جان ضائع ہو جاتی ہے اور ارشاد العالمین ہے ''کہ جو کسی کو ناحق قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے۔''اسی طرح واپڈا کے بے شمار ٹرانسفارمر اور تاروں کو نقصان پہنچتا ہے جس سے بجلی بند ہو جاتی ہے نہ جانے کتنے گھروں میں بعض افراد بیمار یا ہسپتال میں پڑے ہوتے ہیں یہ ملکی ترقی میں معاون کاموں اور فیکٹریوں میں ہوتے ہیں جہاں بجلی نہیں جانی چاہیے مگر آہ ہمیں خود غرضی نے مار دیا۔ہم اجتماعی سوچ نہیں رکھتے اور اپنی ایک خواہش پر ہزاروں افراد کی سہولت و آسائش تباہ کر دیتے ہیں۔

یوم خواتین پر دل کو چھو لینے والی خصوصی تحریر

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانہ جاہلیت میں خواتین کا مرتبہ صرف ایک گھریلو سامان کی حیثیت سے زیادہ نہ تھا، جن کی جانوروں کی طرح خرید و فروخت ہوا کرتی تھی اور ان کے حقوق کا گھلا گھونٹا جاتا تھا۔ تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتی تھیں، وہ اپنے حقوق بھی نہیں مانگ سکتی تھیں اور اگر اپنے حقوق یا کسی بھی شے پر آواز اٹھاتی، تو موت کے گھاٹ اتار دی جاتی۔ مگر مذہب اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، وہ جج بن سکتی ہیں۔ اسلام نے انہیں صحیح آزادی کا تصور دیا ہے جو دیگر مذاہب میں قطعی نہیں تھا۔ اگر یوں کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ آج کے دور میں خواتین کے لیے ایک بیداری مہم چلانے کی اشد ضرورت ہے تا کہ وہ جان سکیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ مگر پہلی بات، مغرب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس نے دنیا کو جمہوریت اور سیکولرازم کا تحفہ دیا ہے، جس میں ہر شخص کو اظہارِ خیال کی اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ رہنے کی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے

کی اجازت ہے اور کسی پر کوئی رائے تھوپی نہیں جاسکتی۔ عالم اسلام پر اس کا دباؤ ہے کہ وہ اپنے یہاں خواتین کو اپنے خیال کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیں، ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اختیار دیں اور اس میں جبراً، زور زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر مغرب میں شاید آزادی کا حقیقی مقصد انسان کو اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد کرنا ہے، نہ کہ آزادی سے ہمکنار کرنا۔ اسی لیے مغرب مسلمانوں کو ان کی مذہبی شناخت سے محروم کرنے اور مسلمان خواتین کو نقاب سے روکنے کی نہ جانے کیسی کیسی مہم چلاتا رہتا ہے۔ واضح ہو کہ فرانس میں اسکول اور سرکاری اداروں میں سکھوں کے لیے پگڑی، مسلمان خواتین کے لیے ' اسکارف' یہودیوں کے لیے ان کی مخصوص ' ٹوپی' اور عیسائیوں کے لیے صلیب رکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، جس کا وبال پوری دنیا میں گونجا تھا۔ افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ کچھ خواتین بھی خواتین کے لیے پردہ کرانے کو غلط بتاتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ جمہوری تصور کے منافی ہے، جس میں تمام لوگوں کو یکساں حقوق دینے کا اور اپنی سوچ کے مطابق عمل کرنے کا حق دینے کا دعویٰ کیا جاتاہے۔ لیکن ذرا سوچیے! کیا سیکولرازم کا مطلب یہی ہے کہ ایک شخص کو جانوروں کی طرح بے لباس ہونے کی تو اجازت ہو؟ لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور خواہش سے لباس پہننا چاہیں تو اس پر پابندی لگا دی جائے؟ اللہ کا نظام ہے کہ جو چیز اہم بھی ہوتی ہے اور نازک، اسے حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ پاؤں پر کوئی حصار نہیں رکھا گیا، لیکن

دماغ کو سخت ہڈیوں والی کھوپڑی کے اندر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا تحفظ ہوسکے۔ دل کی جگہ سینے کی لچک دار ہڈیوں کے بیچ رکھی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کی حفاظت ہوسکے۔ آنکھوں پر پلکوں کا پہرہ بٹھایا گیا۔ یہ ان اعضاء کی حفاظت کے لیے ہے۔ نباتات ہی کو دیکھئے اگر آم پر دبیز چھلکوں کا لباس نہ ہوتا تو کیا مکھیوں اور بھرنڈوں سے بچ کر وہ انسان کے ہاتھ آسکتا ؟ اگر چاول اور گیہوں کے دانوں پر ان کی حفاظت کے لیے چھلکے نہ ہوتے تو انسان انہیں اپنی خوراک نہیں بنا سکتا تھا۔ خود انسانی معاشرہ میں دیکھئے، ملک کا ایک عام شہری کھلے عام ہر جگہ آمد و رفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ سیکورٹی گارڈ ہے نہ اس کی رہائش گاہ پر پہرے دار ہے، جبکہ اہم شخصیتوں کے لیے تحفظ کا خصوصی نظم کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں میں عورتوں کی حفاظت کی زیادہ ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خدا نے انہیں مردوں کے لیے وجہ کشش بنایا ہے، اس لیے ان کی تراش و خراش میں حسن کاری اور لطافت کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر کسی کا لڑکا شہر جائے تو اسے شام کے 4 بجے آجانا چاہیے تھا، لیکن وہ رات کے 10 بجے لوٹے تو اس سے گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر یہی واقعہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آجائے تو دل کا قرار چھن جاتا ہے اور ماں باپ کی کروٹیں بے سکون ہوجاتی ہیں۔ اسی کو دیکھئے کہ پوری دنیا میں اور پاکستان میں بھی مردوں اور عورتوں کے تناسب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اللہ نے ان دونوں صنفوں کو ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے تاکہ دونوں طبقات کی

ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ 100 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اہل مغرب عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینے کا نعرہ لگا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آج بھی عورتیں حقوق مانگتی ہیں اورانہیں وہ حقوق واختیارات پوری طرح نہیں دیے جاتے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں امریکہ وروس میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی؟ اور یورپ میں مار گریٹ تھیچر کے علاوہ کوئی خاتون وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر نہیں پہنچ سکی۔ یہ ظلم وحق تلفی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ قانونی فطرت کا فیصلہ ہے۔ قدرت نے خود دونوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اور صلاحیتوں کے لحاظ سے دائرہ کار متعین کیا ہے۔ پردہ بھی اسی فرق کا ایک حصہ ہے۔ جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اورشہوانی جذبات رکھتے ہیں، لیکن ان کی فطرت لباس کے تصور سے عاری ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریانیت سے بچائے اور لباس زیب تن کرے۔ وہی فطرت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ مردوں کے مقابلے عورتیں زیادہ ڈھکی چھپی ہوں۔ فرض کیجئے دولڑکیاں راستے سے گزر رہی ہیں، ایک لڑکی کا لباس چست اور شوخ ہو، اس کا سر کھلا ہو، اس کے بازو کھلے ہوں، اس کا پیٹ نگاہِ ہوس کو دعوت نظارہ دیتا ہو اور اس کا کسا ہوا لباس جسم کے نشیب وفراز کو نمایاں کرتا ہو اور دوسری لڑکی سرتاپا نقاب میں ہو یا کم سے کم ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر دوپٹہ ہو تو اوباش قسم کے لڑکے ان میں سے کس کو چھیڑنے کی کوشش کریں گے؟ ہوس ناک نگاہوں کا تیر کس کی طرف متوجہ ہوگا؟ برائی کے جذبات ان

میں سے کس کے تئیں دلوں میں کروٹ لیں گے؟ یقیناً بے پردہ لڑکی اس کا نشانہ بنے گی۔ پردہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو نہایت واضح ہیں، قرآن مجید نے عورتوں کو پورے جسم کے علاوہ چہرے پر بھی گھونگھٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ خواتین کے لیے اللہ کے رسول نے مسجد میں پیچھے کی صف رکھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ خواتین کے لیے شریعت نے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں مقرر کیں جو اندرون خانہ کی ہیں اور انہیں شمع محفل بننے کی بجائے گھر کی ملکہ بنایا۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے۔ بائبل میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ جو کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں بلکہ بعض وہ ہیں جو پردہ کی وجہ سے پہچانی نہیں گئیں۔ آج بھی حضرت مریم کا جو فرضی مجسمہ بنایا جاتا ہے اس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ حالانکہ رومن تہذیب اور اس کے بعد یورپ میں
عورتوں کے عریاں مجسمے بنانے اور جسم کے ایک ایک نشیب وفراز اور خدوخال کو نمایاں کرنے کا رواج عام ہے۔ گویا جو لوگ عریانیت اور بے پردگی کے مبلغ ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں کا تقدس باپردہ رہنے میں ہی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بہت سی باکمال خواتین پیدا ہوئی ہیں جن کے حالات پر کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، کارِ افتاء انجام دے سکتی ہیں، وہ حدود

قصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات کی جج بن سکتی ہیں۔یعنی مردوں کی طرح حدود میں رہتے ہوئے ہر کام کر سکتی ہیں۔کاش اہل مغرب اور پردے کے مخالف حضرات عورتوں کے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے دکھ کا مداوا کر سکیں۔ یہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مریم ایک مقدس ترین شخصیت کی مالک ہیں بلکہ بعض تو انہیں عیسائی عقیدہ کے مطابق تین خداؤں میں ایک خیال کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ کنواری تھیں۔ انہیں کسی مرد نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور اللہ تعالی کے خصوصی حکم کی بناپر وہ حاملہ ہوئیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جس عورت کو اتنا بڑا رتبہ دیا گیا ہو، آج انہی پر ایمان رکھنے والی عیسائی قوم دامن عفت تارتار کرنے کو بے قرار ہے۔

آخر کب تک؟

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا اس کی خطاء کو معاف کر کے دنیا میں اس کے زندگی گذارنے کے بہترین اسباب پیدا کئے۔اس دنیا میں ہر وہ چیز پیدا کی جس سے اس رب العزت کا بندہ فیض یاب ہو سکے لیکن انسان نے خیر میں شر کو شامل کر دیا۔یہ فطرت خداداد نہ سہی لیکن شیطان تو ہر انسان کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔اصل کسوٹی تو یہ ہے کہ انسان شیطانی فتنوں سے اپنے آپ کو مرتے دم تک بچاتا رہے۔یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں ہے ،کیوں کہ قرآن و احادیث مبارکہ میں شیطانی فتنوں سے بچنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس راہ پر ڈالتا ہے۔انسان میں تجسس کا مادہ فطری ہے۔ اسی تجسس نے اسے خلاء تک پہنچایا اور اسے زمین کی گہرائی میں بھی اتارا لیکن وہ کائنات کے حدود اربع کی تلاش میں اپنی ذات کو ہی دنیا کی بھول بھلیوں میں فراموش کر بیٹھا۔آج سائنس و ٹکنالوجی کی حد درجہ بڑھتی ہوئی ترقی نے انسان سے انسانیت کو ہی خارج کر دیا اور اسے جانوروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ذرا غور کریں تو انسان کو اپنی وحشت اور بربریت کی سینکڑوں داستانیں ہر روز اخباروں میں پڑھنے کے لئے مل جائیں گی۔کیا یہ داستانیں اس کی ترقی ،دانشمندی اور آزادی کی علامتیں ہیں؟یا

پھر انسان ابلیس سے اپنے ربط و ضبط کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے ؟جو بھی ہو ترقی کے ان وسائل نے جہاں انسان کے در پر دولت کے انبار لگا دیئے ہیں وہیں انسان سے اس کے اعلیٰ اقدار کو چھین لیا ہے۔اب انسان اعلیٰ قدروں سے خالی وجود لئے ترقی کے نام پر رقص ابلیس میں مصروف ہے۔اس طرح وہ بربادی کے دلدل میں دھنستا چلا جارہا ہے۔سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں انسان کھویا ہوا ہے۔سائنس اور ٹکنالوجی کے موجدین چونکہ خدا بیزار اور دنیا پرست لوگ ہیں اس لئے انہیں نہ تو اقدار کی بربادی سے سروکار ہے اور نہ ہی قوموں اور نسلوں کی تباہی پر غور کرنے کی فرصت۔وہ تو دولت اور شہرت کے نشے میں امیر بن جانے کی کوشش میں کوشاں ہیں خواہ وہ کسی بھی قیمت پر ہو۔آج کے دور میں انٹرنیٹ کا فتنہ بیشک ایک دجالی فتنہ کے طور پر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔جس نے عالمی سطح پر وہ بربادی مچائی ہے کہ دنیا تباہ ہونے کے درپے ہے،مگر اس ترقی پسند زمانے کو اس کی ترقی پسند آنکھوں سے دیکھا جائے تو اس انٹرنیٹ کی وجہ سے انسان دنیا کے کونے کونے کی معلومات حاصل کر رہا ہے،خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔یہ دنیا جہاں کی معلومات حاصل کرنے کی جستجو میں انسان اپنی حقیقت سے غافل ہو چکا ہے۔اب انسان کی بہتری اس میں ہے کہ اپنی بقا کے لئے ترقی کے نام پر پیدا ہونے والے نت نئے فتنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے،اسی میں انسان کے دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔اللہ تعالیٰ ہر فرد کو سہی سمجھ عطا کرے اور جدیدیت کے فتنوں سے بچائے، کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ شرح خواندگی

کے لحاظ سے ہمارا ملک دنیا کے پسماندہ ترین ممالک میں شامل ہوتا ہے، اس کے باوجود ہم صرف اپنے بجٹ میں سے G.D.P کا 2.06% فیصد تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں، کم و بیش یہی حالت 90 کی دہائی میں رہی ہے، ہمارے مفاد پرست حکمرانوں کی ترجیح ہمیشہ سے اپنے سیاسی مفادات ہی رہے ہیں اس کے برعکس ہمارے پڑوسی ملک 10 فیصد سے زائد تعلیم پر خرچ کررہے ہیں۔ہمارے موجودہ تعلیمی نظام سے طلباء کی صلاحیتیں مسلسل ماند پڑتی جارہی ہیں، کیریئر پلاننگ کے بغیر یہ نظام تعلیم بیروزگاری میں اضافے کا بڑا سبب ہے۔لیپ ٹاپ تقسیم کرنے سے تعلیم کا معیار بہتر کرنے کا کونسا پہلو نکلتا ہے ؟ کیا لیپ ٹاپ دینے سے بیروزگاری کا خاتمہ ہوگا ؟ یہ دل بہلانے والی سرگرمیاں ہمارے ذہین طلبہ کے مستقبل پر سوالیہ نشان ہیں۔ مستقبل بنیادوں پر کوئی پالیسی مرتب نہیں کی گئی، پاکستان کا شرح خواندگی دس سال میں 90 فیصد کیا جاسکتا ہے، مگر اس کیلئے ضروری اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے، دس سال میں ابتدائی درجے سے یونیورسٹی لیول تک کا نظام تعلیم تبدیل کردیا جائے، طریق تدریس میں بنیادی تبدیلیاں کرتے ہوئے تعلیمی اداروں میں جمہوری رویوں کو فروغ کو فروغ دیا جائے، طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو Thinking اور Understanding پر مشتمل علمی سرگرمیوں کا پروان چڑھانے کیلئے آغاز ابتدائی تدریس سے مڈل لیول تک ایک نظام کی شکل میں نافذ کردیا
جائے۔ہمارے طلبہ کو نظریہ پاکستان سے دور کیا جارہا ہے، نام نہاد دانشوروں اور سیکولر عناصر نے نظریہ پاکستان

کے تشخص کو مجروح کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ، نصاب میں بھی نظریہ پاکستان کو اس انداز میں پڑھایا جاتا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ نظریہ محض پاکستان بننے کیلئے تھا اب اسکی ضرورت نہیں ، نظریہ پاکستان کی ضرورت و اہمیت کو ہر سطح پر تعلیم کا حصہ بنایا جائے ، نصاب اور طریق تدریس میں ایسی انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جن سے طلبہ میں عالمی زاویہ نظر اور استعداد کا فروغ ہو اور ان کی شخصیت جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھے ، ہر طرح کی مذہبی ، علاقائی ، لسانی ، طبقاتی اور فرقہ وارانہ تعصبات اور نفرتوں کو تعلیمی اداروں سے خارج کر دیا جائے۔کاش یہ خواب حقیقت بن پائیں !! طلبہ کسی بھی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں ، موجودہ نظام طلبہ کی تمام تر صلاحیتوں کا استحصال کر رہا ہے ، اس بات پہ کوئی دوسری رائے نہیں کہ ہمارے طلبہ کا شمار دنیا کے ذہین ترین طلبہ میں ہوتا ہے وہ جس میدان میں قدم رکھتے ہیں چھا جاتے ہیں مگر سیاسی موسمی بٹیرے ان صلاحیتوں کو غلط استعمال کرتے ہیں ، مگر کب تک !! اب ضرورت اس امر کی ہے کہ طلبہ معاشرے کی اصلاح میں اہم کردار ادا کریں اور وہی کردار جو قیام پاکستان میں طلبہ نے ادا کیا تھا ، تاریخ دہرانے سے ہی تبدیلی آئے گی وگرنہ الیکشن کے نتیجے میں جعلی ڈگریوں والے براجمان ہوں گے اور وہ نہیں چاہتے کہ اس ملک میں جہالت کے اندھیرے دور ہوں اور تعلیم سے نور سے معاشرہ جگمگا اٹھے۔ ان شاء اللہ

!خوش رہنا ہے تو

کہا جاتا ہے کہ خوشیاں بادل کے اس اجلے ٹکڑے کی طرح ہوتی ہیں جو پل بھر کے لیے سایہ کرکے رخصت ہوجاتا ہے، جب کہ دکھ اور پریشانیاں سردیوں کی طویل راتوں کی طرح کٹنے میں ہی نہیں آتیں۔ ہر انسان خوش رہنا چاہتا ہے اور اس کی ساری زندگی خوشی حاصل کرنے کی تگ و دو میں گذر جاتی ہے۔ ہر انسان کے لیے خوشی مختلف معنی رکھتی ہے۔ کچھ دولت پا کر خوش ہوتے ہیں۔ ماں کو اصل خوشی اپنے ننھے بچے کی معصوم مسکراہٹ سے ملتی ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے خوشی کا پیمانہ معاشرے میں اعلیٰ رتبہ اور مقام ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خوشیاں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں اور دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن میں خوشی کا احساس دوسروں کو اذیت دینے سے جاگتا ہے۔ خوشی ہر ایک کے لیے مختلف ہے اور ہر کوئی مختلف انداز میں اپنے لیے خوشی تلاش کرتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ خوشی کی کوئی مادی حیثیت نہیں ہے۔ وہ انسان کے اندر پھوٹنے والا ایک احساس ہے، جس کے محرکات مختلف ہو سکتے ہیں۔ خوشی کا انحصار ہمارے گردو پیش کے حالات سے بھی ہے۔ ایک چیز جو کسی خاص وقت میں خوشی دیتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ دوسری بار ملنے پر بھی وہ خوشی کے احساس کو
گدگدائے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہر انسان خوش رہ سکتا ہے اور اس کے لیے اسے زیادہ تگ و دو کی بھی

ضرورت نہیں ہے۔ اسے اگر کچھ چاہیے تو وہ ہے اپنی سوچ اور اپنے انداز میں تھوڑی سے تبدیلی۔ خوش رہنے والے افراد ان لوگوں کی نسبت زیادہ عرصہ جیتے ہیں جو ہر وقت جلتے کڑھتے رہتے ہیں۔ طبّی ماہرین کا کہنا ہے کہ لمبی عمر اور اچھی صحت کی کنجی ہے خوش رہنا۔ خوشی ایک ایسی چیز ہے جس کا حصول تقریباً ہر انسان کے اپنے دائرہ اختیار میں ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں انسان کو بڑی بڑی خوشیاں دیتی ہیں۔۔برطانیہ میں حال ہی میں 40 ہزار سے زیادہ گھرانوں پر کیے جانے والے ایک مطالعاتی جائزے سے پتا چلا کہ ایسے گھروں کے لوگ نسبتاً زیادہ خوش پائے گئے جو ہفتے میں کم از کم تین دن گھر میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ ہماری زیادہ تر خوشیوں کا تعلق دوسروں کی ذات سے جڑا ہوتا ہے۔ آپ کا اپنے رشتے داروں اور دوست احباب کے ساتھ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، خوش رہنے کے امکان اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ ماہرین کے مطابق میاں بیوی کا تعلق سب سے لطیف اور سب سے قریبی ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا گہرا ہوگا، انسان اتنا ہی زیادہ خوش رہ سکے گا۔ اکثر اوقات ڈھارس اور تسلی پریشانی میں کمی لاتی ہے اور اپنا مقصد پانے کی امید اسے خوشی کا احساس دلاتی ہے۔ میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا دکھ درد حقیقی معنوں میں بانٹ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے خوشیوں کا دورازہ کھول سکتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں خوشی کا اصل دور 50 سال کی عمر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تک انسان اپنی زندگی کے نشیب وفراز دیکھ چکا ہوتا ہے۔ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ

آگیا ہوتا ہے اور وہ زیادہ حقیقت پسند ہوگیا ہوتا ہے۔ اس عمر میں پہنچ کر میاں بیوی ایک دوسرے کے سچے رفیق بن چکے ہوتے ہیں اور بچے بھی ماں باپ کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے کے قابل ہوچکے ہوتے ہیں۔ماہرین کہتے ہیں کہ خوش رہنے کے لیے آپ اپنے بچوں ، بہن بھائیوں اور دوستوں میں دلچسپی لیں، ان کی سرگرمیوں میں شرکت کریں، اپنے اور ان کے درمیان فاصلے کم کریں۔ باہمی انسانی تعلقات آپ کو خوشیوں تک لے جانے والا ایک کلیدی زینہ ہے۔ اکثر اوقات ہماری پریشانی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم دوسروں سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلیتے ہیں اور جب وہ پوری نہیں ہوتیں توہمیں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب جب ہمیں توقع سے زیادہ ملتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ یعنی توقعات جتنی کم ہوں گے، خوش رہنے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ایک عرب مفکر کا کہنا ہے کہ انسان 90 فی صد حالات و واقعات کے رحم وکرم پر ہوتا ہے جب کہ اس کا اپنا دائرہ اختیار صرف 10 فی صد ہے۔ ہمارے وسائل چاہے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، ہم پھر بھی بہت کچھ نہیں کرسکتے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آپ خوش
رہنا چاہتے ہیں تو اپنے لیے ایسے اہداف مقرر کریں، جنہیں پورا کرنا آپ کے لیے ممکن ہو، خاص طورپر چھوٹے چھوٹے اہداف۔ چھوٹی کامیابی آپ کو بڑی خوشی دے سکتی ہے۔ خوشی کا تعلق ہماری خواہشات سے بھی ہے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ آپ کی خواہشات ایسی ہونی چاہیں جنہیں پورا کرنا آپ کے بس میں ہو۔ بصورت دیگر سوائے پریشانی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ گویا دوسرے لفظوں میں قناعت کی عادت

اپنایئے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ ہر انسان ، خواہ وہ کتنا ہی مفلس کیوں نہ ہو دوسروں کو کم از کم ایک مسکراہٹ تو دے سکتا ہے۔ اور ایک سچی مسکراہٹ انسان کو جتنی خوشی دے سکتی ہے وہ قیمتی سے قیمتی تحفے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایسی ہی خوشیوں کا اہتمام گزشتہ دنوں کالمسٹ کونسل آف پاکستان (سی سی پی) پنجاب کے صدر حافظ جاوید الرحمٰن قصوری نے ایک ایسی ہی خوشی دینے کیلئے سی سی پی کے صوبائی و مرکزی عہدیداران کو لاہور کے بلیو فلیم ہوٹل میں مدعو کیا، جس میں سی سی پی کے چیئرمین ایکشن کمیٹی وسیم نذر، مرکزی صدر ایم اے تبسم، مرکزی سینئر نائب صدر عقیل خان، نائب صدر امتیاز علی شاکر، بہاولپور سے خصوصی طور پر آئے ہوئے مرزا عارف رشید، فیصل آباد سے بہت پیارے اور ہر دل عزیز دوست ملک ساجد اعوان، شیخوپورہ سے ساحر قریشی، اور چوکی سے حکیم کرامت علی نے خصوصی طور پر شرکت کی۔سب دوست احباب نے بڑی ہی گرم جوشی سے ایک دوسرے کو گلے لگایا کچھ دوستوں کے شکوے اور شکائتیں بھی تھیں ، جن کو بڑی ہی فراخ دلی سے دوستوں، نے سنا اور آئندہ سے اس طرح کی شکوے اور شکائتیں نہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا، اصل میں یہ اہم محفل دوستوں کے مل بیٹھنے کے لئے ہی سجائی گئی تھی، جس کا سہرا جناب حافظ جاوید الرحمٰن قصوری کے ہی سر بندھتا ہے، اللہ سب دوستوں کو خوشیوں سے مالا مال کردے اور سب ایسے ہی خوشیوں سے بھرپور محفلوں کا انعقاد کرتے رہیں (آمین)

''اپریل فول'' آغاز اور تاریخ

اکیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں پر مغربی اقوام کا سیاسی اور نظریاتی تسلط اتنا بڑھ چکا ہے کہ کم علم مسلمان جو کہ مغربی افکار سے اتنا مرعوب ہو چکا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں بغیر مغرب کی تقلید کے ترقی ممکن نہیں۔اس لئے وہ ہر بات ہر کام میں مغرب کی تقلید لازم سمجھتا ہے۔ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ مغربی ممالک میں یہ دن کس واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔جب اسپین پر عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں ۔ قتل وغارت سے تھک کر بادشاہ فرڈیننڈ نے اعلان کروایا کہ یہاں مسلمانوں کی جان محفوظ نہیں ہم انہیں ایک اسلامی ملک میں بسانے کا فیصلہ کیا ہے ۔جو مسلمان وہاں جانا چاہتے ہیں حکومت انہیں بذریعہ بحری جہاز بھجوادے گی۔لاتعداد مسلمان اسلامی ملک بسانے کے شوق میں جہاز پر سوار ہو گئے ،سمندر کے بیچ جاکر فرڈیننڈ کے گماشتوں نے جہاز میں بارود سے سوراخ کیا۔خود حفاظتی کشتیوں کے زریعے بچ نکلے ۔ چشم زدن میں پورا جہاز مسافروں سمیت غرق ہوگیا۔اس پر عیسائی دنیا بڑی خوش ہوئی اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے پر بادشاہ کی شرارت کی داد دی۔اس روز یکم اپریل تھا۔فرڈیننڈ کی شرارت اور مسلمانوں کو ڈبونے کی یاد میں مغربی دنیا میں یکم اپریل کو''اپریل فول''

منانا جاتا ہے۔ لوگوں کو جھوتی خبریں سنا کر پریشان کیا جاتا ہے، یکم اپریل کا دن ' بیوقوفوں کے دن ' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ غیر ملکوں میں کئی مقامات پر ' فولزڈے ' منایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی طرف سے یکم اپریل کے دن ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کا کام ہوتا ہے۔ دراصل انسان اپنے تناؤ اور مصروفیات کے درمیان کچھ لمحات کھلے ہنسی، مذاق اور تفریح کے لئے نکالنا چاہتا ہے۔ ' بیوقوفوں کا دن منانے کی روایت کے پس منظر میں انسانی ذہنیت کی یہی قدرتی فطرت دکھائی دیتی ہے۔ یکم اپریل کے دن بیوقوف بنانے اور ہنسی مذاق کرنے کی رسم بہت پرانی ہے لیکن اس کی شروعات کب، کیسے اور کہاں ہوئی، اس سلسلے میں الگ الگ خیالات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ' اپریل ' فولزڈے منانے کی رسم جاپان سے شروع ہوئی۔ وہاں کی ایک رائج کہانی کے مطابق قدیم زمانے میں فرانس میں ہر سال پہلی اپریل کو وہاں کے بادشاہ کی طرف سے شہریوں اور پادریوں کی ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس جلسہ میں راج دربار کے نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس میں حصہ لینے والے لوگ اوٹ پٹانگ حرکتوں اور کاموں سے لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔ اس موقع پر سب سے زیادہ بیوقوفانہ حرکتیں کرنے والے شخص کو تقریب کا صدر چنا جاتا تھا اور اسے ماسٹر آف فولز کے اعزاز سے نوازا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک دوسری روایت کی شروعات اٹلی سے ہوئی، وہاں یکم اپریل کو کارنیوال کے طور پر ایک تفریح کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس دن مرد اور عورتیں جم کر شراب پیتے ہیں اور ناچ گا کر

مستی کرتے ہیں۔ رات کے وقت دعوتوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ایک یونانی قصے میں بتایا گیا ہے کہ یونان میں ایک شخص خود کو فلسفی خاں سمجھتا تھا۔ اسے بھرم تھا کہ پوری دنیا میں اس سے بڑا اور ہوشیار شخص کوئی نہیں ہے۔ اس کے غرور کو دور کرنے اور اسے نصیحت دینے کے لئے کچھ دوستوں نے اس سے کہا کہ آج آدھی رات کو پہاڑ کی چوٹی پر خدا اتریں گے اور وہاں موجود لوگوں کی ہر مراد پوری کریں گے۔ اس شخص نے دوستوں کی اس بات پر یقین کر لیا اور پہاڑ کی چوٹی پر جا کر صبح ہونے تک خدا کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹا تو اس کے دوستوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ اسی وقت سے یونان میں 'فرسٹ اپریل' لوگوں کو بیوقوف بنانے کی روایت شروع ہو گئی کیونکہ اس دن اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔ اس طرح الگ الگ ممالک میں پہلی اپریل یعنی بیوقوفوں کے دن والے مختلف قصے اور واقعات سننے کو ملتے ہیں۔ غیر ملکوں میں کئی جگہوں پر اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو اس دن بیوقوف بنادیا جاتا ہے۔ ان کی باتوں پر لوگ بڑی آسانی سے یقین کر لیتے ہیں۔یکم اپریل کو ہوشیار سے ہوشیار لوگ بھی کسی نہ کسی طرح بیوقوف بن ہی جاتے ہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا بھی بچانے کی کوشش کرلیں۔ کسی کا اپریل فول بنانے کے کئی طریقے ہیں جیسے کسی کو میٹھی چیز میں مرچ ڈال کر کھلانا، سڑک کے بیچوں بیچ سو پچاس یا پانچ سو کا جعلی نوٹ چپکانا اور اٹھانے والے کو اپریل فول کہہ کر اس کا بینڈ بجانا وغیرہ۔اپریل فول خالصتاکافروں کا تہوار ہے جسے منانا

گناہ کبیرہ ہے،اپنی عارضی خوشی کے لئے دوسروں کو حادثات اور ناگہانی واقعات کی جھوٹی اطلاعات دینے سے ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، موبائل فون کے دور میں اس فضول تہوار سے ہونے والے جانی ومالی نقصانات 800 فیصد سے زیادہ ہو چکے ہیں،اپریل فول ہماری نہیں یہود ونصاریٰ کی قبیح رسم ہے جسے ہمیں ترک کرنا چاہیئے ،اگر ملک میں غیر مذہبی تہوار اور رسومات منانے کی رفتار پر فوری کنٹرول نہ کیا گیا تو عنقریب ملک میں بے حیائی کا ناسور پھیلتا ہوا نظر آئے گا،ملک میں بڑے بڑے بحرانوں کی وجہ اسلام سے دوری اور غیر شائستہ رسومات سے عقیدت ہے، پاکستان میں اپریل فول ایک رواج سا بن گیا ہے، جس سے معصوم اور بے خبر لوگوں کو اچانک حادثاتی خبر دے کر انتہائی بھیانک اور مذموم حرکت کا ارتکاب کیا جاتا ہے، فارغ اور گنوار قسم کے لوگ ہی اس تہوار کے پیروکار بنتے ہیں،اپریل فول مسلمانوں کے ساتھ ایک بدترین مذاق ہے،اور اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے انتہائی تکلیف دے دن تھا،جب عیسائی شہنشاہ نے سینکڑوں مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیلا اور بعد ازاں اس نے اس دن کو بطور یادگار مذاق کے طور پر منایا تھا،لہٰذا اس دن کو منانا زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے،اپریل فول ایک ایسی بیہودہ اور غلط رسم ہے جو امریکہ اور یورپ میں بھی تقریبا ختم ہو چکی ہے ،اور ہم اسے منا کر اس کے احیاء کا احترام کرتے ہیں ،ایسی رسمیں وہ قومیں مناتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی طور پر پستی میں گری

ہوئی ہوں۔اللہ تعالیٰ نے قاتل ،زانی اور شرابی کے لئے بھی لعنت کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن جھوٹے پر لعنت کی ہے۔ایسی جاہلانہ رسمیں منا کر نہ صرف ہم دنیاوی طور پر خسارے کا سودا کرتے ہیں بلکہ عذاب الٰہی کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ہم کو مسلمان ہونے کے ناطے ایسی قبیح لغویات سے اجتناب کرنا چاہئے۔یہ دن صرف یورپ اور کافرلابی کو ہی زیب دیتا ہے۔اس سے کسی انسان کی جان بھی جا سکتی ہے۔جبکہ مذہب اسلام ایسے کسی بھی تہوار کے منانے یا سنگین نوعیت کے بیہودہ فعل کی ہرگزاجازت نہیں دیتا۔ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ’’من تشبہ بقوم فھو منھم‘‘جس شخص نے کسی قوم کی مشابہت کی۔وہ انہیں میں سے ہوتا ہے۔جولوگ اپریل فول مناتے ہیں اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن وہ یہود ونصاریٰ کی صف میں اٹھائے جائینگے۔حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ یکم اپریل منانے پر پابندی لگاتے ہوئے حکومت کواس پر قانون سازی کرکے باقاعدہ اسے آئین کا حصہ بنانا چاہیئے تاکہ پاکستانی عوام امن وسکون سے رہ سکیں۔

مدینے میں عام معافی

حضور ﷺ کی حیات طیبہ دوستوں و دشمنوں سے حسن سلوک کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ نبوت کے بعد حضور ﷺ 13 سال مکہ میں رہے اور اس دوران مکہ میں بڑا پر آشوب دور تھا مکہ کے سردار حضور ﷺ کی جان کے درپے تھے اور انہیں اور ان کے ساتھیوں کو طرح طرح سے ستایا جاتا تھا اور اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں جس سے مجبور ہو کر وہ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ بعد میں مدینے پر بھی حملہ کیا گیا اور اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے ان دشمنوں سے، جنہوں نے انہیں اور ان کے ساتھیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے اور ان کو اذیتیں پہنچانے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا، مکہ پر قبضہ کے بعد جب مکہ والے انتقامی کارروائی کے خوف سے لرز رہے تھے اور اس کی توقع بھی کر رہے تھے تو حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ جاؤ، تم سب لوگ آزاد ہو، اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ آج تمہاری کوئی پکڑ نہیں، اللہ تم کو معاف کرے اور وہ ان پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔ (12.92)

مدینہ بھی منافقوں اور دشمنوں سے پاک نہ تھا۔ یہاں انہوں نے حضور ﷺ کو رسوا کرنا چاہا اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کا سرغنہ عبداللہ بن ابی تھا اس نے بظاہر اسلام قبول کر رکھا تھا لیکن حضور ﷺ کے تئیں انتہائی معاندانہ

جذبات رکھتا تھا۔ حضور ﷺ کی احادیث کا مجموعہ بخاری شریف میں دو باب میں اس بات کا ذکر ہے کہ جہاں عبداللہ بن عبائی نے حضور ﷺ کی شان میں بد گوئی کی تھی لیکن حضور ﷺ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ جنگ احد کے موقع پر جب قریش نے مدینہ پر ایک مسلح حملہ کا منصوبہ بنایا۔ حضور ﷺ کی قیادت میں مدینے کے تقریباً 1000 باشندوں نے حملہ آوروں کو پسپا کرنے کے لئے کوچ کیا۔ عبداللہ اور اس کے 300 ساتھی بھی کچھ دور چلے لیکن اچانک ہی واپس ہو گئے۔ یہ کھلی غداری تھی لیکن حضور ﷺ نے یہاں بھی عفو و درگذر سے کام لیا اور اس واقعہ کو نظر انداز کر دیا۔
626 میں بنو مستلیق سے واپسی کے وقت حضور ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے خیمے لگا کر ایک مقام پر قیام کیا جہاں ایک مہاجر اور ایک مقامی شخص میں پانی کے مسئلہ پر تکرار ہو گئی۔ عبداللہ نے موقع غنیمت جانا اور چنگاری بھڑکانے کی کوشش کی اور حضور ﷺ کو مدینہ بدر کر دینے کی دھمکی دی۔ واپسی کے سفر میں اس سے بھی زیادہ گھناؤنی حرکت کی گئی۔ اسے اسلام میں بد خواہی کے ساتھ بہتان تراشی کی داستان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر سورہ نور میں ہے۔ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے بی بی عائشہ کے خلاف انتہائی بھدی تحریک چلا کر حضور ﷺ کی عزت داغدار کرنے کی مذموم حرکت کی۔ بد قسمتی سے اس مذموم تحریک میں عبداللہ کچھ مسلمانوں کو بھی شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا اس میں حضرت عائشہ کا وہ چچازاد بھائی مستاع بھی تھا جس کی بی بی عائشہ کے والد ابو بکر ﷺ کفالت کیا کرتے تھے اور اس کی ہر طرح سے مالی مدد کیا کرتے تھے۔

لیکن جب معاملہ صاف ہو گیا اور عبداللہ کو منہ کی کھانی پڑی تو ابو بکر نے قسم کھائی کہ اب وہ مسطح کی مدد نہیں کریں گے۔ لیکن قرآن نے اسے مسترد کر دیا اور فوراً ہی اس سلسلہ میں آیت نازل ہوئی۔ جس کے بعد ابو بکر نے توبہ و استغفار کیا اور مسطح کی امداد جاری رکھی۔ لیکن عبداللہ سے کیسے نپٹا گیا یا اسے کیا سزا دی گئی؟ اسے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ بلکہ اس کی موت کے بعد حضور ﷺ نے اس کے کفن کے لئے اپنی چادر دی اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں ایسا کرنے سے یہ آیت سنا کر روکنے کی کوشش کی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اگر تم ان لوگوں کو معاف کرنے کے لئے 70 بار بھی کہو گے تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ جس پر حضور ﷺ نے جواب دیا کہ میں 70 سے زیادہ بار کہوں گا۔ قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرو اور واضح طور پر کہتا ہے کہ بے شک رسول اللہ حسن اخلاق کا ایک حسین نمونہ ہیں۔ اور عفو و درگذر سے کام لینے معاف کر دینے، رحمدلی و سخاوت کا مظاہرہ کرنے اور ترس کھانے سے ہی ان کی سنت، پر عمل کرنے کا اظہار ہو سکتا ہے اور یقیناً اہانت رسول ﷺ سے متعلق پاکستان کا غیر انسانی قانون اور علماء کا غیر دانشمندانہ اور بے رحمانہ رویہ نبی پاک حضور ﷺ کے رحملانہ تصور کے مطابق نہیں ہے۔

دربار عالیہ کلیام شریف

شہنشاہ ولایت، تاجدار فقراء امام عارفاں، حضرت خواجہ فضل الدین کلیامی 1223ء میں کلیام سیداں تحصیل گوجرخان ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا حضرت خواجہ ذکاء الدینؒ مومدی پور ضلع گجرات سے ہجرت کرکے کلیام سیداں میں آکر آباد ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان بنو ہاشم سے ہے۔ آپ سہام قریشی ہونے کے ناتے حضرت علیؓ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت حافظ ذکاء الدینؒ نے کلیام کے سہام قریشی خاندان میں شادی کی۔ ان کے ہاں تین بیٹے حافظ نور احمد، حافظ غلام رسول اور حضرت خواجہ فضل الدین کلیامی پیدا ہوئے۔ ان تینوں میں سے صرف حافظ نور احمد نے شادی کی۔ دوسرے دونوں بھائیوں نے شادیاں نہیں کیں۔ آپ دینی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں بھی بڑے ماہر تھے۔ علوم ظاہری میں بڑے بڑے علماء آپ کے سامنے بول نہ پاتے تھے۔ اصول یہ ہے کہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے۔ بڑے بڑے شیخ طریقت، قطب الاقطاب شہباز ولایت خود چل کر مرشد کامل کے پاس جاتے رہے، سالہا سال تک ان کی خدمت میں مصروف رہے۔ لیکن حضرت فضل الدین کلیامی کے لیے یہ اصول ہی بدل گیا۔ آپ کے دادا مرشد حضرت خواجہ سید مظہر علی شاہ چشتی صابری جلال آبادیؒ نے اپنے خلیفہ حضرت خواجہ محمد شریف خان کو حکم دیا کہ کلیام کی بستی میں ایک ایسے بچے کی ولادت ہونے والی ہے

جو اپنے وقت کا بلند مرتبہ ولی اللہ ہوگا۔ لہٰذا آپ کلیام چلے جائیں اور اس بچے کی ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت کریں۔ مرشد کامل کا حکم سنتے ہی حضرت خواجہ محمد شریف خان دہلی سے روانہ ہو کر کلیام اعوان آباد آ گئے۔ موضع کلیام سیداں سے موضع کلیام اعوان دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ بڑے بھائی حافظ غلام رسول کے ساتھ کلیام اعوان آ کر حضرت خواجہ محمد شریف سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ مرشد کامل کی محبت، توجہ اور کشش کے سبب اپنے بڑے بھائی حافظ غلام رسول کے ساتھ کلیام سیداں سے کلیام اعوان ہی مستقل طور پر آ گئے اور عمر بھر مرشد کامل کی خدمت میں مصروف رہے۔ آپ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے وہ عظیم اولیاء ہیں جس سے اس سلسلہ کو دنیا بھر میں فروغ حاصل ہوا آپ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے خصوصی نسبت رکھتے تھے اور آپ حضرت خواجہ علی احمد صابر کلیر شریف کی نسبت سے صابری کہلاتے ہیں۔ حضرت فضل الدین کلیامی کا ایک عیدا نامی مرید تھا اس کی شادی گولڑہ شریف میں ہوئی۔ اس لیے وہ گولڑہ شریف آیا جایا کرتا تھا۔ حضرت پیر مہر علی شاہؒ کے ماموں پیر سید فضل دین گولڑوی کو جب پتا چلا کہ عیدا حضرت فضل الدین کلیامی کا مرید ہے اس وجہ سے عیدا کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے اور شفقت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ سید فضل دین قادری گولڑوی نے عیدا سے کہا ''سنا ہے تمہارے مرشد آج کل کلیام سے راولپنڈی آئے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بھانجے مہر علی شاہ، حال ہی میں ہندوستان سے ظاہری تعلیم مکمل کرکے لوٹے ہیں، کو ساتھ لے جاؤ اور

ملاقات کرادو۔ میری طرف سے دو روپے نقد اور دو کلو مصری لے جاؤ۔ نذرانہ پیش کرکے میرا سلام عرض کرنا، چنانچہ عیدا پیر مہر علی شاہؒ کو ساتھ لے کر راولپنڈی شہر میں تکیہ شاہ (نزد تھانہ وارث خان راولپنڈی) سرکلر روڈ پر حضرت فضل الدین کلیامیؒ کے پاس پہنچا۔ دونوں نے سلام کیا۔ حضرت فضل دین گولڑویؒ کا سلام کا جواب دیا اور مزید کوئی بات نہ کی دونوں قریب بیٹھ گئے۔ آپ حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے۔ مگر مہر علی شاہؒ صاحب کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نہ ہی حال احوال پوچھا۔ آپ کے مرید عیدا کے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ حضرت نے شہزادہ گولڑہ کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ گولڑہ جاکر میری بے عزتی ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے نماز ظہر کا وقت ہوگیا۔ دونوں اجازت لے کر نماز پڑھنے چلے گئے۔ واپس آ کر پھر دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ مگر آپ نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ پھر عصر، مغرب اور عشاء سب نمازوں کیلئے اجازت لے کر جاتے اور واپس آتے رہے۔ عیدا اپنے اور پیر مہر علی شاہؒ صاحب کے لیے لنگر خانے سے لنگر لے آیا۔ پیر مہر علی شاہؒ نے دو لقمے کھا کر کھانا چھوڑ دیا۔ حد تو یہ کہ ان کے حصے میں کوئی بستر بھی نہ آیا۔ عیدا شرمندہ ہوا کہ میں عزت دار آدمی کو ساتھ لے کر آیا ہوں اور میری وجہ سے سید زادے بھی پریشان ہو رہے ہیں۔ عیدا نے شاہ صاحب سے کہا، پیر صاحب آپ میرا کمبل اور پنا دھسہ جوڑ کر اوپر لے لیں۔ شاہ صاحب نے کہا۔ بابا چپ کر خاموشی سے سوجا۔ آج مجھے کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی۔ صبح منہ اندھیرے پیر صاحب نے عیدا سے کہا بابا میں جا رہا

ہوں۔ تم ادھر ہی رہو۔ عیدا نے پوچھا حضرت اس وقت کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔ پیر مہر علی شاہؒ نے کہا میں شاہ چن چراغ کے پاس جا رہا ہوں۔ صبح کی نماز بھی وہی پڑھوں گا۔ سلام بھی کرنا ہے۔ تم ادھر ہی رہو۔ میں آ جاؤں گا۔ پیر مہر علی شاہؒ نماز پڑھنے چلے گئے۔ عیدا نماز پڑھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ سورج نکل آیا مگر وہ نہ آئے۔ باالآخر عیدا خود وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مزار کے صحن میں پیر صاحب بے سدھ پڑے ہیں۔ پگڑی کہیں اور دھسہ کہیں ہے۔ عیدا نے پگڑی اور دھسہ سنبھالا۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں پیر صاحب کو اٹھایا اور تکیہ شاہو پہنچا۔ لوگوں نے پوچھا۔ بابا! کیا کر کے آ گئے ہو؟ عیدا نے رو کر رات والا اور صبح والا واقعہ حضرت فضل الدین کلیامیؒ کی خدمت میں عرض کیا۔ انھوں نے پیر مہر علی شاہؒ کے سر سے پاؤں تک ہاتھ پھیرا۔ وہ کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھے۔ اس کے بعد حضرت فضل دین کلیامیؒ نے دیوان حافظ کا ایک شعر پڑھا۔ پیر مہر علی شاہؒ زار وقطار رونے لگے۔ منہ سے کچھ بول نہ سکے۔ حضرت فضل دین کلیامیؒ نے ان کے کندھے پر تھپکی دے کر دعا دی اور رخصت کیا۔ عیدا پیر مہر علی شاہؒ کو لے کر جب گولڑہ شریف پہنچا تو سارا ماجرا سنایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ عیدا سے کہا، تمہارے پیر کا اسوقت کوئی ثانی نہیں۔ تم خوش قسمت ہو۔ وہ میرے ہم نام ہیں اپنے نام کی لاج ضرور رکھیں گے۔ آپ کی عبادت وریاضت اور مجاہدے کا یہ حال تھا کہ زندگی بھر کبھی آپ کے جسم پر گوشت نہیں چڑھنے دیا اور نہ ہی کبھی سائے میں سوئے۔ آپ کا وصال 1308ھ1892ء بمطابق یکم جنوری

بروز جمعۃ المبارک ہوا۔ نماز جنازہ حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ کو گھوڑے پر سوار ہو کر صفیں درست کرانا پڑیں۔ آپ کا مزار اپنے پیر و مرشد حضرت محمد شریف خانؒ کے قریب ہی ہے۔ آپ کا دس روزہ سالانہ عرس مبارک ہر سال 31 دسمبر سے شروع ہوتا ہے اور 8 جنوری تک اس عرس مبارک میں لاکھوں عقیدت مند دنیا بھر سے شریک ہوتے ہیں۔

اپنے ہی گناہوں کا اثر

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا، تاکہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے، بہت ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں۔ (الروم: ۱۴) اس آیت کریمہ میں فساد سے مراد ہر وہ بگاڑ ہے جس سے انسانوں کے معاشرے اور آبادیوں میں امن وسکون تہہ وبالا ہوجائے، ان کی زندگیوں میں تنگی، بے برکتی، اضطراب وبے چینی اور ظلم وزیادتی عام ہوجائے۔ جب انسان اللہ کی نافرمانیوں کو اپنا وطیرہ بنالیتا ہے، تو پھر مکافات عمل کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے اعمال وکردار کا رخ برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے، جس کی وجہ سے زمین فساد سے بھر جاتی ہے، امن وسکون ختم ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ خوف ودہشت اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض اوقات آفات ارض وسماء بھی سزا کے طور پر نازل ہوتی ہیں جیسے قحط، طاعون، طوفان، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ۔ مقصد اس سے یہی ہوتا ہے کہ لوگ گناہوں سے باز آجائیں، توبہ کرلیں، اور ان کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے۔ گناہوں اور نافرمانیوں کے برے نتائج انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، بلکہ پیڑ، پودے اور جانور بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ بدکار

آدمی کی موت سے صرف انسان ہی نہیں بلکہ جانور، شہر، علاقے، اور پیڑ پودے تک سکون پاتے ہیں۔ یہاں مختصر طور پر بعض ان نتائج و آثار کا ذکر کیا جارہا ہے جو افراد و معاشرہ پر گناہوں کے سبب پڑتے ہیں۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو سب سے پہلے انسان کے دل پر مختلف انداز میں گناہوں کا اثر ہوتا ہے، جن میں اہم یہ ہے کہ دل سے اللہ کی عظمت و محبت رخصت ہو جاتی ہے، شرم وحیاء کا خاتمہ ہو جاتا ہے، حق وباطل کی تمیز مٹ جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو اور ٹیڑھا کر دیا۔ (القف : ۵) گنہگار کے دل سے ایمان کی روشنی ختم ہو جاتی اور وہ وحشت و ظلمت کا شکار ہو جاتا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے: اور جس کو اللہ بے راہ رکھنا چاہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ الانعام :۵۲۱) اسی طرح مرتکب گناہ کا دل علم شرعی کی روشنی سے بھی محروم ہو جاتا) ہے؛ کیوں کہ اس علم کی شرط ہی تقویٰ اور پرہیزگاری ہے، ارشاد ربانی ہے: اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھائے گا۔ (البقرہ : ۲۸۲) گناہوں کا اثر اس کے ارتکاب کرنے والے کے جسم، جان اور عمل پر مرتب ہوتا ہے، چنانچہ ایسے شخص کو دنیا میں شرعی سزائیں دی جائیں گی۔ لیکن مومن کے ساتھ اللہ کا خاص معاملہ یہ ہے کہ اس کو جو سزا ملتی ہے یا مصیبت کا شکار ہوتا ہے یا بیماری لاحق ہوتی ہے تو گرچہ گناہوں کا نتیجہ ہے، لیکن اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اسے کوئی کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ بھی اس کی برائیوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ (بخاری) گنہگار شخص کے اعضاء

وجوارح بھی موت کے وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اسے کلمہ شہادت کی توفیق نہیں ملتی جو کہ جنت میں داخلے کی ضمانت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس کی آخری بات ''لا الہ الا اللہ'' ہو وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ اور گناہوں میں مبتلا شخص اگر نشہ آور اشیاء کا عادی ہوگیا ہو تو اس کی عقل بھی جاتی رہتی ہے اور خود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ گناہوں کے وہ اثرات ہیں جو افراد پر پڑتے ہیں۔ اگر ہم اللہ کی نافرمانیو ں اور معصیتوں کا معاشرہ پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں پچھلی قوموں کی تباہی و بربادی کا باعث کفر و شرک اور معصیت و سرکشی ہی ہے، جیساکہ قرآن نے بڑی تفصیل کے ساتھ انبیاء اور ان کی امتوں کے قصوں کے ذریعہ اسے واضح کردیا ہے؛ چنانچہ قوم نوح، عاد و ثمود، قوم فرعون، قوم شعیب، قوم لوط وغیرہ اپنی خداد شمنی اور معاشرتی، اقتصادی اوراخلاقی جرائم کی پاداش میں ہی ہلاک کی گئیں۔ اللہ تعالی فرماتا ہے۔ مفہوم: ہم نے تو ہر ایک کو اس کے گناہ کے وبال میں گرفتار کرلیا، ان میں سے بعض پر ہم نے پتھروں کا مینہ برسایا، اور ان میں سے بعض کو زور دار سخت آواز نے دبوچ لیا، اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسایا، اور ان میں سے بعض کو ہم نے ڈبو دیا، اللہ تعالی ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرے، بلکہ یہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ (العنکبوت: ۴۰) جس اللہ نے پچھلی قوموں کو ان کے گناہوں کی سزا دی، وہی قادر مطلق اس چیز پر قدرت رکھتا ہے کہ بعد میں آنے والی قوموں کو بھی ان کے

کرتوتوں کا مزا چکھائے ، اللہ نے فرمایا۔ مفہوم: کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا، پر تم ان کے بعد پچھلوں کو لائے، ہم گنہگاروں کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں)۔

المرسلات : ۱۶ ا ۱۸) لہٰذا آج جو ہم دنیا میں پھیلی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے مناظر) دیکھ رہے ہیں کہ خوفناک جنگیں ہزاروں لوگوں کو نگل لیتی ہیں، لاکھوں لوگوں کو بے گھر، یتیم اور بیوہ بنادیتی ہیں، ایسے ایسے مہلک اور تباہ کن اسلحے استعمال ہو رہے ہیں جو آنا فانا بستیاں کی بستیاں صفحہ ہستی سے مٹا دیتی ہیں، کثرت سے گاڑیوں، ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کے حادثات ہورہے۔یہ سب کچھ موجودہ قوموں پر اللہ کی نافرمانیوں کا وبال ہے، جس میں ہمارے لئے درس عبرت ہے۔آج کل لا علاج امراض جیسے ایڈز وغیرہ کا وسیع پیانہ پر پھیلنا بھی اللہ کی مار ہے، جو فحاشی وبدکاری کی کثرت کی وجہ سے موجودہ قوموں پر مسلط کی گئی ہے۔اسی طرح خشک سالی، سیلاب زلزلے ،طاعون کا تسلط بھی اللہ کا عذاب ہے۔کافروں اور ظالموں کا مسلمانوں پر غلبہ، بھی احکام شریعت سے روگردانی اور اللہ کے راستہ میں نہ لگنے کا صلہ اور نتیجہ ہے۔خاص طور پر وہ گناہ زیادہ اللہ کے غیظ وغضب کو دعوت دینے والے ہوتے ہیں جو اعلانیہ کئے جاتے ہیں ،اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ معاشرے اس کا بری طرح شکار ہیں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متفق علیہ حدیث ہے: مفہوم ہے کہ '' میری امت بخش دی جائے گی سوائے ان لوگوں کے جو کھلم کھلا گناہ کرتے ہیں۔اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ اس کو برا نہ سمجھیں اور

کوئی اس پر نکیر نہ کرے، جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سخت تاکید کی ہے اور اس کے ترک پر وعید سنائی ہے، جیسا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”خدا کی قسم ! تم ضرور نیکی کا حکم دوگے اور برائی سے روکوگے، ورنہ وہ دن دور نہیں کہ تم عذاب الٰہی کے مستحق بن جاؤگے پھر دعا بھی کروگے تو قبول نہ ہوگی“ (ترمذی)۔ اللہ تعالی ہمیں اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق عطا کرے، گناہوں سے بچائے اور اپنے غیظ و عذاب سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

موت اٹل حقیقت!

اللہ رب العزت پوری کائنات اور اس میں جو کچھ بھی موجود ہے ، اس کا خالق ہے۔اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ مخلوق ہے۔اللہ ازل سے ہے اور ابد تک ہوگا۔اس ازل کی ابتدا کیا ہے اور اس ابد کی انتہا کیا،اس کو سمجھنے سے انسان کی عقل معذور ہے۔البتہ ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ تمام مخلوق کی ایک ابتداء بھی ہے اور ایک انتہا بھی۔جو کچھ بھی پیدا ہوا، فنا ہوگا۔کوئی استثنا نہیں۔رہنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔"روئے زمین پر جو بھی ہیں سب فانی ہیں۔اور تیرے رب کی عظمت و عزت والی ذات باقی رہنے والی ہے۔" (الرحمٰن ۲۶۔۲۷) ہم اور ہمارا ارد گرد اپنے مقررہ وقت پر ضرور بالضرور ختم ہوگا اور جب اس خاتمے کا وقت آن پہنچے گا اس کو کوئی بھی طاقت ادھر ادھر نہیں ٹال سکتی۔چنانچہ فرمان ربانی ہے۔"سو جس وقت ان کی میعاد معین آ جائے گی اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔(الاعراف: ۳۴)"۔۔۔اور تمہیں ایک وقت مقررہ تک باقی رکھے گا۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔کاش ! تمہیں اس کا علم ہو۔" (نوح ۴) مسلمان کیلئے اللہ کا احسان ہے کہ اس کیلئے یہ راز بھرپور انداز میں واشگاف کیا گیا ہے کہ موت کے بعد ہمیں کہاں جانا ہے اور وہاں ہمارے تعلق سے کیا کارروائی ہوگی۔جب انسان یہ سمجھ لے تو اس دنیا میں اس

کے ہر فعل میں جواب دہی کا احساس موجزن ہوگا۔ موت سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔فرمایا۔ ''ان سے کہو، ''جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو تمہیں آ کر رہے گی۔'' (الجمعہ ۸)''پھر دیکھو، وہ موت کی جان کنی حق لے کر آ پہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔'' (ق ۱۹) کوئی مال، کوئی دولت، کوئی دعا، کوئی جھاڑ پھونک وقت مقررہ پر اس موت کو ٹال نہیں سکتا۔ملاحظہ ہو۔ ''اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جب کہ وہ ہلاک ہو جائے ؟'' (الیل ۱۱) کہیں اور فرمایا۔ ''جب جان حلق تک پہنچ جائے گی، اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا، اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے، اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی، وہ دن ہوگا تیرے رب کی طرف روانگی کا۔'' (القیمہ ۲۶۔۳۰) مال کے تعلق سے دل کو دہلا دینے والا ایک اور فرمان باری تعالیٰ حاضر ہے۔ ''تباہی ہے ہر اس شخص کے لئے جو لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی۔ (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے) (الھمزہ ۱۔۹) عزیز و اقارب سامنے ہوتے ہیں، ان کے سامنے) کوئی جان دے رہا ہے۔وہ خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ ان کا یہ چہیتا ابھی کچھ

دیر اور ان کے درمیان جیے لیکن نہیں، کسی کی اس طرح کی کوئی خواہش کسی کی موت کو موخر نہیں کر سکتی۔"۔۔۔۔تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔" (الواقعہ ۸۴۔۸۵) موت اس دنیا سے ایسی رخصتی کا نام ہے۔ایک بار موت واقع ہوجانے کے بعد پھر اس دنیا میں irrevocable ہے جو واپس لوٹنا ممکن نہیں۔یوں تو ہم روز ایسی کیفیت سے گذرتے ہیں جس میں اپنے آس پاس سے بالکل غافل بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوجاتے ہیں لیکن یہ ایک عارضی دور ہوتا ہے جس سے گذر کر واپس اس دنیا میں ہم روز آجاتے ہیں"وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کرلیتا ہے، پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقتِ مقرر کیلئے واپس بھیج دیتا ہے۔اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔" (الزمر ۴۲)زندگی ایک امتحان ہے اور موت اس امتحان کے وقت کا اختتام اللہ فرماتا ہے۔"جس نے (یعنی اللہ نے) موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔" (الملک ۲)اس امتحان سے گزر کر ہمیں کہاں جانا ہے؟ کوئی فلسفی اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتا ہے کیونکہ یہ سب پردہ غیب کی باتیں ہیں۔کوئی وہاں سے لوٹ کر

آیا ہوتا تو اس کے تجربات کی بنا پر کچھ تحقیق ہو سکتی تھی لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔ شفیق ورفیق اللہ اور اس کے کلام پر قربان جائیں کہ اس نے انسان کے اس دائمی تجسس کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ فرمایا۔ ”ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔“ (العنکبوت ۵۷) اسی طرح سورہ السجدہ کی آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا۔ ”ان سے کہو ”موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔“ یعنی جس خالق نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا، اس سے رخصت ہونے کے بعد ہمیں واپس اسی اللہ کی بارگاہ میں پہنچنا ہے، بلکہ ہم مسلمان جب کسی کے انتقال کی خبر سنتے ہیں یا مال کا کوئی نقصان واقع ہو جائے تو فوراً اعلان کرتے ہیں۔ ”ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے“ (البقرہ ۱۵۶)۔۔۔۔۔ رزق کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ عام طور پر ہم اسے صرف اشیائے خوردنی کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اس سب کچھ پر محیط ہے جو اللہ نے انسان کو عطا فرمایا ہے، جس میں انسان کی توانائی، علم، دولت وغیرہ سب شامل ہیں۔ چونکہ یہ سب کچھ اللہ کا عطا کردہ ہے اسلئے اس کا بہترین مصرف یہی ہے کہ اسے اللہ کے حکم کے تابع اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ جو لوگ اس بارے میں بخل سے کام لیتے ہیں ان کی موت کی منظر کشی قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ”جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ ”اے

میرے رب! کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا"۔ حالانکہ جب کسی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ اس کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔" (المنٰفقون ۱۰۔۱۱) اب جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہمیں اللہ نے ہی خلق فرمایا ہے، وہی ہمیں ایک مقررہ وقت پر موت دینے والا ہے، جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے، موت کے بعد ہمیں دوبارہ اسی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ تو ذی شعور حضرات کا ترانہ بندگی یوں ہوتا ہے۔ "اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاوگے؟" (یٰس ۲۲) اور جن وانس کی مخلوق کو پیدا کرنے کا جو مقصد خود اللہ بیان کرتا ہے، وہ بالکل یہی ہے۔ "ہم نے جن وانس کو اسی لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں۔" (الذاریات ۵۶) موت جیسی حقیقت کو ذہن سے محو کر دینا کسی ذی ہوش کا کام نہیں ہو سکتا۔ حضور پر نور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ایمان والوں میں کون سا شخص سب سے زیادہ عقل مند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ان میں جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرنے والا ہو اور موت کے بعد کیلئے جو سب سے زیادہ تیاری کرنے والا ہو، ایسے ہی لوگ سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔" (ابن ماجہ) ترمذی شریف کی ایک حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ "عقل مند آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور مرنے کے بعد کیلئے عمل کرے، جب کہ عاجز اور درماندہ آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو اپنی خواہش کے تابع بنالے اور پھر اللہ

تعالی سے امیدیں باندھے۔" زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے مبرہن حقیقت یعنی موت کو ہر آن یاد کرنے سے زندگی میں وہ توازن پیدا ہو جاتا ہے جو آخرت کی فلاح کیلئے ہمارا زیور ہوگا۔ موت کو بھلا دینے والا دنیا میں ایسا مگن ہو جاتا ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی کی تیاری اور فکر اس کیلئے بے وقعت عمل بن کے رہ جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس طرز زندگی سے بچائے۔ آمین!

افسوس صد افسوس

اسلام کی کی آمد سے قبل یعنی زمانہ جاہلیت میں انسان بچیوں کو ذلیل و حقیر سمجھتا تھا۔ وہ لوگ لڑکی کی پیدائش کے بجائے اس کی وفات پر مبارکباد دیتے تھے۔ لڑکیوں کو اس قدر ہیچ سمجھتے تھے کہ کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ مارے شرم کے منہ چھپائے پھرتا تھا کہ کہیں اس کی عزت کو داغ نہ لگ جائے ۔۔ان میں کچھ لوگ ایسے ظالم تھے کہ کسی بیٹی کا باپ کہلوانے کے ڈر سے اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یا گلا دبا کر ہمیشہ کے لئے خاموش کردیتے تھے۔ بیٹی کو نجاست کا ڈھیر اور شیطان کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ بیٹی کی ولادت کی خبر سنتے ہی حقارت کی تیوریاں چہرے پر نمایاں ہوتی تھیں۔ایسے لوگوں کا نقشہ قرآن پاک نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ’’جب ان میں کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا ہے ، لوگوں سے چھپاتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رکھے یا مٹی میں دبادے ‘‘۔(سورہ النحل : 85 تا 95) لیکن یہ تو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا حال تھا۔ اب آیئے اس زمانہ کے لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں کہ ان کی نظر میں بیٹی کا کیا مقام ہے ، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ، سچا عاشق رسول ہونے کا دعویٰ

کرتے ہیں، سرکار دو عالم ﷺ کی محبت میں جانِ عزیز کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن جب ان کے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرح یہ بھی بیٹی کی آمد کو خوشگوار نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ بیٹی کی پیدائش اپنے لئے ننگ و عار تصور کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا کہ مبارک باد کہنے کے بجائے آنسو بہا بہا کر افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ بہادر تو یہ بھی کہنے سے نہیں ہچکچاتے کہ اس مرتبہ بیٹا نہیں ہوا تو بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ ایسے نامردوں کے لئے قرآن کیا کہتا ہے ''کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ صرف بیٹا دیتا ہے اور کچھ کے مقدر میں بیٹیاں ہی بیٹیاں اور کچھ لوگوں کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں سے نوازتا ہے اور کچھ لوگوں کی جھولی میں کچھ نہیں ڈالتا اور انہیں بانجھ کر دیتا ہے۔ (الشوری: 05)
یہ لوگ بیٹی کو رحمت کے بجائے زحمت سمجھتے ہیں، اسے ایک بوجھ گردانتے ہیں۔ بیٹیوں کو ہر معاملہ میں کم تر سمجھا جاتا ہے۔ پڑھائی کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ انہیں پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے، آخر گھر کے کام کاج ہی تو کرنا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے تعلیم کے
دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں؛ لیکن یاد رکھو! بزرگوں کا قول ہے ''مرد پڑھا فرد پڑھا عورت پڑھی خاندان پڑھا''۔ اچھا لباس، اچھی غذا اور دیگر ضروریاتِ زندگی میں بھی، بیٹیوں کے بجائے بیٹوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور بیٹوں کی خواہشات کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ آج کے مسلمان زمانہ جاہلیت کے

لوگوں سے بھی آگے نکل گئے۔ جس بچی پر ماں باپ کی طرف سے اس طرح کا ظلم ہو تو یقیناً وہ یہی کہے گی ”کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی ”جس گھر میں بیٹی نہ ہو اس گھر میں رحمت نہیں ہوتی۔ یعنی بیٹی اللہ رب العزت کی طرف سے رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ لڑکیوں پر بہت زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ میرے محبوب ﷺ کی آمد مبارک سے عورت کو دنیا میں جینے کا حق ملا۔ معاشرے میں باعزت مقام ملا۔ اور کہا گیا کہ جس کسی کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس فرشتے بھیجتے ہیں، وہ فرشتے گھر والوں سے کہتے ہیں: اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو پھر اس بچی کو فرشتے اپنے پروں سے ڈھانک لیتے ہیں اور اپنے نورانی ہاتھوں کو اس کے سر پر پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں: ایک کمزور جان ہے جو کمزور جان سے نکلی ہے، قیامت تک اس کے کفیل کی مدد کی جائے گی۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو لڑکیوں کے سلسلے میں کسی طرح آزمایا جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو وہ لڑکیاں اس شخص کے لئے دوزخ سے آڑ بن جاتی ہیں۔ (جامع ترمذی: حدیث: 7302)، حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی کفالت کرتا ہے، اس پر جنت واجب ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر کوئی دو بیٹیوں کی کفالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر بھی واجب ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ نے پوچھا: اگر ایک بیٹی کی اور ایک بہن کی کفالت کرتا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر بھی واجب ہے۔ پیارے نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص لڑکی رکھتا ہے، اللہ کی نصرت، برکت اور اس کی بخششیں اس کے

شاملِ حال ہوتی ہیں۔ایک اور جگہ فرمایا: جس کے یہاں ایک بیٹی ہوتی ہے اسے ایک ہزار حج کا، ہزار جہاد کا، ہزار قربانی کا اور ہزار مہمانوں کا ثواب ملتا ہے۔جب حضرت فاطمہؓ رحمِ مادر میں آئیں تو سورہ کوثر نازل ہوئی اور آپ کو خیرِ کثیر اور دائمی نیکی کی بشارت سنائی گئی۔انسان لڑکی کا باپ ہوتا ہے تو یہ اس کے لئے باعثِ فخر ہے؛ کیونکہ رسولِ خداﷺ بھی لڑکی کے باپ تھے، دنیا میں لڑکی کے پیدا ہونے پر رسولِ خدا سے مشابہت ہو جائے تو واقعتاً بہت بڑا فخر ہے۔پیارے آقاﷺ نے فرمایا: جو شخص دو یا تین لڑکیوں کی سرپرستی کرے گا وہ بہشت میں میرا ہم نشیں ہوگا۔پیارے نبیﷺ نے ایک اور جگہ فرمایا: جس کے گھر لڑکی ہو پھر وہ اسے نہ زندہ در گور کرے نہ اس کی توہین کرے (لڑکی ہونے کے ناطے ہر وقت طعن وملامت نہ کرے) اور نہ لڑکے کو اس پر ترجیح دے، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمادیں گے (ابوداؤد) جو لوگ بیٹی کی پیدائش کو منحوس سمجھتے ہیں انہیں ان احادیثِ مبارکہ کو مد نظر رکھنا چاہیے۔دورِ رسالت کا یہ واقعہ بھی ان کے لئے تازیانہ عبرت، نصیحت کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے۔دورِ جاہلیت کے پروردہ ایک شخص نے حضرت فاطمۃالزہراؓ کے ساتھ نبی اکرمﷺ کی محبت کا عالم دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔آنکھوں سے آنسو نکل آئے، سوچنے لگا کہ آہ کس بے دردی سے میں نے اپنی بیٹی کو صرف دورِ جہالت کی عصبیت کی بنا پر زندہ درگور کردیا تھا، اور پھر نبی کریمﷺ کے استفسار پر اپنی داستاں بیان کرنا شروع کردی۔میری بیوی حاملہ تھی، ان ہی دنوں میں ایک سفر

پر مجبور ہوگیا، عرصے بعد پلٹ کر آیا تو اپنے گھر میں ایک بچی کو کھیلتے دیکھا، بیوی سے پوچھا: یہ کون ہے؟ بیوی نے کہا: یہ تمہاری بیٹی ہے اور پھر کسی نامعلوم خوف کے تحت، التجا آمیز لہجہ میں کہا: ذرا دیکھو تو کس قدر پیاری بچی ہے، اس کے وجود سے گھر میں کتنی رونق ہے، یہ اگر زندہ رہے گی تو تمہاری یادگار بن کر خاندان اور قبیلے کا نام زندہ رکھے گی۔ میں نے گردن جھکالی، بیوی کو کوئی جواب دیئے بغیر لڑکی کو بغور دیکھتا رہا، لڑکی کچھ دیر تو اجنبی نگاہوں سے مجھے تکتی رہی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر بھاگتی ہوئی آئی، اور میرے سینے سے لپٹ گئی، میں نے بھی جذبات کی رو میں اس کو آغوش میں بھر لیا اور پیار کرنے لگا، کچھ عرصہ یونہی گذر گیا۔ لڑکی آہستہ آہستہ بڑی ہوتی رہی اور ہوشیار ہوئی، سن بلوغت کے قریب پہنچ گئی، اب ماں کو میری طرف سے بالکل اطمینان ہوچکا تھا، میرا رویہ بھی بیٹی کے ساتھ محبت آمیز تھا، ایک دن میں نے اپنی بیوی سے کہا: ذرا اس کو بنا سنوار دو، میں قبیلے کی ایک شادی میں اسے لے جاؤں گا، ماں بیچاری خوش ہو گئی اور جلدی سے سجا سنوار کر تیار کر دیا۔ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے روانہ ہوگیا۔ ایک غیر آباد بیابان جگہ پر پہنچ کر پہلے سے تیار شدہ ایک گڑھے کے قریب کھڑا ہوگیا، لڑکی جو بڑی خوشی کے ساتھ اچھلتی کودتی چلی آرہی تھی، میرے قریب آکر رک گئی اور بڑی معصومیت سے سوال کیا: بابا یہ گڑھا کاہے کے لئے ہے؟ میں نے سپاٹ لہجے میں اس سے کہا: اپنے خاندانی رسم ورواج کے مطابق

میں تم کو اس میں دفن کرنا چاہتا ہوں ہتاکہ تمہاری پیدائش سے ہمارے خاندان اور قبیلے کو جو ذلت ورسوائی ہوئی ہے اس سے نجات مل جائے۔لڑکی کو صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور قبل اس کے اس کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار ہو، میں نے اس کو گڑھے میں دھکیل دیا۔لڑکی دیر تک روتی اور گڑگڑاتی رہی ؛لیکن مجھ پر اس کے نالہ وفریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے گڑھے کو مٹی سے بھر دیا، اگر چہ آخر وقت تک وہ ہاتھ اٹھائے مجھ سے زندگی کی التجا کرتی رہی تھی، لیکن افسوس ! میں نے اپنے دل کے ٹکڑے کو زندہ در گور کردیا، لیکن اس کی آخری التجاب بھی میرے کانوں میں لاوے پُکارہی ہے : ''بابا تم نے مجھے تو دفن کر دیا ؛لیکن میری ماں کو حقیقت نہ بتانا، کہہ دینا کہ میں بیٹی کو اپنے قبیلے والوں میں چھوڑ آیا ہوں'' اپنے عرب صحابی سے ایک بیٹی کے زندہ در گور کر دیئے جانے کی داستاں سنی تو حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔اس وقت نبی کریم ﷺ کی آغوش میں جنابِ حضرت فاطمۃالزہراؓ بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آئی، تو نبی کریم ﷺ نے بیٹی کو سینے سے لگایا اور آپ ﷺ کے ہونٹوں پر یہ جملے جاری ہوگئے : ''بیٹی تو رحمت ہے اور پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: میں فاطمۃالزہراؓ کو دیکھ کر اپنے مشامِ جان کو بہشت کی خوشبو سے معطر کرتا ہوں، بارِ الٰہی میں تجھ سے موت کے وقت آرام وراحت اور قیامت کے حساب وکتاب کے وقت عفو، ومغفرت کا طالب ہوں۔جو لوگ اپنی بیٹوں کی کثرت پر ناز

کرتے ہیں اور اپنی بیٹیوں پر افسوس کرتے ہے، انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے۔ غرور وتکبر کرنے کے بجائے اللہ رب العزت کا شکرادا کرنا چاہیئے۔ جس نے انہیں اولاد جیسی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا۔ لڑکا یا لڑکی کی پیدائش انسان کی اپنی پسند یا ناپسند سے نہیں ہوتی، بلکہ اللہ کی عطا ہوتی ہے، اس کی مرضی پر منحصر ہے۔خدارا ! اپنی بیٹیوں کی پیدائش پر رنجیدہ مت ہوں ؛بلکہ خوشی کا اظہار کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے گھر رحمت بھیجی ہے۔

خواتین کی آزادی مگر کیسے؟

بھلا اس مسلمہ حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے بعد سے ہی پورے عالم میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس کے ذریعہ عجمی و عربی، گورے اور کالے، مرد و زن الغرض تمام کے تمام انسان خواہ وہ دنیا کہ کسی بھی خطے یا گوشے میں زندگی گزار رہے ہوں یکساں طور سے مستفید ہوئے، کیا یہ اسلام کا ہی کارنامہ نہیں تھا کہ آمد اسلام سے قبل عرب میں بچیوں کی پیدائش کو باعث شرم وعار تصور کیا جاتا تھا اور جب کسی گھر میں بنت حوا جیسے ہی جنم لیتی اور آنکھیں کھولتی تو اسے اس کا باپ ہی نہایت ہی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے (شرم وعار سے بچنے کے خاطر منوں مٹی تلے زندہ ہی درگور کر دیتا تھا) جس کا بیان قرآن پاک میں کچھ اس طرح سے ہے (جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا اور غصے سے تمتما اٹھتا اور وہ شرم کے باعث لوگوں سے نظریں بچانے لگتا کہ کہیں اسے بیٹی کا باپ نہ تصور کیا جائے) لیکن اسلام نے اپنی آمد کے ساتھ ہی اس جاہلیت کو دور کیا اور خواتین کو باعث زحمت نہیں بلکہ باعث رحمت قرار دیا نیز خواتین کو بھی اس کی زندگی جینے کا پورا پورا حق دیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ حدود وقیود اور شرائط بھی مقرر کئے جیسے پردے

کا حکم اپنے خاوند کی اطلاعت شعاری وغیرہ۔ لیکن آج کا ہمارا موجودہ معاشرہ جو اپنے آپ کو نئی تہذیب وثقافت کا علمبر دار اور نئے ایجادات انکشافات کا پیروکار تصور کرتا ہے اسے اس اسلامی معاشرے میں اور اسلامی نظام زندگی میں نعوذ باللہ نہ جانے کیوں اور کیسے کمی اور خامی بلکہ کچھ جھول سا نظر آنے لگا ہے اور اس سے یہ آوازیں بلند ہونے لگی ہیں کہ آج کے معاشرے میں یعنی ہمارے اسلامی اور مشرقی معاشرے میں خواتین کو مساوات ،آزادی، اختیارات، حقوق وغیرہ حاصل نہیں ہیں۔ حقیقتاً ان کے ان سنہرے نعروں کے پیچھے اور ان کے پس پشت ان کے اذہان میں کوئی نہ کوئی چور چھپا ہے اب خواہ وہ چور بے حیائی، بے پردگی کو فروغ دینے کا ہو یا پھر اپنی خواہشات نفسانیہ کی تکمیل کا کیوں کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں حسن وعشق کی ریل پیل ہوگی وہاں اسکے متوالے اور شیدائیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہوگی اور جہاں سر عام اور سر شام بازار حسن اپنی تمام تر رعنائیوں ودلفریبیوں کا نظارہ پیش کرے گا تو پھر لوگ ان حسین نظاروں سے اپنے دلوں کے شراروں کو ضرور لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرائیں گے جن کے نتائج تو اپنی بھیانک صورتوں میں ضرور نظر آئیں گے اور آتے ہیں جو کہ ہم آج اخبارات ورسائل میں خواتین کے ساتھ عصمت دری اور زیادتی جیسی خبروں کی شکل میں مسلسل پڑھتے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ پھر کیسے اور کیوں کر بچے گی عزت نسواں اور کیوں نہ مارا جائے گا عزت نسواں پر شب خوں یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جو درحقیقت ٹھنڈے ذہن ودماغ کے ساتھ سوچنے اور غور فکر

کرنے کے ہیں کیوں کہ دنیاکہ تمام مذاہب کے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اسلام ہی وہ دین اور وہ مذہب ہے جس نے ہر شخص کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، عجمی ہو یا عربی، کالا ہو یا پھر گورا یکساں اور مکمل حقوق فراہم کیا ہے اور یہ بتایا بھی ہے کہ کسی عجمی کو کسی عربی پر یا کسی عربی کو کسی عجمی پر یا کسی گورے کو کسی کالے پر یا کسی کالے کو کسی گورے پر ہر گز ہر گز فضیلت وبرتری حاصل نہیں اگر کسی کو کوئی فضیلت یا برتری حاصل ہے تو وہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ پھر یہ نعرہ دیناکہ دین اسلام میں عورتیں محصور ہیں انہیں مکمل طور پر اپنی مرضی کی زندگی جینے کے حقوق حاصل نہیں ہیں یہ سراسر فضول ہے،انہیں پراپرٹی میں برابر کا حصہ نہیں ملتاہے یہ بات اور یہ سوال بھی فضول ہے۔ یہاں میرا مقصد اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ ابھی حالیہ دنوں میں ہی برطانیہ میں خواتین کے ساتھ عدم مساوات کے موضوع پر بڑا ہی شور وواویلا مچایاگیا اور یہ کہاگیاکہ عورتیں آج پوری دنیا میں عدم مساوات کی شکار ہیں حتی کہ اس پر برطانیہ کے وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے پوری دنیا میں ایک مہم چلانے کا بھی فیصلہ کرلیا کہ وہ اس مقصد سے پوری دنیا میں ایک مہم چلائیں گے انہوں نے کہاکہ برطانیہ اس مقصد کیلئے قومی آمدنی کے 0.7 فیصد اقوام متحدہ کی امداد کی فراہمی کا ہدف پورا کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے والی ساکھ سے کام لیتے ہوئے خواتین پر جنسی تشدد، پراپرٹی رائٹس جیسے معاملات پیش کرے گا۔ وزیراعظم نے 2015 کے بعد کے برسوں کیلئے ترقیاتی ترجیحات کے حوالے سے

اقوام متحدہ کے اعلیٰ سطح کے پینل کی مشترکہ صدارت کی جسے گزشتہ سال صنفی مساوات اور خواتین کو بااختیار بنانے کا نام دیا گیا تھا اور جو کہ ان 12 کلیدی اہداف میں سے ایک ہے بین الاقوامی برادری جس پر زور دے گی۔پینل کی رپورٹ میں اہداف کے حوالے سے مثالیں دی گئی ہیں اقوام متحدہ جن کو اختیار کر سکتا ہے جس میں لڑکیوں اور خواتین پر ہر طرح کے تشدد کا خاتمہ، بچپن کی شادیوں کا خاتمہ، خواتین کیلئے وراثتی املاک کے حصول کے حوالے سے خواتین کے مساوی حقوق کو یقینی بنانا اور سیاست، معیشت اور عوامی زندگی میں خواتین کے خلاف امتیاز کو ختم کرنا شامل ہیں یہ تو ہیں.برطانوی وزیر اعظم کے خیالات۔لیکن یہ بھی بتاتا چلوں کہ جو اقدار اور جو طریقہ اسلام نے اپنے ماننے والوں اور اپنے پیروکاروں کیلئے مقرر کئے ہیں اور جو نظام زندگی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو عطا کیا ہے اس سے اعلیٰ وافضل طریقہ بھی کوئی مذہب اپنے پیروکاروں کو کیا دے سکتا ہے ؟ہر گز ہر گز نہیں اور قیامت کی صبح تک نہیں کیوں کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کو دین ابدی و سرمدی ہونے کا طرہ امتیاز حاصل ہے جس کے بارے میں خود قرآن پاک میں اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے آج میں نے تمہارے لئے اپنا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور میں نے اپنی رضا کو تمہارے لئے دین اسلام کے ساتھ لازم کر دیا یہ ہے اسلام کا واضح پیغام جس کے بعد ہمارے لئے اس دنیا میں کسی دوسرے مذاہب کو اپنانے کی اور اس کے طریقوں کو اپنا شیوہ بنانے کی ہر گز ہر گز کوئی اجازت نہیں تو

بھلا مغربی طرز زندگی اور مغربی نظام حیات تو دور کی بات جو سراپا برائیوں ، خرابیوں اور فسادات کا مجموعہ ہیں۔ کو کیونکر اپنایا جا سکتا ہے۔

جہیز ایک معاشرتی لعنت

قارئین کرام !آج جو حالات سامنے آرہے ہیں،اسے دیکھ کر اور پڑھ کر ہمارے دلوں میں غم والم کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ہم انسانیت کے چمن میں ہیں یا درندوں کے کسی جنگل میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ایک ایک لمحہ انسانیت کے ساتھ شرافت کی زندگی گزارنا مشکل ہوگیا ہے۔آج انسان، انسان سے ڈر رہا ہے۔انسانیت کے نام سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کی شکل میں یہ درندے کہاں سے آگئے، جنھوں نے شیطان کو بھی شرمندہ کردیا۔ شیطان بھی سوچ رہا ہوگا کہ جو کام ہمیں کرنا تھا وہ آج کے انسان کر رہے ہیں۔آج ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں، نیوز چینلوں میں دیکھتے ہیں کہ فلاں مقام پر مزید جہیز جوڑے کی رقم کا مطالبہ پورا نہ ہونے پر ایک معصوم لڑکی کو زندہ جلا دیا گیا۔فلاں نے گاڑی نہ ملنے پر نازک سی زندگی کا قتل کردیا۔فلاں مقام پر من پسند جہیز نہ ملنے کی وجہ سے ظالم سسرال والوں نے امت مسلمہ کی اس بے قصور بیٹی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کرہلاک کردیا۔ایسے کئی واقعات ہماری نظروں سے گزر رہے ہیں، سننے ،دیکھنے اور پڑھنے میں بھی آرہے ہیں۔آخر ان جلتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے ہیں،ان رپورٹس کو پڑھتے ہیں تو دل بار بار یہی پوچھتا ہے کہ کیا جرم تھا اس معصوم سی بچی

کا؟ کیا گناہ تھے اس کے؟ کیا بات تھی اس کی؟ کیوں تم اس کو سزا دیتے ہو، کیا تمہارے دلوں میں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ بتاؤ اس معصوم سی اور نازک سی زندگی نے وہ کونسا جرم کیا تھا کہ تمہاری عدالت نے اسے موت لکھ دیا؟ کیوں ہم اس ملعون جہیز کی خاطر بے گناہ بہو، بیٹیوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں؟ ملتِ اسلامیہ کی بیٹیاں چیخ چیخ کر ہم سے یہ کہہ رہی ہیں کہ کیوں ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں؟ کیوں ہمارے اوپر مٹی کا تیل چھڑک کر ہمیں نذر آتش کر رہے ہو؟ کیا ہمیں اس لئے جلایا اور مارا پیٹا جارہا ہے کہ ہمارے پاس جہیز میں دینے کے لئے گاڑیاں، جوڑے کی رقم اور ساز وسامان نہیں ہے؟ جہیز کے لئے بھینٹ چڑھنے والی معصوم بچیاں اسلامی شریعت سے کہہ رہی ہیں کہ کاش ہماری اسلامی شریعت صرف کتابوں، وعظوں، نصیحتوں، تقریروں اور اخبارات کے کالموں کے بجائے حقیقی معنوں میں عمل سے ہوتی تو شاید آج خود اسلامی شریعت کو یہ دن نہیں دیکھنے پڑتے، اور دوسری اقوام کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ اسلام بھی ہماری ہی طرح کے اصولوں اور طور طریقوں کا مذہب ہے۔ یاد رکھو مسلمانو! ہمیں ان جلتی ہوئی دوشیزاؤں کی فریاد کا جواب کل قیامت کے دن دینا ہوگا۔ جب قیامت کے دن زندہ درگور کی گئی لڑکیوں سے، ان موت کے گھاٹ اتاری گئی دوشیزاؤں سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کس جرم کی پاداش میں مٹی کا تیل چھڑک کر جلایا گیا تھا؟ تمہیں کس گناہ کے نتیجے میں پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا تھا؟ اس وقت ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ آج مجھے بہت دکھ

ہوتا ہے اور بڑا افسوس ہوتا ہے کہ جہیز کے نام پر ہماری بہنوں کے ساتھ جو ظلم و ستم اور زیادتیاں ہوتی ہیں؟ جس طرح انہیں مارا پیٹا جاتا ہے، ان کے دستِ حنائی کو کھرچا جاتا ہے۔ ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچ دیا جاتا ہے۔ انہیں زہر کھانے پر، پھانسیاں لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جس طرح تیل چھڑک کر انکی جان لی جاتی ہے۔ اس پر دل تڑپ اٹھتا ہے، بیقرار و بے چین ہو جاتا ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی بیٹیوں کا قصور یہی ہوتا ہے کہ وہ منہ مانگا جہیز نہیں لا سکتیں۔ آج ہمارے معاشرے میں ایسے کئی خطرناک واقعات ہو رہے ہیں، جس سے شرم کے مارے ہماری شریعت بھی منہ چھپاتی ہوگی۔ دوستو! بہت سی بیٹیاں جہیز کے لئے زندہ جلادی گئیں.... لیکن ان درد بھرے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اہلِ اسلام میں دن بدن جہیز کے مطالبات میں ترقی ہو رہی ہے۔ جاہل تو جاہل ہیں مگر مہذب اور پڑھے لکھے گھرانے والے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں بڑی بے حیائی و بے غیرتی سے جہیز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں جس انداز سے رشتے طے کئے جاتے ہیں، وہ بالکل کاروباری، ہوس پرستی اور غیر اسلامی ڈھنگ کے ہوتے ہیں۔ ان میں صرف جھوٹی شان و شوکت اور دوسری قوموں جیسی رسم و رواج کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان رشتے ناطوں سے اسلامی شریعتِ مطہرہ کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ قارئینِ کرام! حقیقت میں اس درد کا احساس اور اس درد کی تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب یہ معاملہ ہماری اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ پیش آئے۔ ہمارے یہاں بیٹیاں اور بیٹے بھی

پیدا ہوتے ہیں۔ ہم اپنے بیٹوں کی بدولت جہیز، دعوتیں، جوڑے اور بہت سا تعیش کا سامان چاہتے ہیں اور جب بیٹی جوان ہوتی ہے تو معاشرے پر تنقید کرتے ہیں۔ آخر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ جب ہم اپنے بیٹوں کی بدولت اپنے کل ارمان پورے کرنا چاہتے ہیں تو پھر دوسروں سے یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ وہ ہم سے کچھ طلب نہ کرے؟ ہم جو خسارہ خود اٹھانا نہیں چاہتے اسکی توقع دوسروں سے کیوں کرتے ہیں؟ اپنے لاڈلوں کی اونچی بولی لگانے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں؟ اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی تو ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اپنی بیوی کو ستانے یا جلانے والا مرد غیرت دار ہو سکتا ہے؟ ایسے مردوں کو مرد نہیں نامرد کہنا چاہئے۔ اپنی بیویوں کو مارنا، جلانا ان پر ظلم کرنا مردانگی اور بہادری نہیں۔ بزدلی ہے۔ ایسے مرد معاشرے کا کلنک ہیں۔ کیا یہ دین سے لاعلمی کا نتیجہ نہیں ہے؟ کیا ہم اسلام کو بدنام نہیں کر رہے ہیں؟ کیا ضرورت اس بات کی نہیں ہے کہ ایسے مجرموں کو عبرت ناک سزائیں ملنی چاہئے؟ تو پھر حکومت اس سلسلے میں کچھ کیوں نہیں کر رہی ہے؟ اگر ہم نے جہیز کا لین دین ختم نہ کیا تو اس کے نتائج بہت بھیانک ہوں گے جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے، یہ چند لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ پورے مسلم معاشرے کا مسئلہ ہے۔ ہم کو اس کے خلاف میدان میں آنا ہوگا، اگر ہم اس وقت کھڑے نہ ہوئے اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی تو وہ دن دور نہیں جب مسلمان بھی غیروں کی طرح اپنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالیں گے۔ جاگو مسلمانو! ورنہ دورِ جاہلیت لوٹ

آ ئیگی، حیوانیت کا زمانہ پلٹ آ ئے گا۔اسلام نے جس فتنہ کو بند کر دیا تھا وہ فتنہ پھر سر اٹھا رہا ہے۔آ گے بڑھیے اور اس فتنہ کا دروازہ بند کر دیجئے۔

جمہوریت صرف ایک سلوگن

ملک کے وجود میں آنے کے 66 سال بعد آج بھی ہم ایک منتشر قوم ہیں۔ اخلاقی اقدار کا تو ویسے ہی جنازہ نکل گیا ہے ' مگر بات یہاں ختم نہیں ہوتی معشیت ' معاشرت ' طبقاتی تقسیم ' کرپشن ' تمام قدرتی وسائل کے باوجود توانائی کا بحران ' لوٹ مار ' تعلیم و صحت کے مسائل ' عدل کی عدم فراہمی ' وڈیرا کلچر ' لسانی و مذہبی منافرت ' بے روزگاری ' اور غربت جیسے بے شمار مسائل ابھی بھی منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ ہم سے بعد میں آزاد ہونے والے ممالک ترقی میں آج ہم سے کہیں آگے ہیں یقیناًان کے پاس بھی وسائل محدود تھے ' تو پھر ایسا کیوں ہے کہ وہ ہم سے آگے نکل گئے اور ہم آج بھی زوال کا شکار ہیں؟؟ اس کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ ہے کرپٹ نظامِ انتخاب اور جعلی ڈگریوں والے نام نہاد عوامی نمائندے۔ پاکستان میں رائج موجودہ نظامِ انتخاب کسی بھی طرح اسلام کے دیئے ہوئے تصورات کے مطابق نہیں اور نہ ہی یہ عوام کی حقیقی نمائندگی و حقیقی جمہوریت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ یہ تو بدمعاشوں ' چوروں ' لٹیروں ' وڈیروں کا نظام ہے جو مل بیٹھ کے کھانے کو ''مفاہمت'' کا نام دیتے ہیں اور اپنی اپنی باری پر خوب سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ الیکشن کے قریب آتے ہی ہر امیدوار فریب کا لبادہ اوڑھے ہوئے جھوٹے ہتھکنڈے استعمال کرتے '

جھوٹی تشہیر کرتے ' اور زور و شور سے نعرے لگاتے ہوئے حریف کے مقابل زیادہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے عوام کو بے وقوف بناتا ہے۔ اور اس کے لیے بھاری رقم خرچ کرتا ہے اور جو سب سے اونچا داؤ لگا کر یہ کھیل کھیلتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسا نظامِ انتخاب سراسر غیر مؤثر ہے جہاں نہ تو کوئی رکن اور نہ ہی کوئی حکومت عوام کی اکثریت سے آگے آتی ہے۔ ایسا نظامِ انتخاب صرف سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور صرف وہ ہی منتخب ہو سکتے ہیں کیونکہ موجودہ نظامِ انتخاب کے تحت کسی امیدوار کو قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے کے لیے 10 سے 20 کروڑ جبکہ صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑنے کے لیے 10 سے 15 کروڑ روپے درکار ہیں۔ اس ملک کی 98% فیصد عوام محنت کش ہے پڑھے لکھے اور شعور رکھنے والے ان حالات میں آگے نہیں آ سکتے اور اس صورت میں پھر عوام کی تقدیر کا فیصلہ وہ 2% لوگ کرتے ہیں جنھیں غریب کے مسائل اور اس کی تکالیف سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اراکینِ پارلیمنٹ میں سے 90% ایسے ہیں جنھوں نے آج تک اپنا مائیک آن نہیں کیا بلکہ اب تو میڈیا بھی یہ دکھا چکا ہے کہ کیسے اکثر اراکین دورانِ اجلاس بھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بہتری کی امید کہاں کی جا سکتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کی تقدیر کا اختیار غیر ملکی قوتوں کو دے دیا گیا ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی اہل کار ایسا کارنامہ سرانجام ضرور دے دیتا ہے کہ اسے نااہل قرار دے دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود درحقیقت وہ نااہل نہیں

ہوتے ایسا تو بیچاری عوام کو تسلی دینے کے لیے دکھاوے کو کیا جاتا ہے۔ کرپشن کی بدولت پاکستان پر موجودہ قرض اربوں ڈالر ہو گیا ہے، مہنگائی کئی سو گنا بڑھ گئی ہے، لوگ مر رہے ہیں، کراچی 'کوئٹہ' کی حالت قابلِ رحم ہے۔لوگ بجلی، سوئی گیس اور پانی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ہر طرف عجیب افراتفری ہے پتہ نہیں حکومت کن مفادات پر قائم کی گئی ہے۔ایک صوبے تک میں تو امن وسکون قائم نہیں کر سکے پورا ملک کیا سنبھالیں گے یہ لوگ۔اب اس ساری صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ بات ماننا کہ حکومت کو عوام کا خیال ہے یا وہ اپنے فرائض سے آگاہ ہے تو یہ عقل سے بالاتر بات ہو گی۔ ہمارے ملک کی پارلیمینٹ پر اٹھنے والے اربوں کے اخراجات غیر معمولی ہیں مگر ان سے غریب عوام کو کیا فائدہ ہوا؟؟ ہارس ٹریڈنگ، رشوت، غبن لوٹ مار، خیانت اور ناجائز طریقوں پر کروڑوں اربوں روپے کے قرضے لینا اور دھوکہ دہی سے ان قرضوں کو معاف کروانا ان اراکین کا معمول رہا ہے۔اسی طرح عوام کی خدمت کی خاطر کروڑوں روپے کے منصوبے منظور کروائے گئے اور انھیں اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا گیا۔ ملک کے تمام سنگین مسائل کی جڑ کرپٹ نظامِ انتخاب ہے۔اس کرپٹ نظامِ انتخاب نے قوم کو اس کی حقیقی نمائندگی سے محروم کر دیا ہے اور عوام کے 98% فیصد غریب و متوسط طبقات سے کسی امیدوار کا منتخب ہونا عملاً ناممکن ہو چکا ہے۔ اگر 1934 کے زمانے کا مطالعہ کریں جب سندھ ممبئی کا حصہ تھا تو جو لوگ اس ممبئی کی حکومت کے وزیر تھے سندھ کی سیاست تب سے آج تک اسی

لائن پر چل رہی ہے انہی خاندانوں کی اجارہ داری رہی اور انہی کو منتقل ہوئی۔یہی حال بہاول پور، بلوچستان اور دیگر حلقہ جات کا ہے۔ ہر دفعہ الیکشن ہوتے رہے، حکومتیں بدلتی رہیں، مگر اسمبلیاں اور اقتدار ان خاندانوں سے باہر نہیں گیا۔ یہاں جمہوریت صرف ایک سلوگن ہے۔اس ملک میں کتنے حکمران احتساب کے نام پر بھی آئے، اسلام کے نام پر بھی آئے، جمہوریت کے نام پر بھی آئے مگر کیا کوئی تبدیلی آئی؟ کوئی جمہوریت آئی؟ اجارہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہوا؟ عوام کو بنیادی سہولیات مہیا کی گئیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ سب عوام کو جموریت کے نام پر فریب دے کر چلتے بنے۔ کروڑوں روپے لگا کر اقتدار میں آنے والا عوام کا، محنت کشوں کا، کسانوں کا، تاجروں کا،اس ملک کا نمائندہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ وہ تو صرف اپنے ذاتی مفادات کا نمائندہ ہوگا۔ پارلیمنٹ سے ذرا کوئی پوچھے انھوں نے اس قوم کو دیا کیا ہے؟ 18 کروڑ عوام کو بجلی نہیں مل رہی، پانی نہیں مل رہا، آٹا نہیں مل رہا، کھانا نہیں مل رہا، گیس نہیں مل رہی، روزگار نہیں مل رہا، لوگوں کی جان ومال کا کوئی تحفظ نہیں ہے۔ متذکرہ بالا تمام مسائل کی جڑ کرپٹ نظامِ انتخاب ہے جب تک اس سے قوم کی جان نہیں چھوٹ جاتی ان مسائل سے چھٹکارا ملنا بھی ناممکن ہے۔ ذرا سوچیے! کیا ہم ترقی یافتہ قوموں کے درمیان ایسے ہی ایک ناکام ریاست کے طور پر تسلیم کیے جاتے رہیں گے؟ کیا ہم ہمیشہ ایسے ہی مہنگائی، گیس، بجلی، معاشی، سماجی، سیاسی، مذہبی، قانونی اور تعلیمی طور پر پسماندہ ہی رہیں

گے ؟؟ اگر ہم ایسا نہیں چاہتے تو پھر یہ وہ وقت ہے کہ جہاں ہمیں "لوگوں" سے قوم "بننا ہے اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنی ہے تب ہی ممکن ہے کہ کوئی حقیقی" تبدیلی آسکے اور ہمارا شمار بھی ترقی یافتہ اور خوشحال اقوام میں شمار ہونے لگے۔ ورنہ تو پھر یہ تمام مسائل ہماری آنے والی نسلوں تک بھی جوں کے توں ہی رہیں گے اور ہمیشہ کی طرح اس کی زد میں کوئی اور نہیں بلکہ عوام ہی آئے گی۔

گھریلو بجٹ ایک چیلنج

اکیسویں صدی کی خواتین کو جن مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے ان میں سب سے بڑا چیلنج اگر کسی کو قرار دیا جائے تو وہ اپنا گھر چلانا ہے۔ آج کی خواتین مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر پر بھی کنٹرول کر رہی ہیں۔ مرد جو کما کر لاتے ہیں ان کو کیسے خرچ کیا جائے یا وہ خود جو کماتی ہیں ان میں سے کس طرح پس انداز کر لیا جائے یہ آج کی عورت کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے اور بیشتر گھرانوں کی عورتیں اس چیلنج کا پورے اعتماد و سلیقہ کے ساتھ جواب دے رہی ہیں۔ وہ زمانہ اب باقی نہیں رہا جب عورتوں کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا پڑتا تھا ان کا کام زیادہ سے زیادہ گھر کا کام کاج انجام دینا ہوتا تھا، آج عورتیں ہی نہیں نوعمر لڑکیاں بھی مختلف پیشوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہی ہیں اس لئے جب ان کے ہاتھ میں بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ گھریلو بجٹ تیار کرنے کا کام آتا ہے تو وہ اس میں مردوں سے زیادہ اہلیت اور مہارت کا ثبوت دیتی ہیں۔ پھر بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ عورت پڑھی لکھی ہو، امور خانہ داری میں اسے خاطر خواہ دلچسپی ہو، فضول خرچی سے پہلو بچاتی ہو، جب کسی عورت میں یہ صلاحیتیں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ گھر کا بجٹ متوازن رکھنے میں کامیاب رہتی ہے۔ آج کے اس شدید

مصروفیات کے دور میں جب مرد اپنا کاروبار چلانے یا نوکری کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں تو متعدد گھروں کیلئے خریداری کا کام عورتیں ہی کرتی ہیں اور جو سلیقہ مند خاتون ہوتی ہیں وہ خریداری سے پہلے اپنی گھریلو آمدنی کو سامنے رکھ کر بجٹ بنالیتی ہیں کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہوتی ہیں کہ جتنی چادر ہو، اتنے ہی اپنے پیر پھیلانے چاہئے۔ بجٹ سرکاری ہو یا گھریلو وہ ایک چیلنج ہوتا ہے اور اس کو تیار کرتے وقت اپنی ضرورتوں کا لحاظ کرکے آمدنی وخرچ کو دیکھا جاتا ہے۔ انسانی ضروریات میں پہلی ضرورت اس کا مکان ہوا کرتی ہے۔ دوسری ضرورت اس کا لباس ہوتی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پہنو جو لوگوں کو پسند آئے، پھر اس کے بعد کھانے پینے کی ضرورت کا نمبر آتا ہے، سمجھدار خواتین اور گھر کی ذمہ دار اپنی آمدنی کے اندر بجٹ بناتی ہیں اور جو آمدنی کا لحاظ نہیں رکھتیں انہیں مالی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح دوسری گھریلو ضرورتوں کو پورا کرنے کی کافی اہمیت ہوتی ہے، مثال کے طور پر تعلیم کا خرچ، اخبارات کا بل، بجلی، نل اور ٹیلی فون کے ماہانہ اخراجات، تہوار، تقاریب، مہمان نوازی، سیر وتفریح اور ایسے ہی دوسرے پروگراموں کے لئے رقم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اچھی گرہستن خواتین اپنا بجٹ بناتے وقت اخراجات کی ان سب مدوں کا خیال رکھتی ہیں اور سمجھدار بیویاں تو اپنے شوہر سے صلاح ومشورہ بھی کرلیتی ہیں اور جو ان سبھی پہلوؤں کو سامنے نہیں رکھتیں، انہیں بعد میں مالی دقتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے اور ایک مرتبہ

جب ان کے گھریلو بجٹ کا توازن بگڑ جاتا ہے تو پھر وہ مہینوں سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ شروع سے فضول خرچی کی عادت نہ ڈالی جائے اور کفایت شعاری کی زندگی گزاری جائے۔ در حقیقت گھریلو بجٹ بنانا اپنی آمدنی کو ایک توازن کے ساتھ خرچ کرنے کا دوسرا نام ہے، جس میں کفایت شعاری کافی مددگار ثابت ہوتی ہے اور فضول خرچی پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ پھر دن بدن آسمان کو چھوتی مہنگائی کے اس دور میں انسان دو باتوں پر خاص توجہ دے تو وہ سکون واطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ خرچ کرنے سے قبل سوچ لے کہ کہیں وہ غیر ضروری تو نہیں ہے، فضول چیزوں پر ایک پیسہ صرف نہ کیا جائے، کس دل میں خواہش اور امنگیں نہیں ہوتیں لیکن ان کو اپنی قوتِ خرید کا پابند رکھنا چاہیئے، دوسری یہ کہ مہنگائی برق رفتاری کے ساتھ بڑھ رہی ہے لہٰذا مستقبل کے لئے بھی کچھ نہ کچھ رقم ضرور پس انداز کرکے رکھ لینی چاہیئے، آج کے مزہ کے لئے کل کی پریشانی مول لینے والے اچھے بجٹ ساز نہیں ہوسکتے۔ بعض لوگ قرض کے سہارے اپنی گھریلو زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں جبکہ تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ جہاں تک ہوسکے قرض سے بچا جائے ایک خوشحال اور فارغ البال زندگی گزارنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ آدمی ادھار کی زندگی جینے سے بچے کیونکہ ادھار لیتے وقت برا نہیں لگتا لیکن بعد میں اس کا ادا کرنا ایک مصیبت اور جی کا جنجال بن جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ روپیہ پیسہ کمانا مشکل سمجھتے اور اسے خرچ کرنا ان کے لئے بہت آسان ہوتا ہے

ایسے لوگ آمد و خرچ میں توازن، کفایت شعاری اور سلیقے مندی سے کام نہیں لیتے تو ان کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ کئی مالدار گھرانوں میں گھر کا تمام کام ملازموں پر چھوڑ دیا جاتا ہے، گھر کی مالکن بڑے کرنسی نوٹ دیکر کئی کئی دن حساب نہیں لیتیں، مالکوں کے گھر سے غائب رہنے سے نوکروں کی بن آتی ہے، ان کے ذاتی مہمان گھر میں آنے جانے لگتے ہیں ایسے گھروں میں خانہ داری کا انظام ممکن نہیں رہتا، اسلئے ضروری ہے کہ ملازموں کو صحیح طریقہ سے تربیت دی جائے نیز گھر کی ہر لڑکی کو شادی سے قبل گھر جانے کی کچھ نہ کچھ ٹریننگ ضرور دی جائے، اسی طرح گھر کے سازوسامان کی حفاظت پر بھی توجہ دی جائے، ہر صبح اور رات کو نوکر کی غیر موجودگی میں باورچی خانے کی الماریاں، برتن، گھی، تیل اور دوسرے سامان پر نظر ڈال لی جائے۔ ملازم رکھتے وقت بھی کافی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، جب تک ذمہ دار، شناسا اور مناسب ملازم نہ ملے ہرگز نہ رکھا جائے، ملازم کی پولیس کے ذریعہ شناخت کرالی جائے ورنہ اس میں تھوڑی سی بھی کاہلی برتنے سے بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ غیر ذمہ دار ملازم آپ کو مالی نقصان سے دوچار کر سکتا ہے بعض اوقات مال کے ساتھ جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ ایک خاتون خانہ کی قابلیت کا اندازہ اس سے بھی لگتا ہے کہ وہ حسب حیثیت زندگی گزارے، اگر ممکن ہو تو کچھ پس انداز کرے دوسروں کی مدد میں بھی کچھ نہ کچھ خرچ کرے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کفایت شعاری یا بچت کے لئے کون سے طریقے اپنائے جائیں ،اس کے لئے چند باتوں کا خیال رکھنا چاہئے

جب بازار جائیں تو اتنی ہی چیز خریدیں جتنی کہ ضرورت ہو۔ خرچ کے لئے جو رقم لے جائیں اس میں سے بچا کر لانے کی کوشش کریں۔ اپنی ضرورت کا سامان خریدنے کے بعد خواہ کتنی سستی چیز کیوں نہ ملے ہرگز نہ خریدیں۔ دکاندار جو چیزیں دکھائے دیکھ لیں، بھاؤ معلوم کرلیں۔ لیکن ضرورت نہ ہو تو کبھی نہ خریدیں اور آمدنی کم، خرچ زیادہ نہ ہو، اس کا ہر دم خیال رکھیں، قناعت اور اعتدال پسندی سے کام لیں۔ یہی گھریلو بجٹ کے چیلنج کا معقول جواب ہو سکتا ہے۔

انٹرنیٹ اور ہماری نوجوان نسل

آج کے جدید دور میں انٹرنیٹ دنیا بھر کے انسان کی ضرورت بن چکا ہے۔ اگر ہماری زندگی سے انٹرنیٹ کو نکال دیا جائے تو متعدد ضروریات زندگی خصوصاً روابط قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ انسان انٹرنیٹ کی دی ہوئی آسانیوں کا عادی ہو چکا ہے اور اب وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس بات کو اگر یوں کہا جائے کہ انٹرنیٹ انسانی زندگی کا اہم حصہ بن چکا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ کاروبار، رابطے، اشتہارات، بینکاری، معلومات یا پھر مختلف اشیاء کا فروغ تمام معاملات میں انٹرنیٹ کا استعمال کیا جارہا ہے۔ لوگ روزانہ اربوں روپے کا کاروبار انٹرنیٹ کی بدولت کر رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کے رجحانات میں اضافہ ہوا ہے جس کی بدولت زبانوں کو بھی فروغ ملا۔ مثال کے طور پر آج سے 5 سے 7 سال پہلے بمشکل چند ایک سائٹس پر ہی اردو دیکھنے کو ملتی تھی مگر اب متعدد سائٹس پر اردو زبان دیکھنے کو ملتی ہے۔ انٹرنیٹ اسٹوڈنٹس کمیونیٹی یعنی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بھی نہایت مفید رہا ہے۔ طالب علم کمپیوٹر پر یونیورسٹی و کالج اسائنمنٹس بناتے ہیں اور پھر ای میلز یا پھر دیگر انٹرنیٹ ذرائع سے ایک دوسرے کو ایک ہی جگہ بیٹھے پہنچادیتے ہیں۔ یوں تعلیم سے متعلق تبادلہ خیال میں بھی آسانی ہوتی

ہے اور طلبہ کا اساتذہ سے رابطہ بھی رہتا ہے۔ یونیورسٹیز نے تعلیم انٹرنیٹ کے ذریعے فراہم کرنا شروع کر دی ہے۔ اس طرح ملازم پیشہ طبقے کو بھی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ کی بدولت برقی آموزش یعنی ای لرننگ کا نیا دروازہ بھی اسی کے ذریعہ کھلا ہے جس نے طالب علم کو روایتی استاد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ تمام تر تعلیمی خصوصیتیں جو ایک استاد کے ذریعہ حاصل کی جانے والی تعلیم میں ہوتی ہیں اس برقی آموزش میں مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باریک سے باریک نکات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے چند خرابیاں بھی تعلیمی نظام میں پیدا ہوئی ہیں لیکن اس کی افادیت ان پر غالب ہے۔ ان تمام فوائد کے برعکس انٹرنیٹ کی بدولت چند نقصانات بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے معاشرے میں کتب بینی کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق کتب بینی کی جگہ انٹرنیٹ نے لے لی ہے۔ لوگ اب دکانوں اور کتب خانوں میں جا کر کتابیں، رسائل و ناول پڑھنے کی بجائے انٹرنیٹ پر پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لوگ گھر میں بیٹھے بیٹھے انٹرنیٹ کے ذریعے تمام نئی اور پرانی کتابیں حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کا وقت اور رقم دونوں ضائع ہونے سے بچ جاتی ہیں۔ کتابوں کے شوقین ہمیشہ اچھی کتب کی تلاش میں رہتے ہیں، انہیں ہمیشہ ہر جگہ اچھی اور دلچسپ کتب پڑھنے کا شوق ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے کتابوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے سے کتابیں خریدنے کے رجحان میں کمی آتی جا رہی ہے اور ماضی کے مقابلے

میں اب کتب فروشوں نے دوکانوں پر کتب بینوں کی تعداد میں کمی ریکارڈ کی ہے۔آج ہماری نوجوان نسل کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت نہیں ، لیکن دن رات انٹرنیٹ چیٹنگ اور فضول و عشقیہ ایس ایم ایس کرنے میں انہیں کمال حاصل ہے، جس کی وجہ سے مطالعہ کی عادت ختم ہوتی جارہی ہے۔کتاب بینی میں کمی واقع ہونے کی وجہ صرف انٹرنیٹ نہیں بلکہ کمپیوٹر اور موبائل فون بھی ہیں۔جب سے لوگوں میں اِن جدید ذرائع کے استعمال کی شرح بڑھی ہے، کتاب اور اس کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے نوجوانوں میں ذوق مطالعہ کی کمی ہے ،جس کا سہرا کسی حدتک انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور موبائل فونز پر جاتا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کے گمراہ ہونے میں انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور موبائل فون کا کافی اہم کردار ہے۔ اگرچہ انٹرنیٹ کی بدولت ای لرننگ یا ای ایجوکیشن کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں مگر نوجوان ان سہولیات کا فائدہ اٹھانے کے بجائے انٹرنیٹ کے دیگر فضول استعمالات میں لگے رہتے ہیں۔ اس اہم مسئلے پر قابو پانے کے لئے اقدامات کی ضرورت ہے۔یہ حقیقت ہے کہ کوئی درسگاہ اور تعلیم یافتہ معاشرہ کتاب کی ضرورت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔کہتے ہیں کتاب کا انسان سے تعلق بڑا پرانا ہے اورکتاب نہ صرف انسان کی بہترین دوست ہے، بلکہ یہ انسان کے علم و ہنر اور ذہنی استعداد میں بھی بے پناہ اضافہ کرتی ہے اور خود آگاہی اور اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات کاادراک پیدا کرتی ہیں۔انٹرنیٹ کو ایک ای لائبریری کہا جاتا ہے جہاں ہر قسم کی معلومات اورکتاب محفوظ ہے۔ انسان

جب چاہے انٹرنیٹ کے ذریعے کسی بھی کتاب کا مطالعہ کرسکتا ہے مگر یہ تمام باتیں پڑھنے لکھنے اور آگاہی حاصل کرنے والوں کے لئے ہیں۔ آج کی نوجوان نسل میں بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ان تمام سہولیات کا فائدہ اٹھاتے ہیں، زیادہ تر کے لئے کتابی شعور صرف کتابوں تک محدود ہے۔ ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ کتاب کلچر کو فروغ دیا جائے، کتابوں کی قیمتوں میں کمی کی جائے تاکہ عام آدمی کے لئے سستی و معیاری کتابوں کا حصول آسان ہو اور غریب عوام اور خاص طور پر نوجوان نسل میں مطالعہ کی اہمیت اور عادت کو پختہ کیا جاسکے۔ آخر میں میں اپنے پیارے دوست پنجابی کے معروف شاعر خادم وسائی پوری جو کہ ان دنوں سخت علیل ہیں، کے لئے قارئین سے دعائے صحت کی اپیل کرتا ہوں۔

شراب نوشی کے تباہ کن اثرات

اس دنیائے آب وگل میں انسان کا وجود قدرتِ خداوندی کا عجیب مظہر وپرتو ہے۔ اللہ تعالی نے نہ صرف انسان کو عدم سے وجود بخشا ہے، بلکہ اس کی وضع وساخت اور اعضاء وجوارح کا تناسب ہی کچھ اس انداز سے رکھا ہے کہ جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، جو اس کے افضل الخلق ہونے کا بین اور واضح ثبوت ہے۔ پھر اللہ تعالی نے اسے فہم وادراک اور عقل وشعور کی صلاحیتوں سے نواز کر دیگر مخلوقات کے بالمقابل اس کے امتیازی وصف کو اور زیادہ نمایاں اور اجاگر کردیا، پھر اللہ تعالی نے انسان کو بشمول اس کے اعضاء وجوارح کے ان کے استعمال کے حوالے سے یوں ہی بے مہار نہیں چھوڑا کہ وہ موقع ومحل کی تلاش وجستجو کے بغیر ان کا اندھا دھند اور بے تحاشا استعمال کرے، بلکہ اللہ رب العزت نے ہر عضو کے لئے اس کا دائرہ عمل، نصب العین اور طریق کار اور حدود وقیود کا تعین فرمایا کہ کہاں تک اس عضو کا استعمال انسانی وجود کے لئے سود مند اور کارگر ہوسکتا ہے اور کہاں تک اس کے استعمال سے اسے ناکامی ونامرادی اور شکست وریخت کا سامنا ہوسکتا ہے، انہیں قوی وجوارح میں سے جس سے اللہ عزوجل نے انسانی وجود کو مزین فرمایا ہے فہم ادراک اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بھی ہے جو انسان کے لئے بنیادی اکائی

اور اہم جز کی حیثیت رکھتی ہے؛ تاکہ وہ فہم وشعور کی صلاحیت کو بروئے کار لا کر خیر وشر کے درمیان تمیز کرسکے، اچھائی وبرائی کا اندازہ کرکے خدا کی صناعی اور اس کی کاریگری میں غور وخوض کے ذریعے اس تک رسائی حاصل کرسکے اور اس کے مرضیات کو جان کر اس پر عمل پیرا ہوں اور اپنی اخروی زندگی کو سرخروئی اور کامیابی سے ہمکنار کرسکے، گویا شریعت کی مکمل اساس اور پوری بنیاد ہی اسی فہم وشعور کی صلاحیت پر موقوف ہے، اسی امتیازی وصف کی بناء پر وہ احکامِ خداوندی کا مخاطب ہے، یہی وجہ ہے کہ بچہ، پاگل، مجنون، اسی طرح سمجھ بوجھ کی صلاحیت سے عاری اشخاص احکامِ خداوندی کے پابند نہیں ہوتے، عقل کی اسی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر شریعت نے ان تمام چیزوں کے استعمال پر پابندی لگائی ہے جو اس کے فساد وبگاڑ کا موجب بنتے ہوں، جن میں سرفہرست شراب اور نشہ کا استعمال ہے۔

اس شراب نوشی کے نہ صرف انسانی صحت، جسمانی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں؛ بلکہ اس کا راست اور بلاواسطہ حملہ انسان کے عقل ودماغ پر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وقتی طور پر اس کی صلاحیت کار اور قوت فکر وتدبر مفلوج اور اس کے جسم کے کل پرزے بے ہنگام اور غیر مرتب ہوجاتے ہیں، اس کا ان پر کوئی کنٹرول نہیں رہ جاتا، غیر شعوری طور پر شراب پی کر انسان کی حالت حیوانوں سے بھی بدتر ہوجاتی ہے؛ اس لئے اس حالت میں اپنوں اور غیروں کی تمیز ،

ماں باپ ، بھائی ، بہن ، دیگر رشتہ داروں کی توقیر وعزت تو درکنار وہ اس حالت میں اول بول بکنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اور وہ زبان سے وہ کچھ کہہ دیتا ہے کہ حالتِ اعتدال میں محض اس کے تصور سے اسے خود اپنی ذات سے گھن اور نفرت ہونے لگے ، اگر وہ شادی شدہ ہوتا ہے تو پھر اس کی عائلی زندگی بھی توڑ پھوڑ اور افراتفری کا شکار ہوجاتی ہے ، جس سے دونوں کی قربتیں دوریوں سے بدل جاتی ہیں ، آپس میں محبت والفت ، غمگساری وغم خواری اور ایثار وہمدردی کے بجائے ان کے مابین بغض ، کینہ اور حسد جیسے امراض جنم لینے لگتے ہیں ، بیوی کو نہ صرف شوہر کی طرف سے زبانی تکلیف واذیت کو سہنا پڑتا ہے ؛ بلکہ اسے جسمانی اذیت کا بھی سامنا ہوتا ہے ؛ پھر یہ آپسی نوک جھونک کا سلسلہ کچھ اور دراز ہوجاتا ہے تو پھر نوبت طلاق تک کی آجاتی ہے ؛ پھر یہاں سے ایک لا محدود اور غیر متناہی مفاسد کا تانتا لگ جاتا ہے ، عورت کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے ، اسے بیوگی اور کسمپرسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، بچے والدین کے جیتے جی یتیمی کے تلخ گھونٹ پینے پر مجبور ہوجاتے ہیں ، وہ گردش زمانہ اور حالات کی رو میں بہہ کر گداگری اور کاسہ ء لیسی پر مجبور ہوجاتے ہیں ، پھر جب یہ بڑے ہوتے ہیں تو والدین کی اصلاح وتربیت کے فقدان اور عدم رہبری کی وجہ سے چوری ، ڈکیتی ، بدکاری ، شراب خوری اور قمار بازی جیسے بھیانک جرائم میں ملوث ہوجاتے ہیں ، پھر چونکہ یہ بھی معاشرہ کے ایک فرد ہی کی حیثیت رکھتے ہیں ، ان کی ان حیاء سوز حرکات کا اثر بالواسطہ پوری سوسائٹی پر ہوتا

ہے ، اس لئے اگر ملک میں در پیش ہونے والے طلاق کی واردات کا اور دیگر جرائم کا حقیقت پسندی اور باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح اور آشکارا ہو جائے گی کہ چالیس فیصد واقعات کا تعلق شرابیوں سے ہوتا ہے، جس کا اندازہ ہر منصف مزاج اور معاشرے کے احوال سے باخبر شخص اپنے ارد گرد کے احوال کا جائزہ لے کر لگا سکتا ہے، پھر اسے حضور اکرم ﷺ کے حقیقی احوال پر مبنی کلام کے تعلق سے کوئی شک وشبہ نہیں رہ جائے گا کہ شراب فواحش اور بے حیائی کی جڑ ہے اور سب سے بڑا گناہ ہے۔

اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: " شراب ام الخبائث اور تمام برائیوں کی جڑ ہے ،، جو شخص شراب پیتا ہے اس کی چالیس روز کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں، اگر وہ اپنے پیٹ میں شراب لے کر مرتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے شراب کی حرمت اور اس کی برائی اور قباحت کا ذکر، کرتے ہوئے فرمایا: شراب سے بچو، وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اگلے دور میں ایک شخص تھا جو کہ عبادت میں مشغول رہتا تھا اس کو ایک زناکار عورت نے پھنسانا چاہا چنانچہ (سازش کرکے) اس کے پاس ایک باندی کو بھیجا اور اس سے کہلوایا کہ میں تجھ کو گواہی کے واسطے بلا رہی ہوں چنانچہ وہ شخص چل دیا۔ اس باندی نے مکان کے ہر ایک دروازہ کو جس وقت وہ اس کے اندر داخل ہوتا بند کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ (عبادت گزار شخص)

ایک عورت کے پاس پہنچا جو کہ حسین و جمیل تھی اور اس کے پاس ایک لڑکا تھا اور ایک شراب کا برتن تھا۔ اس عورت نے کہا اللہ کی قسم! میں نے تجھ کو شہادت کے واسطے نہیں بلایا؛ لیکن اس لئے بلایا ہے کہ تو مجھ سے ہم بستری کرے یا اس شراب کا ایک جام پی لے چنانچہ اس عورت نے اس شخص کو ایک گلاس شراب کا پلا دیا۔ اس شخص نے کہا مجھ کو اور (زیادہ شراب) دے پھر وہ شخص وہاں سے اس وقت تک نہیں ہٹا کہ اس عورت سے صحبت کی اور اس لڑکے کا خون کیا، تو تم لوگ شراب سے بچو کیونکہ اللہ کی قسم ایمان اور شراب کا ہمیشہ پینا دونوں ساتھ نہیں ہوتے یہاں تک کہ ایک دوسرے کو نکال دیتا ہے۔ ایمان کے غلبہ کی برکت مطلب یہ ہے کہ اگر ایمان کا غلبہ ہوتا ہے تو شراب نوشی کی عادت چھوٹ جائے گی اور اگر شراب نہ چھوڑی تو ایمان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

اچھا لباس آپ کی پہچان

لباس ایسا پہنو جو شرم و حیا، غیرت و شرافت اور جسم کی ستر پوشی اور حفاظت کے تقاضوں کو پورا کرے اور جس سے تہذیب و سلیقہ اور زینت و جمال کا اظہار ہو۔قرآن پاک میں اللہ تعالٰی نے اپنی اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔اے اولاد آدم۔ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے زینت اور حفاظت کا ذریعہ بھی ہو۔ریش دراصل پرندے کے پروں کو کہتے ہیں، پرندے کے پر اس کے حسن و جمال کا بھی ذریعہ ہیں اور جسم کی حفاظت کا بھی۔عام استعمال میں ریش کا لفظ جمال وزینت اور عمدہ لباس کیلئے بولا جاتا ہے۔لباس کا مقصد زینت و آرائش اور موسمی اثرات سے حفاظت بھی ہے لیکن اولین مقصد قابل شرم حصوں کی ستر پوشی ہے۔اللہ نے شرم و حیا انسان کی فطرت میں پیدا فرمائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ سلام اور حضرت حوا علیہ اسلام سے جنت کا لباس فاخرہ اتروا لیا گیا تو وہ جنت کے درختوں کے پتوں سے اپنے جسموں کو ڈھانپنے لگے۔اس لئے لباس میں اس مقصد کو سب سے مقدم سمجھے اور ایسا لباس منتخب کیجئے جس سے ستر پوشی کا مقصد بخوبی پورا ہوسکے۔ساتھ ہی اس کا بھی خیال رہے کہ لباس موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کرنے والا بھی ہو اور ایسے سلیقے

کا لباس ہو جو زینت و جمال اور تہذیب کا ذریعہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اسے پہن کر آپ کوئی عجوبہ یا کھلونا بن جائیں اور لوگوں کیلئے ہنسی اور دل لگی کا موضوع مہیا ہو جائے۔ لباس ہمیشہ اپنی وسعت اور حیثیت کے مطابق پہنئے، نہ ایسا پہنئیے جس سے فخر و نمائش کا اظہار ہو اور آپ دوسروں کو حقیر سمجھ کر اترائیں اور اپنی دولت مندی کی بے جا نمائش کریں اور نہ ایسا لباس پہنیں جو آپ کی وسعت سے زیادہ قیمتی ہو۔ آپ فضول خرچی کے گناہ میں بھی مبتلا ہوں، اور نہ ایسے شکستہ حال بنے رہیں کہ ہر وقت آپ کی صورت سوال بنی رہے اور سب کچھ ہونے کے باوجود آپ محروم نظر آئیں۔ بلکہ ہمیشہ اپنی وسعت و حیثیت کے لحاظ سے موزوں باسلیقہ اور صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آئیں۔ بعض لوگ پھٹے پرانے کپڑے اور پیوند لگے کپڑے پہن کر شکستہ حال بنے رہتے ہیں اور اس کو دین داری سمجھتے ہیں اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ان لوگوں کو دنیا دار سمجھتے ہیں جو صاف ستھرے سلیقے والے کپڑے پہنتے ہیں، حالانکہ دین داری کا یہ تصور سراسر غلط ہے۔ دراصل دین داری کا انحصار نہ پھٹے پرانے پیوند لگے گھٹیا کپڑے پہننے پر ہے اور نہ لباس فاخرہ پر، دین دار کا دارومدار آمدی کی نیت اور فکر پر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی ہر معاملہ میں اپنی وسعت اور حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے اعتدال اور توازن کی روش رکھے نہ شکستہ صورت بنا کر نفس کو موٹا ہونے کا موقع دے اور نہ زرق برق لباس پہن کر فخر و غرور دکھائے ہے دوسری مخلوقات اس سے محروم ہیں۔ اس امتیازی بخشش و انعام پر اللہ کا شکر ادا کیجئے اور اس

امتیازی انعام سے سرفراز ہو کر کبھی اللہ کی ناشکری اور نافرمانی کا عمل نہ کیجئے۔ لباس اللہ کی ایک زبردست نشانی ہے۔ لباس پہنیں تو اس احساس کو تازہ کیجئے اور جذبات کا شکر کا اظہار اس دعا کے الفاظ میں کیجئے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سکھائی ہے۔ بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ تقویٰ کے لباس سے باطنی پاکیزگی بھی مراد ہے اور ظاہری پرہیزگاری کا لباس بھی۔ یعنی ایسا لباس پہنیئے جو شریعت کی نظر میں پرہیز گاروں کا لباس ہو۔ جس سے تکبر و غرور کا اظہار نہ ہو، جو نہ عورتوں کیلئے مردوں سے مشابہت کا ذریعہ ہو اور نہ مردوں کیلئے عورتوں سے مشابہت کا۔ ایسا لباس پہنیئے جس کو دیکھ کر محسوس کیا جاسکے کہ لباس پہننے والا کوئی خداترس اور بھلا انسان ہے اور عورتیں لباس میں ان حدود کا لحاظ کریں جو شریعت نے ان کیلئے مقرر کی ہیں اور مردان حدود کا لحاظ کریں جو شریعت نے ان کیلئے مقرر کی ہیں۔ نیا لباس پہنیں تو کپڑے کا نام لیکر خوشی کا اظہار کیجئے کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے یہ کپڑا عنایت فرمایا اور شکر کے جذبات سے سرشار ہو کر نیا لباس پہننے کی وہ دعا پڑھیئے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا، عمامہ، کرتا یا چادر پہنتے تو اس کا نام لیکر فرماتے۔ یااللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے یہ لباس پہنایا۔ میں تجھ سے اس کے خیر کا خواہاں ہوں اور میں اپنے آپ کو تیری پناہ میں دیتا ہوں، اس لباس کی برائی سے اور اس برے پہلو سے جس کیلئے یہ بنایا گیا ہے۔ دعا کا مطلب یہ ہے کہ

یااللہ تو مجھے توفیق دے کہ میں تیرا بخشا ہوا لباس انہی مقاصد کیلئے استعمال کروں جو تیرے نزدیک پاکیزہ مقاصد ہیں۔ مجھے توفیق دے کہ میں اس سے اپنی ستر پوشی کر سکوں اور بے شرمی، بے حیائی کی باتوں سے اپنے ظاہر و باطن کو محفوظ رکھ سکوں اور شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے میں اس کے ذریعہ اپنے جسم کی حفاظت کر سکوں اور اس کو زینت و جمال کا ذریعہ بنا سکوں۔ کپڑے پہن کر نہ تو دوسروں پر اپنی بڑائی جتاؤں، نہ غرور اور تکبر کروں اور نہ تیری اس نعمت کو استعمال کرنے میں شریعت کی ان حدود کو توڑوں جو تو نے اپنے بندوں اور بندیوں کیلئے مقرر فرمائی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص نئے کپڑے پہنے اگر وہ گنجائش رکھتا ہو تو اپنے پرانے کپڑے کسی غریب کو خیرات میں دے دے اور نئے کپڑے پہنتے وقت یہ دعا پڑھے۔ ساری تعریف و حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے یہ کپڑے پہنائے جس سے میں اپنی ستر پوشی کرتا ہوں اور جو اس زندگی میں میرے حسن و جمال کا بھی ذریعہ ہے۔ جو شخص بھی نیا لباس پہنتے وقت یہ دعا پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کو زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھے گا۔

لباس سفید پہنئے، سفید لباس مردوں کیلئے پسندیدہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سفید کپڑے پہنا کرو، یہ بہترین لباس ہے، سفید کپڑا ہی زندگی میں پہننا چاہئیے، اور سفید کپڑے میں مردوں کو دفن کرنا چاہئیے۔ ایک اور موقع پر آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ سفید کپڑا پہنا کرو سفید کپڑا زیادہ صاف ستھرا ہوتا ہے، اور اسی میں اپنے مردوں کو دفنایا کرو۔زیادہ صاف ستھرا رہنے سے مراد یہ ہے کہ اگر اس پر ذرا سا داغ دھبہ بھی لگے تو فورا محسوس ہو جائے گا، اور آدمی فورا دھو کر صاف کر لے گا اور اگر کوئی رنگین کپڑا ہو گا تو اس پر داغ دھبہ جلد نظر نہ آ سکے گا اور جلد دھونے کی طرف متوجہ نہ ہو سکے گا، حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفید لباس پہنا کرتے تھے،یعنی آپ نے خود بھی سفید لباس پسند کیا اور امت کے مردوں کو بھی اسکی ترغیب دی۔

گنواں دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

گنواں دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا نے زمین پر آسمان سے ہم کو دے مارا

تاریخ گواہ ہے کہ ظہور اسلام سے قبل جہاں انسان میں بہت ساری برائیاں تھیں،ان میں سب سے نمایاں اور شرمناک بات یہ تھی کہ عورت کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا۔وہ صرف ایک زر خرید لونڈی یا خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کا زریعہ سمجھی جاتی تھیں، معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہ تھا اس کو سرے عام بازار میں نیلام کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ لڑکی کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا،اور اسے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔مختلف قبائل میں مختلف رواج تھے، بعض قبیلوں میں کسی بھی عورت کے شوہر کے مرنے کے بعد اس کا سب سے بڑا حقیقی بیٹا ہی اپنی ماں سے نکاح کا حق رکھتا تھا، بعض قبیلوں میں ایک ہی عورت مشترکہ طور پر کئی مردوں کی بیوی ہوتی تھی، بعض قبیلوں میں شوہر کے مرنے کے بعد اسی مرد کی چتا میں اس کی بیوی کو زندہ جلایا جاتا تھا، جسے ستی کہتے ہیں،اگر کوئی عورت بیوہ ہو گئی تو اسے چار ماہ تک ایک بند کوٹھری میں رکھا جاتا تھا،اس عورت کی صورت دیکھنا منحوس سمجھا جاتا تھا،اور پھر عدت کے دن پورے ہونے کے بعد اسے اونٹ کی مینگنیاں لگا کر سارے شہر کا چکر لگوایا جاتا تھا،اس

طرح عورت کو ہر طرح ذلیل وخوار کیا جاتا تھا، لیکن جب پیغمبر آخر الزماں دنیا میں رونق افروز ہوئے اور آپ ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے عورت کی اصلاح کی جانب خاص توجہ مبذول فرمائی اور عورت کو دنیا کے سامنے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کر کے معاشرے میں اعلیٰ مقام عطا کیا عورتوں کو امہات المومنین، صحابیات جیسے خطابات سے نوازا، خصوصا عورت کو ماں کا، درجہ دے کر فرمایا کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں مردوں کیساتھ ساتھ عورتوں کا بھی واضح طور پر ذکر فرمایا، اور مردوں کے برابر عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں ارشاد فرمایا، اور فرمایا کہ تمہاری اولاد میں ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، جب کہ ظہور اسلام سے قبل عورت کا وراثت میں کوئی حصہ نہ تھا، آج بھی دیگر مذاہب میں عورت کا وراثت میں حصہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ فلاں عورت جہیز کی بھینٹ چڑھا کر نذر آتش کر دی گئی، اسی طرح اسلام سے پہلے شادی وطلاق کا کوئی ضابطہ نہ تھا، اس لئے معاشرے میں انتشار اور بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اسلام میں ایک مرد کو صرف چار شادیوں کی اجازت دی، قرآن پاک میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اگر سب کے ساتھ مساوات نہ کر سکو تو ایک سے زیادہ شادی مت کرو۔ (النساء)، اسی طرح اسلام میں شوہر کے مرنے کے بعد بیواؤں کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی کی مرضی کو لازمی قرار دیا گیا، عورت کو اپنی مرضی سے مرد سے خلع لینے کی اجازت دی گئی، اسلام

میں ہر مرد پر اس کی عورت کا مہر واجب کر دیا گیا،اگرچہ اسلام میں عورت کو پردے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن وہیں بوقت ضرورت عورت کو پردے کے ساتھ گھر سے نکلنے کی اجازت بھی دی گئی،جہاں پر عورت پر مرد کے حقوق ہیں،اسی طرح مرد پر بھی عورت کے حقوق ہیں، جیسے مرد جو کھائے ، عورت کو بھی ویسا ہی کھلائے ، مرد جو پہنے ویسے ہی عورت کو بھی پہنائے ، عورت کیساتھ حسن سلوک سے پیش آئے، عورت کی تمام ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی،جس طرح مرد گھر کا حاکم ہے،اسی طرح عورت بھی اپنے گھر کی ملکہ ہے، گھر میں جو عزت مرد کو حاصل ہے وہی حیثیت عورت کو بھی حاصل ہے، تعلیم کے سلسلے میں حدیث مبارکہ ہے کہ دینی تعلیم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے،یعنی مرد اور عورت (دونوں) کو یکساں فرض قرار دیا گیا،اسی طرح نیک سیرت عورت جس کا شوہر اس سے راضی ہو،اور اس نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کیا اور گھر کو جنت کا نمونہ بنایا اس عورت کے لئے جنت کی بشارت دی گئی، غرض یہ کہ عزت و شرف صرف اسلام ہی میں عورت کو حاصل ہے،اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے عورت کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچایا۔مگر افسوس صد افسوس عورت، آج اپنے اسلام کو بھلا کر مغربی تہذیب کو اپنا کر بلندی سے پستی کی جانب رواں دواں ہے۔

تعلقات کا تقدس برقرار رکھیں

انسان طبعی اور فطری طور پر اختلاط پسند واقع ہوا ہے، یہ میل جول اور کنبہ وبرادری اور عائلی ومعاشرتی زندگی کا عادی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے ''معاشرتی حیوان'' بھی کہا جاتا ہے، یہ معاشرے اور کنبے وخاندان سے کٹ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا، انسان کو اس کی پیدائش سے لے کر اس کی زندگی کے آخری لمحات تک مختلف طریقے سے تعلقات اور رشتہ داریوں سے واسطہ پڑتا ہے، جب وہ بچپن میں اپنی شعور کی آنکھیں کھولتا ہے تو اپنے آپ کو جان نثار ماں، شفیق باپ اور مہربان بہنوں کے جھرمٹ میں پاتا ہے، پھر انہیں ماں باپ اور بھائی بہنوں کے رشتے سے اسے بے شمار رشتہ داریوں، تعلقات وبرادریوں سے نسبت ہوجاتی ہے، پھر جب وہ سن بلوغ کو پہنچ کر خود صاحبِ اہل وعیال ہوجاتا ہے تو یہاں سے رشتہ داریوں کی ایک مزید شاہراہ کھل جاتی ہے، پھر جب وہ اپنی اولاد کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیتا ہے تو یہاں سے تعلقات اور رشتہ داری کا ایک اور در وا ہوجاتا ہے، پھر اس کی اسلام کی نسبت پر بمصداق اس حدیث کے '' ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے'' اخوتِ اسلامی کی یہ کڑی اسے تمام مسلمانانِ عالم کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ پھر اس کے کاروباری وتجارتی تعلقات اور پاس پڑوس اور دوستیوں کا ایک

وسیع وعریض سلسلہ ہے، الغرض انسان کو اس کی زندگی میں مختلف طریقے سے تعلقات اور قرابتوں سے واسطہ پڑتا ہے، وہ ان تعلقات اور رشتہ داریوں کو کیسے نبھائے، ان متعلقین کے حقوق کی ادائیگی کیسے کرے، ان قرابت داروں اور رشتہ داریوں میں آنے والے بگاڑ اور خراب کا خاتمہ کیسے کرے؟ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان اس دنیا میں فرشتہ بنا کر نہیں بھیجا گیا، اللہ عزوجل نے اس میں خیر وشر ہر دو طرح کے مادے اس میں ودیعت کر رکھے ہیں، نفس وشیطان، خود اس کے خواہشات ولذات کا لا متناہی سلسلہ بھی اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے، وہ کبھی اپنی نفسانی خواہشات، دنیاوی اغراض، مال ومتاع کی اندھی ہوس اور اپنی زندگی کو آرام دہ اور پر سکون بنانے کے لئے دوسروں پر ظلم وزیادتی پر اتر آتا ہے، دوسروں کے اموال پر ناجائز قبضہ کے ذریعے اس کو زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ظلم وزیادتی اس کے تعلقات کے بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے، یا دوسرے کی ترقی، اس کی کامیاب زندگی اسے بغض وحسد کی آگ میں جلا کر آپسی تعلقات اور رشتہ داریوں کو اس کے راکھ تلے بھسم کردیتی ہے، یہی سے لڑائی جھگڑے، توڑ، پھوڑ، خون خرابی، دنگے فساد کے دروازے کھل جاتے ہیں۔آج بھی یہی کچھ صورتحال ہمارے معاشرے میں دیکھنے کو مل رہی ہے،۔برق رفتار مادی ترقی، تعیش وآرام کے وسیع وسائل وامکانات اور اس کے حصول کی اندھادھند تگ ودو نے انسان کو ایک دوسرے سے دست وگریباں کردیا ہے، جس کی وجہ سے ہر سطح پر گھریلو تعلقات ملکی تعلقات اور بین الاقوامی تعلقات دھماکو صورتحال،

اختیار کرتے جارہے ہیں، رشتہ کا تقدس پامال ہوا جارہا ہے، اولاد ماں باپ کو ''اولڈ ایج ہوم'' کے حوالے کر رہی ہے، میاں بیوی کے رشتہ میں خلوص اور پیار نہیں رہا، یہ سچ ہے کہ انسان کی یہ آپس کی یہ آویزش وٹکراؤ اور تعلقات کا بگاڑ ابتدا ہی سے چلا آرہا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کا مختصر خاندان جو کہ ان کی اہلیہ حوااور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں پر مشتمل تھا، وہاں پر بھی ایک بھائی قابیل نے ہابیل پر زیادتی کی اور اسے قتل کردیا۔ارشاد باری عزوجل ہے ''آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا تو اس نے اسے مار ڈالا اور نقصان اٹھانے والوں میں (شامل) ہو گیا۔'' (المائدہ: 30) یہ انسانی زندگی کا سب سے پہلا ناحق قتل اور تعلقات کا بگاڑ تھا، انسان کی اسی سرشت وفطرت کی وجہ سے جب اللہ عزوجل نے انسان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو'' فرشتے کہنے لگے: کیا آپ پیدا کریں گے، زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے، اس میں اور خون ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں، بحمد اللہ، تقدیس کرتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے'' (البقرہ: 30)، یہاں پر تحقیق طلب امر یہ ہے کہ کیا انسان کو فطری طور پر جھگڑالو کہہ کر اس کی لڑائی کو مزید ہوادی جائے گی اور اس کے خراب وبگاڑ کی خلیج کو مزید وسعت دی جائے گی؟ چونکہ تعلقات کا بگاڑ، آپس کی نفرت ودشمنی یہ شعلہ زن آگ کے مانند ہوتی ہے، کیا آگ کو اس کی شدت اور حدت کی حالت میں بغیر

بجھائے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ہر چیز کو خاکستر اور ملیامیٹ کردے ؟ نہیں ، بلکہ ایسے وقت سارا معاشرہ ایک باہم یک دست وبازو ہو کر اس آگ کو بجھانے کے لئے لگ جاتا ہے ، ایسا بھی نہیں ہوتا کہ چند مخصوص لوگ ہی اس کو بجھانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں ، خواہ کسی بھی ایک گھر یا چند گھروں کو آگ لگ جائے تو سارا معاشرہ اور ساری بستی مل کر اس کو بجھانے لگ جاتی ہے ، اس طرح اس آگ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ لڑائی جھگڑے ، تعلقات کا بگاڑ ، رشتہ داریوں کی پامالی ، دنگا وفساد یہ بھی ایک طرح کی آگ ہے جو عمارتوں ، پتھروں کو خاکستر نہیں کرتی ، ساز وسامان ، لکڑیاں ، تختے وغیرہ اس کے لقمے نہیں بنتے ؛ بلکہ یہ آگ دلوں اور ضمیر انسانی کو کھاجاتی ہے ، یہ انسانی قلب میں موجود محبت ، خیر خواہی وہمدردی کے جذبات کو ملیامیٹ کر دیتی ہے ، معاشرے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس آگ کو بجھانے کے لئے ایک ہوجائیں۔ اس لئے سارے معاشرے کی ذمہ داری ہے اگر معاشرے میں کہیں بھی کسی بھی قسم کا بگاڑ پیدا ہوجائے تو وہ یک بازو ہو کر اس فساد وبگاڑ کو دور کریں ، اگر اس قسم کا بگاڑ شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے، تو زوجین کے رشتہ داروں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ معاملے کو طلاق تک پہنچنے سے پہلے ہی خوشگوار ماحول میں اس مسئلہ سے نمٹا جائے۔ ارشاد باری تعالی ہے، کہ اگر تمہیں میاں بیوی میں کھٹ پٹ کا اندیشہ ہو تو ایک شخص مرد کے کنبے میں سے مقرر کرو اور ایک شخص عورت کے کنبے میں سے۔ اگر دونوں اشخاص کی نیت اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ میاں

بیوی میں باہم رضامندی کرادے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب سے بڑے علم والے اور بڑے خبر دینے والے ہیں۔" یہاں پر حکم ہے کہ میاں بیوی کے درمیان تعلقات کے بگاڑ اور خراب کی صورت میں خاندان اور معاشرے کے ذمہ دار لوگوں کو حکم اور ثالثی کا رول ادا کرتے ہوئے، اس فساد اور بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔اور جب دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوجائے تو اس سلسلے میں حکم ربانی ہے۔" اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑپڑیں تو انکے درمیان اصلاح کرادو پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہوجائے، پھر اگر رجوع ہوجائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کرادو اور انصاف کا خیال رکھو بیشک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے، مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے" (الحجرات 10-9)،قرآن کریم نے یہاں دو مسلمانوں کے درمیان آپسی جھگڑے کی ایک صورت پیش کی ہے اور بتلایا ہے کہ اگر اتفاق سے مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑپڑیں تو پوری کوشش کرو کہ اختلاف رفع ہوجائے،اس میں اگر کامیابی نہ ہو اور کوئی فریق دوسرے فریق پر چڑھ جائے اور ظلم وزیادتی پر کمر کس لے تو یکسو ہو کر نہ بیٹھے رہو؛ بلکہ جس کسی کی زیادتی ہو سب مسلمان اور پورا معاشرہ مل کر اس سے لڑائی کرے، یہاں تک کہ وہ فریق مجبور ہو کر اپنی زیادتیوں سے باز آجائے، اور خدا کے حکم کی طرف

رجوع کرکے صلح صفائی کے لئے آمادہ ہوجائے ، اس وقت چاہئے کہ مسلمان دونوں فریقوں کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ صلح و میل ملاپ کرادیں ، کسی ایک کی طرف داری میں جادہ حق سے نہ پھر جائیں ، اس مصالحانہ کوشش کے درمیان یہ بات ملحوظ رہے کہ زوجین کی صلح صفائی کے دوران بات خاندان سے باہر نہ جانے پائے ، اسی طرح مسلمانوں کے درمیان آپسی صلح و صفائی کے دوران غیر مسلموں سے مدد نہ لی جائے۔ غرضیکہ اسلام آپسی تعلقات کے بگڑنے کی صورت میں اصلاح ذات البین کا حکم کرتا ہے کہ آپس میں صلح صفائی سے کام لیا جائے ، اس طرح آپسی خلش اور خلیج کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے ، قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں تعلقات کے بگاڑ کو دور کرنے کا حکم دیا ہے۔اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے ’’ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو‘‘ (الانفال : 1) اس آیت کریمہ میں تعلقات کی اصلاح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ : آپس میں مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں خدا سے ڈریں ، آپس میں صلح و صفائی برقرار رکھیں ، ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا نہ ڈالیں ، اپنی آراء وجذبات کی رو میں نہ بہہ جائیں ، اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانیں ، جب خدا اور رسول کا نام آجائے تو ہیبت وخوف کا یہ عالم ہو کہ ایمان ویقین اس قدر مضبوط ہوجائے کہ ہر معاملہ میں ان کا اصلی بھروسہ اور اعتماد اللہ کے سوا کسی پر نہ رہے۔ جس طرح معاشرہ میں آگ بھڑک اٹھنے پر اس کو بجھانے کے لئے فائر بریگیڈ عملہ ، فائر انجن گاڑیاں ہمہ وقت

تیار رہتی ہیں، اس سے بڑھ کر اس بات کی ضرورت ہے کہ تعلقات کے بگاڑ اور خراب کی اس آگ کے شرارے قبل اس کے کہ خاندان، کنبہ، برادریوں، ایمانی و اسلامی اخوتوں کو جلا کر خاکستر کردیں، اس کے لئے ایسے ہی رضاکار، افراد اور تنظیمیں تیار ہوں جو تعلقات کے بناؤ کا کام کریں اور اس آگ پر پوری تیاری کے ساتھ قابو پالیں۔ آج مادی ہوس نے انسان کو اس قدر اندھا، بہرا کردیا ہے کہ رشتہ داریوں اور تعلقات کی اہمیت و تقدس کا بالکل خیال نہیں رہا، ہر شخص دولتِ دنیا کے جمع کرنے اور سامانِ راحت کی تلاش و جستجو میں ماں باپ، بھائی، بہن، آل و اولاد ہر چیز کو نظر انداز کررہا ہے اور محض اپنی نفسانی و حیوانی جذبات کی تکمیل و تسکین کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلقات اور رشتہ داریوں کی اہمیت کو سمجھیں، اللہ کا ڈر خوف اپنے اندر پیدا کریں، اگر تعلقات اور رشتہ داریوں کی بے احترامی اور بے ادبی کی یہی صورتحال رہی تو وہ دن دور نہیں کہ جب ہمارا یہ مشرقی معاشرہ بھی مغرب کی طرح وصفِ انسانیت سے عاری ہو کر مشینوں کے مانند ہوجائے کہ ضرورت کی حد تک استعمال کیا جائے پھر اسے بند کرکے رکھ دیا جائے، مغرب میں انسان ایک مشین بن کر رہ گیا ہے، نہ کنبہ ہے نہ برادری ذرا سوچیں۔

عورت کا دشمن کون؟

عورت قدیم زمانہ سے ہی ایک معمہ بنی رہی ہے، تمام مذاہب نے عورتوں کے سلسلہ میں رائے زنی کی ہے اور عورتوں کو بے وقوف بنانے کی بھرپور کوششیں کی ہیں ،صرف اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے،جس نے عورتوں کو ہر چیز میں مکمل حق دیااور اسے قیمتی سرمایہ قرار دیا،اسے مرد کے لیے دلی وابستگی کا ذریعہ بنایا، نیز اس کی کفالت کی مکمل ذمہ داری مردوں پر ڈالی، بچپن سے شادی تک والد کے ذمہ، شادی کے بعد شوہر کے ذمہ اور شوہر کے بعد اولاد کے ذمہ غرض اسلام نے عورت کو کسی بھی مقام پر بے سہارا نہیں چھوڑا، بلکہ مکمل طور پر اس کی حفاظت کی البتہ اس دور کے نام نہاد محققین اور ترقی کے دل دادہ حضرات آزادی نسواں کا نعرہ لگا کر عورتوں کو بے وقوف بنانے اور دھوکہ دہی کرکے پریشان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے ہیں ،اسلام کے سلسلہ میں پروپیگنڈے پھیلا رہے ہیں کہ ''اسلام عورتوں کو قید وبند کی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے، تعلیم وتمدن سے کوسوں دور کرتا ہے اور ترقی سے روکتا ہے''،حالاں کہ اگر انصاف کے ساتھ تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ تمام مذاہب کا عورتوں کے سلسلہ میں مساوات کا دعوی محض فرضی ہے، ان کے مذہب میں فقط رسوائی ہے،ان کے یہاں عورت کی حیثیت صرف اور صرف ایک شو پیس اور خواہش

پوری کرنے کی چیز تک ہے، آیئے مختلف مذاہب کا سرسری جائزہ لیتے ہیں کہ انھوں نے عورت کے ساتھ کیا رویہ اپنایا ہے، سب سے پہلے عیسائیت کا جائزہ لیتے ہیں، ملت عیسائی کا یہ فیصلہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں ناپاک ہیں، بلکہ گناہ دونوں کے ساتھ وراثتہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، خصوصیت سے عورت کے ساتھ۔ عورت کے متعلق کتاب مقدس میں موجود ہے کہ ''عورت موت سے زیادہ تلخ ہے، جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنے آپ کو عورت سے بچائے گا ہزار آدمیوں میں، میں نے ایک کو خدا کا پیارا پایا ہے؛ مگر تمام عالم میں ایک عورت بھی ایسی نہیں پائی جو خدا کی پیاری ہو''، گویا عورت ایک ایسی گھناؤنی اور ناقابل برداشت چیز ہے، جس سے ملنا جلنا اور اس کے ساتھ زندگی گزارنا کسی بھی حال میں روا نہیں، کیوں کہ خدا کا پیار اسے حاصل نہیں اور جسے خدا کا پیار محبوب ہوگا وہ اس سے کنارہ کش رہنے ہی میں عافیت سمجھے گا، یہ تو تھا عورت کا مقام عیسائیت کی نظر میں اور یہود اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ تو ملت یہود کی مقدس کتابوں کا عورت کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ کون ہے جو ناپاک سے پاک نکالے؟ کوئی نہیں، یعنی ملت یہود کی نظر میں بھی عورت ایک ناقابل اعتنا چیز ہے؛ اس لیے کہ انسان صرف عورت کی ذات سے تباہ و برباد ہوتا ہے، کیوں کہ مقدس کتاب کی تصریح موجود ہے کہ ''انسان صرف اس وجہ سے پاک نہیں ہو سکتا، کہ وہ عورت سے پیدا ہوا ہے اور عورت ہمہ تن ناپاک ہے اور ناپاک سے پاک نہیں نکل سکتا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک وہ ذات جو اپنے بطن سے جنم دے کر،''

انسان کی زندگی پر ہمیشہ کے لیے ناپاکی کا دھبہ لگائے وہ ناقابل معافی ہے، نیز عورت ملت ہنود کی نظر میں ہندو قانون کا عورت کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ تقدیر، طوفان موت، جہنم، زہر، زہریلے سانپ ان میں سے کوئی چیز اس قدر خراب نہیں جتنی، عورت ہے، گویا ملت ہنود کا فیصلہ سب سے زیادہ سخت ہوا کہ دنیا کی بدترین اشیاء بھی عورت کی بدتری کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور دنیا کی تمام مہلک اشیاء عورت کی ہلاکت کے سامنے ہیچ ہیں؛اس لیے اجتناب ہر ذی ہوش کے لیے از حد ضروری ہے، کیوں کہ تقاضائے عافیت یہی ہے، مشرکین مکہ کا سلوک عورت کے ساتھ ان سب سے بہیمانہ تھا وہ عورت کے وجود کو بھی برداشت کرنے پر تیار نہ تھے، چنانچہ جب کسی گھر میں بچی، پیدا ہوتی تو ماں کی فطری محبت و رکاوٹ کے باوجود باپ خود اپنے ہاتھوں سے اسے زندہ درگور کردیتا اور اگر اکا دکا اتفاق سے بچ جاتی تو اس کی زندگی کو جیتے جی جہنم بنا دیا جاتا اور ان کے اپنے اوپر حقوق سمجھنا تو درکنار ان سے بات کرنا بھی گوارا نہ تھا، چنانچہ عین ایسے وقت میں جب عورت اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیلی جارہی تھی اسلام نے آکر اسے تحفظ دیا، اس کے حقوق کو بیان کیا اور جو لوگ اس کو حقیر سمجھتے تھے ان سے کہہ دیا: انا خلقنا کم من ذکر وانثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہی ہے جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو) اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مرد باعتبار خلقت اس پر فخر کرے کیوں کہ فخر کی بات تو تقوی وپرہیزگاری ہے، اس

سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے عورت کو فطری آزادی کا حق دیا اور سکون وچین عطا کیا اور دو دائرے بنا کر کہا کہ ایک میں مرد رہے اور دوسرے میں عورت ایسے دائرے جن میں رہنے سے دونوں کو ابدی سکون میسر ہو اور ان سے تجاوز کرنے میں دونوں کی تباہی و بربادی ہو ۔چنانچہ عورت کی زندگی ایک مرتبہ پھر سنبھل گئی اور دنیا نے جانا کہ عورت بھی خالق عالم کی تخلیق کا ایک بہترین نمونہ ہے ۔اس کے بھی کچھ حقوق ہیں جنھیں ادا کرنا ضروری ہے ،مگر اس دشمن کو جو اسے حقیر سے حقیر تر دیکھنے کا خوہشمند ہو کیسے گوارا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ آج پھر عورت کی زندگی اور اس کی ذات ایک معمہ بنی ہوئی ہے ۔اس کو سکون و راحت پہنچانے والے نظام اسلام کا مذاق اڑانے کی ناپاک کوشش کی جارہی ہے ؛مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ عورت خود اپنے ہاتھوں فریب کھا رہی ہے ،وہ اپنے دشمن کو نہیں پہچان پا رہی ہے ۔اسے دوست سمجھ کر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے ۔اور اپنے وجود کو برابر خطرات میں گھیرتی جا رہی ہے ۔آج بھی عورتوں کے پاس وقت ہے کہ وہ لوگوں کی افواہوں اور پروپیگنڈوں پر توجہ نہ دیں ؛بلکہ انصاف کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں ،خود ان کے سامنے رازہائے سربستہ کھل جائیں گے اور اسلام کے تئیں تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا اور دامن اسلام کے آغوش میں آکر اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگیں گی ۔آج ہزاروں مغربی و مشرقی عورتوں کی مثالیں اخبارات و رسائل میں موجود ہیں جو اسلام کے نظام عفت و عصمت سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئی ہیں ۔ اللہ تعالی تما

م عورتوں کو عقل سلیم عطا فرمائے اور انہیں سنجیدگی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ
کرنے کی توفیق دے (آمین)

ماہ شعبان المعظم وشب برات

اللہ تعالی نے اپنی کسی مصلحت اور حکمت کے تحت بعض اوقات میں تقدس اور عظمت کا پہلو رکھ کر بندوں کے دلوں میں ان اوقات کی طرف رغبت اور میلان پیدا کر دیا ہے۔ جیسے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک کا مہینہ ہے کہ اپنے کلام کے نزول اور روزوں وتراویح کے لئے مخصوص کرکے بندوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دی کہ حتی المقدور وہ اس مقدس مہینہ کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں اور اس کے تقدس و عظمت کو یوں رائیگاں نہ جانے دیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ عبادت کرکے اللہ کے نیک بندوں میں اپنے آپ کو شامل کریں۔ ہفتے کے ساتوں دن اللہ کے یہاں برابر ہیں لیکن ان میں ایک دن جمعہ کے لئے مخصوص کر دیا اور اس نماز جمعہ کی وجہ سے اس دن کو باقی دنوں سے افضل بنا دیا۔ بندگان خدا اس دن کا آغاز بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ضروری سے ضروری دنیاوی مشاغل چھوڑ کر نہا دھو کر اچھے لباس میں ملبوس ہو کر اللہ کے گھر (مسجد) پہنچ کر با جماعت جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ یہی حال شب برات کا ہے۔ جو شعبان المعظم کی پندرھویں شب کہلاتی ہے اور جو بے شمار فضیلت و عظمت کی حامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماہ شعبان المعظم کی آمد سے ہی اہل ایمان کے قلوب میں ہلچل پیدا ہونے لگتی ہے۔ اہل اسلام کے مرجھائے دل کھلنے لگتے ہیں۔ انکے دلوں میں خوف خدا پیدا اور آنکھوں سے ندامت کے آنسو

بہنے لگتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس کے بعد نزول قرآن والا مہینہ ' خیر و برکت اور عظمت و رفعت والا مہینہ رمضان المبارک پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ فگن ہو نے والا ہوتا ہے۔ گویا کہ ماہ رمضان کے قریب ہونے کی وجہ سے شعبان کا مہینہ پورے طور پر نہایت ہی عظمت کا حامل ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شعبان المعظم میں ہی رمضان المبارک کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ کا مہینہ ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان میں آپ ﷺ کی عبادات میں اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ رمضان کے بعد سب سے زیادہ شعبان میں ہی آپ ﷺ روزے رکھتے۔ حضرت عطاء بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان سے زیادہ کسی اور مہینہ میں روزے نہیں رکھتے۔ اس ماہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ روزے رکھنے کی چند وجہیں ہیں۔ جن میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مہینے میں مرنے والوں کی موت لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ ہر روز رات کے اعمال نماز فجر کے بعد اور دن کے اعمال نماز عصر کے بعد اور ہفتہ کے اعمال دو شنبہ یعنی سوموار کو اور جمعرات کو بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں لیکن پورے سال کے اعمال شب برا ت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آنحضور ﷺ ہر مہینہ میں تین روزے رکھا کرتے تھے۔ بسا اوقات کسی وجہ سے وہ روزے چھوٹ جاتے تو سب کو اکٹھا کر کے شعبان میں رکھ لیتے تھے۔ حضرت اسامہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ شعبان کا مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان ہے۔ لوگ اس ماہ کی فضیلت سے غافل ہیں جب کہ اس ماہ میں بندوں کے اعمال بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال پیش ہوں اس حال میں کہ میں روزہ دار رہوں۔ اسی ماہ شعبان المعظم کی پندرھویں شب، شب برات کہلاتی ہے۔ (یعنی چھٹکارہ کی رات) شب برات کی حقیقت کیا ہے۔ شب برات صرف اور صرف عبادت کی رات ہے۔ اللہ کے حضور اپنے گناہوں پر نادم ہو کر سچے دل سے توبہ واستغفار کرنے کی رات ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنے بستر پر) نہ پایا تو میں تلاش میں نکلی۔ آپ ﷺ جنت البقیع (قبرستان) میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میرے پاس حضرت جبرئیل تشریف لائے اور فرمایا کہ آج نصف شعبان کی رات ہے اس رات میں، اللہ تعالیٰ قبیلہ نبو کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے زیادہ لوگوں کی مغفرت کرے گا مگر چند لوگ اس مغفرت سے محروم رہیں گے۔ مشرک، کنبہ پرور، قطع رحمی کرنے والا، اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ شراب پینے والا (ابن ماجہ) راشد بن سعیدؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ چار راتوں میں ہر قسم کے احسانات کے دروازے کھول دیتا ہے اور یہ دروازے اذان فجر تک کھلے رہتے ہیں۔ وہ چار راتیں ہیں۔ (1) عید کی رات۔ (2) بقر عید کی رات۔ (3) شب برات۔ جس میں سب کی عمریں اور سب کے رزق نیز جن کو حج نصیب ہوگا ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ (4) شب عرفہ یعنی نویں ذوالحجہ کی رات۔ شب برات بہت ہی بابرکت

رات ہے۔ اس رات میں خوشنودی الٰہی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عبادات۔ خوب خوب توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس رات میں باری تعالیٰ کے انعامات اور اس کی رحمتوں کی بے پناہ بارش ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی رحمتوں سے فیضیاب ہونے کے لئے پوری مستعدی، حضور قلب اور اخلاص کی سخت ضرورت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کی پندرھویں شب میں قیام کرو یعنی عبادت میں مصروف رہو اس کے دن میں روزہ رکھو۔ اس رات میں کونسا اچھا کام کیا جائے اس کی کوئی تخصیص نہیں۔ جس سے جو ہوسکے وہ کرے۔ ذکر واذکار کرے۔ قرآن شریف کی تلاوت کرے۔ یا نوافل وغیرہ پڑھے۔ علماء نے کتابوں میں لکھا ہے کہ شب برات میں جاگنا اور عبادت میں یہ رات گزارنا مستحب ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی نہیں جاگتا ہے بلکہ سو جاتا ہے تو اس کو برا نہیں کہنا چاہئے اور اس کی عظمت وشان کے خلاف نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ مستحب ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی حالت ایسی ہو کہ رات کو جاگ کر مستحب پر عمل کرنے کی صورت میں فرض چھوٹنے کا اندیشہ ہو یا خشوع وخضوع جانے کا ڈر ہو تو واقعی ایسے شخص کے لئے جاگنے سے بہتر سونا ہے۔ اس رات کا حق تو یہ ہے کہ جس سے جتنا ہوسکے مسجد میں گھر پر یا جہاں بھی مناسب سمجھے تنہا ذکر ونوافل میں مشغول ہو۔ جتنا ہوسکے نیک اعمال کرے۔ اگر پوری رات نہیں جاگ سکتا تو جتنا ہوسکے اتنا ہی جاگے۔ ایسا نہ ہو کہ پوری رات تو جاگ کر نوافل ومستحبات میں گزار لیا اور نماز

فجر جو کہ فرض ہے وہ سونے کی نذر ہو گئی۔ بلکہ اس رات گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر تم اللہ کے ساتھ تعلقات استوار کر لو اور تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی حائل نہ ہو۔ اللہ تعالی ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

بنت حوا خود کو پہچان ؟

یاد کریں اس وقت کو جب غیرت کے نام پر لڑکی زندہ در گور کر دی جاتی تھی زمانہ قدیم یا دور جہالت میں عورتوں کو نہایت حقارت سے دیکھا جاتا تھا، اور اُن کے نزدیک اس کی وقعت ایک گری پڑی چیز سے زیادہ نہ تھی یا ایک ذلیل شے جو صرف مردوں کی خواہشات کو پورا کرنے یا جسمانی لذت کو حاصل کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے،اور یہ صرف مردوں کی غلام بن کر زندگی گزارنے پر ہی مجبور رہے گی ، یہاں تک کہ اسکو اپنا حق ملکیت سمجھ بیٹھا تھا، تو پھر ان کے حقوق پر سوچنا ہی بے معنی تھا، تیسری صدی میں تو عورت پر اس قدر ظلم ہوا کہ اسکے سارے حقوق دبا لئے گئے یعنی شادی بیاہ پر پابندی لگادی گئی اور چوتھی صدی میں یکسانیت کے نام پر عورت کو کسی پابندی کے بغیر سب پر حلال قراد دے کر اس پر ظلم کا پہاڑ توڑا گیا ، پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ماں بیٹی کی تمیز ہی ختم ہو گئی اور اس وقت کا ایرانی فرمارواں یزد گرد دوم نے اپنی ہی بیٹی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا، اور بہرام جس نے چھٹی صدی عیسوی میں ایران پر حکومت کی تھی اس نے اپنی ہی سگی بہن کو بیوی بنا لیا تھا، ہندوستان میں تو مذہب کے نام پر (ستی کی رسم) اسکے جینے کا حق ہی ختم کر دیا گیا تھا،یعنی بیوی اپنے شوہر کی موت کے بعد اسکی لاش کے ساتھ زندہ جل کر راکھ ہو جاتی

تھی، پہلی بات اب یورپ میں دیکھنے کو ملے گی جہاں ماں بیٹی کی تمیز بھی ختم ہو رہی ہے اور یہ ستی کی ظالمانہ رسم شائد اب بھی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں موجود ہو، لیکن جب شمع رسالت روشن ہوئی یعنی محسن انسانیت سرور دوجہان فخر موجودات محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو اس سسکتی بلکتی اور دم توڑتی انسانیت کو انسانوں کے حقوق سمجھائے اور عورت کو وہ مقام دیا جو اس کی سوچوں سے بھی دور تھا، جب اسکو ماں کا درجہ ملا تو اسکا مقام بھی سمجھایا اور اس کے قدموں تلے جنت بتا کر ایک نا قابل انکار حقیقت کو دنیا کے سامنے رکھا اور بہن، بیٹی اور بیوی بنا کر اس کی عزت وتکریم، اور اسکے پاکیزہ رشتوں کی اہمیت یا اس کی قدر منزلت کو اجاگر فرمایا، مگر افسوس آج خواتین اپنے مقام کو بھول کر آزادی کے جھوٹے نعروں کے پیچھے پڑ کر اپنی عزت نیلام کر رہی ہیں اور انسان نما درندوں کی ہوس کا شکار ہو رہی ہیں، دراصل عورت لفظ عربی سے ہے جسکے معنی چھپانے کے ہوتے ہیں، جب یہ نمائش پر آئی تو انجام کیا ہوگا؟ جب فطرت کے خلاف ہوگا تو بات یقینی ہے کہ نتیجہ بھی غلط نکلے گا اور انجام ذلت ورسواء شرمندگی یا ندامت، افسوس، دکھ آہ وبقا پیچھا کرے گی، جو قانونِ قدرت سے ٹکراؤ یا انحراف کا لازمی نتیجہ ہوگا، میکھائل گورباچو جو سویت یونین کا صدر تھا، نے ملک ٹوٹنے اور اپنے صدارت کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد اسلامی پردے کی اہمیت پر کتاب لکھی ہے اور اس نے عورت کی آزادی کے نام پر کئے ہوئے جرم پر اعتراف کے طور پر یوں لکھا ہے کہ سب سے پہلے لڑکی

ہونے کے بہانے اسکا دوپٹہ یا اوڑنی غائب کردی گئی (Disturb) کو کام میں خلل اور پھر اسکو تھوڑا چست رکھنے کے نام پر اس کا ڈھیلا ڈھالا لباس اتار کر اسے ٹی شرٹ، اور جینس پینٹ کی صلاح دی، اور اسے مکتبوں کی زینت کا حیلہ بنا کر یا گاہکوں کی جاذبیت کے لئے تنگ یا چست یا چھوٹے لباس (سکرٹس) پہنے پر مجبور کیا گیا، پھر آخر میں ترقی یا جدیدیت کے نام پر بے وقوف بنا کر ننگا کرکے چھوڑ دیا گیا، افسوس کس طریقے سے شرم و حیا کا جناہ نکالا گیا ہے دراصل یہ ایک جال ہے جو اس دنیا کے شہوت پرست انسان نما حیوانوں نے بچھا رکھا ہے. لیکن اس اعترافِ جرم یا اس کھیل کی حقیقت سامنے آنے کے باوجود آج کی نوجوان لڑکیاں اسی دلدل میں ترقی کے نام سے پھنس کر اپنی آبرو و عزت کا سودا کر رہی ہیں، اسلام نے نہ صرف اسکی عزت و عصمت کی حفاظت کی تعلیم دی ہے بلکہ اس کا باقاعدہ طریقہ یا نظم بھی بتایا ہے، مذہبِ اسلام میں خواتین کی قدر و منزلت یا اکرام کا اندازہ صرف حج و عمرہ کے مقدس فریضہ یا اس عمل سے لگایا جاسکتا ہے کہ دوران حج و عمرہ صفا و مروہ پر جو سعی کی جاتی ہے، اس پر سوچیں یہ کیوں ہے؟ یہ وہ ڈور تھی جو حضرت حاجرہ علیہ السلام نے اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کو روتا بلکتا دیکھ کر پانی کی تلاش میں لگائی تھی، جس کی پکار اور اسکی آہ بقا اور اسمائیل علیہ السلام کا پیاس کی شدّت سے ایڑیاں رگڑنا جس کا نتیجہ تھا رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور پانی کا چشمہ ابل پڑا تھا جو آج بھی زمزم کے نام سے جاری ہے اور دنیا بھر کے مسلمان سیراب ہو رہے ہیں اور

قیامت تک ہوتے رہیں گے ۔ حضرت حاجرہ علیہ السلام کی صفا و مروا پر ڈور بارگاہ الٰہی میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے شریعتِ اسلامی کے اہم فریضہ میں اسکو شامل کر دیا،اور مردوں کیلئے اس طرح کی ڈور کے بغیر حج یا عمرہ کو ادھورا یا نا مکمل ٹھرایا مگر عورتوں پر مزید اکرام و احسان کرتے ہوئے اسے اس ڈور سے مستثنیٰ رکھا ہے،پھر بھی اگر عورت اسلام کے اس عظیم احسان کی قدر نہ کرے اور اللہ کے احکام نبی ﷺ کی تعلیمات کو بھول کر یا نظر انداز کر کے عیش و طرب کی محفلیں سجانے یا اسکی زینت ماڈلز، مس ورلڈ یا مس یونیورس یا ریمپسٹس اور ایکٹرس وغیرہ) بننے یا لوگوں کی تسکین کا سامان مہیا کرنے میں لگ جائے تو اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا ؟اسلئے خواتین کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اپنے مقام کو جانے اور رب کائنات کی دی ہوئی ان لازوال نعمتوں کی قدر کرے اور اس دنیا کی چند روزہ رنگینی کو دیکھ کر اپنی اخروی زندگی کو برباد نہ کرے۔

بیٹیاں اللہ کی رحمت

اسلام مساوات اور عدل کی دعوت دیتا ہے۔ حق تلفی، ظلم و زیادتی اور ناانصافی اسلام کے مزاج رحم و کرم کے خلاف ہے۔ بچوں پر رحم و شفقت کے سلسلہ میں اسلام نے مرد و عورت، مذکر و مونث اور نر و مادہ میں کوئی تفریق نہیں کی، تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان مقدس پر عمل ہو۔ ''عدل کرو یہی بات تقویٰ سے نزدیک ہے۔'' نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کے درمیان عدل و مساوات کرو، تم اپنی اولاد کے درمیان عدل و مساوات کرو، تم اپنی اولاد کے درمیان عدل و مساوات اور برابری کرو۔ جب اسلام رخسار کائنات پر جگمگایا دنیا کی ہر چیز منور و تابندہ ہو گئی، کفر و شرک جہالت و بربریت، سفاکیت و درندگی کا خاتمہ ہوا، اسی بدحالی کے دور میں اس صنف نازک کا کوئی ہمدرد و غم گسار نہ تھا، ظلم و ستم کی چکی میں پس پس کر عورت کراہ رہی تھی اور نومولود کلیاں شگفتہ ہونے کی آرزو میں سپرد خاک ہو جاتی تھیں، گویا کہ بعض قبائل کے لوگ بچیوں کو زندہ ہی دفن کر دیا کرتے تھے، ان کی پیدائش ننگ و عار تھی، عزت و وقار عظمت و تقدس پر داغ تھی، ان کی پیدائش زحمت خیال کی جاتی تھی، اس اضطراب کے عالم میں خدائی آواز نے زندہ درگور ہونے سے بچالیا اور بیٹی کو عظیم نعمت قرار دے کر تصور دے دیا کہ یہ سراپا رحمت ہے زحمت نہیں ہے۔ پیارے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس

نے دو لڑکیاں پائیں اور ان کی اچھی تعلیم و تربیت کی تو وہ دونوں اسے جنت میں داخل کروائیں گی اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں تین لڑکیاں ہوں ، اس گھر میں رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اسلام نے ہر باپ کو مزاج عطا کیا ہے کہ جب بازار سے کوئی کھانے پینے کی چیز لاؤ تو پہلے لڑکی کو دو بعد میں لڑکے کو دو، کیوں کہ لڑکی کا دل نرم و نازک ہوتا ہے۔ یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کا جائزہ لیا جائے تو کوئی ایسا مذہب سوائے مذہب اسلام کے نہیں ہے، جس نے بیٹی کے بارے میں عمدہ فکر و مزاج، عزت و وقار اور ان کے ساتھ ہمدردی و غم گساری کا جذبہ دیا ہے۔ اسلام نے صرف ان کو سپرد خاک ہونے سے بچایا ہی نہیں، بلکہ رنگ و بو کی زینت قرار دے دیا اور ان کی عمدہ تعلیم و تربیت کو جنت میں جانے اور دیگر نعمتوں کے ملنے کا ذریعہ قرار دیا۔ لہٰذا بیٹیوں کی خاطر داری اور دل جوئی زیادہ کریں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے ارشاد نبوی ہے کہ جس کے گھر لڑکی پیدا ہو پھر وہ اس کو زندہ دفن نہ کرے، نہ ہی اس کو ذلیل سمجھے اور نہ ہی لڑکے کو اس پر اہمیت دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (ابو داؤد شریف) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں تو میں اور وہ قیامت کے دن اس طرح ہوں گے پھر آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر بتایا۔ (مسلم شریف) بخاری و ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جو لوگ اپنی لڑکیوں کو پیار و محبت سے پرورش کرینگے تو

وہ بچیاں بروز محشر جہنم سے دیوار بن جائیں گی۔ رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جب تم اپنے بچوں میں کوئی چیز تقسیم کرو تو لڑکیوں سے شروع کرو کیوں کہ لڑکوں کے مقابل میں لڑکیاں والدین سے زیادہ محبت کرنے والی ہوتی ہیں۔ عورت حاملہ ہونے کے بعد یہ تمنا کرے کہ لڑکا پیدا ہو اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو اس کو زحمت نہ سمجھے۔ چہرہ افسردہ نہ کرے دل کو غمزدہ نہ کرے، حسرت وافسوس کے باعث اپنی ہتھیلی نہ ملے، ناامیدی و مایوسی کا چراغ نہ جلائے، یہ کسی مسلمان عورت کے لیے مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کا شکرادا کرے کہ اس نے اس عظیم نعمت سے نواز دیا ہے اور اس کی گود بھر دی ہے، اس کے خاموش آنگن میں رنگت بھرنے والی بچی آچکی ہے جو اس کے لیے رحمت بن کر آئی ہے اپنا رزق اپنے ساتھ لے کر آئی ہے، یہ تو اللہ رب العزت کے قبضہ و قدرت میں ہے، جس کو چاہے بیٹا دے جس کو چاہے بیٹی دے۔ وہی شکم مادر میں صورت گری کا حکم دیتا ہے، اس کی قدرت میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے، اس کی عطا کردہ نعمت پر شکرادا کرے، سینے سے لگائے، اس کو پیار و محبت کی نظر سے دیکھے، اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دے تاکہ وہ سرمایہ آخرت بنے اور جنت میں جانے کا سامان فراہم ہو، اس کو زحمت خیال کرنا اور اس کی پیدائش پر غمزدہ ہو جانا ایمان کی کمزوری کی علامت ہے، جو کفار کا طریقہ کار ہوتا ہے، معاشرے میں پھیلی ہوئی ایسی بیماری ہے، جس کی کڑی دور جاہلیت سے ملتی ہے، دین اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ

کا واقعہ مشہور ہے کہ آپ ایک بار رات میں گشت لگا رہے تھے، ایک مکان کے قریب سے گزرے، جہاں ماں اور بیٹی کے درمیان کسی بات پر بحث ہو رہی تھی، حضرت عمرؓ نے سنا ماں بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں پانی ملا دو اور بیٹی انکار کرتے ہوئے جواب میں کہہ رہی ہے کہ امیر المومنینؓ نے منع فرمایا ہے۔ ماں نے کہا یہاں امیر المومنینؓ تو نہیں دیکھ رہے ہیں، بیٹی نے جواب دیا امیر المومنین تو نہیں دیکھ رہے ہیں ان کا اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ بغیر کچھ کہے گھر چلے گئے اور اپنے بیٹے عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی سے نکاح کرلو، انہوں نے پیغام بھیجا اور نکاح کر دیا، انہی کی نسل سے عمر بن عبدالعزیز جیسا عادل، دین پرور خلیفہ امت کو عطا ہوا، جس پر امت جتنا چاہے فخر کرے کم ہے۔ آج رفتہ رفتہ قدم دور جاہلیت کی جانب بڑھ رہے ہیں، بچیوں کی پیدائش ایک بار پھر زحمت خیال کی جارہی ہے، ان کی پیدائش پر خوشیوں کے بجائے سوگ منایا جاتا ہے، رنج و ملال میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ سب ایمان کی کمزوری کی علامت و نشانی ہے۔ اللہ کی قدرت پر کامل یقین رکھئے کہ جس نے اس لڑکی کو وجود بخشا ہے وہی اس کے رزق کا مالک ہے، ان کو بھی رزق دے گا اور تم کو بھی رزق دیتا ہے اور دے گا۔

شب براَت، بخشش کی رات

ماہِ شعبان کی پندرہویں رات کو شبِ براء ت کہا جاتا ہے شب کے معنی ہیں رات اور براَت کے معنی بری ہونے اور قطع تعلق کرنے کے ہیں۔ چونکہ اس رات مسلمان توبہ کرکے گناہوں سے قطع تعلق کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بے شمار مسلمان جہنم سے نجات پاتے ہیں اس لیے اس رات کو شبِ براء ت کہتے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہوا، ''قسم ہے اس روشن کتاب کی بے شک ہم نے اسے برکت والی رات میں اتارا، بے شک ہم تو رستہ دکھانے والے ہیں اس رات میں تمام حکمت کے کام فیصلے کیے جاتے ہیں''۔ (الدخان آیت 3اور 4) (کنزالایمان)،اس رات سے مراد شبِ قدر ہے یا شبِ براء ت'' (خزائن العرفان) ان آیات کی تفسیر میں حضرتِ عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور بعض دیگر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ''لیلۃ المبارک' سے پندرہ شعبان کی رات مراد ہے۔ اس رات میں زندہ رہنے والے ، فوت ہونے والے اور حج کرنے والے سب کے ناموں کی فہرست تیار کی جاتی ہے اور جس کی تعمیل میں ذرا بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس روایت کو ابن جریر، ابن منذر اور ابنِ ابی حاتم نے بھی لکھا ہے۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ مذکورہ فہرست کی تیاری کا کام لیلۃ القدر میں مکمل ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی ابتداء پندرہویں شعبان کی شب سے ہوتی ہے۔ (ماثبت من السنہ

علامہ قرطبی مالکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ ان امور کے لوح، (محفوظ سے نقل کرنے کا آغاز شبِ برآءت سے ہوتا ہے اور اختتام لیلۃ القدر میں ہوتا ہے۔ (الجامع الاحکام القرآن) یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ امور تو پہلے ہی سے لوح محفوظ میں تحریر ہیں پھر اس شب میں ان کے لکھے جانے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ امور بلاشبہ لوح محفوظ میں تحریر ہیں لیکن اس شب میں مذکورہ امور کی فہرست لوح محفوظ سے نقل کرکے ان فرشتوں کے سپرد کی جاتی ہے جن کے ذمہ یہ امور ہیں۔ حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا فرماتی ہیں، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتی ہو کہ شعبان کی پندرہویں شب میں کیا ہوتا ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرمایئے۔ ارشاد ہوا آئندہ سال میں جتنے بھی پیدا ہونے والے ہوتے ہیں وہ سب اس شب میں لکھ دیئے جاتے ہیں اور جتنے لوگ آئندہ سال مرنے والے ہوتے ہیں وہ بھی اس رات میں لکھ دیئے جاتے ہیں اور اس رات میں لوگوں کا مقررہ رزق اتارا جاتاہے۔ (مشکوٰۃ) حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ تعالٰی عنہ، فرماتے ہیں، " شعبان کی پندرہویں رات میں اللہ تعالٰی ملک الموت کو ایک فہرست دے کر حکم فرماتا ہے کہ جن جن لوگوں کے نام اس میں لکھے ہیں ان کی روحوں کو آئندہ سال مقررہ وقتوں پر قبض کرنا۔ تو اس شب میں لوگوں کے حالات یہ ہوتے ہیں کہ کوئی باغوں میں درخت لگانے کی فکر میں ہوتا ہے کوئی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے۔ کوئی کوٹھی بنگلہ بنوا رہا

ہوتا ہے حالانکہ ان کے نام مُردوں کی فہرست میں لکھے جاچکے ہوتے ہیں۔ حضرت عثمان بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک لوگوں کی زندگی منقطع کرنے کا وقت اس رات میں لکھا جاتا ہے یہاں تک کہ انسان شادی بیاہ کرتا ہے اور اس کے بچے پیدا ہوتے ہیں حالانکہ اس کا نام مُردوں کی فہرست میں لکھا جاچکا ہوتا ہے۔ (الجامع الاحکام القرآن ، شعب الایمان للبیہقی) چونکہ یہ رات گذشتہ سال کے تمام اعمال بارگاہِ الٰہی میں پیش ہونے اور آئندہ سال ملنے والی زندگی اور رزق وغیرہ کے حساب کتاب کی رات ہے اس لیے اس رات میں عبادت الٰہی میں مشغول رہنا رب کریم کی رحمتوں کے مستحق ہونے کا باعث ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی تعلیم

ہے۔شبِ برآءت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس شب میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بے شمار لوگوں کی بخشش فرما دیتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، "ایک رات میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے پاس نہ پایا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں نکلی میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت البقیع میں تشریف فرما ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں یہ خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے ساتھ زیادتی کریں گے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی

دوسری اہلیہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرہویں شب آسمانِ دنیا پر (اپنی شان کے مطابق) جلوہ گر ہوتا ہے اور قبیلہ بنو کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، مشکوٰۃ، مصنف ابنِ ابی شیبہ، شعب الایمان للبیہقی)، حضرتِ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "شعبان کی پندرہویں شب میں اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر اپنی شان کے مطابق) جلوہ گر ہوتا ہے اور اس شب میں ہر کسی کی مغفرت فرما دیتا) ہے سوائے مشرک اور بغض رکھنے والے کے''۔ (شعب الایمان للبیہقی) ارشاد باری تعالیٰ ہوا ''اے ایمان والواللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے نصیحت ہو جائے''۔ التحریم) یعنی توبہ ایسی ہونی چاہیے جس کا اثر توبہ کرنے والے کے اعمال میں ظاہر ہو اور) اس کی زندگی گناہوں سے پاک اور عبادتوں سے معمور ہو جائے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کی۔

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توبۃ النصوح کسے کہتے ہیں اشاد ہوا بندہ اپنے گناہ پر سخت نادم اور شرمسار ہو۔ پھر بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر مغفرت مانگے۔ اور گناہوں سے بچنے کا پختہ عزم کرے تو جس طرح دودھ دوبارہ تھنوں میں داخل نہیں ہو سکتا اسی طرح اس بندے سے یہ گناہ کبھی سرزد نہ ہوگا۔شبِ براء ت فرشتوں کو بعض امور دیئے جانے اور مسلمانوں کی مغفرت کی رات ہے اس کی ایک

اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ رب کریم کی رحمتوں کے نزول کی اور دعاؤں کے قبول ہونے کی رات ہے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالی عنہ، سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''جب شعبان کی پندرہویں شب آتی ہے تو اللہ تعالی کی طرف سے اعلان ہوتا ہے، ہے کوئی مغفرت کا طالب کہ اس کے گناہ بخش دوں، ہے کوئی مجھ سے مانگنے والا کہ اسے عطا کروں۔ اس وقت اللہ تعالی سے جو مانگا جائے وہ ملتا ہے۔ وہ سب کی دعا قبول فرماتا ہے سوائے بدکار عورت اور مشرک کے''۔ (شعب الایمان للبیہقی)، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ، سے روایت ہے کہ آقا و مولی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب شعبان کی پندرھویں شب ہو تو رات کو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو کیونکہ غروب آفتاب کے وقت سے ہی اللہ تعالی کی رحمت آسمان دنیا پر نازل ہوجاتی ہے اور اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے، ہے کوئی مغفرت کا طلب کرنے والا کہ میں اسے بخش دوں۔ ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں ہے کوئی مصیبت زدہ کہ میں اسے مصیبت سے نجات دوں، یہ اعلان طلوع فجر تک ہوتا رہتا ہے۔ (ابن ماجہ، شعب الایمان للبیہقی) اس حدیث پاک میں اللہ تعالی کی طرف سے مغفرت و رحمت کی ندا کا ذکر ہے اگرچہ یہ ندا ہر رات میں ہوتی ہے لیکن رات کے آخری حصے میں شبِ.براء ت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں یہ ندا غروب آفتاب ہی سے شروع ہوجاتی ہے گویا صالحین اور شبِ بیدار مومنوں کے لیے تو ہر رات شبِ.براء ت ہے مگر یہ رات خطاکاروں کے لیے رحمت و عطااور بخشش و مغفرت کی رات

ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس رات میں اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہائیں اور رب کریم سے دنیا و آخرت کی بھلائی مانگیں۔ اس شب رحمتِ خداوندی ہر پیاسے کو سیراب کر دینا چاہتی ہے اور ہر منگتے کی جھولی گوہرِ مراد سے بھر دینے پر مائل ہوتی ہے۔ شبِ براءت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی شبِ بیداری کی اور دوسروں کو بھی شبِ بیداری کی تلقین فرمائی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالیشان اوپر مذکور ہوا کہ "جب شعبان کی پندرہویں رات ہو تو شبِ بیداری کرو اور دن کو روزہ رکھو'' اس فرمان جلیل کی تعمیل میں اکابر علمائے اہلسنت اور عوام اہلسنت کا ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ رات میں شبِ بیداری کا اہتمام کرتے چلے آئے ہیں۔ نیک و متقی لوگوں کا یہ حال ہے جو ہر رات شبِ بیداری کرتے ہیں اور تمام دن اطاعتِ الٰہی میں گزارتے ہیں جب کہ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے کم نصیب ہیں جو اس مقدس رات میں فکر آخرت اور عبادت و دعا میں مشغول ہونے کی بجائے مزید لہو و لعب میں مبتلا ہو جاتے ہیں آتش بازی پٹاخے اور دیگر ناجائز امور میں مبتلا ہو کر وہ اس مبارک رات کا تقدس پامال کرتے ہیں۔ حالانکہ آتش بازی اور پٹاخے نہ صرف ان لوگوں اور ان کے بچوں کی جان کے لیے خطرہ ہیں بلکہ ارد گرد کے لوگوں کی جان کے لیے بھی خطرے کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے لوگ ''مال برباد اور گناہ لازم'' کا مصداق ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ایسے گناہ کے کاموں سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں اور بچوں کو سمجھائیں کہ ایسے لغو کاموں سے

اللہ تعالی اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوتے ہیں۔ مجدد برحق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ آتش بازی جس طرح شادیوں اور شب براءت میں رائج ہے بے شک حرام اور پورا جرم ہے کہ اس میں مال کا ضیاع ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو شیطان کے بھائی فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا، "اور فضول نہ اڑا بے شک (مال) اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں''۔ (بنی اسرائیل)

خدارا سوچو !

کرپشن جان لیوا مرض ہے جو کسی بھی ادارے کو لگ جائے تو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے،اس سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا،اور جس کسی کو بھی یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے وہ کھانا تو بھول سکتا ہے لیکن مال بنانا نہیں بھول سکتا،کچھ ایسا ہی مرض ہمارے پیارے ملک کو لگ چکا ہے،جو دن بدن میرے پیارے وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے،اور یہ مرض لگانے والے بھی گھر کے ہی بھیدی ہیں جو ملک کو دھیرے دھیرے چاٹ رہے ہیں،اور ان کا پیٹ بھرنے کا نام نہیں لیتا،یہ مرض اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اس سے کوئی بھی ادارہ محفوظ نہیں رہ سکا،اس مرض کی لپیٹ میں حکومتی اداروں کیساتھ ساتھ ہمارے ملک کے پرائیویٹ ادارے بھی آ چکے ہیں،اور یہ مرض اس قدر بڑھ چکا ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا،اب تو پاکستان کا ہر ادارہ چاہے وہ اسکول ہو،کالج ہو،ہسپتال ہو،واپڈا ہو،سوئی گیس کا محکمہ ہو،ڈاک خانہ ہو،بینک ہو،ریلوے ہو،ائیرپورٹس ہوں،یا ایک ادنی سے کلرک سے لے کر ایوان صدر ہو،اس کی لپیٹ میں سب ہی آ چکے ہیں،جس ملک کے سابق صدر پر کروڑوں ڈالر کی کرپشن ہو،جس ملک کا وزیراعظم کرپشن کے دھبے سے نہ بچ سکا ہو،جس ملک کی اپوزیشن نے بیرون ممالک میں منی لانڈرنگ کی ہو،جس ملک کے وفاقی اور صوبائی وزراء نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے ہوں

بھلا اس ملک کی عوام کو سکھ کا سانس کیسے مل سکتا ہے، میں یہ سب سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک گھر ہے اور لوٹنے والے لاکھوں کی تعداد میں پھر بھی ہمت ہے گھر بچا ہوا ہے، بات ہو رہی ہے کرپشن کی تو گزشتہ دنوں انگلینڈ میں مقیم میری ایک دوست نے مجھے ای میل کر کے بتایا کہ چند ماہ قبل اسے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم کی ضرورت تھی جو اس کے مویشیوں کے لئے چارہ لا سکے اور ان کا دودھ بھی فروخت کر سکے ۔اسی سلسلے میں اس نے اخبار میں ایک اشتہار دیا کہ اسے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لئے ملازم کی ضرورت ہے خواہش مند رجوع کریں، اشتہار چھپنے کے اگلے روز بہت سے لوگ اس کے پاس ملازمت کے سلسلے میں حاضر ہوئے اور ہر ایک نے ملازمت حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی روداد سنائی، ان میں سے ایک پاکستانی بھی تھا، جس نے بتایا کہ اس کے پاکستان میں غریب ماں باپ ہیں، اور دو بہنیں اور چھوٹے بھائی ہیں اسے کام کی اشد ضرورت ہے ،چنانچہ میں نے پاکستانی کی روداد سننے کے بعد اسے ملازمت پر رکھ لیا کہ غریب آدمی ہے اور بے روزگار بھی ، میری ماہانہ آمدن دودھ کی ایک لاکھ روپے تک تھی، جب میں نے پاکستانی ملازم کو رکھا تو اس نے مویشیوں کو خوب محنت سے چارہ دینا شروع کیا اور پہلے ہی ماہ مجھے ایک لاکھ روپے کے ساتھ پندرہ ہزار روپے اضافی مل گئے میں بہت خوش ہوئی کہ یہ بہت محنتی ہے میں نے اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا، اور وہ محنت سے اپنا کام کرتا رہا پہلے ماہ پندرہ ہزار کا منافع اگلے ماہ مزید رقم بڑھ گئی ،اور اگلے چند

مہینوں میں ہی یہ رقم ایک لاکھ سے بڑھ کر تقریبا 2 لاکھ کے لگ بھگ ہو گئی میں حیران ہو گئی کہ اتنے کم عرصے میں اس نے ایسا کیا کر دیا ہے جو ایک لاکھ کے ساتھ ایک لاکھ روپے اضافہ ہوگیا، میں نے اسے بلایا اور اس سے رقم کے بڑھنے کے متعلق دریافت کیا کہ کیا مارکیٹ میں دودھ کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے، یا مویشی چارہ زیادہ کھا رہے ہیں جو اتنے کم عرصے میں دوگنا پیسے بڑھ گئے ہیں، اس نے بڑے ہی جوشیلے انداز میں جواب دیا، بیگم صاحبہ ابھی تو لاکھ بڑھا ہے آپ دیکھتی جاؤ میں اسے تین لاکھ تک لے کر جاؤں گا، میں نے حیرانگی سے پوچھا کہ وہ کیسے تو اس نے بتایا کہ وہ دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرتا ہے تو میں سکتے میں آ گئی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے بہت بڑا ظلم کر دیا ہے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ کر کیوں کہ یہ تو میرے ملک کی آنے والی نسل کو اپاہج بنا رہا ہے، میری افواج کے جوانوں کو پانی ملا دودھ پلا کر ان کو کمزور کر رہا ہے، میں نے اسے تھپڑ مارا اور کہا کہ جی تو چاہتا ہے کہ میں تم کو سیدھا جیل بھیج دوں مگر تمہارے بوڑھے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر ترس آتا ہے دفعہ ہو جاؤ اور آئندہ کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ تو قارئین یہ سوچ ہے بیرون ممالک میں رہنے والوں کی جو ملاوٹ سے بنائے گئے پیسے کو برا سمجھتے ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ہم ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں، دودھ میں پانی کی ملاوٹ، مرچ میں ہلدی کی ملاوٹ، وغیرہ وغیرہ، ہمارے ملک کا چھوٹے سے چھوٹا آفیسر ہو یا بڑے سے بڑا آفیسر سب کرپشن کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، آج تک

کوئی بھی لیڈر ایسا نہیں آسکا جو خود بھی کرپشن نہ کرے اور اپنے نیچے کام کرنے والوں کو بھی روکے۔ہمارے حکمران صرف اپنی سیٹیں مضبوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔اور ان کی خواہش ہوتی کہ اب باری آئی ہے جی بھر کر لوٹو خدا جانے پھر کبھی موقع ملے نہ ملے۔اور ہمارے ملک کی عوام اس قدر بے حس اور اپاہج ہو چکی ہے کہ بس دیوانہ وار انہی کی مالا جپتے ہیں جو ان کو بجلی، گیس کی لوڈشیڈنگ، مہنگائی کے تحفے دیتے ہیں۔اور عوام خوش دلی سے انہیں اپنے سینوں سے لگا کر پھر سے انہی کے گیت گاتی ہے۔اور وہی لیڈر پھر عوام کو ڈسنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔اور اپنے بینک اکاؤنٹس بھرنے میں لگ جاتے ہیں کہ کہیں خالی نہ رہ جائیں۔آخر عوام کے ٹیکسوں سے آیا پیسہ کیوں ان کی تجوریوں میں پڑا رہتا ہے اس پیسے کو نکلوانے والا کیوں نہیں آتا۔یہ سارا مال وزر غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی ان حکمرانوں کے اکاؤنٹس میں کب تک جمع رہے گا۔یہ حکمران طبقہ مختلف طریقوں سے مال بنانے میں لگا ہوا ہے۔آخر اس مہلک مرض کا سدباب کس دن ہوگا۔پاکستان میں لوٹ مار اور بے ایمانی کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ہم کیوں باہر کی ڈکٹیشن پر چلتے ہیں۔ہم کیوں اغیار کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ہم اپنے ہمسایہ ملک دوست چائنہ کی سستی پالیسیوں کو کیوں نہیں اپناتے ۔ہمارے ملک کے کرپٹ حکمران بیرون ممالک سیر و تفریح میں عوام کا پیسہ کیوں برباد کر رہے ہیں۔جو پیسہ یہ حکمران طبقہ اپنی عیاشیوں میں۔برباد کرتا ہے اگر یہی پیسہ عوام پر لگایا جائے تو عوام بھوک کی وجہ سے خودکشیاں نہ

کرے، بیروزگاری نہ ہو، اگر صرف سابق صدر پاکستان سوئس بینکوں میں جمع کروایا ہوا عوام کا پیسہ واپس لے آئیں تو ہمیں کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی نہ رہے لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا، پاکستان کا عام آدمی بھی سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا بابائے قوم نے یہ ملک صرف حکمرانوں کی لوٹ مار کے لئے ہی بنایا تھا، قائداعظم نے تو پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہوگی ،جہاں پر سب کو مساوی حقوق دیئے جائینگے، مگر یہاں تو صرف دو فیصد لوگ 98 فیصد لوگوں پر مسلط کر دیئے گئے جو باری باری عوام کو نوچتے ہیں، اور اپنی مرضی کے نرخ نافذ کرواتے ہیں تاکہ ان کی اپنی صنعتوں کو فائدہ ہو، یہاں تو ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی چیزیں نہیں مل رہیں، حق دار کو اس کا حق نہیں مل رہا، یہاں بچوں کو مساوی تعلیم کے مواقع میسر نہیں یہاں پر امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے، اور ایک اندازے کے مطابق، پاکستان کا ہر وہ بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہے وہ بھی ہزاروں روپے کا مقروض ہے ،عام آدمی سوچتا ہے کہ کیا اتنا پیسہ ہم نے کھا لیا ہے جو ہمارے بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مقروض ہیں، لیکن آخر میں ایک بات کہنا چاہوں گا اگر عوام کو اب بھی شعور نہ آیا تو پھر کبھی ایسا موقع میسر نہ ہوگا، اگر عوام نے خود کو تبدیلی کی طرف لانا ہے، اگر بیروزگاری کا خاتمہ کرنا ہے، اگر ملک میں خوشحالی لانی ہے تو ایک بار نئی قیادت کو ضرور آزمائیں ،کیونکہ 50 سال سے زائد پیپلزپارٹی عوام مسلط رہی ہے کیا ملا، لوڈشیڈنگ مہنگائی، کرپشن، 30 سال سے زائد ن لیگ نے عوام،

کے احساسات سے کھلواڑ کیا، کیا دیا، فاقہ کشی، خودکشیاں، بیروزگاری، مہنگائی کے سوا کچھ بھی نہیں، خدارا سوچو!

عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی

ہمارے دانشور طبقے کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ نونہالانِ قوم کو عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دینی چاہیے ، اس کے بر عکس وہ اس نہج پر ضرور سوچتے ہیں کہ طلبہ مدارس کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب اخبارات میں صرف اسی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ، عصری تعلیم گاہوں کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ بلاشبہ دینی تعلیم کے ساتھ اگر کچھ ضروری تعلیم عصریات کی بھی ہو جائے تو ہمارے دینی مدارس دین ودنیا کے اس امتزاج کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں خدمت کر سکتے ہیں ، لیکن مدارس کی اصلاح کے چکر میں پڑ کر ہمیں ان بچوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جو محض دنیوی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں یا ان کے سرپرستوں ، یا ان کے ٹیچروں کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہمارے بچوں کو دین کا اتنا علم ضرور ہونا چاہیے جو انہیں اچھے تعلیم یافتہ انسان کے ساتھ ساتھ اچھا مسلمان بھی بناسکے۔ ہر سال اخبارات میں ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے سالانہ نتائج پر کافی کچھ لکھا جاتا ہے۔ جو بچے اپنے شہروں میں یا قصبوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں ان کے فوٹو چھپ رہے ہوتے ہیں ، انٹرویو شائع کیے جاتے ہیں ، ہر طرف

خوشی کا ماحول ہوتا ہے۔ جن اسکولوں اور کالجوں کا رزلٹ اچھا ہوتا ہے ان کی کوششوں کو خوب سراہا جاتا ہے، اور جن اسکولوں کا رزلٹ مایوس کن ہوتا ہے ان پر تنقید کے نشتر بھی چل رہے ہوتے ہیں۔ پوری قوم عصری تعلیم کے نشے میں سرشار ہے، جو کچھ ہو رہا ہے، بہت اچھا ہو رہا ہے، لگتا ہے عصری تعلیم کے تئیں قوم بیدار ہو چلی ہے۔ یقینی طور پر قوم کو انجینئروں کی، ڈاکٹروں کی اور دوسرے ماہرین کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت عصری تعلیم گاہوں سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ عوام میں عصری تعلیم کے تئیں زبردست بیداری آئی ہے، یہ بڑی خوش آئند بات ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے، مگر یہاں کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عصری تعلیم کے شور میں دین کا پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے، یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ آج ڈاکٹروں، انجینئروں اور دوسرے پیشہ وروں کی ایسی ٹیم تیار ہو رہی ہے جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ یہ ان کا قصور نہیں ہے، قصور اس نظامِ تعلیم کا ہے جس نے ان کا راستہ غیر محسوس طریقے سے الگ کر دیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد سے ہی ماں باپ کو یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ ان کا بچہ اس نظام تعلیم میں کہاں اور کس طرح فٹ ہوگا، کیوں کہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر اس کے لیے ابھی سے جدوجہد نہ کی گئی تو وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس فکر نے ماں باپ کو ان کے اس فرض سے غافل کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ایک اچھا مسلمان بنانے کا بھی سوچیں۔ بچہ ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں

سنبھالتا کہ اسے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کر دیا جاتا ہے، اس اسکول سے وہ بہترین انگریزی بولتا ہوا نکلتا ہے۔ عیسائی مذہب کے متعلق اسے بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لیکن وہ اپنے مذہب سے قطعی بیگانہ رہتا ہے، ماں باپ یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ ہمارے بچے نے ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھا دیے ہیں، ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ ترقی کا یہ صرف ایک رخ ہے، یقیناً ان کا بچہ بڑا ہو کر اچھا پیشہ ور انسان ضرور بنے گا اور لاکھوں کما کر گھر بھر دے گا، لیکن اس کے دل کی دنیا دین جیسی بیش قیمت متاعِ زندگی سے خالی رہ گئی ہے اسے کون پُر کرے گا؟ مسلمان اور دین دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ دین کا ایک علم تو وہ ہے جو مکمل نظام کے ساتھ اسلامی مدارس میں جاری ہے، جہاں مفسر، محدث، اور فقھیہ پیدا کیے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ بڑا کام ہے اور امت کو دینی رہنمائی کے لیے ماہر علماء کی سخت ضرورت ہے، مگر یہ ضرورت ایک محدود تعداد پر ختم بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قوم کو میڈیسن، انجینئرنگ اور لاء وغیرہ کے شعبوں میں ماہرین کی ضرورت ہے، مگر یہ ضرورت اس وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک معقول تعداد ان ماہرین کی پیدا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح قوم کے ہر فرد کا ڈاکٹر یا انجینئر بننا ضروری نہیں ہے اسی طرح قوم کے ہر فرد کا محدث، فقیہ، اور مفسر بننا بھی ضروری نہیں ہے، لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو ہر شخص کے لیے ضروری ہیں، مثال کے طور پر ایک اچھا شہری بننے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملک کا

قانون کن امور کو صحیح اور کن امور کو غلط کہتا ہے، نہ صرف جاننا ضروری ہے بلکہ صحیح امور پر چلنا اور غلط امور سے بچنا بھی ضروری ہے۔ ملک کا قانون ہمیں فتنہ وفساد اور شر انگیزی سے روکتا ہے، اور پُر امن بقائے باہم کے اصول پر زندگی گزارنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس صورت میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ملکی قوانین پر عمل کرتے ہوئے ہر ایسے کام سے بچیں جس سے معاشرے میں فتنہ وفساد پھیلتا ہو اور ہر وہ کام کریں جس سے امن وامان کو فروغ ملتا ہو۔ اسی طرح ہمیں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ ایک اچھا مسلمان بننے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، کن چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے اور کن چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے، یہ وہ ضرورت ہے جس کا اظہار اس حدیث شریف میں کیا گیا ہے۔ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے'' اس علم کو جس کا اس حدیث میں ذکر ہے۔ اگر ہم ان علوم پر محمول کریں جو مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جا رہے ہیں تو یہ بات نا قابل فہم ہے کہ ان علوم کا حصول تمام مسلمانوں پر فرض کر دیا جائے اور اگر دنیوی علوم مراد لیں جیسا کہ بعض لوگ 'اطلبو العلم ولو کان بالصین'، ''علم حاصل کرو اگرچہ چین جانا پڑے'' جیسی ضعیف احادیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جدید علوم کا حصول بھی فرض کے درجے میں ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں چین جانے کی ہدایت بھی کی گئی ہے اور چین نہ پہلے علوم دینیہ کا مرکز تھا اور نہ آج ہے، وہ اُس زمانے میں بھی ٹکنالوجی کا مرکز تھا اور آج بھی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اسلام میں جدید علوم کے حصول کو بھی لازم

قرار دیا گیا ہے، یہ دعویٰ بھی غلط ہے اور استدلال بھی، دعویٰ تو اس لیے غلط ہے کہ جدید علوم کا حصول سب کے لیے یکساں طور پر ضروری نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ سب لوگ ایک ہی راستے کے مسافر بن جائیں، اس طرح تو زندگی کا سفر رک سکتا ہے۔ استدلال اس لیے غلط ہے کہ اگر حدیث کے ضعف کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی چین اصل میں دوری کی علامت ہے، منشاءِ حدیث یہ ہے کہ علم حاصل کرو اگرچہ اس کے لیے کتنی ہی دور کیوں نہ جانا پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض علوم وہ بھی ہیں جو بلا استثناء سب پر فرض ہیں اور ان کے حصول کے لیے جد و جہد کرنا بھی فرض کے درجے میں ہے، ہم ان علوم کو دین کی بنیادی تعلیمات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قوم کے نوجوان ترقی کی شاہراہ پر تو آگے بڑھ رہے ہیں مگر دین کے راستے سے دور ہوتے جارہے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارے بچے اس طرح آگے بڑھیں کہ وہ پکے سچے مسلمان بھی ہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری بھی، اس کے لیے والدین کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے جو تعلیم کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ بچہ پیدا ہو تو جس طرح آپ کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ کس مشہور ومعروف اور اعلیٰ معیار کے حامل اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا؟ اسی کے ساتھ آپ کو یہ فکر بھی ہونی چاہیے کہ آپ کا بچہ دین دار کیسے بنے گا؟ یاد رکھئے اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بننے میں اور دین دار بننے میں کوئی تضاد نہیں ہے، ایک بچہ دین داری کے ساتھ دنیا داری کے تقاضے بھی پورے کر سکتا ہے، اس کی کئی

مثالیں ہمارے سامنے ہیں، لیکن وہ اتنی کم ہیں کہ ہم انہیں قابل تقلید نمونہ تو کہہ سکتے ہیں مگر ان پر قناعت نہیں کر سکتے۔ان مثالوں کو عام کرنے کے لیے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔اس وقت ملت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ مسلمان نرسری اسکولوں سے لے کر کالج کی سطح تک تمام ادارے اپنے قائم کریں پھر ان اداروں میں دینیات کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اختیار کریں۔ اگر بچے کو، نرسری سے لے کر کالج کی سطح تک دینی تعلیم دی جاتی رہی تو جس وقت وہ عملی زندگی میں قدم رکھے گا ہر اعتبار سے مکمل انسان ہوگا، ایک ایسا انسان جس کے اندر تعلیمی صلاحیت بھی ہوگی، تہذیبی شعور بھی ہوگا، اور دین کی سمجھ بھی، یہ نوجوان نہ صرف اپنے والدین کے لیے دنیا وآخرت میں متاعِ گراں مایہ ثابت ہوگا بلکہ قوم وملت کے لیے بھی باعث افتخار بنے گا۔عصری علوم کے مدارس میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اگر ان میں مذہبی تعلیم دی جائے گی تو حکومت ان کو جو مالی تعاون دیتی ہے وہ بند ہو جائے گا، اور ہو سکتا ہے ان اداروں کی منظوری بھی ختم ہو جائے، یہ بڑی غلط فہمی ہے، یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اقلیتوں کو اپنے اداروں میں مخلوط تعلیم سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ مخلوط تعلیم اس دور کا وہ فتنہ ہے جس نے معاشرے کو اخلاقی اعتبار سے تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا ہے۔آج جدید تعلیم یافتہ معاشرے میں جس قدر برائیاں عام ہیں وہ ان ہی دو چیزوں کی وجہ سے ہیں، ایک دینی تعلیم سے دوری اور دوسرے طلبہ وطالبات کا

آزادانہ اختلاط و میل وجول۔ ہم دینی تعلیم کو اپنے اداروں کے نصاب تعلیم کا لازمی جز بنا کر اور مخلوط تعلیم سے دور رہ کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک طرف جدید تعلیم یافتہ بھی ہو اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا بھی، کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے بچے ایسے ماحول میں تعلیم حاصل کریں جو دین کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہو۔ اگر کسی جگہ اسکولوں اور کالجوں میں یہ ماحول میسر نہیں آتا تو گھر کی فضاؤں میں یہ ماحول بنانا ضروری ہے۔ اگر بچے اس ماحول سے محروم رہ گئے تو وہ آپ کی خواہش کے مطابق اچھا ڈاکٹر یا انجینئر یا قانون داں یا اکاؤنٹنٹ تو بن جائے گا مگر ایک اچھا مسلمان نہ بن سکے گا، اور اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہو گی، والدین کی حیثیت سے آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور نہ آخرت کی جواب دہی سے دامن بچا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے، مسئلہ یہ بھی ہے کہ عصری تعلیم کے اداروں کے نصاب تعلیم کو بھی دینی تقاضوں سے مربوط کیا جائے، دونوں ہی مسئلے اہم ہیں دونوں پر بہ یک وقت توجہ دینے کی ضرورت ہے، اگر مدارس میں عصری علوم کی شمولیت پر علماء اور ذمہ داران مدارس کو غور کرنا چاہیے تو عصری تعلیم گاہوں میں دینی علوم کے اضافے کے موضوع پر دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو بھی توجہ دینی چاہیے .

درگاہ عالیہ بری امام شریف

سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ سلسلہ سے ہیں، آپ بری امام کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں آپ کا دربار پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے نواحی گاؤں نور پور شاہاں میں واقع ہے۔ جہاں ہر سال لاکھوں عقیدت مند حاضری دیتے ہیں۔ سید عبدالطیف کاظمی قادریؒکے والد کا نام سید محمود شاہ کاظمیؒ ہے سید محمود شاہ کاظمیؒ کا دربار پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں آبپارہ کے مقام پر واقع ہے۔ سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ سولہ سو سترہ عیسوی اور دس سو چھبیس ہجری میں چکوال کے ایک گاؤں کرسال میں پیدا ہوئے سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ کے والد سید محمود شاہ کاظمیؒ اپنے پورے خاندان سمیت ہجرت کرکے باغان گئے جو اب آبپارہ کے نام سے مشہور ہے۔ سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ غور غستی (اٹک) گئے جہاں پر دو سال قیام کے دوران آپ نے فقہ، حدیث، منطق، ریاضی اور علم طب کے متعلق سیکھا کیوں کہ اس دور میں غور غستی (اٹک) علم کا مرکز جانا جاتا تھا۔ سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ بچپن میں مویشی چرایا کرتے تھے ایک بار آپ مویشی چرانے لے کر گئے آپ نے مویشیوں کو کھلا چھوڑ دیا کہ مویشی چرلیں اور خود درخت کے نیچے آرام کرنے لگے آپ کے مویشی چرتے ہوئے کھیتوں میں گھس گئے اور فصل کو نقصان پہنچایا آپ مویشی لے کر واپس آ گئے اتنے میں کھیت کا مالک بھی آ پہنچا اس نے

آپ کے والد صاحب کو شکایت لگائی کہ آپ کے مویشیوں نے میری فصل تباہ کردی ہے اور میرے پاس چشم دید گواہ بھی موجود ہیں جنھوں نے خود مویشیوں کو کھیت میں گھس کر فصل کو تباہ کرتے دیکھا اس پر سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ نے جواب دیا کہ فصل کو کسی نے تباہ نہیں کیا فصل بالکل ٹھیک ہے یہ سن کر کھیت کے مالک نے آپ کے والد صاحب سے کہا کہ آپ خود جا کر کھیتوں کی حالت دیکھیں جب آپ کے والد صاحب کھیتوں میں پہنچے تو وہاں کا نظارہ کچھ اور تھا کھیت لہلہا رہے تھے اور فصلیں بھی بالکل ٹھیک تھیں یہ نظارہ دیکھ کہ کھیت کا مالک حیران رہ گیا کہ اس نے جب دیکھا اس وقت کھیتوں کی حالت اور تھی اور اب اور ہے کھیت کا مالک اپنی بات پر پشیمان ہوا اور معافی مانگ کر واپس چلا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پیدائشی ولی تھے۔ سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ ایک بار پتھر پر بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہے تھے کہ اس علاقے سے بادشاہ وقت اورنگزیب عالمگیر کا اپنی فوج کے ساتھ گزر ہوا رات ہونے کی وجہ سے اورنگزیب عالمگیر نے فوج کو پڑاؤ کا حکم دیا اور لنگر کی تیاری کا بھی حکم دیا جب لنگر تیار ہوا تو اورنگزیب عالمگیر نے حکم دیا کہ تمام علاقے کے عوام کو بھی کھانے میں شرکت کی دعوت دی جائے حکم کے مطابق لوگ کھانے کے لیے آگئے اور کھانا شروع کردیا اس اثنا میں چند سپاہی اورنگزیب عالمگیر کے پاس حاضر ہوئے اور شکایت لگاتے ہوئے کہا کہ ایک شخص نے آپ کا حکم ماننے سے انکار کردیا ہے یہ سن کر اورنگزیب عالمگیر برہم ہوا اور بولا کہ جاؤ اور دوبارہ انہیں ہمارا

حکم سناؤ سپاہی چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد جب لوٹے تو انھوں نے دوبارہ وہی جواب دیا جسے سن کر اورنگزیب عالمگیر نے سپاہیوں سے کہا کہ ہم خود جا کر اس شخص کو ملنا چاہتے ہیں۔

جب اورنگزیب عالمگیر سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ کے پاس پہنچا تو تحکمانہ انداز میں سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ سے مخاطب ہوا "کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارا حکم ماننے سے انکار کیا ہے" سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ نے جواب دیا "ہاں وہ میں ہی ہوں" اس پر اورنگزیب عالمگیر بولا "کیا تم نہیں جانتے کہ ہم بادشاہ وقت ہیں اور تم ہماری جاگیر میں موجود ہو" سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ نے جواب دیا "تم جو بھی ہو جاگیر صرف اللہ کی ہے اور اگر تمہیں جاگیر دیکھنے کا بہت شوق ہے تو ہمارے ساتھ اس پتھر پر بیٹھو" جب اورنگزیب عالمگیر بیٹھا تو اسے پانے چاروں طرف ہیرے جواہرات سے بنا دربار نظر آیا اور پتھ جس پر سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ بیٹھے تھے وہ ایک بہت خوبصورت تخت کی صورت میں نظر آیا" تو اورنگزیب عالمگیر سید عبدالطیف بھٹائی کاظمی قادریؒ سے بولا مجھے معاف کیجئے گا میں آپ کو نہیں پہچان سکا تھا اس لیے آپ سے گستاخی کر بیٹھا تھا"" یہ سن کر سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ نے اورنگزیب عالمگیر کو معاف کیا اور اس کے حق میں دعا بھی فرمائی۔ سید عبدالطیف کاظمی قادریؒ نے بہت سے علاقوں کا دورہ کیا جن میں کشمیر، بدخشاں، بخارا، مشہد،

بغداد اور دمشق شامل ہیں آپ حج کی غرض سے مکہ مکرمہ بھی گئے۔ سید عبداللطیف کاظمی قادریؒ نے نور پور شاہاں میں قیام کے دوران اسلام کی تعلیمات کے ذریعے لاتعداد ہندوؤں کے دلوں میں اسلام کی شمع کو روشن کیا۔ آپ کا دربار پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے نواحی گاؤں نور پور شاہاں میں واقع ہے۔ جہاں ہر سال لاکھوں عقیدت مند حاضری دیتے ہیں آپ کا دربار اورنگزیب عالمگیر نے اپنے دور حکومت میں تیار کروایا۔

ماہ مقدس رمضان المبارک کی آمد

ماہ مقدس رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ ہر چہار جانب خوشیوں کا ماحول ہے۔ ہر طرف فرحت و شادمانی کے نغمے گائے جا رہے ہیں۔ ہوائیں مستی میں جھوم رہی ہیں۔ فضائیں ماحول میں خوشبو بکھیر رہی ہیں۔ ابر کرم اور رحمت و مغفرت کی گھٹائیں برسنے کو تیار ہیں۔ رزق میں فراوانی اور وسعت ملنے والی ہے۔ کیوں نہ ہو یہ مہینہ تو تمام مہینوں سے افضل و خیر و برکت والا ہے۔ جس کا ایک ایک لمحہ اور ہر ہر ساعت نہایت ہی متبرک ہے۔ یہی وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں تمام آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو صحیفے اسی ماہ میں عطا کئے گئے اور آخری کتاب ہدایت (قرآن پاک) کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسیلم پر اسی ماہ میں نازل فرمایا۔ یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر پورا کا پورا اسی ماہ مبارک کی لیلتہ القدر (شب قدر) میں اتارا اور وہاں سے پھر 23 سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا موقع محل کے حساب سے نازل ہوا۔ یہی وہ کتاب ہے جو تا قیامت پوری انسانیت کے لئے سراپا ذریعہ ہدایت ہے اور اپنے وقت نزول سے لے کر آج تک اور رہتی دنیا تک اس میں رد و بدل کا کوئی امکان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک زبر۔ زیر

اور نقطہ کی ذمہ داری خود رب العالمین نے لی ہے۔ اس کا خود اعلان ہے کہ ”بے شک قرآن کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں“ بہر حال رمضان کے ساتھ قرآن مجید کا خاص لگاؤ ہے۔ جب ہی اس کے نزول کے لئے اس مہینہ کا انتخاب کیا گیا۔ اسی بات کو خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: ” ترجمہ “۔ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے“

الغرض اس ماہ کی عظمت وفضیلت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ قرآن مقدس کا اس ماہ میں نزول ہوا۔ جس نے ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کیا۔ سسکتی ہوئی انسانیت کو ہدایت کی راہ دکھائی۔ یہ ایک ایسا کامل ومکمل دستور حیات ہے جس کی روشنی میں گم کردہ راہ انسانیت کو رہنمائی ملی اور ایک طویل تاریکی کے بعد انسانیت کی صبح سعادت طلوع ہوئی۔ چمنستان انسانیت میں بہار آئی ، خزاں رسیدہ دل ایک بار پھر سے کھل اٹھے۔ صحابی رسول حضرت کعب بن عجرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ منبر کے قریب ہو جاؤ۔ ہم لوگ منبر کے قریب حاضر ہو گئے۔ جب آپ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا تو فرمایا آمین۔ جب دوسرے درجہ پر قدم رکھا فرمایا آمین۔ پھر آپ نے ہمیں خطبہ دیا۔ جب خطبہ سے فارغ ہو کر آپ منبر سے نیچے اترے تو ہم نے عرض کیا۔ اللہ کے رسول آج ہم نے منبر پر چڑھتے ہوئے آپ سے ایسی بات سنی ہے جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی اور یہ کہ آپ نے تین مرتبہ آمین آمین کہا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس وقت میرے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے تھے۔ جب منبر

کے پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو جائے وہ شخص جس نے رمضان کا مہینہ پایا۔ پھر بھی اس کی مغفرت نہیں ہوئی۔ میں نے اس پر کہا آمین (یعنی ایسا ہی ہو) پھر جب دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو جائے وہ شخص جس کے سامنے آپ کا ذکر مبارک کیا جا رہا ہو اور وہ آپ پر درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا آمین۔ جب میں نے تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو جبریل علیہ السلام نے کہا۔ ہلاک ہو جائے وہ شخص جو اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور وہ اس کی جنت میں داخل نہ کرائیں۔ میں نے کہا آمین۔ آپ ﷺ نے تین چیزیں بیان کی ہیں جن میں پہلی بات کا تعلق رمضان المبارک سے ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کا مہینہ پائے اور صحیح ڈھنگ سے روزہ رکھ کر تراویح وغیرہ پڑھ کر دریائے رحمت کے جوش واہال سے سیراب نہ ہو۔ مغفرت ونجات کے ابلتے ہوئے چشموں سے اپنے گناہوں کی غلاظت کو نہ دھوئے تو واقعی ایسے شخص سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہیں ہو سکتا اور ایسے گم کردہ منزل اور مقصد حیات سے غافل کو ہلاک ہو ہی جانا چاہئے اور پھر جس بد نصیب کے لئے افضل الملائکہ حضرت جبریل علیہ السلام بد دعا کر رہے ہوں اور اس پر خلاصہ کائنات حضرت محمد ﷺ آمین فرما رہے ہوں پھر ایسے شخص کی ہلاکت وتباہی میں کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ بہر حال اس ماہ میں رب کریم کی رحمت اس قدر جوش میں آتی ہے۔ کہ اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کے ذریعہ اپنی رحمت کو اسطرح بیان کرایا کہ رمضان میں جہنم کے مستحق لوگوں کو پورے ماہ

آزاد کردیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو اللہ تعالٰی فرشتوں سے کہتے ہیں کہ جنت کو سنوارو کہ کہیں کوئی میرا بندہ آجائے۔ نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ رمضان کیا چیز ہے تو میری امت یہ تمنا کرنے لگے کہ سارا سال ہی رمضان ہو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ماہ میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر گنا زیادہ دیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی پاک ارشاد ہے کہ اللہ بزرگ و برتر رمضان کی ہر رات میں ایک منادی کو حکم دیتے ہیں کہ وہ تین مرتبہ آواز دے کر کہے ہے کوئی مانگنے والا جس کو میں عطا کروں۔ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں۔ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ میں اسکی مغفرت کروں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ جن کی دعائیں رد نہیں کی جاتیں۔ ایک روزہ دار جو افطار کے وقت دعا کرتا ہے۔ دوسرا انصاف پرور بادشاہ اور تیسرا مظلوم یعنی جس پر ظلم کیا جائے۔ (یہ ظلم چاہے جس طرح کا بھی ہو) آج ظلم کا دور دورہ ہے۔ غریبوں کو ستانا۔ کمزروں کو دبانا اور بے یارومددگار اور بے سہاروں کو اجاڑنا۔ اپنے ماتحتوں کو ستانا۔ آج ذیادہ تر لوگوں کا شیوہ زندگی بنا ہوا ہے۔ بہت سے طاقتور، مالدار، دولت و ثروت کے نشے میں چور طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ مظلوموں کی آہوں کا شکار ہو جائیں۔ اسلئے امت محمد ﷺ کے لئے خوشی کا مقام ہے کہ رمضان المبارک پوری خیر و برکت کے ساتھ ہمارے سروں پر سایہ فگن

ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنی آغوش رحمت میں لینے والا ہے۔ اب ہمارے اوپر ہے کہ ہم اس کا کیسے استقبال کرتے ہیں۔ کتنا احترام کرتے ہیں اور اس کے تقاضوں کو کتنا پورا کرتے ہیں۔ آیا گرمی اور دھوپ کا بہانہ بنا کر رب ذوالجلال کے احکام کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ یا اپنے رب کی رضا کی خاطر دنیا کی ہر تکلیف کو ہیچ سمجھتے ہوئے اپنے معبود حقیقی کے سامنے سرنیاز تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ یاد رکھیں یہ رمضان ہر سال آئے گا۔ اور چلا جائے گا۔ لیکن اگلے سال تک ہم ہوں گے یا نہیں؟ ہمیں نہیں معلوم۔ اس لئے ہم اللہ رب العزت کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے کہ اس نے ہمیں یہ بابرکت مہینہ نصیب کیا اور روزہ جیسی عظیم اور بیش بہا نعمت عطا فرمائی جو دنیاوی اعتبار سے بھی مفید ہے اور آخرت میں تو باعث نجات ہے ہی۔ روزہ انسان کی صحت و تندرستی قائم و دائم رکھنے کے لئے ایک مفید عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے غیر مسلم مفکر و دانشور بھی اسلامی روزوں کی تعریف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں کہ یہ نسخہ کیمیا بندوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خالق کائنات کا بنایا ہوا ہے اور اس سے زیادہ کس کو معلوم ہوگا کہ میرے بندوں کے لئے کون سا عمل مفید ہوگا۔ روزے کے بارے میں ایک عیسائی دانشور ڈاکٹر رچرڈ کا کہنا ہے کہ " جس شخص کو تزکیہ نفس کی ضرورت ہو اسے چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ روزہ رکھا کرے۔ اسی طرح ڈاکٹر ہیزی ایڈورڈ لکھتے ہیں " روزہ دل میں صبر و سکون اور اطمینان پیدا کرتا ہے۔ اس سے قوت.برادشت اور سختیاں سہنے کی عادت پیدا ہوتی ہے"۔ گویا روزہ

روحانیت کی غذا تو ہے ہی۔امراض جسمانی کے لئے بھی مفید ہے۔آیئے: ہم عہد کریں کہ یہ رمضان ہم رمضان کے طریقے سے گزاریں گے۔ صرف پیٹ کا ہی روزہ نہیں رکھیں گے بلکہ ہاتھ "پیر" زبان" کان" ناک" دل و دماغ سب کا روزہ رکھیں گے۔ اپنے تمام اعضا کو اپنے قابو میں رکھیں گے۔ خاص طور پر سے اپنی زبان کو تمام برائیوں سے دور رکھتے ہوئے ہمہ وقت رب ذوالجلال کی یاد میں ' قرآن کریم کی تلاوت میں اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجیں گے۔اس رمضان کو گویا ہم اپنی زندگی کا آخری رمضان سمجھ کر ایک ایک لمحہ کی قدر کریں گے۔ ہم یہ عہد کریں کہ رمضان کا ایک بھی روزہ ہم سے کسی طرح چھوٹ نہ جائے۔ اس لئے کہ قصداً یعنی بغیر کسی شرعی عذر) کے ایک روزہ بھی چھوڑ کر اگر کوئی پوری زندگی روزہ رکھے) تب بھی اس ایک روزہ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اندازہ کریں کہ بغیر عذر روزہ نہ رکھنا کتنا بڑا گناہ ہوگا۔ اسی طرح تراویح کا پورا اہتمام کریں گے جو کہ نہایت ہی ضروری ہے۔آیئے: ہم اپنے مقام کو سمجھیں۔ رمضان کا کھلے دل سے استقبال کریں۔ اس کے تقاضوں کو پورا کریں۔ عبادت کا اہتمام کریں اور اللہ کے متقی و پرہیزگار بندوں میں اپنے کو شامل کریں۔ آمین

رمضان قرآن کا مہینہ

رمضان اسلامی مہینے کا نواں مہینہ ہے۔ اس کا نام بھی اسلامی کیلنڈر کے نویں مہینے سے بنا ہے۔ یہ مہینہ اسلام کے سب سے پاک مہینوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلام کے تمام پیروکاروں کو اس مہینے میں روزہ، نماز فطرہ ادا کرنے کی صلاح دی گئی ہے۔ رمضان المبارک کے مہینے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے. ہر حصہ میں دس دس دن آتے ہیں۔ ہر دس دن کے حصے کو عشرہ کہتے ہیں جس کا مطلب عربی میں 10 ہے۔ اس طرح اسی ماہ میں مکمل قرآن پاک کا نزول ہوا، جو اسلام کی پاک کتاب ہے۔ قرآن کے دوسرے پارے کی آیت نمبر 183 میں روزہ رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری بتایا گیا ہے۔ روزہ صرف بھوکے، پیاسے رہنے کا نام نہیں بلکہ غلط کام سے بچنا بھی ہے۔ اس کا مطلب ہمیں ہمارے جسمانی اور ذہنی دونوں کو کنٹرول میں رکھنا ہے۔ قرآن پاک میں اس مبارک مہینے میں کسی طرح کے جھگڑے یا غصے سے نہ صرف منع کیا گیا ہے بلکہ کسی سے گلہ شکوہ ہے تو اس سے معافی مانگ کر معاشرے میں اتحاد قائم کرنے کی صلاح دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک طے رقم یا سامان غریبوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ تمام حمد وثنا اس خدائے بزرگ و برتر کے لئے ہیں۔ اللہ تعالی نے اپنے مومن بندوں پر احسان عظیم فرمایا اور ان کے لئے فضیلت کے اوقات مقرر کئے تاکہ وہ رمضان المبارک سے اعمال صالح کے گلہائے شگفتہ چنیں

اور اپنے لئے خوشبو کا خزانہ جمع کر لیں جو قیامت کے دن کام آسکے اور درود و سلام حضور ﷺ پر بھیجیں، جنھوں نے رمضان المبارک میں عبادت اور بندگی کی منفرد مثال قائم کی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ رمضان المبارک وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن پاک نازل ہوا جو نبی نوع انسان یعنی لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور روشنی کی راہ پانے کا ایک خاص ذریعہ ہے حق کو باطل سے جدا کرنے کا۔ سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینے کو تو اس کے روزے رکھے۔ رمضان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ قرآن جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہدایت ہے حضور اکرم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ اور امت محمد کے لئے سب سے عظیم نعمت ہے اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے، وہ رمضان المبارک میں نازل ہوئی اور اسی وجہ سے رمضان کو قرآن کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ اے ایمان والو! تم پر رمضان المبارک کے روزے فرض کر دیئے گئے ہیں جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کئے جا چکے ہیں تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔اللہ رب العزت نے فرمایا ہے کہ روزے رکھنے کا حکم ہم نے بلاوجہ ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ یہ صرف تمہارے متقی بننے اور جنت میں داخل ہونے کے لئے ایک بہترین طریقہ ہے اور اس سے گریز کرنا ایسا ہی ہے جیسے متقی بننے اور جنت میں داخل ہونے سے انکار کرنا۔ کیا تم مومن ہو کر یہ گوارہ کروگے؟ تمہیں تو یہ چاہئے کہ جنت کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ پرہیزگار بننے کی جد وجہد کرو۔ رسول اللہ ﷺ

رمضان المبارک سے بہت محبت فرماتے تھے اور اس کے پانے کی دعا کرتے تھے۔ آپ اس مقدس ماہ کا استقبال ماہ شعبان میں ہی روزوں کی کثرت کے ساتھ کرتے تھے۔

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی حضور کے معمولات۔ عبادت و ریاضت میں عام دنوں کی نسبت بہت اضافہ ہو جاتا تھا۔ حضور ﷺ رمضان کا چاند دیکھتے تو فرماتے یہ چاند خیر و برکت کا ہے۔ میں اس ذات پر یقین رکھتا ہوں جس نے مجھے پیدا فرمایا۔

حضور ﷺ روزے کا آغاز سحری کھانے سے فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے امت کو تلقین فرمائی کی سحری ضرور کھایا کرو۔ خواہ وہ پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا: سحری سراپا برکت ہے اسے ترک نہ کرو۔ آپ نے فرمایا سحری کرنیوالے پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چاہئے کہ کھجور سے کرے۔ کیونکہ اس میں برکت ہے اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے کرے کیونکہ پانی پاک ہے۔ سحری کھانے میں تاخیر اور افطار کرنے میں جلدی کرنا حضور کا زندگی بھر معمول رہا۔ روزہ رضائے حق حاصل کرنے کا ذریعہ اور مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت کا وسیلہ نفسانی خواہشات پر قابو پانے اور اپنے آپ کو منکرات سے بچانے کا اہم ذریعہ ہے۔ روزہ گناہوں کے لئے ڈھال ہے۔ روزہ دار کو چاہئے کہ وہ گناہ کا کام نہ کرے۔ روزہ کا مقصد قرآن پاک نے تقویٰ کو قرار دیا ہے اور تقویٰ بری باتوں اور برے کاموں سے بچنے، اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے۔ لوگو جو ایمان لائے ہو اور اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ یقینا اللہ تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے۔ ایسے روزے دار بہت ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ بہت سے روزہ دار ایسے جن کو روزے کے نام پر صرف بھوک پیاس ملتی ہے اور بہت سے رات کو نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جن کو قیام لیل کے نام پر رات کا جاگنا ہی ملتا ہے۔ یہ لوگ روزہ تو رکھتے ہیں مگر روزے کے روحانی اور اخلاقی تقاضے پورے نہیں کرتے۔ زبان کو دوسروں کی غیبت سے، برائی سے اور بد گوئی سے محفوظ نہیں رکھتے۔ دوسروں کی حق تلفی سے، ایذا رسانی سے، جھگڑنے اور لڑائی سے باز نہیں آتے۔ غرض ایسے لوگوں کو روزہ سے نہ خود فائدہ ہوگا اور نہ اللہ کو اس کے روزہ کی ضرورت ہے۔

رمضان وہ ماہ مقدس ہے جس میں نیکیوں کی فصل اگتی ہے اور پھر لہلہاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ بے شک روزہ خالص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا کہ بندہ میری ہی خاطر اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہش نفس سب کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ نیز فرمایا روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ اور بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ اچھی اور پاکیزہ ہے۔ الغرض رمضان قرآن کا مہینہ ہے، رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ ہے اور اللہ کا مہینہ ہے۔ اس میں ہر مومن کو اپنے گیارہ مہینوں کا محاسبہ کرنا چاہئے اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دوسرے مشاغل سے فارغ ہو کر یاد باری تعالیٰ میں لگانا چاہئے۔

اللہ ہم سب کو روزہ کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

!پردہ جاہلانہ رسم تو نہیں

آج کل کے سائنسی دور میں ایک طرف تو مادی ترقی اپنے عروج پر ہے، دوسری طرف عریانی اور فحاشی کا سیلاب ہے۔ فرنگی تہذیب کے اثرات نے فیشن پرستی اور بے حیائی کو عام کر دیا ہے، یونیورسٹی کالج کی تعلیم یافتہ خواتین نے حجاب کو غیر اہم سمجھنا شروع کر دیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ حجاب اور پردہ کی اہمیت فرضیت کو قرآن وسنت کی روشنی میں رقم کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ النور میں فرمان خداوندی ہے، ''اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کا طریقہ ہے۔ یقیناً اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے۔ اور وہ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے، شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، اپنی عورتیں، اپنے غلام، وہ مرد خدمت گار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے، یا وہ لڑکے جو ابھی عورتوں کی پردہ کی باتوں سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں۔ نیز وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ مارتی چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا

اظہار ہو۔ (النور: ۳۱، ۳۰) سورہ احزاب میں ہے ” اے نبی کی بیویوں تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں۔ اگر تمہیں پر ہیزگاری منظور ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں کوئی خرابی ہے وہ تم سے کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھے۔ بات سیدھی سادھی طرح کرو اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور اگلے زمانہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو“ (الاحزاب ۳۳، ۳۲) سورۃ احزاب میں ہی دوسری جگہ حکم رب ہے ” اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور ان کو ستایا نہ جائے گا۔“ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان مجمل ہدایات کو نبی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے اسلامی معاشرت میں کس طرح نافذ کیا ہے اور ان کے اقوال اور اعمال سے ان ہدایات کی معنوی اور عملی تفصیلات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کسی ضرورت کے تحت گھر سے نکلیں تو اپنے چہروں کو سروں کی طرف سے چادر سے ڈھانپ لیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں (تفسیر ابن کثیر ۹۱۵۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے سوال کیا ” عورتوں کے لئے کیا چیز بہتر ہے؟“ صحابہ کرامؓ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ اسی دوران مجھے گھر جانا پڑھا تو میں نے فاطمہؓ سے یہی سوال پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ” عورتوں کے لئے بہتر ہے کہ نہ تو وہ مردوں

کو دیکھیں اور نہ ہی مرد ان کو دیکھیں'' میں نے یہ جواب نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا'' وہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے'' معارف القرآن''حضرت عائشہ فرماتی ہیں'' میں اس کمرے میں داخل ہوتی جس میں نبی ﷺ مدفون ہیں تو اپنی چادر رکھ دیتی تھی اور کہتی تھی کہ یہاں تو صرف میرے شوہر اور میرے والد مدفون ہیں۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو دفن کیا گیا تو اللہ کی قسم میں ان سے حیا کی وجہ سے خوب اچھی طرح پردہ کر لیا کرتی تھی'' اس سے پردہ کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہئے کہ سیدہ عائشہؓ تو قبر میں مدفون شخص سے بھی پردہ کر رہی ہیں جب کہ آج کی بے پردہ عورتیں زندہ جیتے جاگتے مردوں سے پردہ نہیں کرتیں۔ دیندار عورتوں کے لئے سید عائشہؓ کا عمل روشنی کا مینار ہے۔ترمذی شریف میں ہے'' ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت حفصہؓ اور عائشہؓ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ حضرت عبد اللہ بن مکتومؓ گھر میں داخل ہوئے ، یہ نابینا صحابی تھے۔آپ ﷺ نے دونوں سے فرمایا: کہ پردہ کروانھوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ نابینا نہیں ہیں ؟ نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں نہ ہی پہچان سکتے ہیں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم دونوں بھی نابینا ہو ؟ کیا تم اسے نہیں دیکھ رہی ہو ؟ (ترمذی شریف)پردہ داری ایک عقلی قانون بھی ہے۔ اسلامی پردہ کوئی جاہلی رسم نہیں بلکہ ایک عقلی قانون ہے۔ جاہلی رسم ایک جامد چیز ہوتی ہے۔ جو طریقہ جس صورت سے رائج ہو گیا کسی حال میں اس کے اندر تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز چھپادی گئی وہ بس ہمیشہ کے لئے چھپادی گئی۔ اب

مرتے مرجائیں مگر اس کا کھلنا غیر ممکن۔ بہ خلاف اس کے عقلی قانون میں لچک ہوتی ہے۔ اس میں احوال کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی گنجائش ہوتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اس کے عام قواعد میں استثنائی صورتیں رکھی جاتی ہیں۔فرنگی ماحول میں محرم غیر محرم اور پردہ بے پردگی کا کوئی تصور نہیں ہے عریانی اور فحاشی اپنے عروج پر ہے۔

عیدالفطر امن وسلامتی کا تہوار

عیدالفطر مسلمانوں کا سب سے بڑا اسلامی تہوار ہے۔ عید عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی اس خوشی و مسرت کے ہیں جو لوٹ کر بار بار آئے۔ اس تہوار میں امن وسلامتی ہے بھائی چارہ ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی، یکجہتی ، مساوات اور ہمدردی و اتحاد کا بہترین مظاہرہ بھی ہے۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ 2 ہجری کو عیدالفطر کا تصور محمد ﷺ نے امت کو دیا۔ اسی سال رمضان المبارک کا روزہ فرض ہوا۔ ہجرت کے بعد کفار مکہ سے پہلا مقابلہ جنگ بدر کے نام سے 17 رمضان 2 ہجری ہی کو پیش آیا۔ حدیث پاک میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر قوم کے لئے خوشی کا دن متعین ہوتا ہے اور ہمارے لئے یہ خوشی کا دن ہے اور آپ اس طرح سے اپنے صحابہؓ کے ساتھ یکم شوال 2 ہجری کو مدینہ منورہ سے نصف میل دور ایک کھلے میدان میں تشریف لے گئے اور عیدالفطر کی نماز ادا فرمائی۔ عیدالفطر کے روز جو سب سے پہلا کام آپ ﷺ کیا کرتے وہ صدقہ فطر کی ادائیگی ہوتی تھی۔ یہی وہ اخلاقی دعوت اور مشترکہ تہذیب ہے جو یہاں صدقہ فطر کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے کہ آپ کے پڑوس میں آپ کے محلے اور بستی میں آپ ہی کے بچوں کی طرح دل رکھنے والے اور دلوں میں ارمان و شوق رکھنے والے کچھ اور بچے بھی ہیں جن کے ناز بردار ماں باپ آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ عید ان کے گھر بھی آئی ہے مگر ان کے

چہرے اداس ہیں۔ وہ بے یار و مددگار ہیں آپ ان کی سرپرستی کیجئے۔ وہ بے آسرا ہیں آپ ان کا آسرا بنئے۔ آپ کی عید جب ہی مقبول ہو سکتی ہے۔ آپ اگر عید کی حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پر تکلف کھانے سے پہلے ان فاقہ کشوں، محتاجوں اور مسکینوں کو کھانا کھلا کر ان کی مجبوری کا روزہ کھلوایئے اس لئے کہ آپ ﷺ کا یہی طریقہ تھا کہ یتیموں کی غمخواری، مسکینوں کی دستگیری اور درد مندوں کی حاجت روائی فرماتے تھے۔ صدقہ فطر کی ادائیگی اسی لئے ہر مسلمان عاقل بالغ صاحب استطاعت پر قبل نماز عید واجب ہے۔ بہر حال اطاعت اور شکر گزاری کے جشن کے طور پر مسلمانوں کو عیدالفطر کا دن نصیب ہوا۔ عیدالفطر رمضان المبارک میں پورے ایک مہینے کے روزے رکھنے کے بعد روحانی مسرت اور نفس و شیطان پر فتح پانے کی خوشی کا دن ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ جب عیدالفطر کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجتے ہیں وہ زمین پر اتر کر گلیوں راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی آواز سے پکارتے ہیں جس کو جنات وانس کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے ' اے محمد ﷺ کی امت اس کریم رب کی بارگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے، بڑے بڑے قصور معاف کرنیوالا ہے۔ پھر جب لوگ عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہو، وہ عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے معبود اس کا بدلہ یہی ہے کہ ان کی مزدوری پوری پوری دی جائے۔ پھر حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو گواہ بنا کر فرماتے ہیں کہ اے

فرشتوں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں ان کو رمضان کے روزے اور تراویح کے بدلے میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کرتا ہوں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو خوشی کے اظہار کی اجازت تو دیتا ہے۔ مگر بے قابو ہونے کی اجازت نہیں دیتا، عید منانے کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق مسلمانوں کو اس موقع پر نئے کپڑے یا حتی الوسع عمدہ کپڑے پہننے، عطر لگانے، بہتر کھانا کھانے ،ایک دوسرے کو مبارک باد دینے، رشتہ داروں اور دوستوں کے یہاں آنے جانے کی اجازت ہے،اس دن دوگانہ نماز ادا کرنے اور فقراء و مساکین کا تعاون کرنے کی بھی ہدایت ہے۔ مگر کسی غیر شرعی کام کرنے کی اس دن بھی اجازت نہیں ہے، نہ خوشی میں ناچنے گانے کی اجازت ہے نہ ڈانس کلبوں میں جانے کی اجازت ہے ، نہ شراب پینے کی اجازت ہے ، نہ غیر عورتوں سے باتیں کرنے اور نہ انہیں دیکھنے کی اجازت ہے ، نہ زنا کاری ، فحاشی و بے حیائی کی اجازت ہے ، نہ اصراف اور فضول خرچی کی اجازت ہے، غرض ہر وہ عمل جو اسلام میں دیگر دنوں میں جائز نہیں وہ اس دن بھی جائز نہیں ہے۔ عیدالفطر کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی چارے کے ساتھ رہیں ان کے درمیان نفرت و کدورت کی خلیجیں قائم نہ ہوں، اگر پہلے سے ہوں تو عید کے موقع پر ختم ہو جانی چاہئیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اجتماعی طور سے خوشی کا یہ دن فراہم کرکے یہ درس دیتا ہے کہ جس طرح اس دن مسلمانوں نے آپسی بھائی چارے کا مظاہرہ کیا ہے ، کسی اختلاف کو اس دن نہیں چھیڑا تو بقیہ دنوں میں بھی

اسی بھائی چارے کو قائم رکھیں، تاکہ آپسی اتحاد قائم رہے اور ایک اجتماعی طاقت کا مظاہرہ ہو۔آج مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا جو سلسلہ جاری ہے اور وہ جن چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور مسلکوں میں تقسیم ہو کر وہ تباہی کا شکار ہو رہے ہیں، عیدالفطر ان کی جوڑنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس روز کسی قسم کے امتیاز، نفرت، کدورت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اگر کوئی منفی جذبہ دل میں باقی رہ جائے تو پھر عید حقیقتاً عید کہلانے کے مستحق نہیں اس لئے عید کے دن ہر کسی سے معانقہ و مصافحہ کیجئے تاکہ دل صاف ہو اس سے اخوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ملک میں صحت عامہ کی سہولیات کا فقدان

ملک میں صحت عامہ کی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے اچھا علاج ایک خواب بنتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں حکومت نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف غریبوں کے لئے بلکہ صاحب وسائل کے لئے بھی علاج مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک میں نجی زمرے کے اسپتال بھاری منافع کما رہے ہیں لیکن حکومت کے اس فیصلے سے عوام ہی متاثر ہوں گے۔ ہمارے ملک میں غریبی کی دوسری سب سے بڑی وجہ صحت عامہ ہے۔ 30،25% لوگ اپنی کم ماہانہ آمدنی کی وجہ سے علاج سے گریز کرتے ہیں جس کے سبب ان کی بیماری سنگین صورتحال اختیار کر لیتی ہے، اسپتال میں داخل ہونے والوں میں سے 40% مریضوں کو اپنے علاج اور علاج کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے قرض لینا پڑتا ہے یا اپنی جائداد فروخت کرنا پڑتی ہے ایک اندازے کے مطابق اسپتال میں داخل ہونے والا ہر چوتھا مریض خط افلاس سے نیچے آ جاتا ہے. صحت کا شعبہ کسی بھی ملک کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ملک کے ہر شہری کو بنیادی صحت کی سہولتیں فراہم کرے۔ پاکستان میں تیز رفتار اقتصادی ترقی کے باوجود چھوٹے بچوں اور حاملہ خواتین کی شرح اموات آج بھی بہت زیادہ ہے اور ملیریا اور تپ دق کے ساتھ ساتھ دائمی امراض بھی بڑا سماجی مسئلہ اور طبّی چیلنج

بنتے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں 1923 آبادی کے لئے صرف ایک ڈاکٹر ہے جبکہ جرمنی میں 296، امریکہ میں 350، برطانیہ میں 469، تھائی لینڈ میں 500، جاپان میں 606، سنگاپور میں 714، برازیل میں 944 اور کوریا میں 951 کی ہر آبادی پر ایک ایک ڈاکٹر ہے۔ چین میں ایک ڈاکٹر کے لئے 1063، مصر میں 1484 ہے۔ ملک میں حکومت صحت عامہ کے لئے مجموعی گھریلو پیداوار کا بہت کم خرچ کر رہی ہے جبکہ نیپال اس مد میں ایک اعشاریہ چھ، چین ایک اعشاریہ آٹھ اور سری لنکا ایک اعشاریہ نوفی صد خرچ کر رہے ہیں۔ پاکستان میں صحت عامہ کا نظام عوامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں میڈیکل کالجوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر ہے جہاں سے ہر سال ڈاکٹر بننے والوں کی تعداد انتہائی کم ہے ہے۔ ملک میں بڑھتی آبادی کو دیکھتے ہوئے میڈیکل کالجوں اور میڈیکل طلبا کی تعداد دگنی کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ملک میں ڈاکٹروں، نرسوں اور دانتوں کے ڈاکٹروں کی کمی ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے زیادہ تر ڈاکٹر حضرات بیرون ممالک میں کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں طبّی سہولتوں کا حصول اتنا مہنگا ہو چکا ہے کہ عام شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنے علاج معالجے کے لیے کافی مالی وسائل دستیاب ہی نہیں ہوتے۔ اس پس منظر میں یہ سماجی حقیقت بھی بڑی تکلیف دہ ہے کہ ملک میں ہر سال نچلے متوسط طبقے کے تقریبا چار کروڑ شہری غربت کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہماری حکومت نے آج تک صحت پر کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا جس سے غریبوں

کو ریلیف مل سکے۔ سوائے امیروں کی جیبیں بھرنے کے،آج ہمیں اپنی صحت پر اپنی آمدنی کا 75 فی صد خرچ کرنا پڑتا ہے جبکہ نیپال میں یہ شرح 71.9 فی صد، چین میں 61.2 فی صد اور سری لنکا میں 53.8 فی صد ہے۔ پاکستان میں ہر سال بہت سے مریض صرف غربت کی وجہ سے اسپتال کا خرچ نہیں اٹھا پاتے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ صحت کے شعبے کا یہ حال ہے کہ دیہی علاقوں میں مراکز صحت کی بڑی تعداد عملے اور دواؤں سے محروم ہے۔ شہروں میں بھی چند سرکاری اسپتالوں کو چھوڑ کر بیشتر سرکاری ڈسپنسریوں کی حالت غیر تسلی بخش ہے۔ غریبوں کو گھنٹوں قطاروں میں کھڑے ہو کر معمولی مکسچر حاصل ہوتا ہے۔ بیشتر دوائیں باہر سے خریدنی پڑتی ہیں۔ کئی خیراتی اداروں کی طرف سے اسپتالوں میں داخل مریضوں کے لئے خوراک کی فراہمی کا بندوبست نہ ہو تو خدا جانے ان پر کیا بیتے۔ ملک میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اپنی جملہ کوششوں اور وسائل کو مربوط بناتے ہوئے جلد سے جلد صحت کی بہتری کا نظام متعارف کرانا چاہیے، مطلب یہ کہ موجودہ عشرے کے آخر تک ہر پاکستانی شہری کو حکومت کی طرف سے مہیا کردہ مکمل طبّی سہولتوں تک رسائی ملنی چاہیے۔

پاکستان میں ہر سال ہونے والی اموات کے تین چوتھائی حصے کی وجہ امراض قلب، نظام تنفس کی بیماریاں، ذہنی امراض، ذیابیطس اور سرطان جیسی دائمی عارضے ہیں جن کے خلاف حکومت کو ایک جامع ایکشن پلان ترتیب دینا ہوگا تاکہ ملک کی پوری آبادی کی طبّی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ صحیح وقت پر صحیح کھانا کھانے سے ہم صحتمند رہ سکتے

ہیں۔ ہمیں اپنی خوراک میں سبزیوں کی مقدار اور اناج کو بڑھانا ہوگا۔ دودھ بغیر بالائی کے اور کھانے کا تیل استعمال کیا جائے نمک اور چینی کا استعمال کم رکھنا چاہیئے تاکہ دل اور گردے کی بیماریوں سے بچا جاسکے۔ خوراک اور طرز زندگی میں تبدیلی لاکرامراض سے بچا جاسکتا ہے۔ تعلیم و صحت کے میدانوں میں ترقی کے لئے فنڈز مہیا کرنے، جامع منصوبہ بنانے اور ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔

رہنما کی تلاش

جب سے کائنات وجود میں آئی ہے تب ہی سے اس پہ بسنے والے ذی روح کو ہر دور میں کسی رہنما کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔جو انھیں صحیح راہ دکھا سکے ان کی رہنمائی کر سکے اور پیدا ہوتے بگاڑ کو روک سکے۔ تبھی تو جب بھی کسی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو یہ رہنما و ہمدرد کسی مشعل کی صورت اپنا کردار ادا کرتا ہوا اندھیروں میں بھٹکے ،جہالت کی تاریکیوں میں دم توڑتے انسانوں کو بصیرتِ شعور بخشتا ہے اور کسی طبیب کی مانند ان کے درد کا درماں کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو آج کے دور میں بھی ایسے رہنما موجود ہیں جو معاشرے اور سسٹم میں موجود بگاڑ کو درست کرنے کے لیے ہر وقت مصروفِ جہد رہتے ہیں اور ملک و قوم کی اصلاح کے لیے اپنا نایاب کردار ادا کرتے ہیں۔ میں جس رہنما و ہمدرد کی بات کر رہا ہوں اسے اگر پاسبانِ قلم کہہ کر مخاطب کروں تو میرے خیال سے غلط نہیں ہوگا۔ یہ پاسبانِ قلم اپنے قلم کی طاقت سے قوموں کی سوچ اور ان کے اندازِ فکر کو نئی راہ دکھاتے ہوئے ان کی اصلاح کرتا ہے۔ان کے لیے غور وفکر کے نئے و روشن در کھولتے ہوئے بوسیدہ و زنگ آلود ذہنوں کو آبِ علم و شعور سے سیر اب کر کے انھیں نکھار بخشتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اندھیرا، جہالت حد درجہ ہو جائے تو انسان اپنے رہنما کی تلاش میں نکلتا ہے ۔پھر اس

اندھیرے سے چھٹکارہ پانے تک اور بوسیدہ وناتواں شعور کے توانا ں ہونے تلک یہ تلاش حدِ نگاہ تک وسیع موج بے کراں کی مانند دنیا کے اس لا محدود سمندر میں جاری رہتی ہے۔ ہاں اگر خیالات میں پاکیزگی، پختگی اور ارادے صادق ہوں تو یہ تلاش رنگِ حنا کی مانند صفحہ قرطاس پر اُمنڈ آتی ہے اور دنیا کا یہ بے کراں سمندرایک کوزے میں سمٹ آتا ہے۔ لیکن اگر رہنما خود چل کر پاس آ جائے اور پلک جھپکنے میں ہر تاریکی کو شعورِ روشن میں بدل دے تو یہ کم ظرف انسان کس طرح ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے متبرہ ہو جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کس طرح یہ رہنما اس کے لیے شعور کی کرنیں بکھیرتا ہے، اسے تاریکی سے آزادی دلواتا ہے،اسے دیدہ واری بخشتا ہے اور بدلے میں اسے تسلی و تشفی کے دو بول تک نہیں ملتے۔ حد درجہ افسوس و رنج کے ساتھ اگر پلٹ کے دیکھیں تو اس کے تمام تر بے لوث جذبات کے بدلے اس کے حصے میں اپنوں ہی کی بے رُخی آتی ہے۔ ہمارے درمیان ایسے بے شمار پاسبانِ قلم موجود ہیں جن سے ہمارا بد نصیب معاشرہ مکمل طور پر فیض یاب نہیں ہوتا۔ پاسبانِ قلم کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار ایسے بہت سے نام ہیں جو میرے شعور میں شور مچاتے ہیں۔ جنھیں وہ عزت نہیں دی گئی جس کے وہ حق دار ہیں اور تھے۔ حساس دل رکھنے والے ان پاسبانِ قلم کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے یہ حق دار ہیں۔ ہر غیر پر قلم اٹھانے والے، معاشرے اور آگاہی کے درمیا issues اخلاقی اور نا قابلِ قبول ن

تعلق کو مضبوط کرنے والے یہ قلم کے پاسباں کیا اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں سراہا جا
ئے؟ جبکہ اکثر سچ کا پرچار کرنے کے عوض انھیں بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑتا
ہے۔اور بعد از انتہائی حالات میں انھیں سچ کو screen پر لانے کے جرم میں جان
سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ مگر ہر طرح کے ایثار کے بعد بھی انھیں وہ تحفظات فرا
ہم نہیں کیے جاتے جو ان کی ضرورت ہوتے ہیں۔ حتیٰ کے جن سہولیات کے وہ اہل ہو
تے ہیں وہ بھی انھیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ مگر اس سب کے باوجود بھی اگر وہ اپنا سفر
جاری رکھتے ہیں تو یقیناً وہ پھر عزت کے قابل ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کے ان کی ہر طر
ح سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ ورنہ ایسے معاشرے جو اپنے رہنماؤں کی عزت و تکریم
نہیں کرتے تاریخ کبھی بھی انھیں سنہری حروف میں رقم نہیں کرتی۔ معاشرے کو ایسے
دیدہ وروں کے لیے برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے جو برائی کو ختم کرنے میں اہم کردار
ادا کرتے ہوئے غلط نظریات رکھنے والوں کی اصلاح کرتے ہیں اور انھیں حقیقت سے
روشناس کرواتے ہیں۔ یہ پاسباں ہر وقت معاشرے کی تراش خراش میں مصروفِ عمل
رہتے ہیں تاکہ وہ ایک بہترین ہیرے کی صورت اختیار کرلے۔ عام لوگوں سے ہٹ
کے یہ اپنا وقت ملک و قوم کی بہتری کے لیے وقف کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں
پر غور کرتے ہیں اور پھر لوگوں کو آگاہی کی روشنی سے منور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ
یقیناً عام نہیں ہوتے بلکہ ان کی قدروقیمت قدر کرنے والے ہی جان سکتے ہیں جو عقل
و شعور رکھتے ہیں اور اس با

ت سے آگاہ ہیں کہ یہ لوگ ہمارے معاشرے کے لیے کتنے اہم و ملزوم ہیں کہ ان کے
بغیر کبھی بھی صحت مند معاشرے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ قرآنِ کریم میں بھی اللہ پا
ک فرماتا ہے کہ ''علم رکھنے والے اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے'' ۔ لہٰذا اس آیت مبار
کہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پاسبانِ قلم ہمارے معاشرے کا کوئی عام کردار نہیں
لیا جائے بلکہ یہ وہ اہم کردار ہے جو چاہے تو پورے کے (for guranted) جسے
پورے سسٹم کو بدل دے، نئے فکرو راموز اجاگر کر دے اور صاحبِ شعور، سمجھ رکھنے
والوں کی وسعتوں کو انتہائی وسیع کر دے کہ اس کے ارد گرد علم و شعور کا اجالا ہی اجالا
پھیل جائے اور وہ مکمل طور پر اس میں نہا جائے۔ اس لیے میری تمام پڑھنے والوں
سے گزارش ہے کہ اس رواج کو ہمارے معاشرے کا المیہ نا بنایئے جہاں قلم کے پا
سبانوں کو دیدہ واری بخشنے کے باوجود بھی زمین پر رینگنے والے کیڑے کی مانند سمجھا جا
ئے کہ جسے جب چاہا کسی بھی رقیبِ حق نے اپنے پاؤں تلے روند دیا اور اسے
کرنے والا معاشرہ تصویرِ حسرت بنا تماشا دیکھتا رہے۔ میری گزارش ہے تمام protect
شعور رکھنے والوں سے کہ خدارا ان کی عزت کیجیے ان کی حوصلہ افزائی کیجیے۔ ان کا احترام
ہم سب پر لازم ہے۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے
ساتھ دوام بخشتے ہیں۔ جو اپنا سب کچھ ہار کر زندگی کے سرور کو تروتازہ رکھتے ہیں۔ جو
زمانے کی سختیوں کو اپنے شفیق وجود میں قید کر لیتے ہیں اور ہمارے لیے علم و

شعور کی شمعیں روشن رکھتے ہیں۔

آزادی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

کیسے کہہ دیں کہ ہم آزاد ہیں؟
یہ محافظ نہیں یہ جلاد ہیں!

وطن عزیز کو معرض وجود میں آئے 68 سال کا عرصہ گزر چکا ہے ''یوم آزادی'' ایک طرف تاریخ کے لہو رنگ اوراق کی یاد تازہ کرتی ہے، تو دوسری طرف وہ آزادی کے حسین خواب پر قربان ہوئی قیمتی جانوں، لٹی عصمتوں سے تجدید عہد وفا کا ایک اور موقع بھی فراہم کرتی ہے تاکہ ہم اپنے ماضی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حال کا محاسبہ کریں اور مستقبل کے لئے ان راہوں کا انتخاب کریں جو ہماری قوم کو زندہ ضمیر لئے حقیقی معنوں میں آزاد قوموں کی فہرست میں لا کھڑا کریں۔ ہم آج تک قومی محاسبہ سے نگاہیں چراتے ہوئے ہر سال چودہ اگست کے دن کو بھرپور جوش وخروش سے منانا قومی روایت سمجھتے آرہے ہیں۔ جشن آزادی کا مقصد بحیثیت قوم ہمارا قومی محاسبہ ہونا چاہیے جو گزشتہ ماہ و سال کے آئینے میں ہمیں ہماری ناکامیاں اور کامیابیاں صاف صاف دکھائے تاکہ ہم دوسری قوموں سے مقابلہ کرنے کا ظرف پیدا کر سکیں۔ اگر آزادی کا صحیح مفہوم سمجھنا ہے تو ایک نظر جرمنی اور جاپان پر ڈال لیجئے جو دوسری جنگ عظیم 1945 کی بھیانک تباہی کے بعد دوبارہ نئے سرے سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں جٹ گئے تھے اور ہم نے بھی تقریباً اسی وقت 1947 میں ایک نوزائیدہ آزاد مملکت کے طور پر اپنا

سفر اختیار کیا تھا اگر آج ان سے موازنہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ 68 برس کا عرصہ آگے کی بجائے ہمیں مزید صدیوں پیچھے لے گیا ہے۔ جرمن قوم کے اتحاد و یکجہتی نے دیوار برلن تک گرادی ... مگر ہماری قومی ناؤ فرقہ وارانہ چھیدوں نے قومی سلامتی منافرت کے سیلاب میں بہادی۔ جاپانی قوم کے حوصلے اور قوت ارادی نے انہیں ایک بار پھر سے دنیا کی عظیم ترقی یافتہ قوموں میں سر فہرست لا کھڑا کیا .... مگر جہالت اور ضمیر فروشی نے ہمیں آسمان کی بلندیوں سے ذلت کی گہرائیوں میں لا پٹخا ... کہ آج ہمیں آزادی کا دن تو یاد رہا مگر آزادی کا حقیقی مفہوم کیا ہے یہ بھول گئے . . آج تک ہم جس نام و نہاد آزادی کی مالا جپتے چلے آرہے ہیں وہ تو ہمیں کبھی نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی اگر ہمیں اپنی قومی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آزادی کا جشن منانا ہے تو پھر شوق سے منایئے مگر ساتھ ساتھ غربت ، بے روزگاری ، خودکشیوں ،اخلاقی اقدار سے آزادی اور قانون سے آزادی کا جشن بھی منایئے ...، دہشت گردی اور جرائم میں آزادی کا جشن بھی منایئے ... انسانی حقوق سے آزادی کا جشن بھی منایئے ... اور پھر اپنی قومی جہالت کی آزادی کا جشن بھی منایئے۔ آج ہم بحیثیت قوم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں چاروں طرف سینکڑوں بحران جبڑے کھولے ہماری ذرا سی لغزش کے منتظر ہیں۔ ایک طرف ہمارا سب سے بڑا بحران نظریاتی یکجہتی ، فکری وحدت اور اتحاد و اتفاق سے محروم ہے تو دوسری طرف امن و امان کی دگرگوں صورتحال کا بحران ہے ، ایک طرف ہمارا حال ہے جو روز بروز

لا قانونیت کی دلدل میں دھنسا چلا جا رہا ہے تو دوسری طرف ہمارا مستقبل وہ نوجوان نسل ہے جسے علم کو اپنا آلہ کار بنانا ہے، مگر وہ خود دہشت گردی کا آلہ کار بن چکی ہے۔ جن کے ہاتھوں کو کل قوم کے مستقبل کی باگ ڈور سنبھالنی ہے ان میں آج کتابیں نہیں بلکہ قوم کی تباہی کے سامان ہیں۔ دماغ علم کی روشنی سے منور نہیں بلکہ اسلحہ اور ہتھیاروں سے لیس ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ طبقاتی تفریق، استحصالی نظام، ہنر کی نا قدری، تعلیمی ڈھانچے کا کھوکھلا پن، اختیارات کا نا جائز استعمال اور اخلاقی اقدار کا فقدان جیسی خوفناک آندھیاں ہیں جن سے ہمارا حال بری طرح لرز رہا ہے۔ جمہوری روایات کے فقدان کا المیہ جس نے ماضی تباہ حال سے بے حال اور اب مستقبل کو رسوا کرنے کا بیڑہ اپنی قوم کو ہر پل گرتی معیشت کے ساتھ ہاتھوں میں کشکول کا تحفہ دے کر ایک شان سے اٹھا رکھا ہے۔ غریب کا چولہا بجھ گیا ہے تو اشیائے خورد و نوش کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں۔ 60 فیصد ہم وطن پہلے ہی خط غربت تلے زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں۔ پینے کے صاف پانی سے محروم اور بجلی کی نعمت چھینی جا چکی ہے۔ نظام صحت کے اخراجات نا قابل برداشت اور ایک عام انسان کے بس سے باہر ہیں۔ابابیلوں کے لشکر ہم جیسی بے ایمان، بے یقین اور بے حس قوموں کی طرف نہیں اترا کرتے۔ ہم وہ قوم ہیں کہ جن کے مولوی حلوے کی چند پلیٹوں کی خاطر تو کافر میں مومن میں مسلمان تو مرتد کا ورد کرتے ہیں اور ہم اس پر آمین کرتے چلے آ رہے ہیں ... ہم خود وہ غربت کی ماری قوم ہیں جو یوں

تو جمہوریت کا رونا روتے ہیں مگر چودھری وڈیرے اور جاگیر دارانہ نظام کے تناور درخت کو اپنے لہو سے سینچتے چلے آرہے ہیں . ... ہم وہ بے غیرت قوم ہیں جو'' امریکی کتے ہائے ہائے'' کے نعرے تو بہت غیر تمندی سے لگاتے ہیں مگر جب بھی مصیبت پڑے کشکول تھامے بے غیرتی سے اسی کی طرف دوڑتے ہیں ....ہم وہ بے ضمیر قوم ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اپنے مسلمان بھائیوں کا لہو تک بیچتے ہیں ...کہ آؤ ہم پر سے اقتصادی پابندیاں اٹھانے کا وعدہ کرو ہم پاکستان کو قبرستان بنانے کے لئے تمہاری راہیں ہموار کرتے ہیں ... آؤ اور مال وزر سے ہماری تجوریاں بھر دو ہم اپنے مادر وطن کے کسی بھی حصے پر بمباری کرنے کی پوری اجازت دیتے ہیں ... آؤ اور ہمیں جنت کے ٹکٹ دو ہم ملک کو جہنم بنا کے تمہارے ازلی سپنے پورے کرتے ہیں .... آؤ اور صرف ہمیں مسلمانیت کا سرٹیفکیٹ دے دو اور ہم اپنی سرزمین پاک پر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے لہو کی ندیاں بہا کر تمہاری خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں ....یہ ہے ہمارا اسلامی جمہوریہ پاکستان، جہاں عدالتوں میں انصاف، درسگاہوں میں ڈگریاں، اسمبلیوں میں ضمیر، اسپتالوں میں جعلی دوائیاں اور مسجدوں میں ایمان تک بکتے ہیں۔ اگر مسجدوں سے نفرت کی منادی اور مدرسوں سے خودکش بمبار جہادی بن کر نکلتے ہیں تو نکلنے دو ہم اپنے گھروں میں بیٹھے اسلام کے نام کی مالا جپتے رہیں گے۔ اگر امریکی فوج اور طالبان نامی ظالمان ہماری ہی سرزمیں پر ایک دوسرے کا لہو پی کر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو کرنے دو، ہم منرل واٹر سے اپنی پیاس

بجھاتے رہیں گے۔اگر ماؤں بہنوں کی عصمتیں نیلام ہوتی ہیں تو ہونے دو ہم جوش و خروش سے مدر ڈے منا لیا کریں گے ..... اگر حکمران ملکی خزانہ لوٹتے ہیں تو لوٹنے دو، تو ہم بسنت کی چڑھتی پتنگیں لوٹتے رہیں گے ....اگر ہم وطنوں کی تمناؤں کے پھول مرجھاتے ہیں تو مرجھانے دو ہم ویلن ٹائن ڈے دھوم سے منا لیا کریں گے ...اگر غریب کا چولہا بجھتا ہے، فاقوں سے بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بلبلاتے ہیں، صاف پانی نہ پینے سے ہزاروں اموات ہوتی ہیں، بے روزگاری کے ستائے مینار پاکستان سے چھلانگیں لگا کر جان دینے والوں کی آرزوئیں لٹتی ہوں یا پھر مزار قائد پر قوم کی بیٹیوں کی عصمتیں ... ہمیں سوچنے کی بھلا کیا ضرورت ہے ہمارے لئے تو اتنا ہی بہت ہے کہ ہمارا پاکستان آزاد ..... ہے۔ پاکستان زندہ باد...پاکستان زندہ باد...پاکستان زندہ باد

میرے عزیز ہم وطنو! ...کب تک خون بہے گا اپنے اس گلستان میں ؟ ...کب تک وقت کی آندھیاں ہماری شاخیں قلم کرتی رہیں گی ؟ . . کب تک ہم اپنے ہاتھ اپنے ہی ہم وطنو کے لہو سے رنگتے رہیں گے ؟ ...کب تک ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی اس نام و نہاد آزادی کا جشن دھوم دھام سے مناتے رہیں گے ؟ ... کب تک اس 68 سالہ بوسیدہ آزادی کے تصور کو لئے خود کو دھوکہ دیتے رہیں گے ؟ ...احساس کی کونپلیں اب بھی نہ پھوٹیں تو پھر کب پھوٹیں گی ؟ ہمارا سویا ہوا ضمیر اب بھی نہ جاگا تو پھر کب جاگے گا ؟آخر کب تک ہم اپنی ناکامیوں پر آزادی کے

جشن کا پردہ ڈال کر ناچتے رہیں گے ؟... آخر کب تک ؟ ایک نہ ایک دن تو ہمیں بھی وقت کے کٹھرے اور ضمیر کی عدالت میں کھڑے ہو کر اس سوال کا جواب دینا ہی ہو گا کہ ’’ کیا ہم آزاد ہیں ؟

سچ کی تلاش

وہ سچ کی تلاش میں تھا۔ اس نے آنکھ ایسے ماحول میں کھولی جس کی تمنا دوسرے کئی برس سپنوں کی طرح کھلی آنکھوں میں بساتے ہیں۔ مگر جن میں مایوسی لوڈ شیڈنگ کے اندھیروں سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے۔ معاشرہ سے کٹ کر ضرورت صرف معاش رہ جاتی ہے۔ پھر انسان بھی انس آن نہیں رہتا۔ رشتوں کے ٹوٹنے کی آواز سوکھی لکڑی کے تنے سے الگ ہونے جیسی ہوتی ہے مگر سنائی نہیں دیتی۔ اپنے پن سے جدا ہونے کا درد محسوسات سے خالی کبھی نہیں ہوتا۔

اس کا یہی درد پیشانی پہ پڑی سلوٹوں سے عیاں تھا۔ ہر سوال کے آخر میں کیوں اور پھر ایک نئے سوال کی ابتداء، یوں نہ تو وہ سوال سے اپنے آپ کو روک پایا اور نہ ہی جواب سے تسلی۔ " کیوں " نے اس میں گھبراہٹ کا سایہ پھیلا رکھا تھا۔ سایہ اتنا گہرا ہو گیا کہ مایوسی کے اندھیرے میں اسے روشنی کی تلاش نے بے چین کر دیا۔ باپ سے سوال کرتا تو وہ دوسری بیوی اور اس کے پہلے بچوں کے معاملات میں الجھنے کی وجہ سے اسے پہلی غلطی کی سزا نظر آتا۔ اس کی پہلی بیوی دوسرے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے اس کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئی اور دوسری بیوی اپنی پہلی اولاد کے ساتھ ساتھ اس کی بچی پر بھی اپنا حق جتاتی۔

ہمسائے اس سے نالاں ، دوست اس سے کنارہ کرتے ،مذہب میں اسے پناہ نہ ملتی۔وہ الجھتا چلا گیا۔نشہ کی بجائے اس نے دوا کا سہارا لیا۔ جس سے خیالات کچھ دیر ستا لیتے مگر آنکھ کھولتے ہی اسے بے رحم سوالوں کے تھپیڑے آ لیتے۔وہ سوالوں کی گٹھڑی کندھوں سے اوپر دماغ میں سجائے سوالی بنا پھرتا۔آخر اسے کس کی تلاش تھی۔ کہیں رشتوں سے فرار کا راستہ ڈھونڈنے کے لئے سہارے کی تلاش میں تو نہیں مارا مارا پھرتا رہا۔ملاقات دوسری بار سوال پہلے والا۔اسے ایسی کتاب کی تلاش کیوں جس کے ایک ایک لفظ پہ سچائی لکھی ہو۔ بندے پہ جس کا اثر تو ہو مگر دسترس و اختیار سے اوپر ہو۔ جن کی نظریں اپنے چاروں اطراف.برپا ہنگامہ خیزی سے دوچار ہوں۔ دماغ کے تندور میں خیال کے پیڑے سے اختلاف کی روٹی پکانے کا عمل جاری و ساری ہو۔ وہاں قلب میں میوے انتظار میں ہی سوکھ جاتے ہیں۔جو زندگی آنکھوں اور کانوں سے بسر کرتے ہیں زندہ قلب سے نہیں رہتے۔ جو لفظ پڑھنے یا سننے سے ذہن میں سما جائیں مگر قلب میں نہ اتر پائیں تو.برین واش تو ہو جاتا ہے مگر قلب صفائی سے محروم رہ جاتا ہے۔دروازے پہ دستک گھر کے مکین سے تعلق کی غماز ہوتی ہے۔ مکین سے محبت ہو تو دستک ملائمت احساس سے بھری ہو گی۔ دوسری صورت میں ہاتھ کی ضرب آنے والے کے ارادے کا ڈھنڈورا پیٹے گی۔اللہ سبحان تعالی کے فرمان تک پہنچنے کے لئے ذہن کے دریچے بند کر کے قلب کی سیڑھی سے سچائی کی رسی تک رسائی ممکن بنائی جا سکتی ہے۔ اگر جینے میں کیوں ، کیا، کیسے کے حروف اضافی کی تکرار ہو تو سوالوں کی

بھرمار کے وزن سے پیشانی پہ سلوٹیں بڑھتی ہی رہتی ہیں۔چاند پر پڑتی سورج کی شعائیں اسے گھٹا بڑھا کر تاریخوں میں بدل دیتی ہیں۔یہی شعائیں زمین پر دن رات کی تمیز کرتی ہیں۔اس سے آگے کا علم نہیں۔ کہیں مفروضے تو کہیں کہانیاں ہیں۔زمین میں ننھے بیج کے دبانے سے خوشبو اور مہک میں لپٹنے تک پھل اور پھول ایک وقت کی حقیقت کے عکاس ہیں۔پل بھر کے چکھنے کی داستان نہیں۔جو ابر کے کرم کے محتاج ہیں۔جو اتاریں نہ جا سکیں تو خود ہی اتر کر زمین سے لپٹ کر فنا ہو کر پھر نئی زندگی بن جاتے ہیں۔رب العالمین کا تصور کرنے کے لئے بند کمرے سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آنا ہو گا۔

نعمتوں کا تصور باغوں و بہاروں سے جدا ہو کر رنگ نہیں دکھا پائے گا۔ مہتاب کو اپنا کہہ دینے سے کسی کی ناراضگی کا اندیشہ نہیں رہتا۔کیونکہ زمین کے عشق میں وہ خود دیوانہ وار جھومتا ہے۔ہوائیں زندگی کی محبت میں بستر سے لیٹی سانس تک آمدورفت جاری رکھتی ہے جو زرد پتوں کو گرا دیتی ہیں اور آندھی بن جائیں تو اڑا دیتی ہیں۔خیالات کی زمین پر جب شک کی پنیری لگائی جائے گی۔ تو اختلاف کی فصل کو کاٹنا بہ امر مجبوری بن جائے گا۔دوسروں کا احتساب کرنے سے پہلے اپنا محاسبہ ضروری ہے۔ترازو میں تولنے والا ایک طرف ہمیشہ اپنے پاس باٹ رکھتا ہے۔ جس کے وزن کا پورا ہونا تول کی گارنٹی ہے۔نئے ماڈل کی کار، پوش علاقے میں مہنگے بنگلے خواہشات کے غلاموں کی امارت کی منڈیوں میں نیلام ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جسے پانے کے لئے آزادی کے پروانے اپنی جانوں پر کھیل جاتے

ہیں۔ باتیں تو پرانی تھیں اسے نہ جانے کیوں نئی محسوس ہوئیں۔ شائد اسے دنیا میں جینے کے لئے جینے کا ڈھنگ ہی بتایا جاتا رہا۔ مگر سچ تو قلب میں ایسے اترے جیسے پھل میں رس اترتا ہے۔ کلام کا اثر قلب کے پاک ہونے سے بڑھ جاتا ہے۔ علم تو معلم کا محتاج ہو سکتا ہے۔ عقیدتِ عشق، محبوب کے وصل سے وابستہ نہیں۔ خوشنودی کے لئے رضا بھی درکار ہوتی ہے۔زیادہ سوالات کبھی گتھیاں سلجھانے کی بجائے خود ہی اُلجھ جاتے ہیں۔ جس سے طالب متعلّم ہو جاتے ہیں اور فیصلے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو علم کی معراج تو بن جاتے ہیں مگر عمل کی میراث نہیں۔۔برسہابرس کی دھول چند لمحوں میں قلب سے دھل جائے تو شکریہ کا ہار الفاظ کے گلے میں نہیں ڈالا جائے گا۔بلکہ اس قلب کو پہنایا جائے گا جو سچائی کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا تھا۔ لفظوں کو موتیوں کی مالا بنا کر جس نے پرو لیا۔

موت سے بھی بڑا حادثہ ہے زندگی

آج کا انسان جو کہ بظاہر اچھا بھلا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا کام کاج میں مصروف نظر آتا ہے۔ دراصل یہ زندہ نہیں ہے۔ یہ مردہ ہو چکا ہے، بقول شاعر

زندہ لاشوں کی بھیڑ ہے چاروں طرف!

موت سے بھی بڑا حادثہ ہے زندگی۔

یہ سب چلتی پھرتی لاشیں ہیں کیونکہ ان کے دل مردہ اور تاریک ہو چکے ہیں، جن کی روحیں نور مصطفیٰ ﷺ سے منور ہونی چاہیں، وہ اس حقیر سی دنیا میں ہمیشہ رہنے کی جستجو میں ہیں، شہر شہر گاؤں گاؤں گھر گھر جھگڑے ہی جھگڑے نظر آ رہے ہیں۔ کوئی مذہب کے نام پر لڑ رہا ہے تو کوئی فرقہ واریت کے نام پر اور کوئی رنگ و نسل کے لئے لڑ رہا ہے تو کوئی زمین و جائیداد کی خاطر اپنے ہی بھائی کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے ہمارے اخبارات اور نیوز چینل ایسے ہزارہا واقعات سے بھرے پڑے ہیں، ان تمام فسادات کی فقط ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے لئے تو ہر ایک سے بھلا چاہتا ہے۔ لیکن خود کسی کا بھلا نہیں چاہتا، ان قیامت خیز حالات میں مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو بے قرار دلوں کو اطمینان بخش دے، مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو غم زدہ انسانوں کو تجلیات مہر محبت سے

خوشحال کردے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو مظلوموں کی آبرو کی پاسبانی کرے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو ابن آدم کے سینے میں دہکتی ہوئی آتش نفرت وحسد کو گلزار کردے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو رنگ ونسل کے سب جھگڑے مٹا کر فقط انسانیت کا درس دے مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو اپنی سخاوت سے گھر گھر میں بھوک افلاس کے کہرام کو شکم سیری میں بدل دے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو نسل نو کی ہوس پرست نگاہوں پر حجاب شرم وحیاء ڈال دے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو تاریک اور مردہ دلوں کے آخری کونوں تک شمع نور عشق مصطفیٰ ﷺ سے بھر دے۔اور کمزور ایمانوں کو نئی زندگی نواز دے مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو انسان کے زنگ آلودہ ایمان کو کمال بندگی تک لیجائے۔اور تجلیات توحید سے زنگ آلودہ ایمان منور ہو کر جگمگانے لگے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو بے گناہوں کے بہتے ہوئے لہو کو روک دے اور برسات امن وامان سے وطن عزیز کی سرزمین پاک کے خطے کو ہرا بھرا کرکے خوشحالی کی بہاریں نواز دے ،مجھے تلاش ہے اس نظر کی جو انسان کو گمراہی اور جہالت کی تاریک اور جان لیوا دلدل سے نکال کر قرآن وحدیث کی ہمیشہ قائم رہنے والی سچی اور پاکیزہ نوانیت میں لے آئے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو احکامات مصطفیٰ ﷺ کی پاسداری کرے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو اولاد کو ماں باپ کے حقیقی مقام ومرتبے سے آگاہ کرکے انہیں شعور ادب واحترام کا درس دے،مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو جسمانی اور روحانی بیماریوں کی مسیحائی کرے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو انساں کی روح پر لگے کفر وشرک کے

سب داغ دھو کر پاکیزہ کردے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو ہر جگہ قانون مصطفیٰ ﷺ کو نافذ کرے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو انسان کو اپنے خالق حقیقی کی رضا میں راضی رہنے کا ہنر سیکھا دے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو بے لوث بھٹکے ہوئے انسانوں کی رہنمائی کرے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دلائے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو انسان کو اسرار حق سے روشناس کردے۔مجھے تلاش ہے اس نظر کی کہ جو تمام فرقوں سے سب جھگڑے مٹا کر پرچم مصطفیٰ ﷺ کے سائے میں منزل توحید پر پہنچا دے۔مجھے تلاش ہے ایسے نظر مرد کامل درویش کی ہاں مجھے تلاش ہے، مجھے تلاش ہے۔

وطن عزیز کے معاشی حالات بد سے بدتر کیوں؟

حضرتِ عمر فاروقؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے پوچھا کہ تم میری دوری کو کتنا عرصہ برداشت کر سکتی ہو زوجہ محترمہ نے نہایت ادب سے جواب دیا زیادہ سے زیادہ چھ ماہ۔۔۔ حضرتِ عمر فاروقؓ نے فوراً فرمان جاری کیا کہ کسی فوجی کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ محاذ پر نہ روکا جائے اور ہر سپاہی کو چھ ماہ کے بعد چھٹی دی جائے۔ حضرتِ عمر فاروقؓ کا یہ فرمان تمام دُنیا کی سپاہ پر تاحال لاگو ہے اور شدید جنگ کی صورت میں بھی اس پر من و عن عمل کیا جاتا ہے۔ جبکہ برطانیہ نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران اپنے فوجیوں کے دل بستگیوں کیلئے چھاؤنیوں کے نزدیک پیشہ ور عورتوں کے اڈے بسائے اور انہیں مکمل تحفظ بھی دیا۔ مگر عساکرِ اسلامی نے اپنے سپاہ کی کردار سازی پر تاحال بھرپور توجہ رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ قلیل تعداد کثیر پر بھاری ہے۔تلاشِ معاش کے سلسلے میں ہجرت کا سلسلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا اولادِ آدم کا وجود مگر زیادہ تر لوگ زمین کا سینہ چیر کر اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرتے تھے اور آج بھی آبادی کا 75% طبقہ اسی شعبہ زراعت سے وابستہ ہے جو سخت سردی اور شدید گرمی کی پرواکیے بغیر زمین کا سینہ چیر کر نہ صرف اپنی بلکہ شہروں میں رہنے والے باسیوں کی خوراک کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ 60ء کی دہائی

سے قبل وطن عزیز کے زیادہ تر لوگ دیہات سے شہروں کا رُخ کرتے تھے اور فصل کی تیاری تک شہروں میں کام کاج کرتے اور کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی یہی لوگ اپنے اپنے دیہاتوں کو لوٹ جاتے تھے۔ 60ء کی دہائی میں جب وطن عزیز میں پہلی بار مارشل لاء لگا تو سیاسی عدم استحکام مزید شدید تر ہو گیا جسکے بطن سے معاشی عدم مساوات نے جنم لیا اور ملکی دولت اور وسائل چند خاندانوں تک محدود ہو گئے زیادہ تر لوگوں نے سیاسی پناہ کے بہانے مغربی ملکوں کا بالعموم اور برطانیہ کا بالخصوص رُخ کیا وہاں کی چکا چوند اور ترقی کے مواقع وافر ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت وہاں آباد ہونے لگی پھر بھی صورتحال اتنی ابتر نہ ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے 70ء کی دہائی میں سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد جب باقی ماندہ پاکستان کے معاشی حالات انتہائی دگرگوں ہو گئے اور راشن بندی ہونے لگی تو ایسے میں ذوالفقار علی بھٹو جو خارجہ امور کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ دُنیا کے بیشتر حکمرانوں سے ذاتی مراسم تھے۔ بالخصوص 74ء کی اسلامی سربراہی کانفرنس کا میزبان ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور خلیجی ریاستوں کے حکمران اور بالخصوص سعودی عربیہ کے شاہ فیصل مرحوم) سے توانکے تعلقات ضرب المثل تھے۔ عرب کے صحراؤں میں جب سیال) سونا دریافت ہوا تو مغربی ممالک نے اور بالخصوص امریکہ نے اس خطہ پر اپنے پنجے گاڑھنا شروع کر دیئے جبکہ بھٹو (مرحوم) نے عرب کے شیوخ کو پاکستان سے افرادی قوت منگوانے پر راضی کر لیا چنانچہ گرین پاسپورٹ پر

سینکڑوں لوگ سہانے مستقبل کی خاطر عرب کے صحراؤں کا رُخ کرنے لگے جس کے نتیجے میں عرب کے صحرا اشاداب ہونے لگے دوسری جانب وطن عزیز کے متوسط طبقے کے لوگ بھی خوشحال ہونے لگے مگر اس خوشحالی نے بہت سی دوسری معاشرتی برائیوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ وفاشعاری کی جگہ ہوس اور کچے آنگن کے سکون کی جگہ پکے چوباروں میں بے سکونی نے ڈیرے ڈال دیے۔ جو بچے شام ڈھلے اپنے باپ کی راہ دیکھتے تھے وہ باپ کی صورت بھول گئے عورتیں سہاگن ہونے کے باوجود بیوہ جیسی زندگی اور بچے باپ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو یتیم محسوس کرنے لگے۔ انسانی فطرت کے تقاضوں نے وفاؤں کے انداز بدل ڈالے جس کا لازمی نتیجہ عدالتوں میں طلاق اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو گستاخ بنا ڈالا جسکے نتیجے میں جن بچوں کے سہانے مستقبل کی خاطر باپ نے عرب کے صحراؤں کی خاک چھانی تھی وہی بڑھاپے کی لاٹھی کی بجائے دکھ کا باعث بننے لگے نتیجتاً آج اولڈ ایج ہاؤس جنکا تصور کبھی وطنِ عزیز کے لوگوں نے نہ کیا تھا وہ آباد ہونے کو ہیں۔ انسان کیلئے معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کی مناسب دیکھ بھال اور وقت دینا بھی بہت ضروری ہے۔ مانا کے وطن عزیز کے معاشی حالات اتنے بہتر نہیں اور نہ ہی روزگار کے اتنے زیادہ مواقع میسر ہیں مگر سالہا سال گھر سے دُوری بہت سی معاشرتی بُرائیوں اور مخصوص مشرقی وفاؤں کیلئے زہر قاتل ہے وہ سہاگن شادی کے فوراً بعد سالہا سال کی دُوری برداشت کیسے کر سکتی ہے جسکے ہاتھوں کی مہندی بھی ابھی نہ اتری ہو۔ ہونا تو یہ

چاہیے تھا کہ کم از کم چھ ماہ کے بعد دو ماہ کی رخصت لیکر گھر آتے مگر خلیجی ریاستوں کی دوسالہ ویزہ پالیسی نے تمام ارمانوں کا خون کر ڈالا۔ وطن عزیز کے ارباب اقتدار کو بھی چاہیے کہ وہ سمندر پار پاکستانیوں کے مسائل کو سمجھیں اور ان کے تدارک کیلئے کوئی راست قدم اُٹھائیں۔ میں جب بھی ملک کے ویزہ سیکشن کے سامنے میلوں لمبی قطار دیکھتا ہوں تو چشم تصور میں نوبیاہتا سہاگنوں کے مرجھائے چہرے اور معصوم بچوں کی ترستی نگاہیں ایک لمبی آہ بھرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ یا اللہ وطن عزیز کو بہتر قیادت اور خوشحالی عطا فرما۔

بلیک منی واپس لاؤ

پاکستان دنیا کی نظروں میں یقینی طور پر 14 اگست 1947 کو آزاد اور خود مختار ہو گیا لیکن آزادی کے بعد قوم کے خیر خواہ لیڈران، افسران اور محب وطنوں کے سامنے اس وقت اس عظیم ملک کو خود کفیل بنانے جیسا بڑا چیلنج تھا وہیں اسی کے متوازی ہمارے ہی ملک میں وہ طاقتیں بھی ساتھ ساتھ سرگرم عمل ہو اٹھیں جنہیں ملکی ترقی یا ملک کے غریب عوام کی سلامتی سے الگ اس بات کی فکر تھی کہ وہ کس طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر سکیں اور ایسی ملک مخالف طاقتوں کے ذریعہ ملک لٹنا شروع ہو گیا۔ آج جو لوگ 1947 کے بعد اور اس سے پہلے کی آزادی سے وابستہ تمام واقعات سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے اور سنتے آ رہے ہیں کہ ملک کے تمام بدعنوان لیڈر، افسر، تاجر، جمع خوروں اور بلیک منی جمع کرنے والوں کا پیسہ سوئٹزرلینڈ میں یا سوئس بینکوں میں جمع ہے۔ اب دھیرے دھیرے عوام کو میڈیا کے ذریعہ یہ پتہ چلنے لگا ہے کہ سوئس بینک کے کھاتوں سے متعلق مکمل پرائیویسی برتنے کا کام اور بھی کئی مغربی ممالک کے بینکوں میں کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا ایسی بلیک منی صرف سوئس بینک میں ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی غیر ملکی بینکوں میں جمع ہے۔ پاکستانی معیشت یہاں پھیلی غریبی اور بے

روزگاری، پاکستانی قاعدے قانون اور اپنی ضرورت کے لئے غیر ملکی بینکوں سے وقتاً فوقتاً قرض لینے جیسے حالات بلاشبہ کسی بھی پاکستانی شہری کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنے پیسے کو پاکستان کے بینکوں میں جمع کرنے کے بجائے غیر ملکی بینکوں میں جمع کرے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کا پیسہ ناجائز اور غلط طریقوں سے جمع کیا گیا ہے۔ جسے وہ دنیا کی نظروں سے صرف اس لئے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے کہ ایک تو اس کا پیسہ محفوظ رہ سکے دوسرے یہ کہ وہ پاکستانی مالیاتی قانون سے بچا رہ سکے اور تیسری بات یہ کہ وہ خود کو بدنامی سے بچائے رکھ سکے۔ دیکھا بھی یہی جا رہا ہے کہ مغربی ممالک کے بلیک منی جمع کرنے والے ان بینکوں کی پرائیویسی برقرار رکھنے کے اس قدر اونچے پیمانے مقرر کئے گئے ہیں کہ ابھی تک واضح طور سے کسی بھی کھاتے دار کا نام اور اس کی جمع رقم کا انکشاف ابھی تک نہیں سنا گیا۔ البتہ اگر وکی لیکس جیسی ویب سائٹ یا اس جیسی کسی دیگر سراغ رساں صحافت کے سبب کچھ نام سامنے آجائیں تو یہ بات الگ ہے۔ ایسے بینک بلیک منی کی اصطلاح بھی اپنے ہی طریقہ سے وضع کرتے ہیں مگر پاکستان میں گزشتہ کچھ سال سے غیر ملکی بینکوں میں جمع بلیک منی کا ایشو اس قدر گرمایا ہوا ہے جیسے کہ اس موضوع پر شوروغل کرنے اور ہنگامہ برپا کرنے والوں کو اس بات کا پتہ چل چکا ہو کہ کس شخص کا کتنا پیسہ کس ملک کے بینک میں جمع ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان جیسے ملک کی اقتصادی حالت قطعی ایسی نہیں کہ اس طرح کے منفی اقتصادی ماحول کا سامنا

کرسکے۔ یقینی طور پر پاکستان کو اس سلسلہ میں پوری سنجیدگی سے کام کرنا چاہئے اور غیر ممالک میں جمع پاکستانی بلیک منی جلد از جلد اپنے ملک میں واپس لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔اتنا ہی نہیں بلکہ ایسے غیر قانونی کاموں میں ملوث لوگوں کو خواہ وہ کتنی بھی قدآور شخصیت کے مالک کیوں نہ ہوں ،انہیں قانون کے مطابق سخت سے سخت سزا دی جانی چاہئے اور ایسے لوگوں کے نام بھی جلد سے جلد اجاگر کئے جانے چاہئیں تاکہ ملک کے عوام یہ سمجھ سکیں کہ لیڈر، اداکار، افسر، سماجی خدمت گار یا مذہبی رہنما اور تاجر کی شکل میں دکھائی دینے والا یہ شخص حقیقت میں وہ نہیں ہے جو دکھائی دے رہا ہے بلکہ سادھو کے بھیس میں نظر آنے والا یہ شخص ملک کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ناجائز دولت کی جمع خوری کرنے والے یہی وہ لوگ ہیں جن کے سبب پاکستان کو غریب ملک کہا جانے لگا ہے، لیکن غیر ملکوں میں جمع کالے دھن کے ایشو کو لے کر پاکستان میں ہو رہی ہائے توبہ کی آڑ میں تمام پاکستانی لیڈر، سیاسی جماعتیں اور سیاست میں اعلیٰ عہدوں کے خواہشمند تمام نئے چہرے اس موضوع پر کچھ اتنی زیادہ دلیلیں اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے کہ کالا دھن غیر ممالک سے واپس لانے جیسا سنگین ایشو اپنے موضوع سے بھٹکتا دکھائی دینے لگا ہے اور یہ بھی صاف ظاہر ہونے لگا ہے کہ اس ایشو پر کئے جانے والے شور شرابہ کا مقصد حقیقت میں غیر ممالک سے بلیک منی کی واپسی کا کم ،بلکہ سیاسی طور پر کسی مخصوص شخص یا جماعت کو بدنام کرنے کا زیادہ ہے۔ غالباً ایسے لوگ

یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ملک کے بھولے بھالے عوام اور رائے دہندگان اس طرح کی افواہوں پر جلدی یقین کر لیتے ہیں اور ان کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں لگتا ہے۔ کسی بھی شخص کو بدنام کرنا یہ آخر کہاں کی سیاست ہے اور اسے کس طرح کی سیاست کہا جانا چاہئے ؟ جو بھی سیاستدان اگر قصوروار ہیں یا ان کے خلاف پختہ ثبوت ہیں تو ضرور انہیں تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور ان کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے لیکن ملک کے عوام کو بے وجہ گمراہ کرنا، ملک کے ذمہ دار سیاستدانوں پر کیچڑ اچھال کر خود اپنے اور اپنی جماعت کے لیڈران پر لگے سیاہ دھبوں کو چھپانے کی کوشش کرنا قطعی غیر اخلاقی ہے۔اس طرح کے بے بنیاد شور شرابہ اور الزام تراشی سے صاف ظاہر ہوتا ہے ۔کہ ہم اپنے لیڈران کی بلیک منی کو اپنے بیانات کے ذریعے تحفظ دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔اب جبکہ پاکستان تقریباہر سال سیلاب جیسے عذاب کا سامنا کرتا ہے۔اور ہمارے حکمران ہمیشہ کی طرح غیر ملکی ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہیں کہ کوئی ہماری مدد کرے ۔کیونکہ ہمیشہ سے وہی قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں جو اپنی عوام کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی ہر ممکن مدد میں پہل کرتی ہیں۔جو قومیں غیر ملکی قرضوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی تگ ودو میں لگی رہتی ہیں۔اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے میں ہی اپنی قوم کا ذہن بنائے رکھتی ہیں ۔وہ ترقی نہیں کر سکتیں۔

کرپشن کا بول بالا ہو!

کرپشن جان لیوا مرض ہے جو کسی بھی ادارے کو لگ جائے تو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے،اس سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا،اور جس کسی کو بھی یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے وہ کھانا تو بھول سکتا ہے لیکن مال بنانا نہیں بھول سکتا،کچھ ایسا ہی مرض ہمارے پیارے ملک کو لگ چکا ہے،جو دن بدن میرے پیارے وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے،اور یہ مرض لگانے والے بھی گھر کے ہی بھیدی ہیں جو ملک کو دھیرے دھیرے چاٹ رہے ہیں،اور ان کا پیٹ بھرنے کا نام نہیں لیتا،یہ مرض اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اس سے کوئی بھی ادارہ محفوظ نہیں رہ سکا،اس مرض کی لپیٹ میں حکومتی اداروں کیساتھ ساتھ ہمارے ملک کے پرائیویٹ ادارے بھی آ چکے ہیں،اور یہ مرض اس قدر بڑھ چکا ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا،اب تو پاکستان کا ہر ادارہ چاہے وہ اسکول ہو،کالج ہو،ہسپتال ہو،واپڈا ہو،سوئی گیس کا محکمہ ہو،ڈاک خانہ ہو،بینک ہو،ریلوے ہو،ائیرپورٹس ہوں،یا ایک ادنٰی سے کلرک سے لے کر ایوان صدر ہو،اس کی لپیٹ میں سب ہی آ چکے ہیں،جس ملک کے سابق صدر پر کروڑوں ڈالر کی کرپشن ہو،جس ملک کا سابق وزیراعظم کرپشن کے دھبے سے نہ بچ سکا ہو،جس ملک کی اپوزیشن نے بیرون ممالک میں منی لانڈرنگ کی ہو،جس ملک کے وفاقی اور صوبائی وزراء نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے

ہوں بھلا اس ملک کی عوام کو سکھ کا سانس کیسے مل سکتا ہے، میں یہ سب سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک گھر ہے اور لوٹنے والے لاکھوں کی تعداد میں پھر بھی ہمت ہے گھر بچا ہوا ہے، بات ہو رہی ہے کرپشن کی تو گزشتہ دنوں انگلینڈ میں مقیم ایک دوست نے مجھے ای میل کرکے بتایا کہ چند ماہ قبل اسے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم کی ضرورت تھی جو اس کے مویشیوں کے لئے چارہ لاسکے اور ان کا دودھ بھی فروخت کرسکے ،اسی سلسلے میں اس نے اخبار میں ایک اشتہار دیا کہ اسے مویشیوں کی دیکھ بھال کے لئے ملازم کی ضرورت ہے خواہش مند رجوع کریں،اشتہار چھپنے کے اگلے روز بہت سے لوگ اس کے پاس ملازمت کے سلسلے میں حاضر ہوئے اور ہر ایک نے ملازمت حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی روداد سنائی،ان میں سے ایک پاکستانی بھی تھا،جس نے بتایا کہ اس کے پاکستان میں غریب ماں باپ ہیں،اور دو بہنیں اور چھوٹے بھائی ہیں اسے کام کی اشد ضرورت ہے ،چنانچہ میں نے پاکستانی کی روداد سننے کے بعد اسے ملازمت پر رکھ لیا کہ غریب آدمی ہے اور بے روزگار بھی ، میری ماہانہ آمدن دودھ کی ایک لاکھ روپے تک تھی،جب میں نے پاکستانی ملازم کو رکھا تو اس نے مویشیوں کو خوب محنت سے چارہ دینا شروع کیا اور پہلے ہی ماہ مجھے ایک لاکھ روپے کے ساتھ پندرہ ہزار روپے اضافی مل گئے میں بہت خوش ہوئی کہ یہ بہت محنتی ہے میں نے اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کردیا،اور وہ محنت سے اپنا کام کرتا رہا پہلے ماہ پندرہ ہزار کا منافع اگلے ماہ مزید رقم بڑھ گئی ،اور اگلے چند

مہینوں میں ہی یہ رقم ایک لاکھ سے بڑھ کر تقریبا 2 لاکھ کے لگ بھگ ہو گئی میں حیران ہو گئی کہ اتنے کم عرصے میں اس نے ایسا کیا کر دیا ہے جو ایک لاکھ کے ساتھ ایک لاکھ روپے اضافہ ہوگیا، میں نے اسے بلایا اور اس سے رقم کے بڑھنے کے متعلق دریافت کیا کہ کیا مارکیٹ میں دودھ کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے، یا مویشی چارہ ذیادہ کھا رہے ہیں جو اتنے کم عرصے میں دوگنا پیسے بڑھ گئے ہیں، اس نے بڑے ہی جوشیلے انداز میں جواب دیا ، بیگم صاحبہ ابھی تو لاکھ بڑھا ہے آپ دیکھتی جاؤ میں اسے تین لاکھ تک لے کر جاؤں گا، میں نے حیرانگی سے پوچھا کہ وہ کیسے تو اس نے بتایا کہ وہ دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرتا ہے تو میں سکتے میں آ گئی ۔مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے بہت بڑا ظلم کر دیا ہے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ کر کیوں کہ یہ تو میرے ملک کی آنے والی نسل کو اپاہج بنا رہا ہے، میری افواج کے جوانوں کو پانی ملا دودھ پلا کر ان کو کمزور کر رہا ہے، میں نے اسے تھپڑ مارا اور کہا کہ جی تو چاہتا ہے کہ میں تم کو سیدھا جیل بھیج دوں مگر تمہارے بوڑھے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر ترس آتا ہے دفعہ ہو جاؤ اور آئندہ کبھی اپنی شکل نہ دکھانا ۔تو قارئین یہ سوچ ہے بیرون ممالک میں رہنے والوں کی جو ملاوٹ سے بنائے گئے پیسے کو برا سمجھتے ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ہم ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں، دودھ میں پانی کی ملاوٹ، مرچ میں ہلدی کی ملاوٹ، وغیرہ وغیرہ، ہمارے ملک کا چھوٹے سے چھوٹا آفیسر ہو یا بڑے سے بڑا آفیسر سب کرپشن کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، آج تک

کوئی بھی لیڈر ایسا نہیں آسکا جو خود بھی کرپشن نہ کرے اور اپنے نیچے کام کرنے والوں کو بھی روکے۔ہمارے حکمران صرف اپنی سیٹیں مضبوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔اور ان کی خواہش ہوتی کہ اب باری آئی ہے جی بھر کر لوٹو خدا جانے پھر کبھی موقع ملے نہ ملے۔اور ہمارے ملک کی عوام اس قدر بے حس اور اپاہج ہو چکی ہے کہ بس دیوانہ وار انہی کی مالا جپتے ہیں جو ان کو بجلی، گیس کی لوڈشیڈنگ، مہنگائی کے تحفے دیتے ہیں۔اور عوام خوش دلی سے انہیں اپنے سینوں سے لگا کر پھر سے انہی کے گیت گاتی ہے۔اور وہی لیڈر پھر عوام کو ڈسنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔اور اپنے بینک اکاؤنٹس بھرنے میں لگ جاتے ہیں کہ کہیں خالی نہ رہ جائیں۔آخر عوام کے ٹیکسوں سے آیا پیسہ کیوں ان کی تجوریوں میں پڑا رہتا ہے اس پیسے کو نکلوانے والا کیوں نہیں آتا۔یہ سارا مال وزر غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی ان حکمرانوں کے اکاؤنٹس میں کب تک جمع رہے گا۔یہ حکمران طبقہ مختلف طریقوں سے مال بنانے میں لگا ہوا ہے۔آخر اس مہلک مرض کا سدباب کس دن ہوگا۔پاکستان میں لوٹ مار اور بے ایمانی کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ہم کیوں باہر کی ڈکٹیشن پر چلتے ہیں۔ہم کیوں اغیار کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ہم اپنے ہمسایہ ملک دوست چائنہ کی سستی پالیسیوں کو کیوں نہیں اپناتے۔ہمارے ملک کے کرپٹ حکمران بیرون ممالک سیر و تفریح میں عوام کا پیسہ کیوں برباد کر رہے ہیں۔جو پیسہ یہ حکمران طبقہ اپنی عیاشیوں میں برباد کرتا ہے اگر یہی پیسہ عوام پر لگایا جائے تو عوام بھوک کی وجہ سے خودکشیاں نہ

کرے، بیروزگاری نہ ہو، اگر صرف سابق صدر پاکستان کا سوئس بینکوں میں جمع کروایا ہوا عوام کا پیسہ واپس لے آئیں تو ہمیں کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی نہ رہے لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا، پاکستان کا عام آدمی بھی سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا بابائے قوم نے یہ ملک صرف حکمرانوں کی لوٹ مار کے لئے ہی بنایا تھا، قائدِاعظم نے تو پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہوگی، جہاں پر سب کو مساوی حقوق دیئے جائینگے، مگر یہاں تو صرف دو فیصد لوگ 98 فیصد لوگوں پر مسلط کردیئے گئے جو باری باری عوام کو نوچتے ہیں، اور اپنی مرضی کے نرخ نافذ کرواتے ہیں تاکہ ان کی اپنی صنعتوں کو فائدہ ہو، یہاں تو ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی چیزیں نہیں مل رہیں، حق دار کو اس کا حق نہیں مل رہا، یہاں بچوں کو مساوی تعلیم کے مواقع میسر نہیں یہاں پر امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے، اور ایک اندازے کے مطابق، پاکستان کا ہر وہ بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہے وہ بھی تقریباً ایک لاکھ روپے کا مقروض ہے، عام آدمی سوچتا ہے کہ کیا اتنا پیسہ ہم نے کھا لیا ہے جو ہمارے بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مقروض ہیں، لیکن آخر میں ایک بات کہنا چاہوں گا اگر عوام کو اب بھی شعور نہ آیا تو پھر کبھی ایسا موقع میسر نہ ہوگا، اگر عوام نے خود کو تبدیلی کی طرف لانا ہے، اگر بیروزگاری کا خاتمہ کرنا ہے، اگر ملک میں خوشحالی لانی ہے تو ایک بار نئی قیادت کو ضرور آزمائیں، کیونکہ 50 سال سے زائد پیپلز پارٹی عوام پر مسلط رہی ہے کیا ملا، لوڈشیڈنگ

مہنگائی، کرپشن، 30 سال سے زائد ن لیگ نے عوام کے احساسات سے کھیلا کیا دیا، فاقہ، کشی، خودکشیاں، بیروزگاری، مہنگائی، اوراب عوام کوایک بار نئی قیادت کو بھی آزمانا چاہیے۔

بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی

بیٹی اللہ کی رحمت بن کر اس دنیا میں آتی ہے مگر اس کے آنے کے بعد لڑکی کے ساتھ عمر کے ہر موڑ پر ایک نیا امتحان منتظر ہوتا ہے. اسکی پرورش شروعات ہی سے بہت نگرانی سے کی جاتی ہے. اور اسے بار بار یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ اسے ایک روز بیاہ کر دوسرے گھر جانا ہے. جہاں نئے لوگ نیا ماحول اور ہر بات مین نیا پن ہوگا. اس طرح کی باتیں اپنے بڑوں کی زبانی سن سن کر وہ معصوم پریشان ہوجاتی ہے اور سوچنے لگتی ہے کہ بھلا میں اپنے گھر کو چھوڑ دوسرے گھر کیوں جاؤں. جس طرح یہ گھر میرے بھیا کا ہے اسی طرح میرا بھی تو ہے. یہ سارے پیچیدہ سوالات اس معصوم کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتے ہے. پہلے اسطرح کی باتیں گھر والے بچّی کو صرف چھیڑنے کی غرض سے لاڈ و پیار سے کرتے ہیں. مگر جیسے جیسے بیٹی بڑی ہوتی نظر آتی ہے اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس طرح کی باتیں گھر میں تھوڑی سنجیدگی سے کی جاتی ہیں. پھر لڑکی خود اس بات سے سمجھوتہ کرلیتی ہے کہ ایک روز مجھے بیاہ کر دوسرے گھر جانا ہے جو مستقبل میں میرا اپنا گھر کہلائے گا اور میں اپنے والدین کی ایک اہم ذمہ داری ہوں اور اپنے والدین کو خوش رکھنا ہی میرا اولین فرض ہے اسطرح دوسروں کی خوشی کا خیال رکھنا یہ سوچ لڑکی کی زندگی کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے اسکے بعد عورت اپنی زندگی میں جس

سیڑھی پر بھی قدم رکھتی ہے وہ سیڑھی کسی ناں کسی کی خوشیوں سے جڑی ہوتی ہے. گھر والوں کی اچھی پرورش اور سلیقہ شعاری کی تربیت ہوتے ہوئے بھی پاس پڑوس اور رشتے دار جس گھر میں بیٹی ہوتی ہے وہاں اپنی نظریں جمائے رکھتے ہیں. کہ کب اس لڑکی سے کوئی غلطی یا بھول ہو جائے اور وہ بات کا بتنگڑ بنا کر یہاں وہاں کہتے پھرے. جب کہ دور جدید کی عورت مرد کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہے. اور وہ ساری ترقیاں حاصل کر رہی ہے جوایک مرد حاصل کرتا ہے. مگر پھر بھی عورت کو آج بھی ان ہی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے جس طرح کہ صدیوں پہلے دیکھا جاتا تھا. جب کے آج کی عورت دوہری جدوجہد بھری زندگی جی رہی ہے. وہ ذریعہ معاش میں اپنے خاوند کی پوری مدد بھی کر رہی ہے اور ماں بن کر امورِ خانہ داری سے لیکر گھر کی ذمہ داریوں کو بھی بخوبی سنبھال رہی ہے. پھر بھی اسکی پیدائش سے لیکر اسکی آخری سانس تک اسے کئی طرح کے چھوٹے بڑے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے. یہاں ایک اہم موزوں بہت ہی غور کرنے لائق ہے، کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس گھر میں دو یا دو سے زائد بیٹیاں ہوتی ہے. وہاں اگر بڑی بہن سے پہلے چھوٹی بہن کا کوئی اچھا رشتہ آجائے تو والدین اچھا رشتہ ہے اسے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہئے یہ سوچ کر اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ بڑی بیٹی سے پہلے طے کر دیتے ہیں. جو ان کا صحیح فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ مگر ہمارے اس ترقی یافتہ تعلیم یافتہ جدید دور میں جہاں کہ ہر بات کو سمجھنے کی قوت انسان میں آگئی ہے. کئی گھٹیا قسم کی سوچ رکھنے والے لوگ اس بات پر آج

بھی جہالت کے دور کی طرح تنقید کرنے سے نہیں چوکتے ہیں. کہ بھئی یہ کیسے ہوگیا۔ بھلا.بڑی کو گھر میں بیٹھائے ہیں اور چھوٹی کا بیاہ طے کر رہے ہیں. ایسے وقت تنقید کرنے والوں کو یہ تک نہیں سوجھتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں بلا وجہ کسی کے گھریلو معاملے میں اپنی ٹانگ اڑا رہے ہیں. بھئی یہ اس کے گھر کا معاملہ ہے، تم اپنا کھاؤ اپنا پہنو. کیوں کسی کے گھر میں تانک جھانک کرکے اپنا اور دوسروں کا بھی قیمتی وقت .برباد کرتے ہو. دوسری سب سے اہم بات یہ کہ وہ.بڑی بیٹی جس کے پہلے چھوٹی کا رشتہ طے ہوتا ہے. اس.بڑی بیٹی کو اس روز سے ایک گہری اور شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتاہے. کہ اس کو چھوڑ.بڑی کا رشتہ کیوں طے ہوا کہیں اس میں کوئی خامی کمی یا گمراہی تو نہیں ہے. نعوذو باللہ یہاں تک کہا جاتا ہے اپنی خود کی بیٹی کو بھلا کر دوسروں کی بیٹی کے لئے کہ یہ بد چلن بد کردار تو نہیں ہے. بنا سوچ سمجھے کتنا گھناؤنا الزام کتنی بڑی تہمت اور کتنی غلط بیانی لوگ کر جاتے ہیں. کسی کے گھر کی رحمت کے لئے. جو بلا شبہ ایک عظیم گناہ ہے. حالانکہ ان کہنے والوں میں کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس لڑکی کے نیک چال چلن سے واقف بھی ہوتے ہیں کہ جس کے بارے میں وہ بول رہے ہیں وہ ایک نیک کردار اور بہت ہی اچھی اور نیک بخت بیٹی ہے۔ افسوس کے اس طرح کی ذلیل گری ہوئی باتیں کرنے والوں میں ایسی گندھی سوچ اس پاکدامن لڑکی کے لئے رکھنے والوں میں زیادہ تر اس لڑکی کے قریبی رشتے دار ہوتے ہیں. اللہ رحم کرے ایسے لوگوں پر کیونکہ جو کسی کی پا

کدامن بیٹی پر اتنا گھناؤنا الزام بنا سوچے سمجھے لگاتے ہیں. وہ کھلے عام اللہ کے قہر کو بلاوا دیتے ہیں .اگر کسی گھر میں بڑی بیٹی سے پہلے چھوٹی کا رشتہ طے ہوجائے تو اس کی کئی وجوہات ہمارے سامنے ہوتی ہیں . مگر اچھی باتوں کو سوچنا چھوڑ لوگ گندگی کو اپناتے ہیں . رشتے میں تین باتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ خوبصورتی۔ تعلیم۔ اور دولت۔ ہمارے نبی ﷺ نے کہا ہے کہ رشتہ طے کرتے وقت ان ساری باتوں پر تو غور کیا جائے مگر سب سے زیادہ اہمیت دینی مذہبی تعلیم کو دی جائے۔آج کے دور میں لوگ رشتہ طے کرتے وقت زیادہ تر اعلیٰ تعلیم پر توجہ دیتے ہیں لڑکا بھلے ہی معمولی پڑھا لکھا ہو مگر اس کی اور اسکے والدین کی سوچ ہوتی ہے کہ لڑکی کم از کم (بی اے،بی ایس سی،بی کام)تو ہونی ہی چاہئے . سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ کیسی سوچ ہوتی ہے والدین کی .اور خود اس لڑکے کی جو اپنے سے زیادہ پڑھی لکھی دلہن چاہتا ہے. تو اس طرح ہوتا یوں ہے کہ اگر کسی گھر کی چھوٹی بیٹی بڑی سے زیادہ پڑھی لکھی ہو تو لوگ اپنے بیٹے کا رشتہ چھوٹی کے لئے لے آتے ہیں. یہاں کبھی یوں ہوتا ہے کے لڑکا بارھویں پاس ہے. گھر میں دھن دولت کی کمی نہیں ہے. اور لڑکا بھی قابلِ قبول شخصیت کا مالک ہے. تو والدین اپنی پڑھی لکھی چھوٹی بیٹی کو آئے ہوئے رشتے پر لبیک بول دیتے ہیں. اب اس میں نہ والدین کا قصور ہے. اور نہ ہی اس گھر کی بڑی لڑکی کا . پھر یہ گندھی اور غلط سوچ کیوں کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کیوں؟ کبھی ایسے معاملے میں خوبصورتی بھی وجہ بن جاتی ہے،ایسا بھی

ہوتا ہے کہ .بڑی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور چھوٹی کم پڑھی لکھی مگر غضب کی خوبصورت ہے. تو اس کی خوبصورتی کو دیکھ اسے .بڑی سے پہلے اچھا رشتہ آ جاتا ہے. اور والدین ایک قابل رشتے کو دیکھ یہ سوچ کر چھوٹی بیٹی کا رشتہ .بڑی سے پہلے طے کر دیتے ہیں. کہ بھئی .بڑی پڑھی لکھی ہے. اسے بہت رشتے آئیں گے. اب اسے اچھا آیا ہے تو بسم اللہ بول دیتے ہیں .کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے تعلیم یافتہ زمانے میں بھی اگر کوئی کسی کی بیٹی پر تہمت لگاتا ہے تو اس کو اپنی کم ظرفی پر توجہ دینی ضروری ہے. اور اپنی چھوٹی ذہنیت کو بدلنا ہے. کیونکہ اسے کسی کی بیٹی پر تبصرہ کرنے کی اجازت نہ تو ہمارا مذہب دیتا ہے. اور نہ آج کا یہ ترقی یافتہ زمانہ، اور یہ تو قدرت کا فیصلہ ہے. کیونکہ ہمارا ہر کام اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اشارے سے اس کے حکم سے ہوتا ہے. اس تعلیم یافتہ زمانے میں کسی کی بیٹی کے لئے ایسی گھٹیا سوچ رکھتے ہوئے اپنے وقت کو .برباد کرنے سے بہتر ہے کہ لوگ اپنے گھر کی بیٹیوں اور ان کے مستقبل کے بارے میں سوچیں .اور انہیں اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ پیراستہ کریں .تاکہ اللہ ربّ العزت آپ کی اس نیکی کے بدلے آپ کی بیٹی کو ایک اچھا اور قابل رشتہ نصیب کرے. کیونکہ سارے رشتے اللہ کے گھر ہی طے ہوتے ہیں.

ایسی ہوتی ہے زندہ قوم!

دفتروں میں محصور لوگوں کا اپنے خاندان کے ساتھ رابطہ نہیں تھا اور گھر کے لوگ باہر دفتروں اور بازاروں میں موجود اپنے عزیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ مضافات سے آنے والے یہ 50 لاکھ لوگ چار روز تک ٹوکیو میں پڑے رہے۔ ان کی جیب میں زیادہ رقم بھی نہیں تھی اور ان کے سردی سے بچاؤ کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ایسے نازک حالات میں بالعموم نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے لیکن جاپانی عجیب قوم ہیں انہوں نے وہ کر دکھایا جو نہ صرف ہندوستان، پاکستان بلکہ امریکہ اور یورپ میں بھی نہیں ہوتا۔ ٹوکیو کے چھوٹے چھوٹے دکانداروں تک نے نہ صرف اپنی اشیاء کے نرخ کم کر دیئے بلکہ سارا اسٹاک نکال کے اپنی دکانوں کے سامنے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے باکس پر یہ لکھ کر وہاں نمایاں جگہ پر رکھ دیا کہ ’’آپ کو جو چیز چاہئے ‘ بغیر پوچھے اٹھا لیجئے اور اس کے لئے جتنی رقم دے سکتے ہیں آپ اس باکس میں ڈال دیجئے۔‘‘ لوگ آتے اپنی ضرورت کی چیزیں اٹھاتے اور جتنے پیسے آسانی سے دے سکتے تھے وہ باکس میں ڈال دیتے اور چلے جاتے۔ اخباروں نے لکھا ہے کہ ٹوکیو کے 90 فیصد چھوٹے بڑے دکانداروں نے یہی کیا۔ تمام جاپانی تاجروں اور دکانداروں نے اس قیامت صغریٰ کے امتحانی موقع پر کھانے پینے کی اشیاء کی قیمت بھی کم کر دی اور ذخیرہ اندوزی او

ربلیک مارکیٹنگ کے بجائے اپنا پورا اسٹاک باہر نکال لائے۔بڑے شاپنگ مالز نے بھی یہی کیا۔ انہوں نے بھی کولڈ اسٹوریج اور گوداموں سے مال نکال دیا یہاں تک کہ ٹوکیو کے عام شہریوں تک نے اپنی ضرورت سے زائد گرم کمبل، گدے، سیوٹر اور جیکٹ اپنے اپنے گھروں کے باہر رکھ دیئے۔ یہ سامان ان پچاس لاکھ لوگوں کے کام آیا جو ناگہانی آفت اور راستے بند ہو جانے کے سبب سڑکوں پر اور کھلے آسمان کے نیچے زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ اس فراخ دلی، ایثار،اور قربانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پچاس لاکھ لوگوں کی وجہ سے ٹوکیو شہر میں نہ کوئی لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہوا نہ کسی کو سڑکوں پر کسی قسم کی چیخ و پکار اور شور وغل سنائی دیا۔ نہ لوگوں نے حکومت کے خلاف زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگائے۔ نہ کسی سرکاری عمارت کا کوئی شیشہ ٹوٹا، نہ کوئی احتجاجی جلوس نکلا نہ کسی نے حکومت کو برا بھلا کہا۔ یہ تمام لوگ چپ چاپ رابطوں اور مواصلات کے نظام کی بحالی کا انتظار کرتے رہے۔ ان لوگوں میں موجود ڈاکٹروں نے خود بخود دوسرے متاثرین کا علاج شروع کر دیا' انجینئروں نے میٹرو ریلوے کے ٹریکس کی بحالی، سڑکوں کو دوبارہ قابل استعمال بنانے اور پلوں کی مرمت کا تخمینہ لگانے او رٹیلی فونک رابطوں کو بحال کرنے کا کام سنبھال لیا۔ ٹوکیو کے مزدوروں اور مستریوں نے حکومت کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور خواتین نے چھوٹے بچوں کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ اس طرح بغیر کسی شور شرابے اور چیخ وپکار کے، نہایت اطمینان اور بردباری

کے ساتھ ٹوکیو کی بحالی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح برسوں کا کام دنوں میں مکمل ہو گیا اور اس دوران نہ ٹوکیو میں کسی نے کوئی ریڈ سگنل توڑا، نہ سڑکوں اور میدانوں میں کچرا جمع ہوا، نہ مہنگائی ہوئی بلکہ آج ٹوکیو میں 11 مارچ کے مقابلے میں نسبتاً کم قیمت پر تمام ضروری اشیاء دستیاب ہیں۔ تو ایسی ہوتی ہے زندہ قوم! غیرت دار، ایماندار اور اپنے وطن اور اہل وطن سے محبت کرنے والی قوم اور ایک ہم ہیں! اللہ محفوظ رکھے۔ سالانہ سیلابوں کے موقع پر اور قحط و خشک سالی کے موقع پر متاثرہ علاقوں میں ارضی و سماوی آفت سے زیادہ بے حس، خود غرض اور لالچی لوگوں کی لائی ہوئی آفت' قہر برپا کرتی ہے۔ جاپانیوں نے 1945 کی طرح 2011 میں بھی مصیبتوں پر ماتم نہیں کیا، صبر و شکر کے ساتھ یہ ثابت کر دیا کہ ہیروشیما کی طرح وہ سنڈائی کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیں گے۔ اللہ بھی ایسے ہی انسانوں کو دوست رکھتا ہے۔

احکام حج اور اس کی فضیلت

حضرت محمدؐ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے کے بعد سر اطاعت خم کرنے کی پہلی صورت نماز ہے اور آخری صورت حج بیت اللہ ہے۔ حج سابقہ امتوں میں ادا کیا جاتا رہا۔ امت محمدیہ پر حج کی فرضیت 9 ہجری میں ہوئی۔ حضرت محمدؐ نے اپنی حیات طیبہ کا واحد حج 10 ہجری میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہؓ کے ساتھ ادا کیا۔ آپ کا یہ حج "حجتہ الوادع" کہلاتا ہے۔ حج ان تمام عاقل، آزاد اور اہل ثروت مسلمانوں پر عمر بھر میں ایک بار فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کے وسائل رکھتے ہوں۔ حج کی فرضیت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ " اور لوگوں پر اللہ کے لئے لازم ہے کہ جو کوئی بیت اللہ تک آنے کی قدرت رکھتا ہو وہ حج کے لئے آئے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔" ارشاد نبوی ہے۔ " اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ پس تم ضرور حج کرو"۔ یوں تو عبادت کے اور بھی طریقے ہیں مثلاً نماز، روزہ اور زکوۃ مگر حج کی اہمیت یہ ہے کہ نماز اور روزہ صرف جانی عبادات ہیں اور حج جانی مالی دونوں عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ حج کا قصد کرنیوالا خالص حج کی نیت سے نکلے۔ حج کے اخراجات حلال اموال میں سے ہونے چاہئیں۔ حج کرنے والا رب حقیقی سے اپنے گناہوں پر توبہ کے ساتھ ساتھ لوگوں سے اپنی غلطیوں پر معذرت خواہ ہو۔

اہل وعیال کے لئے واپسی تک اخراجات کا انتظام کرے۔ قرض ہو تو اس کی ادائیگی کردے۔ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جن کو دولت اور جوانی اللہ نے دی مگر فریضہ حج کو ٹالتے رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں حج کو جاتے ہیں۔ اس وقت حج کے ارکان ان سے صحیح طریقہ سے ادا نہیں ہوتے۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے جب وسائل مہیا ہوں تو ہر مسلمان کو بلاتاخیر یہ فریضہ انجام دینا چاہیے۔ جو شخص خلوص نیت سے سفر حج اختیار کرتا ہے اس کے دل میں محبت الٰہی کی ایسی شمع روشن ہو جاتی ہے جو اس کے قلب کو غلاظتوں سے پاک کرکے ہدایت سے منور کر دیتی ہے پھر وہ محبت و اطاعت الٰہی کے جذبہ کے تحت عملی طور پر قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار نظر آتا ہے۔ احرام باندھتے ہی بندے پر کئی ایک حلال اشیاء مقررہ مدت تک حرام ہو جاتی ہیں۔ وہ ان اشیاء کی طرف میلان رکھتے ہوئے بھی حکم الٰہی کے تحت ان سے پرہیز کرتا ہے اور یوں ضبط نفس کا عملی مظاہرہ کرتا ہے۔ اس طرح حج ضبط نفس کے لئے بھی بہترین تربیت ہے۔ حج انسان میں سادگی و اعتدال کی صفات پیدا کرتا ہے اور فضول خرچی اور فخر اور غرور سے بچاتا ہے۔ حج کے اس خاص موقع پر دنیا کے ہر کونے سے آنے والے بندگان الٰہی ایک لباس، ایک امام اور ایک مقصد کے تحت مساوات کا بے مثال اور لازوال عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسی مثال دنیا کے کسی بھی کونے میں دیکھنا ناممکن ہے۔ خواہ وہ مساوات کے علمبردار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ دین اسلام ہی ہے جس کے ماننے والے رنگ 'نسل علاقے' زبان اور امیری اور غربت کے مصنوعی امتیازات سے بالاتر ہوتے ہیں اور

حج کے موقع پر اس پر بہترین عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ مقام فکر ہے کہ جب ایک شخص حج بیت اللہ کے لئے گھر سے روانہ ہو تو اس کا دل شرک' منافرت' انتشار اور دنیاوی خواہشات سے پاک وصاف ہونا چاہئے تاکہ اس کا حج شرف قبولیت کا باعث بن جائے۔ اگر حج کر لینے کے بعد ایک انسان اپنی نفسانی خواہشات کو ختم نہیں کر سکتا اور نفس کی سر کشی کو دبا نہیں سکتا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ حج پر گیا ہی نہیں۔ حج ایسا کرنا چاہئے کہ انسان کا ضمیر خود مطمئن ہو۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ حج کے بعد نفسانی خواہشات فسق وفجور اور برائیوں سے اجتناب کرنے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے جنم لینے والا معصوم بچہ۔ آپ فرمایا کہ حج و عمرہ ادا کرنے والے اللہ کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کی تمام حاجتیں پوری اور دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ قیامت کے دن برائیوں سے اجتناب کرنے والے حاجیوں کی بخشش یقینی ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق ادائیگی حج میں جلدی کی تلقین کی گئی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں تنگ دستی یا مجبوری تمہارا راستہ روک دے۔ ہر اہل مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اسے اسلام کا ایک اہم رکن تصور کرتے ہوئے اسے پورے احترام و عقیدے اور احکام شرعی کے مطابق ادا کرے۔ اس دوران نفس کے خلاف جہاد اور عبادتوں ریاضتوں سے اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرے۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یذید ہے۔
اسلام زندہ ہوتا ہے، ہر کربلا کے بعد

نواسہ رسول ﷺ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے اہل بیت کی شہادت کا دن ہر سال ہجری تقویم کے اول ماہ کی دسویں تاریخ کو آتا ہے تو اس تاریخ ساز واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے اپنے ظہور کے وقت خواہ کوئی طوفان برپا نہ کیا ہو، لیکن وقت کے ساتھ جیسے جیسے زمانہ کا پہیہ گھومتا گیا، اس واقعہ کی اہمیت واثرات واضح ہوتے گئے، اس واقعہ سے بنی نوع انسان کو صبر واستقلال اور ایثار وقربانی کا سبق ہی نہیں ملتا، بلکہ فکر وعمل اور حق وانصاف کی پاسداری کی تحریک بھی ہوتی ہے۔ شہادت امام حسینؓ میں سب سے بڑا سبق یہ پوشیدہ ہے کہ ظلم کے آگے سر نہ جھکایا جائے اور انسان اپنی خوداری اور شرف کو ظالم کے قدموں میں روندنے کے لئے نہ ڈال دے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غیر ضروری طور پر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا جائے اور خونریزی سے تحفظ کی کوئی باعزت راہ ہو تو اسے تلاش نہ کیا جائے قتل وغارتگری ، فتنہ وفساد اور ظلم وتشدد اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ عمل ہیں، اسلام کا مطلب ہی امن وسلامتی ہے کرۂ ارض پر آباد تمام انسان یہاں تک کہ چرند پرند، حیوان اور چیونٹیوں تک کو اسلام میں امان وپناہ ہے، ہرے بھرے درختوں کی حفاظت،

ماحولیات کے رکھ رکھاؤ اور انسانوں پر عائد انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے، لیکن اگر ظالم کسی طرح نہ مانے اور اس کی سرکشی حد سے گزر جائے تو پھر اسلام ظلم کے خلاف اٹھنے اور مقابلہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ ایسا نہ کیا جائے تو حق مغلوب اور باطل غالب آ جائے گا پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کا اسوہ اسی جانب ہماری رہبری کرتا ہے جسے نواسہ رسول ﷺ نے اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا۔ ''واقعہ کربلا'' کو حق و باطل کے درمیان معرکہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو اسلام کی ''شورائی جمہوریت ''کے تحفظ کے لئے ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ کے خلاف لڑی گئی اس جمہوریت میں مسلمانوں کے خلیفہ یا امیر کا انتخاب عام لوگوں کے مشورے سے کیا جاتا ہے جس کا جانشینی یا وراثت سے کوئی تعلق نہیں، نہ اس بات کی گنجائش ہے کہ کوئی بزعم خود یا طاقت کے زور پر خلیفہ اور امیر بن جائے اس نظام نے آج سے چودہ سو برس پہلے سماجی اونچ نیچ اور ادنیٰ واعلیٰ کے امتیاز کو مٹا دیا تھا، جرم وسزا میں کسی کے ساتھ تفریق نہیں تھی، غلطی خواہ امیر کرے یا کسی غریب سے سرزد ہو، شریعت کی نظر میں دونوں کی حیثیت مساوی ہے، اس اسلامی جمہوریت کے طفیل میں نسلی امتیازات اور قبائلی غرور کا خاتمہ ہوا ،ایک دوسرے کے دشمن ہمدرد بن گئے، ان کی تمام تر پسماندگی ترقی میں بدل گئی، اونٹوں کی ریوڑ لے کر ریگستانوں کی خاک چھاننے والے مسلمانوں، ملکوں اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگے، اس جمہوریت کی بنیاد سب سے پہلے اسلام نے رکھی جسے یزید نے ڈھانے کی کوشش

کی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت پر امت کی اکثریت کا اتفاق تھا مگر حضرت معاویہ نے اس سے اختلاف کیا اور شام کی گورنری کو اپنے لئے خلافت کے استحقاق کی بنیاد بنالیا۔ اس کی وجہ سے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں اسی دوران ایک ملعون ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو شہید کردیا۔ انتقال کے وقت لوگوں نے آپؓ سے معلوم کیا کہ اپنے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیا ہم انہیں اپنا خلیفہ بنالیں، حضرت علیؓ کا واضح جواب تھا کہ ''نہ میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں، تم لوگ جو مناسب سمجھو وہی کرنا'' یہ تھی اسلام کی جمہوریت لوگوں کو اتنا دریافت کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی اگر حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ میں جنگ نہ چل رہی ہوتی جس کا فیصلہ ہوئے بغیر خلیفہ چہارم کی وفات قاتلانہ حملہ سے ہو رہی تھی لیکن اس کے برعکس حضرت معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو زندگی میں ہی اپنا ولی عہد مقرر کرکے لوگوں سے اس کے لئے بیعت لینا شروع کردی۔ اسلام میں یہ پہلی بدعت تھی کہ ''جمہوریت کی جگہ ملوکیت'' لے رہی تھی۔

حضرت حسینؓ نے بھی اپنے والد ماجد کی پیروی کرتے ہوئے خلافت کے واسطے کوئی دعویٰ پیش نہیں کیا، نہ یہ کہا کہ میرے والد خلیفہ تھے لہٰذا مجھے ان کا وارث سمجھا جائے بلکہ ہوا یہ کہ کوفے کے لوگوں نے حضرت امام حسینؓ کو بار بار یزید کی مطلق العنانی اور حدودِ اسلامی سے سرتابی کی طرف متوجہ کیا اور یہ بھی درخواست کی کہ آپ اپنے ناناﷺ کے دین کو بچانے اور ہماری مدد کرنے کو

آئیں تو ہم آپ کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلیں گے لیکن کوفے کے قریب پہنچنے پر آپ کو یہ خبر ملی کہ اہل کوفہ کی رائے بدل گئی اور وہ اپنے وعدہ سے پھر گئے ہیں تو ایک سچے جمہوریت پسند کی حیثیت سے آپ نے اس مہم سے کنارہ کشی اختیار کرلی تب۔ یزیدی لشکر نے آپ کو گھیر لیا اور میدان کربلا میں آپ نے محصور ہوجانا گوارہ کیا لیکن خود کو ایک غیر شرعی حکومت کے سپرد نہ کیا بلکہ مصالحت کی نہایت موزوں اور عزت نفس کی حامل تین شرطیں پیش کیں اول میں مدینہ واپس چلا جاتا ہوں، یہ منظور نہیں تو میں جہاد میں حصہ لینے کے لئے سرحد کی طرف نکل جاتا ہوں، یہ بھی قبول نہیں تو میرا راستہ چھوڑ دو اور مجھے۔یزید کے پاس جانے دو تاکہ اس سے مل کر میں اپنا معاملہ خود طے کرلوں، مگر۔یزید کے لشکر نے مصالحت کی ان تینوں شرطوں کو نہ مانا تو نواسۂ رسول ﷺ اور آپ کے اہل خاندان نیز جاں نثاروں نے بے سروسامانی کی حالت میں اس طرح دادِ شجاعت دی جو ہمیشہ ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کا حوصلہ بڑھاتی رہے گی۔ حضرت امام حسینؓ یہ جانتے تھے کہ لشکر۔یزید سے مقابلہ کا نتیجہ کیا ہوگا ایک طرف مٹھی بھر نفوس اور دوسری جانب ہزاروں کا لشکر جرار جو خون بہانے اور جان لینے کو بے تاب تھا۔ حضرت امام حسینؓ نے جنگ میں پہل نہیں کی اور یہ جنگ تھی ہی کب؟ جنگ دو فوجوں کے درمیان ہوا کرتی ہے نواسۂ رسول ﷺ کے پاس فوج کہاں تھی؟ اہل خاندان، بچے، مستورات اور چند جاں نثار تھے معاملہ صرف جارحیت کے مقابلہ میں اپنے دفاع کا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے پاس

وپریشانی اور بھوک وپیاس کے عالم میں بہترین دفاع فرمایا۔ حضرت امام حسینؓ کی میدان کربلا میں صف آرائی درحقیقت اسلام کے مزاج میں تغیر وتبدل کے خلاف ایک ایسی مزاحمت تھی جو رہتی دنیاتک حق وباطل کے امتیاز کو واضح کرتی رہے گی آزادی ضمیر، آزادی فکر اور اختلافِ رائے کا حق آج کے جمہوری دور کا ایک امتیاز ہے جس کو چھیننے والی حکومت کبھی جمہوری قرار نہیں پاسکتی۔ حضرت امام حسینؓ نے بھی حکومت اور اقتدار کے مطالبہ بیعت کو ٹھکرا کر رہتی دنیاتک اپنے عمل وکردار سے یہ سبق دے دیا کہ جبر کی بنیاد پر کسی سے کوئی مطالبہ وفاداری باطل ہے اور اس جبر واستبداد کا مقابلہ اس عزیمت کے ساتھ ہونا چاہئے کہ 'سر کٹ جائے مگر جھکے نہیں' معاشی نظام کے متوازن ہونے کا تصور موجودہ عہد کی بیشتر حکومتوں کا ایک موثر حربہ ہے شخصی نظام ہو یا آمریت اس میں معاشی عدم توازن اور طبقاتی اونچ نیچ ضرور پیدا ہوجاتی ہے، جمہوریت میں بھی عموماً یہ خرابی درآتی ہے کہ برسر اقتدار گروہ دولت ووسائل پر حاوی ہوجاتا ہے حضرت حسینؓ نے جب مطالبہ بیعت کو ٹھکرایا تو منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی فرمایا جس کا مفہوم تھا کہ ''حکومت مال مسکین پر قابض ومتصرف ہے جو جائز نہیں'' اس بلیغ فقرہ سے اسلام میں دولت کے تصور تقسیم پر روشنی پڑتی ہے جو جمع ہونا نہیں تقسیم ہونا ہے، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کے مال پر قابض ومتصرف ہوجائے عوام کی دولت عوام میں ہی تقسیم ہونا چاہئے یہی نعرہ آج کی نام نہاد فلاحی مملکتیں بھی بلند کررہی ہیں لیکن

اس کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہیں۔

شیشہ پینے والوں کی تعداد میں اضافہ کیوں؟

ایک دن عمران کو اسکے دوست نے زبردستی سگریٹ پینے کو کہا، لیکن عمران نے اسکو پینے سے انکار کر دیا اسکا دوست مسلسل بضد تھا کہ یار اسکو ایک بار پی کر دیکھ تمہیں سکون آجائے گا جوان دنوں گھریلو حالات سے تنگ، ٹینشن اور پریشانی کا شکار تھا اس نے وہ سگریٹ پی لی۔ وہ سگریٹ پی کر عمران دنیا ومافیا سے بے نیاز ہو کر سو گیا کیونکہ اسکے دوست نے اس سگریٹ میں ہیروئین ملا کر دی تھی اس طرح عمران اس نشے کا عادی ہو گیا وہ اپنا نشہ پورا کرنے کہ لیے چوریاں کرنے لگا حتی کہ اس نے اپنے گھر کا سامان تک فروخت کرنا شروع کر دیا گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی، لیکن اسے صرف اپنے نشے سے مطلب تھا۔ اسطرح عمران کو نشے کی سخت طلب ہونے لگی اور اسکو خریدنے کے لیے اسکے پاس رقم نہیں ہوتی تھی، اس نشے کی وجہ سے اس نے سسک سسک کر جان دے دی۔ اور اسطرح ایک ہنستے بستے گھر کا چشم وچراغ گل ہو گیا۔ زیادہ تر لڑکوں کو دوستوں کی صحبت خراب کرتی ہے اور جو شخص ایک دفعہ نشے کی لت میں پڑ جائے تو اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیئے والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے دوستوں پر نظر رکھیں کہ وہ کس طرح کہ لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ تاکہ بر وقت انہیں برے کاموں سے روکا جاسکے نشہ مختلف قسم کی منشیات سے کیا جاتا ہے جس میں چرس، ہیروئن،

کوکین۔ شراب، سپریٹ، حقہ سگریٹ، نشہ آور کیپسول اور شیشہ کے مختلف ذائقوں سے کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں کئی مقامات پر یہ نشہ آور منشیات بغیر کسی پابندی کے فروخت ہوتی ہیں۔ ایک وقت تھا جب لوگ مغرب کی سگریٹ نوشی کو اسٹیٹس سمبل قرار دیتے تھے اور لوگ سرے عام اسموکنگ کو باعث فخر تصور کرتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکے انتہائی مہلک نقصانات سامنے آنے لگے یہاں تک کہ اسکی وجہ سے کینسر اور پھیپھڑوں کے امراض پھیل گیے پھر والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ عرصے سے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں لاہور اسلام آباد اور کراچی میں جو شیشہ کے نام سے نشہ مشہور اور مقبول ہو رہا ہے ایک اندازے کے مطابق یہ نشے کرنے والوں کی تعداد اب ہزاروں میں ہے لیکن اندیشہ ہے عنقریب یہ تعداد لاکھوں تک جا پہنچے گی۔ اس نشے میں امیر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھرپور دلچسپی لے رہے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس میں سگریٹ والے نشے سے کئی گنا ذیادہ نشہ ہوتا ہے۔ دور اندیشوں کا کہنا ہے کہ ابھی سے اسکے آگے بند نہ باندھا گیا تو یہ شیشہ نامی نشہ باصلاحیت نوجوان نسل کو اپنے عکس میں اتار لے گا اور منشیات کا گندا کاروبار کرنے والے قوم کے مستقبل کے معماروں کو اندھے غار کی طرف دھکیلتے رہیں گے۔ موت کے سوداگر نوجون نسل کو نشے کی مختلف بیماریوں میں مبتلا کر کے موت کے گھاٹ اتارتے رہیں گے۔ نشے میں راحت اور آرام تلاش کرنے والے نہ جانے کتنے نوجوان اپنی راہ بھٹک گئے ہیں۔ ضرورت

اس امر کی ہے کہ منشیات کی روک تھام کے لیے ہر سطح پر کوشش کی جائے گھریلو سطح پر والدین اپنی اولاد کو نشہ آور چیزوں کے قریب بھٹکنے نہ دیں۔ سکینڈری سکولوں میں منشیات کی مذمت میں مضامین باقاعدہ نصاب میں شامل کیے جائیں جن میں ان نشہ آور اشیاء کے بارے میں مفصل بیان کیا جائے اساتذہ اس موضوع پر لیکچر دے کر طلبہ اور طالبات میں نشے کے خلاف نفرت پیدا کریں۔ ناپختہ ذہنوں کو اس سے آگاہ کریں تاکہ وہ اپنی زندگی میں اس سے دور رہیں۔

توہم پرستی کا انسانی سوچ پر غلبہ

سائنس کے نظریات توہم پرستی کے منافی ہیں۔توہم پرستی کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔انسان کائنات کو تسخیر کر رہا ہے۔اور اسکے اسرار ورموز سے آئے روز پردہ اٹھا رہا ہے۔ سائنس کی ترقی نے حضرت انسان کی عقل کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اولاد آدم عروج کی سیڑیوں کے زینہ چڑھی جا رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود انسان کی سوچ آج بھی بہت سے معاملات میں قید نظر آتی ہے۔ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تسخیر کائنات کا موجب بننے والا انسان آج بھی توہم پرستی کا شکار نظر آتا ہے،اور نہ صرف یہ ہمارے معاشرے میں پھن تانے کھڑا ہے بلکہ اس نے مغربی معاشرے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔توہم پرستی کا مطلب ایسے عقائد جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور انسانی اور عقل انسانی اسے ماننے سے انکار کر دے۔انسان کی زندگی میں بہت سے حادثات وواقعات اچانک رونما ہو جاتے ہیں، جن کا ایسے عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہوتااور ہم ان کے بارے میں غیر سائنسی اصول پیش کرنے لگتے ہیں۔انسان کی سائنسی ترقی اپنے عروج پر ہے۔انسان اپنے بارے میں اور اپنے ہم جنوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہے۔اس کے باوجود بھی انسانی زندگی میں یہ غیر عقلی عقائد اپنی جگہ موجود ہیں۔ جیسے بہت سے لوگ آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر کالی بلی راستہ کاٹ لے تو جس کام، جس مقصد کے لیے جا

رہے ہیں وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ ماضی کا انسان توہم پرستی کا زیادہ شکار تھا، جیسے غاروں کے انسان کی زندگی دیکھیں تو وہ جس چیز سے خوف کھاتا تھا اسکی عبادت شروع کر دیتا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج کا دوران تمام باتوں سے پاک ہے۔اب ماضی جیسی توہم پرستی تو نہیں رہی لیکن آج کے جدید دور کی توہم پرستی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔اسکا وجود معاشرے میں کہی نہ کہی موجود ہے۔ مغرب ترقی کے لحاظ سے سب سے آگے جا رہا ہے مگر مغربی ممالک کے لوگ نمبر18 سے بہت خوف کھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک نمبر18 بہت بد قسمت ہندسہ سمجھا جاتا ہے ۔اس کے علاوہ وہ لوگ سیڑھیوں کے نیچے سے گزرنے کو بھی بد قسمتی سے عبارت کرتے ہیں۔یہ بھی عقیدہ ہے کہ بلی کی نو کئی زندگیاں ہوتی ہیں یعنی وہ آٹھ بار مرنے کے بعد بھی زندہ ہو سکتی ہیں، اگر آپ اپنی سالگرہ کے دن ایک ہی پھوک میں ساری موم بتیاں بجھا دیں تو آپ کی جو خواہش ہو گی پوری ہو گی۔ گھر کے اندر کرکٹ کھیلنا خوش قسمتی کو دعوت دینا ہے۔جب کتا روتا ہے تو مانو ہیبت کی علامت ، میز پر سونا بھی بد قسمتی،اگر پاؤں میں درد ہے تو آپ کا سفر متوقع ہے اور اس طرح کے متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔توہم پرستی کے وجود کی سب سے بڑی وجہ آباواجداد کی طرف سے ورثے میں ملنے والے رسم و رواج بھی ہو سکتے ہیں ۔ بچپن سے جو عقیدہ ہم دیکھتے چلے آئیں اس کا جدید علم کے ساتھ ٹکراؤ اور پھر صحیح سمت رہنمائی میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے ہمارا کائنات کے بارے میں علم محدود ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے علم میں اضافہ

ہو رہا ہے۔انسان جو کہ فطری طور پر تجسس رکھتا ہے، جس کے باعث دنیا آج ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور جب تک انسان سکون واطمینان حاصل نہیں کر لیتا جاننے کا یہ عمل اسی طرح جاری رہے گا۔زمین انسان کی تخلیق سے پہلے وجود میں آئی ۔اس کے بننے کے عمل میں جو باتیں روز اول سے سنتے آرہے ہیں وہی باتیں آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ توہم پرستی کے حوالے سے آنے والے عقائد بھی اس طرح سے قائم ہیں۔یہ درست ہے کہ وقت کے ساتھ ان میں جدت آرہی ہے۔لیکن آج بھی لوگ اس حوالے سے بات کرتے ہیں۔ کسی بھی اچانک ہونے والے واقع کو کسی نہ کسی طرح توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔اگر آپ میں کام کرنے کی لگن اور ارادے کی مضبوطی موجود ہے تو چاہے کالی بلی راستہ کاٹ لے پھر بھی آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ایسی باتوں پر وہ لوگ یقین رکھتے ہیں جو ارادے کے کمزور اور کم عقل ہوں۔سائنس بھی بہت سی باتوں کو ثابت کر چکی ہے جیسے لوگوں میں یہ بات بہت مقبول تھی کہ چاند پہ بھی ایک بڑھیا رہتی ہے۔جو ہر وقت چرخہ کاتتی رہتی ہے۔آج انسان نے اپنے علم کی بدولت چاند تک رسائی حاصل کر لی ہے۔وہ چاند کی زمین کو چھو آیا ہے لیکن ایسی کسی بھی بات کی تصدیق نہیں کی کہ چاند پر کوئی بڑھیا ہے اور نہ ہی کوئی چرخہ، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں یہ صرف قصہ کہانیوں تک ہی محدود ہے۔یہ کائنات ہے اور اس میں توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ جیسے حیات انسانی کی بقا کے لیے زندگی اور موت کا عمل جاری ہے۔اس لیے ٹوٹتے ہوئے ستاروں کو بد

قسمتی سے منسلک کرنا غلط ہے۔صرف مغربی ممالک میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی بہت سی توہیمات موجود ہیں جیسے آنکھ پھڑکے تو کچھ برا ہوتا ہے۔اُلو بولے تو وہ جس علاقے میں بول رہا ہے،وہاں بدقسمتی آنے والی ہے۔کوئی گلاس یا شیشہ ٹوٹے تو اچھا تصور نہیں کیا جاتا۔اگر کہیں سے کچھ کھانے کو آئے تو برتن خالی نہیں لوٹانے چاہیے۔خواب میں اگر بھینس نظر آجائے تو بھی بری قسمت کا دور شروع ہونے والا ہے۔بچوں پر سے پھیلانگنا نہیں چاہیے اس سے بچوں کی نشونما رک جاتی ہے اور اس کے علاوہ بغیر کسی وجہ کے قینچی چلانا گھر میں لڑائی کا سبب بن سکتی ہے۔اسطرح گھر کے اندر چھتری کھولنا بھی پریشانی کا سبب بن سکتی ہے۔ان جیسی دیگر بہت سی توہمات نے معاشرے کو جکڑ لیا ہے۔المیہ یہ ہے کہ ہم علم حاصل کرنے کے باوجود ایسی غیر سائنس باتوں پر آنکھیں بند کر لیتے ہیں جس کا حقیقت سے کوئی عمل دخل نہیں ہے۔یہ سب باتیں اپنی جگہ انسان کو اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے۔اللہ رب العزت نے ہر انسان کو شعور عطاء کیااور اس کے ساتھ ساتھ ہی کائنات پر غوروفکر کی دعوت دی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام عقائد ونظریات کو اپنے علم کی روشنی اور عمل کے مطابق پرکھا جائے۔اور پھر ان کا عملی زندگی میں اثر دیکھ کر حقیقت سے تعلق جوڑنے کے بعد ہی یقین کیا جائے اور دیگر علم وکم شعور لوگوں کو بھی اس بارے میں آگاہ کیا جائے اور شعور تو بچوں سے بھی لیا جا سکتا ہے جیسا کہ کسی نے ایک بچہ سے پوچھا کہ اگر کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو اس کا کیا مطلب ہے تو بچے

نے جواب دیااس کا مطلب ہے کہ بلی بھی کہیں جا رہی ہے صرف اس جواب پر غور کر لیا جائے تو ساری توہمات خود بخود بے معنی ہو جائیں گی۔

گداگری ایک لعنت

گداگری ایک لعنت تصور کی جاتی ہے جبکہ موجودہ دور میں یہ ایک پیشے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔پیشہ ور گداگر پورے ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکے ہیں آپ کہیں پر بھی چلے جائیں، کسی بھی سڑک پر کھڑے ہوں ،اشارہ بند ہو،آپ کو کہیں نہ کہیں گداگر ضرور نظر آئیں گے۔اگر آپ ایک کی مدد کریں تو اس کے پیچھے پیچھے کئی دوسرے گداگر چلے آتے ہیں۔یہ تمام لوگ پیشے کی حیثیت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔جس طرح ایک نوکری پیشہ شخص صبح گھر سے نکل کر اپنے دفتر میں حاضری دیتا ہے اسی طرح یہ گداگر بھی صبح گھر سے نکل کر اپنے مخصوص اڈوں کا رخ کرتے ہیں۔لوگوں سے گداگری کروانے کے لئے مختلف منظم گروہ سرگرم عمل ہیں۔یہ گروہ غریب بچوں کو پیسوں کا لالچ دے کر اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ چوکوں اور مختلف شاہراؤں پر کھڑے ہو کر بھیک مانگیں۔یہ گروہ بچوں کے علاوہ عورتوں اور مردوں کی بھی مفلسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ان گروہوں میں سے اکثر افراد معاشرے کے با اثر لوگ ہوتے ہیں جن کی سرپرستی میں یہ گروہ کام کرتے ہیں اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ ان گروہوں کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔یہ گروہ بچوں، عورتوں اور مردوں کے مختلف اعضاء توڑ کر انہیں قابل رحم بنا دیتے ہیں تاکہ لوگ متاثر ہو کر بھیک دیں۔یہ گروہ اکثر انسانی اعضاء کی سمگلنگ میں بھی ملوث ہوتے

ہیں۔ غریب لوگوں کے اعضاء نکال کر جہاں انہیں بھیک مانگنے پر مجبور کرتے ہیں وہیں ان کے اعضاء کو فروخت کرکے انسانیت سوز حرکت کا ارتکاب بھی کرتے ہیں ان گداگروں میں علاقے تقسیم کر دیئے جاتے ہیں ان کا کام ہوتا ہے کہ صبح سویرے سے اپنے علاقوں میں پھیل جائیں اور شام تک اپنی آمدنی لا کر ان کے سربراہ کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ان منظم گروہوں کی زبردستی کے علاوہ گداگر خود بھی اس پیشے کا انتخاب کرنے پر خود کو مجبور کرتے ہیں ان کی مختلف وجوہات ہیں۔ جن میں بے روزگاری سر فہرست ہے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری لوگوں کو اس پیشے کو اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس سفارش ہو وہ نوکری حاصل کر لیتے ہیں جس سے معاشرے میں تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے روزگار کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور ملک کا یہ طبقہ اپنے جائز حق سے محروم ہو کر مجبور ہو جاتا ہے کہ گداگری کو پیشے کی حیثیت سے اختیار کرے۔ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں معاشرتی ترقی کا پہیہ کبھی چل پڑتا ہے تو کبھی رک جاتا ہے وہاں نچلے طبقے کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے ایسا نچلا طبقہ جس کا کوئی خاص ذریعہ معاش نہیں ہوتا۔وہ دیہاڑی پر کام کرتے ہیں صبح گھر سے نکلتے وقت انہیں اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ انہیں کام ملے گا کہ نہیں ایسے لوگ معاشرتی ترقی کے عروج وزوال سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔پاکستان کے موجودہ حالات میں جب معاشرتی ترقی کا پہیہ مکمل طور پر جام ہے۔ بجلی ایک جھلک دکھا کر گم

ہو جاتی ہے، صنعتیں بند ہو رہی ہے حکومتی ترقیاتی منصوبے تعطل کا شکار ہیں اسی صورتحال میں ملک کا مجبور طبقہ جن کے پاس ضروریات زندگی تک نہیں وہ اس بات پر مجبور ہے کہ زندگی کی گاڑی کو چلانے کیلئے گداگری کا سہارا لیں۔اس کے علاوہ کچھ لوگ شوقیہ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں گداگری کے ذریعہ پیسے کمانے کا طریقہ سہل لگتا ہے۔ایسے لوگ ان لوگوں کی حق تلفی کرتے ہیں جنہیں حقیقی طور پر مدد کی ضرورت ہوتی ہے،جو اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے۔ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی مفلسی کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ ایسے حالات میں ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کی مدد کی جائے۔ وہ لوگ جو جھوٹ اور غلط بیانی کرکے پیسہ اکھٹا کر لیتے ہیں ان کی مدد کے بجائے ہمارا فرض ہے کی ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو کہ سفید پوش ہیں، گداگری کے پیشے کو پولیس کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے۔پولیس کی ذمہ داری ہے کہ ایسے پیشہ ور گداگروں کو گرفتار کرے۔جبکہ پولیس جہاں اپنی ذمہ داریوں سے روگردانی کرتی ہے وہیں ان لوگوں سے بھتہ بھی وصول کرتی ہے۔پولیس کی نگرانی میں یہ لوگ ایک منظم گروہ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جو معاشرے کیلئے ناسور بن جاتے ہیں۔ اگر ہمیں معاشرے سے اس لعنت کو ختم کرنا ہے تو گداگری کو پیشے کی حیثیت دینے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے تو ضروری ہے کہ محکمہ پولیس سے بے ایمان لوگوں کا صفایا کیا جائے۔ پولیس کے کارندوں پر چیک اینڈ بیلنس رکھا جائے تاکہ جو غلط حرکات میں ملوث پایا جائے اسے کڑی سے کڑی سزا دی

جائے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔اس کے علاوہ ملکی انتظامیہ کو بھی اس سمت میں مضبوط اور ٹھوس اقدام اٹھانے چاہیں۔ حکومت کے علاوہ عام لوگوں کا بھی فرض ہے کہ برائیوں کی نشاندہی کرے اور اسے ختم کرنے کیلئے حکومت کا ساتھ دیں کیونکہ یہ ہمارا ہی ملک ہے۔اس کے علاوہ ہم میڈیا کے ذریعے لوگوں تک شعور اور آگاہی پھیلا سکتے ہیں۔لوگوں کو گداگری جیسی لعنت سے آگاہی دلانے کیلئے مختلف پروگرام نشر اور شائع کیے جا سکتے ہیں۔کیونکہ یہ ہماری معاشرتی ہی نہیں بلکہ اخلاقی اور مذہبی ذمہ داری بھی ہے۔

کتاب دوستی کا کم ہوتا رجحان

ماضی ہو حال یا مستقبل کتابوں کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ آج اس کے قدر دان پہلے کی نسبت کم ہو گئے ہیں۔دن ہو یا رات جب بھی کتاب ہاتھ میں اٹھائی جائے تو سینکڑوں لکھنے والے انسان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ کتاب امیر و غریب دونوں کو نہایت کم خرچ میں معلومات و تفریح فراہم کرنے کا فریضہ بھی سر انجام دیتی ہے۔لیکن یہاں دلچسپ امر یہ ہے کہ اتنے فوائد رکھنے کے باوجود بھی آج کتاب کے پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہو رہی ہے یہ کوئی پرانی بات نہیں ہے کہ کچھ ہی سال پہلے کتب خانوں کی صورتحال یہ تھی کہ جب آپ کسی لائبریری میں جائیں تو لائبریری کے اندر کتاب دوست لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی۔ان میں سے کچھ لوگ کتاب جاری کروا کر وہیں بیٹھ کر پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے اور بعض الماری کے اندر رکھی ہوئی کتابوں کا سرسری جائزہ لے رہے ہوتے اور پھر واپس چلے جاتے۔غرض کتاب سے دوستی رکھنے والے ہر نوع کے لوگ لائبریریوں کا ذوق و شوق سے رخ کرتے اور لائبریریوں کے اندر کتاب دوست کا ایک بھرپور ماحول ملتا تھا۔اس کے برعکس موجودہ دور میں لائبریریوں کے اندر شاذ و نادر ہی رش دیکھنے کو ملتا ہے صرف گنتی کے چند لوگ ہی لائبریریوں کا رخ کرتے نظر آتے

ہیں ۔اس کی ایک وجہ لائبریریوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہے ۔کیونکہ پہلے ان کی تعداد میں کمی تھی لیکن اب ان کی تعداد میں خاطر خواہ حد تک اضافہ ہو چکا ہے نہ صرف پبلک لائبریریاں مزید بنائی گئی ہیں بلکہ ہر تعلیمی ادارے کے اندر ایک لائبریری لازما موجود ہے ۔جہاں کورس کتب کے علاوہ بھی دیگر مضامین اور معلومات کیلئے کتابیں رکھی جاتی ہیں جن میں تفریحی کتب بھی شامل ہیں ۔دوسری وجہ کتاب سے دوری کی ٹائم کا نہ ہونا بتائی جاتی ہے ۔آج انسان اپنی فکر معاش میں اس قدر مصروف ہو چکا ہے کہ وہ اپنے شوق کی تسکین بھی نہیں کر پاتا۔صرف زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول ہی انسان کا مقصد بن کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے باقی شوق کو پس پشت ڈال دیتا ہے ۔لوگ اپنی مطلوبہ کتاب خود خرید لیتے ہیں اور فارغ اوقات میں پڑھنے کا سوچ کر الماری کی زینت بنا دیتے ہیں جو سالہاسال زینت بننے کے بعد سٹور روم میں قید ہو جاتی ہیں جہاں دیمک ان کا انجام ہوتا ہے ۔ موجودہ دور میں الیکٹرانک آلات کی ترقی نے کتاب دوستی کے سفر کو روکا ہوا ہے ۔اس کی بڑی وجہ انٹرنیٹ کا بڑھتا ہوا استعمال ہے ۔جس نے لائبریریوں کو ویران کر ڈالا ہے الیکٹرانک آلات کے استعمال سے کم وقت میں مطلوبہ مواد آپ کے سامنے آجاتا ہے جس کو کبھی بے شمار کتابوں کی مدد سے اکٹھا کیا جاتا تھا ۔آج کل کی نوجوان نسل اول تو ویسے ہی کتابوں سے پناہ مانگتی ہے لیکن اگر غلطی سے کچھ پڑھنے یا تحریری مواد سے بیشتر انٹرنیٹ کی طرف رخ موڑ لیا جاتا ہے ۔اس کے علاوہ طلباء پر اپنے ہی سلیبس

کا بوجھ اس قدر لاد دیا جاتا ہے کہ وہ دیگر معلوماتی کتب کا مطالعہ کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں اور دوسرا بڑا عنصر وقت کی قلت ہے جو دیگر معلوماتی کتب کے مطالعے کے درمیان حائل ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور نئی ایجادات سے مستفید ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن کسی بھی چیز کا استعمال اس قدر نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے دوسری چیزیں متاثر ہو کر اپنا وجود کھو ڈالیں۔تاہم آج کل کی بھیڑ چال اور نفسا نفسی کے دور میں زیادہ تر لوگ لائبریریوں کی بجائے انٹرنیٹ کو قابل بھروسہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود آج بھی کتابوں کے اصل قدر دان لائبریری جاتے ہیں اور اپنے شوق کی تسکین کرتے ہیں وقت چاہے کوئی سا بھی ہو۔کتاب دوستی ہر زمانے میں ہر دور میں اپنی الگ حیثیت رکھتی ہے۔اگر ہم حکومتی اقدامات کا جائزہ لیں تو ملک کے بڑھتے ہوئے مسائل میں حکومت اس طرح الجھ چکی ہے کہ وہ بجٹ میں بھی تعلیم کو نظر انداز کر دیتی ہے جو لائبریریاں ملک کے اندر موجود ہیں ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی جس کی وجہ سے نہ تو نئی کتب لائبریریوں میں موجود ہوتی ہیں اور نہ ہی جدید سہولتیں عوام کو دی جاتی ہیں۔جس کی وجہ سے کتاب سے دوستی کم ہو کر رہ گئی ہے۔حکومت کو چاہیئے کہ وہ موجودہ لائبریریوں کی حالت کو بہتر بنائیں انہیں متنوع موضوعات کی کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنائے۔تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد لائبریریوں کی طرف رجوع کریں جس سے کتاب دوستی کو بھی فروغ ملے گا اور لائبریریوں کی رونق بھی بحال ہو گی کتاب

دوستی کیلئے ورکشاپ کا وسیع پیمانے پر آغاز ہونا چاہیئے۔ تاکہ عوام اس میں بھرپور دلچسپی لیں اور عوام کو شعوری طور پر بہتر بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

میرا قائد محمد علی جناحؒ

بابائے قوم کی یوم پیدائش پر خصوصی تحریر

قائداعظم محمد علی جناحؒ کراچی کے ایک مشہور و معروف تاجر جناح پونجا کے گھر پیدا ہونے والا بچہ جو بچپن ہی سے دیانت دار، ہونہار، اور فہم و فراست میں اپنی مثال آپ تھا۔ میٹرک کے بعد آپ کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے ہونہار بیٹے کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگا کر کاروبار کو وسعت دیں مگر قدرت نے اس عظیم انسان کو کسی اور ہی مقصد کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ آپ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جب آپ واپس تشریف لائے تو انھیں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر گہرا دکھ ہوا۔ اور ان کو شدت سے محسوس ہوا کہ مسلمانان ہند کو ان کی سخت ضرورت ہے اس وقت مسلمان غلامی کی زندگی گزار رہے تھے اور اپنے جائز حقوق سے بھی محروم تھے ۔ قائداعظم سمجھتے تھے کہ مسلمان مذہب کی رو سے ہندوؤں اور انگریزوں سے الگ قوم ہیں اس لیے ان کی آزادی اور خود مختاری کے لیے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کی ضرورت ہے۔ یہاں اگر مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا ذکر نہ کیا جائے تو مناسب نہ ہوگا۔ یوں تو حضرت علامہ اقبالؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ یوں

تو ہم ہر برس یوم اقبال اور یوم قائد بڑے عقیدت واحترام سے مناتے ہیں لیکن اپنے عظیم قائدین کے قول اور عملی زندگی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ۔یہی سوچ کر میں آج اپنی تحریر میں اپنے عظیم قائد مصور پاکستان حضرت ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کے بارے میں کچھ معلومات شامل کر رہا ہوں۔حضرت علامہ اقبال 9نومبر1877 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا جن کا تعلق کشمیری برہمنوں کے خاندان سے تھا نور محمد ایک سچے ،کھرے اور ایماندار انسان تھے ۔حضرت علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے ہی حاصل کی آپ ایف اے کا امتحان مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لاہور چلے گئے جہاں آپ نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات گورنمٹ کالج لاہور سے پاس کئے ۔1905 میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونورسٹی میں داخلہ لیا اور پھر وہاں سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ جرمنی چلے گئے جہاں آپ نے میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔اور یوں آپ اس دور کے نہایت بڑے شخص تھے ۔آپ نے اپنے اردو اور فارسی کلام کے ذریعے برصغیر پر انگریزی تسلط
اور ہندوستان کے عہد غلامی میں مسلمانانِ ہند کو بیدار کرنے کے لیے اپنے لوح و قلم فکرو ادراک اور شعر وادب کو وقف کردیا۔ہندو اور انگریز سامراجی عہد جبریت میں برصغیر کے مسلمانوں کوآزادی کی اہمیت کادرس دیا۔یہ کام اس وقت آسان نہ تھا مگر حضرت علامہ اقبال نے اپنے چراغ فکر کا اجالا پھیلا کر مسلمانوں کو ظلم

وستم کے تاریک اندھیروں میں وہ روشنی دی جس کا وجود آج بھی نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمان محسوس کرتے ہیں۔جی ہاں وہ علامہ اقبالؒ ہی تھے جنھوں نے 30 دسمبر1930ء کو الہ آباد میں منعقدآل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنا صدارتی خطبہ دیتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں فرما دیا کہ انگریزی تسلط کے اندر یا باہر (ہندوستان کے ان علاقوں پر مشتمل جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی) بہر حال مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطے کا قیام نا گزیر ہو چکا تھا۔علامہ اقبال کا وہ اعلان قیام پاکستان کے اندھیرے راستوں کو روشن کرنے والا پہلا چراغ تھا۔اور پھر علامہ اقبال ہی کے اصرار پر مسلمانان ہندوستان کے بطل جلیل اور مسلمانان ہندوستان کے منتشر شرارے کو مجتمع کر کے ایک قوم کے سانچے میں ڈھال دینے والے عظیم رہبر حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح انگلستان سے واپس بمبئی تشریف لائے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی نئے سرے سے تنظیم سازی کرنے کے بعد 23 مارچ1940ء کو لاہور میں بر صغیر کے تمام مسلم لیگی رہنماوں کی موجودگی میں صدارت کرتے ہوئے وہ قراداد منظور کرائی جس نے ہندو پریس کو قرارداد پاکستان تسلیم کرنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔اور پھر حضرت قائدِ اعظم کی عظیم الشان قیادت میں وہ نا قابل شکست تحریک چلی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور بلا آخر 14اگست 1947 کو پاکستان اسلامی مملکت کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو ان کی اصول پسندی، مستقل مزاجی،فرض شناسی اور ایمان داری کی وجہ سے پاکستا

ن کے پہلے گورنر جنرل بنایا گیا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس عہدے پر سرفرازی، قائد کی بے لوث خدمات کا اعتراف تھا۔ کیونکہ صرف جناح کی قیادت اور درخشندہ شخصیت ہی مسلمانوں کو مطمئن و متحرک کر سکتی تھی۔بحثیت گورنر جنرل قائد اعظم کی حیثیت بے مثل تھی ان کی حیثیت مروجہ طرز حکومت میں محض ایک روایتی سربراہ مملکت کی نہیں تھی،بلکہ انہیں وہ حیثیت حاصل تھی جو کہ بانی پاکستان اور بابائے قوم کے لیے وقف تھی ایسی شخصیت جنھیں نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی مانتے تھے ۔ قائد اعظم کے کارناموں اور تاریخی کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اسٹینلے والپرٹ نے تحریر کیا کہ چند افراد نے تاریخ کے دھارے کو بدلنے کی نمایاں کوشش کی،اور صرف چند نے دنیا کا نقشہ تبدیل کیا،لیکن شائد ہی کسی رہنما کو قومی ریاست قائم کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہو۔ محمد علی جناح نے یہ تینوں کارنامے انجام دیے۔ قائد اعظم ایک ہمہ گیر عمل سیاسی رہنما تھے یہ ان کی سچی اور پر خلوص جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ بے شمار دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود ایک مقتدر مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ قائد اعظم پاکستان کو مضبوط ومستحکم ،ترقی یافتہ اور خود کفیل بنانا چاہتے تھے مگر زندگی نے ان کو مہلت نہ دی اور وہ مختصر علالت کے بعد 11 ستمبر 1948ء کو خالق حقیقی سے جا ملے ۔ قائد اعظم کہتے تھے کہ میرا کام اب ختم ہو چکا ہے اب مجھے مرنے کا افسوس نہ ہوگا، چند برس قبل یقینا میری آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں اس لیے نہیں کہ مجھے دنیا کی تمنا تھی یا میں موت سے خوف کھاتا

تھابلکہ اس لیے کہ قوم نے جو کام میرے سپرد کیا تھا اور قدرت نے جس کام کے لیے مجھے چنا تھا، میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ وہ کام پورا ہوگیا ہے میں اپنا فرض نبھا چکا ہوں، پاکستان بن گیا ہے۔ اب یہ قوم کا کام ہے کہ وہ اس کی تعمیر کرے اور نا قابل تسخیر اور ترقی یافتہ ملک بنائے۔ حکمران حکومت کا کام نظم و نسق، دیانت داری، اور محنت سے چلائے۔ صد افسوس کہ قائداعظم جس پاکستان کو مضبوط و مستحکم ،ترقی یافتہ اور خود کفیل دیکھنا چاہتے تھے آج اسی پاکستان کی ہم نے چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں اور وہ ترقی کی راہ سے بھٹک کر گداگری کی راہ پر آن پڑا ہے۔ پاکستان قدرتی وسائل سے مالامال ہے۔ سونا اگلتی ذرخیز زمینیں ، سمندر، دریا ، پہاڑ ، میدان، سونے ، چاندی ،تانبے ، قیمتی پتھر ، کوئلے کے ذخائر، قدرتی نمک کے ذخائر، قدرتی گیس، تیل سال میں چار موسم پاکستان کپاس کی پیداوار کے حوالے سے دنیا کا پہلا ملک ، چینی پیدا کرنے والا 5 واں، گندم پیدا کرنے والا 9 واں، پھر بھی پاکستان کے حکمرانوں کا بھیک مانگنا عوام کی سمجھ سے، بالاتر ہے۔ بھلا جس کے گھر میں پیٹ بھرنے کے لیے کھانا ہو۔ جس کے پاس تن ڈھکنے کے لیے کپڑا موجود ہو۔ جس قوم کے تھوڑی سی محنت کرنے پر تابناک مستقبل اس کے قدم چومے اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے دست دراز کرے۔ وہ قوم جس پر زکواۃ دینا فرض ہو وہ قوم خود غیر مذہب لوگوں سے جھولی پھیلائے صدقہ خیرات مانگ رہی ہے۔ قائداعظم جس قوم کو معاشی چکی میں پسنے سے بچانا چاہتے تھے آج اسی قوم کا برا حال ہے اور ایسا صرف اس لیے ہوا

ہے کیونکہ ہم نے قائد اعظم محمد علی جناح کی ایمان داری، دیانت داری، مستقل مزاجی فرض شناسی، روشن خیالی اور عمدہ اصولوں کو بھی ان کے ساتھ ہی دفن کردیا ہے۔ آج، ہم اپنے بڑے بڑے دفتروں میں بڑے فخر کے ساتھ اپنے قائد کی بڑی سی تصویر لگاتے ہیں کہ ہم تو بڑے محب وطن، اور قائدانہ سوچ کے حامل ہیں، اور پھر اسی دفتر میں بیٹھ کرنا انصافی، بددیانتی، رشوت، سفارش، اقرباپروری اور دوسرے بہت سے معاملات میں سارا سارا دن ہیر پھیر کرتے رہتے ہیں اور ہماری پشت پر لگی ہے قائد کی تصویر، کیا یہ ان کی پرخلوص قربانی کی توہین نہیں ہے اگر ہم ان کی سیاسی بصیرت اور عمدہ اصولوں سے روگردانی نا کرتے تو یقیناآج ہمارا حال کچھ اور ہوتا۔ مگر ہم نے نہ صرف ان کے احسانات بلکہ ان کے اقوال و عمل کو بھی فراموش کردیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل بھی اپنے عظیم قائد کی پر وقار زندگی سے پوری طرح آگاہ نہیں اگر ان سے غیر ملکی فلمسٹاروں کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ فرفر پورا بائیو ڈیٹابتائیں گے، ٹی وی ڈراموں کا پوچھا جائے تو یقیناً سبھی یاد ہونگے، مگر اگر ان سے قائد اعظم کی زندگی کا کوئی حوالہ پوچھا جائے تو نتیجہ غلط جواب کی صورت میں نکلے گا، مگر اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے یہ سارا کیا دھرا تو ہمارا ہے ہم نے ان کو بتایا ہی کب ہے سکھایا ہی کب ان کے سامنے ایمان داری، دیانت داری، مستقل مزاجی، فرض شناسی، روشن خیالی اور عمدہ اصولوں کا مظاہرہ کیا ہی کب ہے۔افسوس کہ ہم اپنے ساتھ ساتھ نوجوان نسل جسے قائد اعظم

قوم کا سرمایہ کہتے تھے ،اس کو بھی تباہ و برباد کر رہے ہیں۔

سوہناﷺ آیا تے سج گئے نیں، گلیاں بازار

آج سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت کی مناسبت سے پورے عالم اسلام میں جشن عید میلاد النبی منایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی پیروی کو اپنی محبت کی نشانی قرار دیا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے۔ " اے پیغمبر! کہہ دو! اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو" مزید ارشاد ہوا۔ "تمہارے لئے اللہ کے رسول ہی بہترین نمونہ عمل ہیں"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ ﷺ کو مجسم قرآن کہا تھا۔ آپ کے اسوہ حسنہ سے ہی دنیا انقلاب آشنا ہوئی۔ انسان نے اپنے آپ کو پہچانا' انسانیت کی رفعتوں کو پایا' زندگی کا قرینہ سیکھا' مقصد حیات سے آگاہی حاصل کی۔ آج کے دن نے قیامت تک آنے والے زمانوں کے قرینے بدل دیئے۔

اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے، طاقت اور تلوار کے زور پر نہیں بلکہ رحمتہ للعالمین کی تعلیمات اور محسن انسانیت کے اخوت، بھائی چارے،.برابری کی بنیاد پر انسانوں کے ساتھ سلوک اور رواداری کے بل بوتے پر پھیلا۔ حضور نبی اکرم ﷺ پوری کائنات میں بلند ترین مقام پر فائز ہیں جن کے وجود سے نکلنے والے پسینے میں خوشبو، ان کے پیغام حسنہ میں امن و بھائی چارے کا درس اور ان کے چلنے پھرنے میں لوگوں کو سکون قلب اور حفاظت نصیب ہوتی ہے۔ شاہ و گدا بھی، امیر غریب حتیٰ کہ غیر مسلم بھی آپ کی ذات کو محسن عظیم قرار دیتے ہیں۔ دور حاضر میں باہمی

اخوت و محبت، امن و سلامتی اور امانت و دیانت کے پیغام اسلامی کو اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ دہشت گردی کے بدنما داغ اسلام اور مسلمانوں کے دامن سے صاف کرکے اسلام کے حقیقی پیغام کو نمایاں کیا جائے۔ اسلام رحمت اور امن کا درس دیتا ہے اور دلوں میں جذبہ محبت، امن اور خدمت انسانیت، محبت رسول کے ذریعے پیدا ہو تو انسانیت کی فلاح ممکن ہوتی ہے۔ بلاشبہ اسلام سیاست سے لے کر معیشت تک زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے اور یہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کو بھی اسلامی خطوط پر استوار کرانے کا درس دیتا ہے۔ امت مسلمہ اتحاد کے بجائے نفاق میں مبتلا ہے، دنیا بھر میں مسلمان دشمنان اسلام کے آگے محتاج و مجبور ہیں۔ جس دن ہم واقعتاً امت محمدی بن گئے تو ہم دشمنان اسلام کی غلامی سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ ربیع الاول ایسا مقدس مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں علم کی روشنی پھیلانے کیلئے نبی کریم کو پیدا فرمایا اور نبی کریم پر اپنی آخری کتاب قرآن مجید نازل کی جو رہتی دنیا تک انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ قرآن مجید ایسی کتاب ہے جس میں دنیا کے تمام علوم کے اشارے ملتے ہیں۔ دنیا میں انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے بڑے بڑے فلسفہ ، نظریئے اور منشور پیش کئے گئے جن کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تمام میں قرآن مجید کی تعلیمات کا عکس دکھائی دے گا۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت محمد مصطفیٰ کی امت میں پیدا کیا۔ امت مسلمہ جن حالات سے گزر رہی ہے اس کا

تقاضا ہے کہ ہم اتحاد بین المسلمین اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیں لیکن بد قسمتی سے دنیا بھر میں ہر جگہ مسلمان پیسوں، مشینری، ٹیکنالوجی، عسکری آلات اور دیگر معاملات میں دشمنان اسلام کے آگے محتاج و مجبور بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں عملاً یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ہم اتحاد بین المسلمین اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کیلئے پوری سچائی کے ساتھ کام کریں۔ اگر ہم اب بھی عہد کرلیں کہ ہمیں امت واحد اور امت رسول بننا ہے تو پھر ہمیں اپنے عمل سے بھی دکھانا ہوگا کہ ہم ایک امت ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور آپ کی تعلیمات پر عمل ہمارا مقصد زیست ہونا چاہیئے ایمان اور یقین کی دولت کے ذریعہ ہی ہمیں راہ حق پر چلنے کی سعادت حاصل ہوسکتی ہے۔ علم ہی کے ذریعہ حق و باطل کی تمیز کی جاسکتی ہے جب تک ہم عشق رسول سے اپنی زندگی کو معمور نہیں کرتے سچے مسلمان نہیں بن سکتے آج ہم علم و عمل سے دور ہوچکے ہیں۔ اسلام اخلاقی تعلیمات، احترام انسانیت کا درس دیتا ہے اور عدم تشدد کی تعلیم و تلقین کرتا ہے یہ آپ کا حسن سلوک ہی تھا کہ آپ سب کے لئے صادق اور امین تھے دراصل اسلامی تعلیمات ضابطہ حیات اور فلسفہ زیست سارے عالم انسانیت کے لئے بھی ہے۔ آج ہماری تباہی اور بربادی کی بنیادی وجہ دین اسلام سے دوری ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ ہمارے لئے اثاثہ زیست ہے۔ اگر ہمیں پستی سے دوبارہ بلندی کی طرف جانا ہے تو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا محور بنانا ہوگا۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات پر اس کی روح کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ آج کے دن علمائے

کرام حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا بیان کرتے ہیں۔ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے آپ ﷺ کے پیغام کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگیاں حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مطابق گزارنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ سنجیدگی سے سوچا جائے تو یہ مبارک دن ہمارے لئے ہر پہلو اور ہر زاویے سے اپنی زندگیوں کو اسلام کے ابدی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے یوم تجدید عہد کا درجہ رکھتا ہے۔

پاکستان دہشت گردی کے لیے زرخیز میدان کیوں؟

اسلامی ممالک کی فہرست میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جو نظریہ اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا۔اس کے قیام میں مسلمانوں کو لاکھوں قربانیاں دیناپڑیں۔پاکستان کے حصول کا مقصد اسلامی اقدار کے سایے میں زندگی بسر کرنا تھامگر بدقسمتی سے یہ ملک.بڑی منصوبہ بندی اور سوچی سمجھی سازش کے ساتھ اپنے اعلیٰ اہداف سے ہٹاکر قتل و غارت اور انسانیت سوز مظالم کی آماجگاہ میں تبدیل کردیاگیا۔آج ملک کے اندر بدعنوانی اور لاقانونیت کا راج ہے۔خوف وہراس کی ایک عجیب فضا پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ناجانے وہ کون سی نادیدہ قوتیں ہیں، جنھیں ہماری آزادی آج بھی کھٹک رہی ہے،اوروہ قوتیں ہم پر پے درپے وار کررہی ہیں اور ہم.برسوں کی طرح آج بھی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں،ہمیں بحیثیت قوم شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے کہ جن کی قربانیوں سے یہ ملک وجود میں آیا آج وہی اس ملک کے اندر دربدر کی ٹھوکریں کھارہے ہیں۔نااہل اور کرپٹ حکمرانوں کے ہاتھ میں اس ملک کی تقدیر تھما دی گئی ہے۔ایک طرف مافیائی نظام اپنی درندگی کے خنجر سے اس قوم کو زخم لگارہاہے تو دوسری طرف نام نہاد اورمفادپرست این جی اوز بھٹکی ہوئی لاچار قوم کے ذہنوں میں اپنی شاطر سوچ پیوست کررہی ہیں۔پاکستان میں دہشت گردی، قتل و غارت عام ہے یہاں انسانیت کشی

کبھی ثواب کا ذریعہ سمجھی گئی تو کبھی جھوٹی انا کی تسکین کا ذریعہ ۔دہشت گردی مذہبی طبقے کی جہالت ونادانی ، حکمران طبقے کی مغرب نوازی اور امریکہ کی گھناؤنی، مکارانہ سوچ کا نتیجہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پاکستان اس وقت دہشت گردی کے لیے ایک زرخیز میدان ہے جو دشمنان وطن کے پیسے اور امریکہ کی مکاریوں سے وجود میں آئی ۔اس طرح قتل وغارت اس ملک کے انسان نما درندوں کے لیے ذریعہ معاش بنی ہوئی ہے ۔قتل وغارت اس قدر عام ہے کہ اگر کہیں پندرہ بیس لاشیں گر جائیں تو میڈیا اس کو معمولی خبر سمجھ کے شائع نہیں کرتا اور عوام اس کو خاطر میں نہیں لاتے ۔للذا اس طرح کی صورت حال میں ایک پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ حالات کا درست جائزہ لیکر اس مایوسی ، نفسا نفسی کے ماحول میں زندگی گزارنے کے آداب سے آگاہ ہو اور وقت کی آواز پر لبیک کہے ۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے ؟اس وقت قوم کے سامنے ہجرت کے نام پر فرار ،ذاتی مفادات کے حصول وبقاء کیلئے ملکی مفاد کی غلط تفسیر کا سہارا، اقدار کواوزار کے طورپراستعمال کرنے ، عوام کو پست، بھکاری ، چپاتی پرست ، بیرونی امداد کا دلدادہ،آرام طلبی کوراہ حل کے طورپراستعمال کیا جارہا ہے۔بدعنوان اور نااہل حکمرانوں کی ایک نفسیاتی خامی یہ ہوتی ہے وہ ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کوئی ان کی پگڑی نہ اچھال دے، کہیں ان کی شان میں کمی نہ ہو، لہٰذا اپنے لئے ایک جھوٹی فضاء قائم کرتے ہیں،طاقت اور اسلحہ کے زور پر ہراس آواز کودبانے کی کوشش کرتے ہیں جوان کے خلاف اٹھے یہ ہراس شخص سے

ہراساں رہتے ہیں جو اپنے وجود کا اظہار کھل کر کرے، اگر ہم ایک قوم بن کر ان بھیڑیوں، مگرمچھوں کا مقابلہ کریں، تو یہ جرائم پیشہ قاتل بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر بن سکتی ہے آج ہمیں اپنے وجود کا اظہار اس طرح سے کرنا ہے کہ اگر دشمن ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھے تو اسے اس کی قیمت چکانا پڑے۔آج درحقیقت ہم دشمن کے ہاتھوں نہیں بلکہ حالات کے تقاضوں پر کان نہ دھرنے کی وجہ سے رسواء ہیں جو قومیں حالات کے تقاضے پورے نہ کریں تو بے رحم اور سفاک ان پر مسلط ہو جاتے ہیں حالات کے تقاضوں کو سمجھنے کیلئے بصیرت کی ضرورت ہے اس لئے لوگوں کے اندر شعور وآگاہی پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ مافیائی نظام کو سمجھیں اور اس سے لاتعلقی کا اظہار کریں۔ہم بحثیت پاکستانی شہری اپنے وجود کو محسوس کروائیں، ہماری ناکامی کی ایک وجہ ہمارا جرم اور مجرم کا تعاقب نہ کرنا ہے پورے ملک کا یہ حال ہے کہ کہیں بھی جرم ہو کوئی تعاقب کرنے والا نہیں ۔اگر کوئی مجرم اپنے ہاتھ خون ناحق سے رنگ بھی لیتا ہے تو اس کے خلاف ایف آئی آر تک نہیں کاٹی جاتی۔لہٰذا قاتل کو کوئی قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی حتیٰ کہ اسے ایک دفعہ بھی تھانے نہیں جانا پڑتا۔آج پاکستان میں مختلف طبقات کے اندر خوداعتمادی کا فقدان ہے لہٰذا اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کریں، ہمیں یہ کسی احمق نے باور کرادیا ہے کہ ہمارے مسائل کوئی باہر سے حل کریگا۔آج ہمیں بحثیت قوم اپنی مشکلات کا خود حل نکالنا ہوگا، کسی دوسری قوم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں کہ کوئی

باہر سے مسیحا بن کر آئے گا اور ہماری مشکلات کو حل کریگا۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ہم تمام فرائض کو چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں اور سارا کام اللہ تعالٰی پر چھوڑ دیں، اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہمارا کام ہے اور نتیجہ اللہ تعالٰی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر مندرجہ بالا نکات کی طرف پوری قوم توجہ دے تو انشاء اللہ پاکستان کے اوپر بدبختی کے منڈلاتے بادل چھٹ جائیں گے اور یہ قوم سکھ کا سانس لے گی۔

دعا !

دعا ہمارے اوراللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی وضاحت کرتی ہے۔ ہم مانگتے ہیں اور وہ دیتاہے. ہم میں سے بہت سے لوگ اس شک کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں کہ ان کی دعائیں خدا کی طرف سے قبول کی جارہا ہیں یا نہیں ، نعوذ باللہ (ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)ایسا اس لئے ہے کیونکہ بسااوقات ہمیں وہ چیزیں نہیں ملتی ، جن کیلئے ہم دعا گو ہوتے ہیں. اللہ "سب جاننے والا" ہے اس لئے یہ بھی جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں مناسب وقت اور مناسب صورت میں وہ چیزیں عطا کی جاتی ہیں جو ہمارے لئے بہتر ہوں۔ للہذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم نماز پڑھتے رہیں اور رب العزت سے اس کی مہربانیوں کی درخواست کرتے رہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ ’’ کسی بھی مومن کی دعا بیکار نہیں جاتی ۔ اسے اس کا اجر یا تو اسی دنیا میں مل جاتا ہے یا آخرت میں بشرط یہ کہ وہ صابر ہو۔‘‘حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا مندرجہ بالا بیان ہمارے لئے ایک چشم کشا حقیقت ہونا چاہئے اور اسے فائدہ مند سمجھ کر ہمیں اس یقین کے ساتھ خود کو دعاؤں میں مشغول رکھنا چاہیے کہ اگر اس دنیا میں نہیں تو آخرت کی زندگی میں اس کا اجر ضرور ملے گا (سبحان اللہ) جو اس زندگی سے زیادہ اہم اورہمیشہ رہنے والی ہے۔دعا ہماری

روز مرہ کی زندگی میں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے. یہ ایک ایسا بندھن ہے جو خدا کی ذات سے ہمارے ایمان کو مضبوطی کے ساتھ باندھے رکھتا ہے. ہم خدا کو سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے اور عبادت کرتے ہر وقت یاد کرتے ہیں کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ کہ صرف وہی ایک ایسی ذات ہے جو شر سے اور شرپسندوں سے ہماری حفاظت کر سکتا ہے۔ ہمارے مبلغین کو چاہیے کہ ہمیں دعا، کی اہمیت اور اس کے تکمیل کے متعلق کچھ بتائیں۔ مبلغین کو چاہئے کہ وہ ہماری حوصلہ افزائی کریں اور ہمیں یقین دلائیں کہ کوئی دعا بیکار نہیں جاتی اس لے ہمیں زیادہ سے زیادہ دعا مانگنی چاہے۔. کیوں کہ یہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور قبول کر لی جاتی ہے۔ مبلغین کی طرف سے بار بار دعا کے لیے قائل کرنے کی کوشش امت کے لئے حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہوگی۔ مسلمانوں کو درپیش تمام مصائب کا خاتمہ کرنے کے لئے، دعا کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کرنے کہ علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے. دعا امت میں ایک اچھی عادت یہ پیدا کر دے گی کہ ہر مسلمان پاکیزگی کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو گا. تقویٰ ایمان کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اللہ کے بندے دنیاوی مفادات کے لیے خدا سے تعلقات زیادہ استوار کرتے ہیں. یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اسے قبول نہ کرے۔ دنیاوی آرام و آسائش کا مطالبہ کرنا بھی اچھی بات ہے یہ منع نہیں ہے۔اور یہ بھی اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول ہے۔ لیکن ہمیں ہمارے چھوٹے بڑے، جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر کیے گئے گناہوں

کی بخشش طلب کرنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہمارے گناہ معاف کر دیے گئے تو ہمارے روز مرہ کے مسائل یا تو حل ہو جائیں گے۔یا بالکل واقع ہی نہیں ہو نگے ، انشاء اللہ.

لہٰذا اگر دعا کی اہمیت پوچھی جائے۔تو اللہ اپنے بندوں پر سب سے زیادہ مہربان اور نظر عنایت کرنے والا ہے اور ہمیشہ اپنے بندوں کو معاف کرنے کے لئے تیار ہے۔اس لیے کہ اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اللہ تمام مخلوقات سے زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں یا کسی بھی حالت میں ہوں اسکی رحمت اور محبت ہمارے ساتھ ہوتی ہے، ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہماری فریادوں کی سنوائی ابھی نہیں تو بعد میں ورنہ آخرت میں تو ضرور ہو گی۔ اللہ ایک صورت حال پیدا فرماتا ہے اور شدید غیر متوقع صورت میں مدد بھیجتا ہے۔ یہ ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ کس طرح ہمیشہ اس کی رحمت اسکی رحمت و شفقت نے ہمیں بے چینیوں سے نجات دلائی ہے۔ یہ طرز عمل ہمیں اسکا شکر گذار بنا دیگا۔ اسکے بدلے ہمیں مشروع طریقہ سے شکر گذاری اور احسان مندی کا اظہار کرنا چاہئے۔ ہم سب یہ بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ ہمیں پکارتا ہے کہ (ہے کوئی مجھے پکارنے والا کہ میں اس کی درخواست قبول کروں) ہماری خواہشیں پوری کرنے کیلئے۔ خدا سب جانتا ہے کوئی بھی چیز اس سے چھپی نہیں ہے۔وہ آپ کی جائز ضروریات کو جانتا ہے۔ وہ آپ کی خاموشی کی

آواز کو سنتا ہے اور آپ کے آنسوؤں کی زبان کو سمجھتا ہے۔ اس سے مانگتے رہیں انشاء اللہ ہماری خواہشیں اور دعائیں ضرور پوری ہونگی۔ اسلام میں 'مایوسی' کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اسلئے کہ ناامیدی کفر ہے۔ اور جو نعمتیں تم کو میسر ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں۔ پھر جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کے آگے چلاتے ہو ہم انسانوں کو اللہ ہر طرح کا سکون، مہربانی، مدد اور رحمت عطا فرماتا ہے۔ ہم دنیاوی آرام حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے یہ تمام مہربانیاں اس دعا کی وجہ سے ہیں۔ جو ہم کرتے ہیں اور خدا اسے قبول کرتا ہے۔ اور اگر کسی بھی قسم کی تکلیف، شر، یا بدقسمتی ہمیں پہنچتی ہے تو خدا سے مدد حاصل طلب کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ وہ خود ہمیں اس کی مدد چاہنے کی ترغیب دیتا ہے. ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے یقیناً ہمیں اس کے سامنے جھکنا چاہئے اور مدد طلب کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ دعا ہر قسم کی مصیبت کے لئے امرت ہے۔ دعا کو مزید مؤثر بنانے کے لئے، ہمیں کبھی دعا نہیں چھوڑنی چاہئے۔ اور اللہ کی ذات سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہئے اسلئے کہ اللہ کی رحمتیں اور عنایتیں لامحدود ہیں۔ " رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "ضرورت کے دوران اللہ سے مدد طلب کرو۔ اور ہر طرح کی تکلیف اور دکھ میں اس کی پناہ چاہو۔"" "عاجزی کا اظہار کرو اور اسے پکارو، یہی دعا کا منشاء اور لب لباب ہے۔ جب بھی کوئی مومن دعا کرتا ہے تو مندرجہ بالا صورتوں میں اسکی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔ یا تو اسکی دعا اسی دنیا میں

قبول کر لی جاتی ہے۔ یا پھر اسکا اجر اسے آخرت میں ملے گا۔ یا پھر اسکے گناہوں کو اس
" طرح چھپا دیا جاتا ہے جیسا کہ اس نے ایک بھی گناہ کیا ہی نہیں۔

ڈپریشن-DEPRESSION

آج کل یہ ایک لفظ ہے جس کا استعمال بہت عام ہوگیا ہے، اور کچھ رواج سا بن گیا ہے کہ جب بھی کسی کو کوئی پریشانی ہوتی ہے، یا کوئی بات بار خاطر ہو جاتی ہے، یاماحول ناگوار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ڈاکٹروں کے پاس جائیں تو ڈاکٹر کا جواب ہوتا ہے کہ بس تھوڑے ڈپریشن DEPRESSION کی وجہ سے آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا ہے۔ کسی کو ہارٹ اٹیک ہو ...... وجہ...... ڈپریشن گھر میں یا آفس میں کوئی سر پکڑے بیٹھا ہو......

وجہ ......پوچھیں۔

کچھ نہیں ......بس ذرا سا ڈپریشن ہے۔

دراصل اس حالیہ زمانہ کے لوگ زیادہ ڈپریشن میں نہیں، لیکن وہ خود کو زیادہ ڈپریشن میں سمجھتے ضرور ہیں۔ فی زمانہ ڈپریشن کا لفظ بذات خود ایک روگ بن گیا ہے۔ جس سے کسی فرد کو فرار نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ پتا چلانا مشکل ہے کہ ڈپریشن کیوں اور کیسے ہوتا ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے بھی لوگ بیمار پڑتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں ڈپریشن کی اصطلاح اتنی عام نہیں تھی۔ دراصل ! ڈپریشن ایک جسمانی کیفیت کا نام ہے جو مخصوص حالات کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ

دماغی واعصابی اعتبار سے انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اسلئے اس میں جذبات کی کیفیات اور جذباتی تلاطم زیادہ ہوتا ہے۔ جس کو وہ برداشت بھی کرتا ہے۔ دیگر جانداروں کی طرح فوراً حملہ نہیں کر بیٹھتا۔ یہی کیفیت جس میں مصیبت کو برداشت کرنا پڑے ڈپریشن DEPRESSION کہلاتا ہے۔ڈپریشن کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ موسم کی سختی سے لے کر بچوں کی بیماری تک ،اسباب خورد نوش کی کمیابی سے لیکر شریک حیات کی سرگرانی تک۔ لوگ تیز رفتار اور تن آسان زندگی کے عادی ہو گئے ہیں، اور اس کے علاوہ ہمارے اپنے تضادات ہیں، جو ہمیں سخت ڈپریشن میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ڈپریشن کے اثرات ہر شخص کے مزاج و پس منظر کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان سے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے مزاج کی ساخت استطاعت اور حالات کے لحاظ سے زندگی گذارنے کے لئے اپنا لائحۂ عمل تجویز کرے۔

اگر آپ خاتون خانہ ہیں اور اپنے سسرال والوں سے علیحدہ نیوکلیر فیملی کی ممبر ہیں تو صبح بہ یک وقت کتنے ہی کام اکٹھے آپ کو کرنے پڑ جاتے ہیں ، جلدی بیدار ہونا ، بچوں کو اسکول کے لئے تیار کرنا، شوہر نامدار کے لئے چائے ناشتہ وغیرہ ، پھر ان کے جانے کے بعد گھر میں ہر طرف بکھرا سامان ، کچن میں گندے برتنوں کا ڈھیر ،اور یہ فکر کہ دوپہر کے کھانے میں کیا پکائیں ، یہ سب امور دل و دماغ میں ایک کھچڑی پکا کر آپ کو شدید دباؤ میں مبتلا کر سکتے ہیں یہ ایک دن کا نہیں بلکہ روز روز کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح اگر آپ مرد ہیں تو آفس میں آپ کی ٹیبل پر

کی جا بے جا ڈانٹ پھٹکار آپ (BOSS) رکھی ہوئی فائلوں کا انبار اور گاہے بگاہے باس کو یقینی ڈپریشن کا مریض بنا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کم آمدنی، زیادہ اخراجات، بچوں کی تعلیم و تربیت، بیماریاں، خاندانی جھگڑے، ایسے لاتعداد امور ہیں جو آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ڈپریشن کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے، کیوں کہ اس مرض میں ذہن مزاج، بدن، عادات واطوار، رویہ سب متاثر ہوتے ہیں۔ نیند میں کمی، تھکن کمزوری، بے چینی، یادداشت میں خلل، فیصلے کرنے میں دشواری، خوردونوش کی طرف کم توجہ، بے ربط خیالات کی آمد، خصوصاً بلند فشار خون امراض قلب، خلل اعصاب، السر معدہ، یہ سب ڈپریشن کے زیر اثر رونما ہو سکتے ہیں،، اور بعض اوقات ہارٹ اٹیک اور خود کشی کا سبب بن جاتے ہیں۔ بہر حال! ڈپریشن ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ یہ نہیں، DEPRESSION، کہ اس سے آنکھیں بند کرلی جائیں، بلکہ اس سے نمٹنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ڈپریشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے نبرد آزمائی کی جائے۔ اس بیماری میں مبتلا لوگوں کی وسیع پیمانے پر تحقیق و تفتیش کی گئی ہے۔ ہر طبقہ خیال اور شعبہ زندگی کے لوگوں کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ وہ سب کے سب کسی اندرونی بیماری میں مبتلا نہیں تھے۔ بلکہ احساس تنہائی، کسی پریشانی، غصہ، جھنجھلاہٹ، ہیجان، داخلی کشمکش یا زندگی کی سختی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار تھے۔ اس تکلیف میں مردوں سے زیادہ خواتین مبتلا ہوتی ہیں، عمر رسیدہ لوگوں سے زیادہ جوان العمر

ان پڑھ لوگوں سے زیادہ تعلیم یافتہ۔دست کاروں سے زیادہ دماغی کام کرنے والے۔ ڈپریشن میں مبتلا لوگ زیادہ تر ایک خاص شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔یعنی فطرتاً حساس، باریک بین، بے حد محتاط، جذئیات کا از حد خیال رکھنے والے۔ڈپریشن ایک ایسا روگ ہے جسے ہم جڑ سے تو ختم نہیں کر سکتے،لیکن مختلف ذرائع اور طریقوں سے اس کو کم ضرور کر سکتے ہیں۔اس لئے جب بھی آپ کو محسوس ہو کہ ڈپریشن کا شکار ہو رہے ہیں تو فوراً کسی ماہر معالج سے رجوع کرنا چاہئے، اور اس کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے،تاکہ آپ فوری طور پر ڈپریشن کا تدارک کر سکیں۔ڈپریشن دور کرنے والی دواؤں اور علاج سے 80 فیصد افراد کو فائدہ ہوتا ہے۔آج کل متعدد دافع ڈپریشن اور بحالی مزاجی ادویہ دستیاب ہیں۔لیکن سب سے پہلے تو ڈپریشن کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ آپ اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھیں۔ خود بھی خوش وخرم رہیں۔اور اپنے ارد گرد والے لوگوں اور خاندان والوں کو بھی خوش وخرم رکھیں۔آپ کے دوست احباب بھی ڈپریشن کے سد باب اور ازالے کے لئے ضروری ہیں۔ رشتہ داروں دوستوں کی اعانت اور مثبت رویہ ہو تو نہایت صحت افزا اثر ہوتا ہے۔آج کل ڈپریشن ایک بڑی وجہ ہمارے آپس ہمیں رفقاء اور اقرباء کے درمیان کمیونیکیشن گیپ [Communication Gap] ہے۔جس کی وجہ سے لوگ اندر ہی اندر الجھ کر زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اس لئے کوشش کرکے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گذارنے کے لئے وقت نکالیں۔قرآن الکریم میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 36 میں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔اور اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ
والدین سے اچھا سلوک کرو، نیز قریبی رشتہ داروں سے۔ یتیموں، مسکینوں، رشتہ،
داروں، ہمسایوں، اور اجنبی ہمسایوں، اپنے ہم نشین اور مسافر، ان سب سے اچھا
سلوک کرو۔ (القرآن)

رشوت ایک گھناؤنا جرم

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایک نگراں رکھا ہے، جسے ضمیر کہا جاتا ہے۔ ضمیر جب تک جاگتا رہتا ہے، سب کچھ ٹھیک رہتا ہے، مگر اس کے مردہ ہوتے ہی اعضائے جسم اچھے برے کی تمیز کھودیتے ہیں اور انسان نفس کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ ضمیر کے بیدار رہنے یا مردہ ہونے کا کوئی موسم نہیں ہوتا، بلکہ معاشرے میں جب بھی برائی ،بدعنوانی یا ناجائز کاموں کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے یا برے انسان کی جھوٹی شان و شوکت کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے، اس وقت انسان کا ضمیر شیطانی روپ اختیار کرلیتا ہے اور وہ معاشرے میں منفی کردار انجام دینے لگتا ہے۔ آغاز میں وہ اس فعل بد اور منفی کردار کو چیلنج کے طور پر لیتا ہے۔ مثلاً وہ سوچتا ہے کہ جب دوسرے لوگ ایسا کرکے معاشرے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں تو پھر وہ کیوں نہ ایسا کرے۔ چنانچہ وہ اپنی محنت اور کوشش کو تیز کردیتا ہے، جب تک اسے اس فعل کے برے انجام کا احساس ہوتا ہے، تب تک وہ اس دلدل میں دھنس چکا ہوتا ہے، جس سے نکلنے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور غربت کا خوف اسے اس دلدل میں مردہ زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ جھوٹ،
رشوت، چوری، قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کردیتا ہے، جس سے معاشرہ بے چینی اور بدامنی کا

شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً رشوت خوری ایک بہت برا فعل ہے۔ حق دار سے حق چھین کر غیر مستحق کو حقدار بنانے کے لیے یہ فعل بدانجام دیا جاتا ہے۔ ضمیر کے بیدار رہنے یا مردہ ہونے کا کوئی موسم نہیں ہوتا، بلکہ معاشرے میں جب بھی برائی، بدعنوانی یا ناجائز کاموں کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے یا برے انسان کی جھوٹی شان و شوکت کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے، اس وقت انسان کا ضمیر شیطانی روپ اختیار کرلیتا ہے اور وہ معاشرے میں منفی کردار انجام دینے لگتا ہے۔ آغاز میں وہ اس فعل بد اور منفی کردار کو چیلنج کے طور پر لیتا ہے۔ مثلاً وہ سوچتا ہے کہ جب دوسرے لوگ ایسا کرکے معاشرے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں تو پھر وہ کیوں نہ ایسا کرے۔ اس فعل میں رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں ملوث ہوتے ہیں، کیوں کہ ایک شخص اگر وہ حقدار نہیں ہے تو کیوں دوسرے کا حق لینے کی کوشش کر رہا ہے، پھر یہ جانتے ہوئے کہ اس میں صاحب حق کی حق تلفی ہوگی، رشوت لینے والا اس غلط کام کی اور ناجائز طریقے سے اس کی مدد کر رہا ہے، اسی لیے دونوں گنہگار ہوں گے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی کی مدد کرتے وقت اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اس کے عوض مال کا مطالبہ کرے یا لاچار شخص اس کو پیسہ دینے کے لیے مجبور ہو، قرآن کریم میں یہ صفت یہودیوں کی قرار دی گئی ہے: ''یہ لوگ جھوٹ کو سننے والے اور حرام کا مال کھانے والے ہیں۔'' رشوت کا طریقہ نہ صرف مشکلات پیدا کرتا ہے، بلکہ زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ مثلاً آج مکانات تیار کیے جاتے ہیں، تو ان میں اس قدر پیسہ

نہیں لگتا، جس قدر اس کے بیچنے والے اپنا بھاؤ رکھتے ہیں۔ یا دیگر اشیاء جو انسانوں کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہیں، مگر جب بلڈر یا تاجر سے اس سلسلے میں معلوم کیا جاتا ہے، تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں ان چیزوں کی تیاری میں بہت زیادہ رشوت دینی پڑتی ہے، اس کے بغیر ہم انھیں تیار نہیں کر سکتے۔ ایسے تاجر اپنی مصنوعات کی قیمت کو مناسب رکھنے کے لیے رشوت میں تو کمی نہیں کرپاتے، کیوں کہ وہ ان کے بس میں نہیں ہوتا، مگر وہ میٹریل میں کمی کر دیتے ہیں، جس سے وہ مکان یا سامان، انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ آئے دن اس طرح کے واقعات اخباروں میں پڑھنے کو ملتے ہیں، جب کہ رشوت کا یہ مال سفید پوش سرمایہ کاروں کی جیب میں جاتا ہے۔ اولاً تو ایسے واقعات کی چھان بین نہیں ہوتی، اگر عوام کے احتجاج کے نتیجے میں کچھ کارروائی ہوئی بھی، تو صرف وہ لوگ گرفت میں آتے ہیں جو رشوت دینے والے ہوتے ہیں، مگر پس پردہ رہنے والے سفید پوش سرمایہ داروں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس طرح رشوت اور بدعنوانی کا عام رواج ہو جاتا ہے۔ پھر اندرونی طور پر اس کار بد کی مدح سرائی یا اس کو مزے لے لے کر بیان کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے، تب یہ رویہ ان کے ارد گرد رہنے والے عام لوگوں میں اس برائی کو پیدا کرنے کا محرک بن جاتا ہے، جو معاشرے کے لیے ناسور ثابت ہوتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنے بچے کو اس کی ذہانت کے سبب بڑا ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتا ہے، تاکہ معاشرے میں اس کی تحسین ہو اور وہ لڑکا آئندہ اس کے لیے بڑے بینک کا اے ٹی ایم ثابت ہو، جس میں

ہر وقت روپے بھرے ہوں۔ تو وہ اس کے لیے ڈونیشن کے طور پر لاکھوں، روپے خرچ دیتا ہے۔ پھر جب یہ بچہ بڑا ہو کر اپنی تعلیم مکمل کرلیتا ہے تو اپنے باپ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے اپنے ضمیر کا سودا کرتا ہے اور رشوت کا کھیل شروع کردیتا ہے۔ موجودہ دور میں ایسی ہی تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے، جو رشوت خوری کی بنیاد پر کھڑی ہو۔ایسے میں دوسرے لوگ اس میدان میں پیچھے کیوں رہیں، اس میں عزت بھی ہے اور پیسہ بھی۔ایسا ہی کچھ معاملہ ملک کے ان حکمرانوں کا بھی ہے جو انتخاب میں کامیابی کے بعد ملنے والے بے حساب پیسوں کے لیے لاکھوں، کروڑوں روپے انتخابی مراحل میں بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔یہی حال تمام معاملات میں ہے، شاید ہی کوئی جگہ ہو جو اس سے خالی ہو۔ معاشرہ افراد سے بنتا ہے، اس کی تعمیر وترقی یا اس کے برعکس تخریب وتنزلی کا معاملہ بھی اس میں رہنے والے افراد کے کارناموں سے ہی وجود میں آتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ پرامن اور خوشحال رہے، تو ہمیں 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔ ورنہ معاشرے کے افراد بڑی تعداد میں جرائم میں ملوث ہوں گے اور اسباب تعیش کے حصول، مال واسباب کے غرور میں چور ہو کر وہ دوسروں کو بھی اس مایا جال میں پھنسانے پر مجبور کریں گے۔ ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اسلامی احکام کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ ہمہ وقت یہ تصور ذہن میں بٹھانے کی ضرورت ہے کہ دنیا کی زندگی ایک عارضی زندگی ہے، اس کی چمک دمک محض ایک

دھوکہ ہے،اصل زندگی آخرت کی ہے۔جب ہم اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں گے اور مضبوطی سے اس پر ثابت قدم رہیں گے، تو پھر ہمارا ضمیر ہمیشہ بیدار رہے گا اور ہم احساس کمتری کا شکار ہو کر عارضی دنیا کو ترجیح دینے کے بجائے آخرت کی دائمی زندگی ،اس کی راحت اور وسکون کو فوقیت دیں گے۔

خوش رہنا ہے تو!

کہا جاتا ہے کہ خوشیاں بادل کے اس اجلے ٹکڑے کی طرح ہوتی ہیں جو پل بھر کے لیے سایہ کرکے رخصت ہو جاتا ہے، جب کہ دکھ اور پریشانیاں سردیوں کی طویل راتوں کی طرح کٹنے میں ہی نہیں آتیں۔ ہر انسان خوش رہنا چاہتا ہے اور اس کی ساری زندگی خوشی حاصل کرنے کی تگ و دو میں گذر جاتی ہے۔ ہر انسان کے لیے خوشی مختلف معنی رکھتی ہے۔ کچھ دولت پا کر خوش ہوتے ہیں۔ ماں کو اصل خوشی اپنے ننھے بچے کی معصوم مسکراہٹ سے ملتی ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے خوشی کا پیمانہ معاشرے میں اعلیٰ رتبہ اور مقام ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خوشیاں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں اور دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن میں خوشی کا احساس دوسروں کو اذیت دینے سے جاگتا ہے۔ خوشی ہر ایک کے لیے مختلف ہے اور ہر کوئی مختلف انداز میں اپنے لیے خوشی تلاش کرتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ خوشی کی کوئی مادی حیثیت نہیں ہے۔ وہ انسان کے اندر پھوٹنے والا ایک احساس ہے، جس کے محرکات مختلف ہو سکتے ہیں۔ خوشی کا انحصار ہمارے گرد و پیش کے حالات سے بھی ہے۔ ایک چیز جو کسی خاص وقت میں خوشی دیتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ دوسری بار ملنے پر بھی وہ خوشی کے احساس کو
گدگدائے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہر انسان خوش رہ سکتا ہے اور اس کے لیے اسے زیادہ تگ و دو کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اسے اگر کچھ چاہیے تو وہ ہے

اپنی سوچ اور اپنے انداز میں تھوڑی سے تبدیلی۔ خوش رہنے والے افراد ان لوگوں کی نسبت زیادہ عرصہ جیتے ہیں جو ہر وقت جلتے کڑھتے رہتے ہیں۔ طبّی ماہرین کا کہنا ہے کہ لمبی عمر اور اچھی صحت کی کنجی ہے خوش رہنا۔ خوشی ایک ایسی چیز ہے جس کا حصول تقریباً ہر انسان کے اپنے دائرہ اختیار میں ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں انسان کو بڑی بڑی خوشیاں دیتی ہیں۔۔ برطانیہ میں حال ہی میں 40 ہزار سے زیادہ گھرانوں پر کیے جانے والے ایک مطالعاتی جائزے سے پتا چلا کہ ایسے گھروں کے لوگ نسبتاً زیادہ خوش پائے گئے جو ہفتے میں کم از کم تین دن گھر میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہماری زیادہ تر خوشیوں کا تعلق دوسروں کی ذات سے جڑا ہوتا ہے۔ آپ کا اپنے رشتے داروں اور دوست احباب کے ساتھ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، خوش رہنے کے امکان اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ ماہرین کے مطابق میاں بیوی کا تعلق سب سے لطیف اور سب سے قریبی ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا گہرا ہوگا، انسان اتنا ہی زیادہ خوش رہ سکے گا۔ اکثر اوقات ڈھارس اور تسلی پریشانی میں کمی لاتی ہے اور اپنا مقصد پانے کی امید اسے خوشی کا احساس دلاتی ہے۔ میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا دکھ درد حقیقی معنوں میں بانٹ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے خوشیوں کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں خوشی کا اصل دور 50 سال کی عمر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تک انسان اپنی زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہوتا ہے۔ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آگیا ہوتا ہے اور وہ زیادہ حقیقت

پسند ہوگیا ہوتا ہے۔ اس عمر میں پہنچ کر میاں بیوی ایک دوسرے کے سچے رفیق بن چکے ہوتے ہیں اور بچے بھی ماں باپ کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے کے قابل ہو چکے ہوتے ہیں۔ماہرین کہتے ہیں کہ خوش رہنے کے لیے آپ اپنے بچوں ، بہن بھائیوں اور دوستوں میں دلچسپی لیں، ان کی سرگرمیوں میں شرکت کریں، اپنے اور ان کے درمیان فاصلے کم کریں۔ باہمی انسانی تعلقات آپ کو خوشیوں تک لے جانے والا ایک کلیدی زینہ ہے۔ اکثر اوقات ہماری پریشانی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم دوسروں سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلیتے ہیں اور جب وہ پوری نہیں ہوتیں تو ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب جب ہمیں توقع سے زیادہ ملتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ یعنی توقعات جتنی کم ہوں گے، خوش رہنے کا امکان اتنا ہی زیاد ہوگا۔ایک عرب مفکر کا کہنا ہے کہ انسان 90 فی صد حالات و واقعات کے رحم وکرم پر ہوتا ہے جب کہ اس کا اپنا دائرہ اختیار صرف 10 فی صد ہے۔ ہمارے وسائل چاہے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، ہم پھر بھی بہت کچھ نہیں کر سکتے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو اپنے لیے ایسے اہداف مقرر کریں ، جنہیں پورا کرنا آپ کے لیے ممکن ہو، خاص طور پر چھوٹے چھوٹے اہداف۔ چھوٹی کامیابی آپ کو بڑی خوشی دے سکتی ہے۔ خوشی کا تعلق ہماری خواہشات سے بھی ہے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ آپ کی خواہشات ایسی ہونی چاہئیں جنہیں پورا کرنا آپ کے بس میں ہو۔ بصورت دیگر سوائے پریشانی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ گویا دوسرے لفظوں میں قناعت کی عادت اپنایئے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ خوشیاں بانٹئے

سے بڑھتی ہیں۔ ہر انسان، خواہ وہ کتنا ہی مفلس کیوں نہ ہو دوسروں کو کم از کم ایک مسکراہٹ تو دے سکتا ہے۔ اور ایک سچی مسکراہٹ انسان کو جتنی خوشی دے سکتی ہے وہ قیمتی سے قیمتی تحفے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

بہار کی آمد آمد، بوکاٹا بوکاٹا کی صدائیں

بسنت کا نام سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بار بار توجہ ان نتائج پر جاتی ہے تو اہل وطن کی اس انسیت پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔آپ کہیں گے کہ ہم جو مرضی کریں آپ جانیں اور آپ کا دل..... مگر شائد آپ کے ضمیر کی اتھاہ گہرائیوں میں ایمان کی روشنی آج بھی بقعہ نور بن کر چمک سکتی ہے کہ جب ہم ان امور کو سمجھنے لگیں جو ہماری دنیا و آخرت دونوں میں معاون ہیں۔ہمارے ہاں جس چیز کی سب سے بڑھ کر کمی ہے وہ ہے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔اکثر لوگ عیش و عشرت اور رنگینیوں میں کھو جانے کے بعد تباہی کے دھانے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں تو انہیں ہوش آتا ہے لیکن پھر سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔اگر سوچا جائے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہماری طرز زندگی ہمیشہ غیر مسلموں سے مختلف ہونی چاہیے۔ہمارا اولین دین اور دیگر معاملات انفرادیت رکھتے ہوں تو یہ عظمت انسانیت کی دلیل بن سکتی ہے۔مگر جب ہم مسلمان کہلانے کے باوجود اللہ تعالی اور اس کے محبوب کا دین اپنانے کے باوجود غیر مسلموں کی روش اختیار کریں۔انہیں کی طرز معاشرت اپنالیں تو مسلمانی کیا ہوئی ایک مسلمان کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ شان خداوندی یا اس کے پیارے محبوب کی بارگاہ میں بے ادبی کی جائے اور ان کو اذیت دی جائے مگر یاد رکھیں جب ہم قرآن و حدیث کے احکامات کو پس پشت ڈال کر اپنے نفس کی

پیروی میں لگ جائیں تو یہ بھی ادب کے خلاف ہے کہ جن کا نام لیتے ہیں ان ہی کی باتوں پر عمل کرنے سے کتراتے ہیں اور کفار و منافقین کے قدموں سے قدم ملاتے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔

: من تشبہ بقوم فھو منہ

جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی میں سے ہوتا ہے۔ذرا غور کریں کون سا" کام ہم اپنے دین اور دینداروں کی طرز پر کرتے ہیں اور کون کون سے کفار و یہود کی پیروی میں کرکے انکی مشابہت اختیار کررہے ہیں؟؟؟اگر آپ نے غور کیا تو معلوم ہوگا کہ زندگی بھر صبح سے شام تک سوائے چند افراد کے جو نماز روزہ کرلیتے ہیں باقی سب کا حال یہ ہے کہ نہ صبح خیزی کی عادت' نہ نماز و عبادت دنیا کی رنگینیوں میں کھونا' دیر سے سونا' فحش اور غیر شرعی اعمال نہ صبح اچھی نہ شام کا حال' کیا ہم اسی مقصد کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟کیا ہماری نسلوں کے خون میں صرف شیطان کا اثر ہونا چاہئے؟کیا ان کی نگہداشت و تربیت میں ہماری ذمہ داری ختم ہو چکی ہے؟ان سب باتوں پر غور کریں اور توجہ سے سوچیں کہ "بسنت" کیا ہے؟یہ کہاں سے چلی ہے؟اور لوگ اس کے پس پشت اپنی جانوں پر کتنا ظلم کیے جاتے ہیں؟بنیادی طور پر بسنت ہندوؤں کا تہوار ہے۔یہ انہیں کی رسم اور کھیل ہے۔مگر حیرت ہے ان لوگوں پر جنہوں نے دین اسلام میں پناہ لے رکھی ہے اور مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر مشابہت اسی

قوم کی اختیار کرتے ہیں جن سے بچنا چاہیئے۔بڑے بڑے سیاستدانوں جاگیر دار اور نیکی کے دعویدار اس رسم کے دلدادہ ہیں اور سرکاری سطح پر بھی ''بسنت میلہ'' کا اہتمام خوب کیا جاتا ہے وہ لوگ جو چند منٹ کے لیے بارگاہ خداوندی کی حاضری کا وقت نہیں نکال سکتے۔میوزک کی آواز اور لغویات کے سائے میں سارا سارا دن گزار دیتے ہیں۔وہ لوگ جو راتوں کو عبادات وریاضت کو فضول سمجھتے ہیں اور زندگی بھر قیام سے محروم رہتے ہیں ''بسنت نائٹ'' بڑے شوق سے مناتے ہیں۔آہ یہ مسلمان ہیں انہیں دیکھ کر شرمائیں یہود، یہ پتنگ تو کاٹ رہے ہیں مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا رابطہ اللہ اور اس کے حبیب سے کٹ رہا ہے۔یقینا جب انکی نافرمانی کے ذریعے پاس ادب نہ کریں گے تو رابطہ منقطع ہوگا ہی۔اتباع سنت کا راستہ چھوڑ کر اتباع الشیطان کی جاتی ہے اور دن رات شور وغل سے طوفان بد تمیزی اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔بسنت نہ صرف غیر اسلامی تہوار کی نقل ہے بلکہ کروڑوں روپے اس پر ضائع کیے جاتے ہیں۔مگر ہر شخص یہی کہتا نظر آتا ہے کہ یہ تو چند روپوں کا کھیل ہے۔ارے تمام لوگ چند روپے خرچ کرتے ہیں مگر لاکھوں افراد کے چند روپے کروڑوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ایک غریب آدمی بھی اپنے لڑکے کی خوشی کے لیے آٹا دال پوری کرنے کے بجائے پتنگ پر رقم صرف کرتا ہے۔یہ اس کی ظاہر تو اولاد سے محبت ہے کہ ان کی خوشی حاصل کر رہا ہے مگر حقیقتاً اپنی اولاد کی جان و اخلاق کا دشمن ہوگیا ہے۔دیکھو وہی بچہ چھت پر شرارت کر رہا ہے دوسرے بچے گالیاں دے رہے ہیں اور وہ بھی سیکھ رہا ہے

اسلام میں گالی دینا سخت گناہ ہے مگر یہاں گالیاں سکھائی جارہی ہیں۔دوسری طرف لڑکے آپس میں جھگڑپڑتے ہیں اور چند روپوں کی پتنگ جان لے جاتی ہے پھر یہی نہیں آئے روز کتنے ہی لوگوں کے لخت جگر بجلی کا کرنٹ لگنے یا چھت سے گر کر ہلاک ہوچکے ہیں۔مگر نشہ ہے کہ بڑھتا ہے اور ہر سال اس طوفان بدتمیزی کی نگہداشت کی جارہی ہے ایک بات جو بہت ضروری ہے عرض کرتے چلیں کہ جس کاغذ سے پتنگ بنائی جاتی ہے اور دھاگہ جو ڈور کی صورت میں استعمال کیا جاتاہے دونوں باہر کی غیر مسلم ممالک خصوصاً بھارت سے منگوائے جاتے ہیں اور بھارت کو اس قبیح کام کے لیے کروڑوں روپے کی آمدن دی جاتی ہے آہ آج ہم کشمیر کا رونا روتے ہیں لیکن شاید کشمیریوں سے سچی محبت نہیں رکھتے۔ورنہ بھارت کو کسی بھی انداز میں آمدن کا ذریعہ پیدا نہ کرنے دیتے کہ انہیں پتنگوں کو بیچ کر اس کی رقم سے گولیاں اور پتنگ خریدے جاتے ہیں جو کشمیری مسلمانوں پر برسائے جاتے ہیں۔کاش ہم مسلمان ہوکر اہل کشمیر اور دنیاکے دیگر مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی جتلانے کی بجائے پہلے اہل کفر کو پہنچنے والی امدادکے راستے بند کرتے اور ان کے معاون نہ بنتے مگر ''بسنت میلہ ''تو منانا ضروری ہے چاہے جان جائے یا کشمیر جائے؟؟؟اے مسلمانوں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔اپنے اسلاف کی تعلیمات کو اور بزرگوں کی روایات کو چھوڑ کر کس راہ پر چل نکلے ہو؟جان لو یہ بسنت نہیں بلکہ اس کی آڑ میں کشمیریوں پر ظلم ہے تمہارے مال و دولت کس کا پیٹ بھر رہے ہیں۔تمہاری طرف سے ملنے والی آمدن سے غیر مسلم قومیں پلتی ہیں۔اور

تمہاری طرف توپوں کا رخ کرکے تمہاری ہی جانوں کا خون کرتی ہیں۔آہ آج ہم سب جاننے کے باوجود بھارت کو کتنی امداد دے رہے ہیں یہ امداد ویڈیو کیسٹوں اور ڈور کے دھاگے کی آڑ میں مسلسل دی جاتی ہے۔انہیں کے اداکاروں کی زبان سے لغو اور فحش گائے جانے والے گانے تمہاری زبانوں کی بھی زینت بن رہے ہیں۔وہ زبانیں جو یاد خداوندی میں تر ہونا تھیں بوکاٹا بوکاٹا کی صدائیں اور گانے گانے میں مصروف ہیں۔آج کشمیر کا ذرہ ذرہ پکار رہا ہے کہ شہیدوں کے لہو سے بے وفائی مت کرو۔اس دیس کی پاک مٹی پر ناپاک کام چھوڑ دو۔شراب و جواء جو کہ تم پر حرام ہیں۔انہیں اپنا کر اپنی عاقبت و صحت تباہ کر رہے ہو۔اور اپنی زندگی کی ساعتوں کو ناکارہ کرنے میں مصروف ہو۔فحاشی و عریانی کا بازار اتنا گرم ہوتا جا رہا ہے کہ بسنت میلہ کی آڑ میں پاک وطن سے ٹیلی وژن و ریڈیو بھی مختلف فحش انگیز پروگرام پیش کر رہے ہیں۔جس اسلامی معاشرے میں عورت گھر کی زینت اور باپردہ ہونی چاہیے۔ٹی وی پر ننگے سر اور ننگے منہ فیشن میں لت پت اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑا رہی ہیں اور گانے باجے سن سنا رہی ہیں۔

آہ اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

بسنت منانے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ رسم یا کھیل کسی فائدہ کا باعث نہیں ہر سال سینکڑوں جانیں ضائع ہو رہی ہیں کیا آپ سب اس بات سے باخبر ہیں؟؟ کیا

کسی نے جان سے بچ جانے کا سرٹیفکیٹ لے رکھا ہے آج قانون کی نظر میں بھی بسنت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے تو کیا اگر یہ مذہب سے علیحدہ ہے تو اسی پر اصرار ضروری ہے؟اور یقیناً جو بات مذہب سے لا تعلق ہونے کی دلیل ہے۔وہ دوسروں کو بھی مذہب سے قطع تعلق ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔آؤ اس نافرمانی سے باز آنے کا اعلان کریں۔یہ جان و ایمان کا دشمن کام ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی بے شمار چیزوں کے لیے نقصان دہ ہے۔وہ ڈور جو کٹنے کے بعد زمین کی طرف لپکتی ہے راہ گیروں کی گردن پر پھر جاتی ہے جس سے ایک جان ضائع ہو جاتی ہے اور ارشاد العالمین ہے ''کہ جو کسی کو ناحق قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے۔''اسی طرح واپڈا کے بے شمار ٹرانسفارمر اور تاروں کو نقصان پہنچتا ہے جس سے بجلی بند ہو جاتی ہے نہ جانے کتنے گھروں میں بعض افراد بیمار یا ہسپتال میں پڑے ہوتے ہیں یہ ملکی ترقی میں معاون کاموں اور فیکٹریوں میں ہوتے ہیں جہاں بجلی نہیں جانی چاہیے مگر آہ ہمیں خود غرضی نے مار دیا۔ہم اجتماعی سوچ نہیں رکھتے اور اپنی ایک خواہش پر ہزاروں افراد کی سہولت و آسائش تباہ کر دیتے ہیں۔

مالک کی صدا

بیل ایک جانور ہے، عقل وشعور سے نابلد اسے کولہو پہ باندھ دیں تو وہ آنکھوں پہ پٹی بندھے ہونے کے باوجود راہٹ چلانے کے لئے دائرے میں گھومتا رہتا ہے،اپنے مدار سے ہٹتا نہیں ،وہ جگہ تو محدود ہوتی ہے،مگر وہ مسلسل گھومتا ہے،اس کے قدم اپنے مدار سے ڈگمگانے لگیں تو مالک کی طرف سے ایک صدا پہ چوکنا ہو جاتا ہے،مگر انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اپنی حد نہیں پہچان سکا،جانور جب کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا ہے تو مالک کی ایک صدا اسے مجبور کر دیتی ہے،اور وہ باز آجاتا ہے،مگر انسان ایسا بھٹکا ہے کہ باربار صدا دینے پہ بھی نہیں پلٹا ،سرکشی پہ باضد ہے،کتا جب دور جانے لگے اور مالک اسے صدا دے تو وہ بھاگ کے مالک کے پاؤں سے لپٹتا ہے اسکے تلوے چاٹتا ہے،ایک جانور کو بھی مالک کی پہچان ہے وہ اسکا وفادار ہے مگر انسان عقل وشعور ہونے کے باوجود اپنے اصلی مالک کو بھلا بیٹھا ہے ،اس سے بے وفائی کر رہا ہے،اس کے باربار پکارنے پہ بھی پلٹنا اسے گوارا نہیں،اصلی مالک کون ہے ؟،(اللہ رب العزت) جو تمام جہانوں کا رب ہے جو خالق کائنات ہے،جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ،وہ اللہ جو مالک بھی ہے ،خالق بھی ہے،رحمٰن بھی ہے،اور رحیم بھی ہے،ایک ماں جو نو ماہ اپنے پیٹ میں ایک بچہ کو رکھتی ہے پھر موت وحیات کی کشمکش سے گزرنے کے بعد اسے جنم دیتی ہے،اور پھر

جنم سے لے کر موت کی وادی میں اتر جانے کے بعد تک بھی وہ اپنے بچے کے لئے شفیق ہوتی ہے، بچے کو ٹھوکر لگے ، گر جائے، یا کوئی تکلیف ہو تو ماں بلبلا اٹھتی ہے،اور جب بچہ ڈگمگانے لگے تو ماں بڑھ کر تھام لیتی ہے،ماں کی سب محبتیں ،سب چاہتیں اللہ رب العزت کی چاہت کا ایک روپ ہیں،اللہ تعالیٰ ماں کی محبت سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے،اور اس کا بندہ ڈگمگانے لگے تو وہ اسے راہ ہدائت دکھاتا ہے، مگر بندہ اس رب کا شکر ادا نہیں کرتا اور اس کی پکار نہیں سنتا اور اس کی پکار کا جواب بھی نہیں دیتا، طلوع سحر ،سے رات کی تاریکی چھا جانے تک دنیا کے کونے کونے سے صدا بلند ہوتی ہے

اللہ اکبر،اللہ اکبر حیَ علی الصلوۃ، حیَ علی الفلاح

اور یہ صدا دن میں پانچ مرتبہ انسان سنتا ہے، مگر اس کی اس صدا پہ غور نہیں کرتا اس کا جواب نہیں دیتا ،اور پلٹتا نہیں ہے،انسان اپنے مالک کا کس قدر نافرمان ہے، کہ، مالک اسے فلاح کی طرف بلاتا ہے،کامیابی کی طرف بلاتا ہے، مگر انسان اس پر غور کرتا ہی نہیں ،اپنے مالک کی صدا سنتا ہی نہیں،اللہ تعالیٰ انسان کو بار بار موقع دیتا ہے،تب ہی تو اللہ تعالیٰ کرہ عرض پر چوبیس گھنٹوں میں پانچ مرتبہ اپنے در پہ حاضری کا موقع دیتا ہے، مگر نادان انسان کہتا ہے ،بہت مصروف تھا اس لئے نماز قضا ہو گئی ہے، نماز تو ادا کی نہیں ،اذان غور سے سننے کی فرصت نہیں، جواب دینا تو بہت دور کی بات ہے، آج ہم بڑے فخر کے طور پر دوسروں

سنائیں اور جب (POEM) کے سامنے اپنے معصوم بچے سے کہتے ہیں، کہ ہمیں انگلش میں بچہ لہک لہک کر سناتا ہے تو اسکو فخر سے داد دیتے ہیں، ہم نے اپنے بچوں کو باقی توسب کچھ سکھا دیا ہے، مگر اسے یہ بتانا بھول گئے کہ اس کا مالک کون ہے، اور اس کا کیا حکم ہے، کم از کم بچے کو سب سے پہلے اسلام کی بنیادی چیزیں سکھانا ہمارا فرض ہے، اس کے بعد دنیاوی تعلیم دینا چاہیئے، حضرت بلالؓ جب اذان دیتے تھے تو جن وانس ٹھہر جاتے تھے، وہ حضرت بلالؓ جن کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ چلتے زمین پر تھے اور ان کے قدموں کی آہٹ عرش پہ سنائی دیتی تھی، وہ جب اذان دیتے تو چرند پرند اڑنا بھول جاتے اور اذان سنتے تھے، مگر انسان آج کل کتنا غافل ہو چکا ہے، کہ ہر طرف اذان کی صدا بلند ہوتی ہے مگر انسان ٹس سے مس نہیں ہوتا اور اپنی کاروباری زندگی میں مگن ہو جاتا ہے، اپنے مالک حقیقی کی صدا سننے کی فرصت نہیں، ارے اے بدبخت انسان تو کچھ بھی نہ تھا اس ذات نے تجھے گندے خون سے وجود بخشا، جب تجھے دنیا میں بھیجا گیا تو ہر مراحل سے گزارتے ہوئے تیری ضرورت کے مطابق تجھے بن مانگے سب کچھ دیا، وہ اللہ جو تجھ سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے، وہ اللہ جو تیری شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، تیری ناشکریوں کے باوجود بھی وہ تجھے سب کچھ دے رہا ہے، اس کی ایک ایک نعمت پر ذرا غور تو کر، کہ اگر وہ اک نعمت تم سے چھین لے تو ہے کوئی دنیا کی طاقت جو واپس دلوا سکے، اے انسان اپنے اصلی مالک کو پہچان اور اس کے ہر حکم پہ قربان ہو جا، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو، آمین ثم آمین۔

خواتین کی آزادی مگر کیسے؟

بھلا اس مسلمہ حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے بعد سے ہی پورے عالم میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس کے ذریعہ عجمی و عربی، گورے اور کالے، مرد و زن الغرض تمام کے تمام انسان خواہ وہ دنیا کہ کسی بھی خطے یا گوشے میں زندگی گزار رہے ہوں یکساں طور سے مستفید ہوئے، کیا یہ اسلام کا ہی کارنامہ نہیں تھا کہ آمد اسلام سے قبل عرب میں بچیوں کی پیدائش کو باعث شرم و عار تصور کیا جاتا تھا اور جب کسی گھر میں بنت حوا جیسے ہی جنم لیتی اور آنکھیں کھولتی تو اسے اس کا باپ ہی اسے شرم و عار سے بچنے کے خاطر منوں مٹی تلے زندہ ہی در گور کر دیتا تھا، جس کا بیان قرآن پاک میں کچھ اس طرح سے ہے (جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا اور غصے سے تمتما اٹھتا اور وہ شرم کے باعث لوگوں سے نظریں بچانے لگتا کہ کہیں اسے بیٹی کا باپ نہ تصور کیا جائے) لیکن اسلام نے اپنی آمد کے ساتھ ہی اس جاہلیت کو دور کیا
اور خواتین کو باعث زحمت نہیں بلکہ باعث رحمت قرار دیا نیز خواتین کو بھی اس کی زندگی جینے کا پورا پورا حق دیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ حدود و قیود اور شرائط بھی مقرر کیۓ جیسے پردے کا حکم اپنے خاوند کی اطلاعت شعاری وغیرہ۔ لیکن آج کا ہمارا موجودہ معاشرہ جو اپنے آپ کو

نئی تہذیب و ثقافت کا علمبردار اور نئے ایجادات انکشافات کا پیروکار تصور کرتا ہے اسے اس اسلامی معاشرے میں اوراسلامی نظام زندگی میں نعوذ باللہ نہ جانے کیوں اور کیسے کمی اور خامی بلکہ کچھ جھول سا نظر آنے لگا ہے اور اس سے یہ آوازیں بلند ہونے لگی ہیں کہ آج کے معاشرے میں یعنی ہمارے اسلامی اور مشرقی معاشرے میں خواتین کو مساوات ، آزادی، اختیارات، حقوق وغیرہ حاصل نہیں ہیں۔ حقیقتاً ان کے ان سنہرے نعروں کے پیچھے اور ان کے پس پشت ان کے اذہان میں کوئی نہ کوئی چور چھپا ہے اب خواہ وہ چور بے حیائی، بے پردگی کو فروغ دینے کا ہو یا پھر اپنی خواہشات نفسانیہ کی تکمیل کا کیوں کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں حسن و عشق کی ریل پیل ہوگی وہاں اسکے متوالے اور شیدائیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہوگی اور جہاں سر عام اور سر شام بازار حسن اپنی تمام تر رعنائیوں ودلفریبیوں کا نظارہ پیش کرے گا تو پھر لوگ ان حسین نظاروں سے اپنے دلوں کے شراروں کو ضرور لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرائیں گے جن کے نتائج تو اپنی بھیانک صورتوں میں ضرور نظر آئیں گے اور آتے ہیں جو کہ ہم آج اخبارات ورسائل میں خواتین کے ساتھ عصمت دری اور زیادتی جیسی خبروں کی شکل میں مسلسل پڑھتے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ پھر کیسے اور کیوں کر بچے گی عزت نسواں اور کیوں نہ مارا جائے گا عزت نسواں پر شب خوں یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جو درحقیقت ٹھنڈے ذہن ودماغ کے ساتھ سوچنے اور غور فکر کرنے کے ہیں کیوں کہ دنیاکہ تمام مذاہب کے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اسلام ہی وہ

دین اور وہ مذہب ہے جس نے ہر شخص کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، عجمی ہو یا عربی، کالا ہو یا پھر گورا یکساں اور مکمل حقوق فراہم کیا ہے اور یہ بتایا بھی ہے کہ کسی عجمی کو کسی عربی پر یا کسی عربی کو کسی عجمی پر یا کسی گورے کو کسی کالے پر یا کسی کالے کو کسی گورے پر ہر گز ہر گز فضیلت وبرتری حاصل نہیں اگر کسی کو کوئی فضیلت یا برتری حاصل ہے تو وہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ پھر یہ نعرہ دینا کہ دین اسلام میں عورتیں محصور ہیں انہیں مکمل طور پر اپنی مرضی کی زندگی جینے کے حقوق حاصل نہیں ہیں یہ سراسر فضول ہے،انہیں پراپرٹی میں برابر کا حصہ نہیں ملتا ہے یہ بات اور یہ سوال بھی فضول ہے۔ یہاں میرا مقصد اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ ابھی حالیہ دنوں میں ہی برطانیہ میں خواتین کے ساتھ عدم مساوات کے موضوع پر بڑا ہی شور وواویلا مچایا گیا اور یہ کہا گیا کہ عورتیں آج پوری دنیا میں عدم مساوات کی شکار ہیں حتی کہ اس پر برطانیہ کے وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون نے پوری دنیا میں ایک مہم چلانے کا بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ اس مقصد سے پوری دنیا میں ایک مہم چلائیں گے انہوں نے کہا کہ برطانیہ اس مقصد کیلئے قومی آمدنی کے 0.7 فیصد اقوام متحدہ کی امداد کی فراہمی کا ہدف پورا کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے والی ساکھ سے کام لیتے ہوئے خواتین پر جنسی تشدد، پراپرٹی رائٹس جیسے معاملات پیش کرے گا۔ وزیر اعظم نے 2015 کے بعد کے برسوں کیلئے ترقیاتی ترجیحات کے حوالے سے اقوام متحدہ کے اعلیٰ سطح کے پینل کی مشترکہ صدارت کی جسے گزشتہ سال صنفی

مساوات اور خواتین کو بااختیار بنانے کا نام دیا گیا تھا اور جو کہ ان 12 کلیدی اہداف میں سے ایک ہے بین الاقوامی برادری جس پر زور دے گی۔پینل کی رپورٹ میں اہداف کے حوالے سے مثالیں دی گئی ہیں اقوام متحدہ جن کو اختیار کرسکتا ہے جس میں لڑکیوں اور خواتین پر ہر طرح کے تشدد کا خاتمہ، بچپن کی شادیوں کا خاتمہ، خواتین کیلئے وراثتی املاک کے حصول کے حوالے سے خواتین کے مساوی حقوق کو یقینی بنانا اور سیاست، معیشت اور عوامی زندگی میں خواتین کے خلاف امتیاز کو ختم کرنا شامل ہیں یہ تو ہیں برطانوی وزیر اعظم کے خیالات۔لیکن یہ بھی بتاتا چلوں کہ جو اقدار اور جو طریقہ اسلام نے اپنے ماننے والوں اور اپنے پیروکاروں کیلئے مقرر کئے ہیں اور جو نظام زندگی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو عطا کیا ہے اس سے اعلیٰ وافضل طریقہ بھی کوئی مذہب اپنے پیروکاروں کو کیا دے سکتا ہے ؟ہرگز ہرگز نہیں اور قیامت کی صبح تک نہیں کیوں کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کو دین ابدی و سرمدی ہونے کا طرہ امتیاز حاصل ہے جس کے بارے میں خود قرآن پاک میں اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے آج میں نے تمہارے لئے اپنا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور میں نے اپنی رضا کو تمہارے لئے دین اسلام کے ساتھ لازم کردیا یہ ہے اسلام کا واضح پیغام جس کے بعد ہمارے لئے اس دنیا میں کسی دوسرے مذاہب کو اپنانے کی اور اس کے طریقوں کو اپنا شیوہ بنانے کی ہرگز ہرگز کوئی اجازت نہیں تو بھلا مغربی طرز زندگی اور مغربی نظام حیات تو دور کی بات جو سراپا برائیوں

خرابیوں اور فسادات کا مجموعہ ہیں۔ کو کیونکر اپنایا جا سکتا ہے۔ ،

شمع محفل یا گھر کی ملکہ

یوم خواتین پر دل کو چھو لینے والی خصوصی تحریر

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ جاہلیت میں خواتین کا مرتبہ صرف ایک گھریلو سامان کی حیثیت سے زیادہ نہ تھا، جن کی جانوروں کی طرح خرید وفروخت ہوا کرتی تھی اور ان کے حقوق کا گھلا گھونٹا جاتا تھا۔ تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتی تھیں، وہ اپنے حقوق بھی نہیں مانگ سکتی تھیں اور اگر اپنے حقوق یا کسی بھی شے پر آواز اٹھاتی، تو موت کے گھاٹ اتار دی جاتی۔ مگر مذہب اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، وہ جج بن سکتی ہیں۔ اسلام نے انہیں صحیح آزادی کا تصور دیا ہے جو دیگر مذاہب میں قطعی نہیں تھا۔ اگر یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آج کے دور میں خواتین کے لیے ایک بیداری مہم چلانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ مگر پہلی بات، مغرب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس نے دنیا کو جمہوریت اور سیکولرازم کا تحفہ دیا ہے، جس میں ہر شخص کو اظہارِ خیال کی اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ رہنے کی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے

کی اجازت ہے اور کسی پر کوئی رائے تھوپی نہیں جاسکتی۔ عالم اسلام پر اس کا دباؤ ہے کہ وہ اپنے یہاں خواتین کو اپنے خیال کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیں، ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اختیار دیں اور اس میں جبراً، زور زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر مغرب میں شاید آزادی کا حقیقی مقصد انسان کو اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد کرنا ہے، نہ کہ آزادی سے ہمکنار کرنا۔ اسی لیے مغرب مسلمانوں کو ان کی مذہبی شناخت سے محروم کرنے اور مسلمان خواتین کو نقاب سے روکنے کی نہ جانے کیسی کیسی مہم چلاتا رہتا ہے۔ واضح ہو کہ فرانس میں اسکول اور سرکاری اداروں میں سکھوں کے لیے پگڑی، مسلمان خواتین کے لیے 'اسکارف' یہودیوں کے لیے ان کی مخصوص 'ٹوپی' اور عیسائیوں کے لیے صلیب رکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، جس کا وبال پوری دنیا میں گونجا تھا۔ افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ کچھ خواتین بھی خواتین کے لیے پردہ کرانے کو غلط بتاتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ جمہوری تصور کے منافی ہے، جس میں تمام لوگوں کو یکساں حقوق دینے کا اور اپنی سوچ کے مطابق عمل کرنے کا حق دینے کا دعویٰ کیا
جاتاہے۔ لیکن ذرا سوچئے! کیا سیکولرازم کا مطلب یہی ہے کہ ایک شخص کو جانوروں کی طرح بے لباس ہونے کی تو اجازت ہو؟ لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور خواہش سے لباس پہننا چاہیں تو اس پر پابندی لگا دی جائے؟ اللہ کا نظام ہے کہ جو چیز اہم بھی ہوتی ہے اور نازک، اسے حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ پاؤں پر کوئی حصار نہیں رکھا گیا، لیکن

دماغ کو سخت ہڈیوں والی کھوپڑی کے اندر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا تحفظ ہو سکے۔ دل کی جگہ سینے کی لچک دار ہڈیوں کے بیچ رکھی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کی حفاظت ہو سکے۔ آنکھوں پر پلکوں کا پہرہ بٹھایا گیا۔ یہ ان اعضاء کی حفاظت کے لیے ہے۔ نباتات ہی کو دیکھئے اگر آم پر دبیز چھلکوں کا لباس نہ ہوتا تو کیا مکھیوں اور بھرنڈوں سے بچ کر وہ انسان کے ہاتھ آ سکتا؟ اگر چاول اور گیہوں کے دانوں پر ان کی حفاظت کے لیے چھلکے نہ ہوتے تو انسان انہیں اپنی خوراک نہیں بنا سکتا تھا۔ خود انسانی معاشرہ میں دیکھئے، ملک کا ایک عام شہری کھلے عام ہر جگہ آمد و رفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ سیکورٹی گارڈ ہے نہ اس کی رہائش گاہ پر پہرے دار ہے، جبکہ اہم شخصیتوں کے لیے تحفظ کا خصوصی نظم کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں میں عورتوں کی حفاظت کی زیادہ ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خدا نے انہیں مردوں کے لیے وجہ کشش بنایا ہے، اس لیے ان کی تراش و خراش میں حسن کاری اور لطافت کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر کسی کا لڑکا شہر جائے تو اسے شام کے 4 بجے آ جانا چاہیے تھا، لیکن وہ رات کے 10 بجے لوٹے تو اس سے گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر یہی واقعہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آ جائے تو دل کا قرار چھن جاتا ہے اور ماں باپ کی کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں۔ اسی کو دیکھئے کہ پوری دنیا میں اور پاکستان میں بھی مردوں اور عورتوں کے تناسب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اللہ نے ان دونوں صنفوں کو ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے تاکہ دونوں طبقات

کی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ 100 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اہل مغرب عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینے کا نعرہ لگا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آج بھی عورتیں حقوق مانگتی ہیں اورانہیں وہ حقوق و اختیارات پوری طرح نہیں دیے جاتے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں امریکہ و روس میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی؟ اور یورپ میں مارگریٹ تھیچر کے علاوہ کوئی خاتون وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر نہیں پہنچ سکی۔ یہ ظلم و حق تلفی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ قانونی فطرت کا فیصلہ ہے۔ قدرت نے خود دونوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اور صلاحیتوں کے لحاظ سے دائرہ کار متعین کیا ہے۔ پردہ بھی اسی فرق کا ایک حصہ ہے۔ جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اور شہوانی جذبات رکھتے ہیں، لیکن ان کی فطرت لباس کے تصور سے عاری ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریانیت سے بچائے اور لباس زیب تن کرے۔ وہی فطرت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ مردوں کے مقابلے عورتیں زیادہ ڈھکی چھپی ہوں۔ فرض کیجئے دو لڑکیاں راستے سے گزر رہی ہیں، ایک لڑکی کا لباس چست اور شوخ ہو، اس کا سر کھلا ہو، اس کے بازو کھلے ہوں، اس کا پیٹ نگاہِ ہوس کو دعوت نظارہ دیتا ہو اور اس کا کسا ہوا لباس جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرتا ہو اور دوسری لڑکی سرتاپا نقاب میں ہو یا کم سے کم ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر دوپٹہ ہو تو اوباش قسم کے لڑکے ان میں سے کس کو چھیڑنے کی کوشش کریں گے؟ ہوس ناک نگاہوں کا تیر کس کی طرف متوجہ ہوگا؟ برائی کے جذبات ان

میں سے کس کے تئیں دلوں میں کروٹ لیں گے؟ یقیناً بے پردہ لڑکی اس کا نشانہ بنے گی۔ پردہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو نہایت واضح ہیں، قرآن مجید نے عورتوں کو پورے جسم کے علاوہ چہرے پر بھی گھونگھٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ خواتین کے لیے اللہ کے رسول نے مسجد میں پیچھے کی صف رکھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ خواتین کے لیے شریعت نے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں مقرر کیں جو اندرون خانہ کی ہیں اور انہیں شمع محفل بننے کی بجائے گھر کی ملکہ بنایا۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے۔ بائبل میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ جو کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں بلکہ بعض وہ ہیں جو پردہ کی وجہ سے پہچانی نہیں گئیں۔آج بھی حضرت مریم کا جو فرضی مجسمہ بنایا جاتا ہے اس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ حالانکہ رومن تہذیب اور اس کے بعد یورپ میں

عورتوں کے عریاں مجسمے بنانے اور جسم کے ایک ایک نشیب وفراز اور خدوخال کو نمایاں کرنے کا رواج عام ہے۔ گویا جو لوگ عریانیت اور بے پردگی کے مبلغ ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں کا تقدس باپردہ رہنے میں ہی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بہت سی باکمال خواتین پیدا ہوئی ہیں جن کے حالات پر کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ معلم ہو سکتی ہیں، طبیب ہو سکتی ہیں، شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کر سکتی ہیں، کارِ افتاء انجام دے سکتی ہیں، وہ حدود

قصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات کی جج بن سکتی ہیں۔یعنی مردوں کی طرح حدود میں رہتے ہوئے ہر کام کر سکتی ہیں۔کاش اہل مغرب اور پردے کے مخالف حضرات عورتوں کے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے دکھ کا مداوا کر سکیں۔ یہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مریم ایک مقدس ترین شخصیت کی مالک ہیں بلکہ بعض تو انہیں عیسائی عقیدہ کے مطابق تین خداؤں میں ایک خیال کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ کنواری تھیں۔ انہیں کسی مرد نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور اللہ تعالی کے خصوصی حکم کی بناپر وہ حاملہ ہوئیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جس عورت کو اتنا بڑا رتبہ دیا گیا ہو، آج انہی پر ایمان رکھنے والی عیسائی قوم دامن عفت تار تار کرنے کو بے قرار ہے۔

"اپریل فول" آغاز اور تاریخ

اکیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں پر مغربی اقوام کا سیاسی اور نظریاتی تسلط اتنا بڑھ چکا ہے کہ کم علم مسلمان جو کہ مغربی افکار سے اتنا مرعوب ہو چکا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں بغیر مغرب کی تقلید کے ترقی ممکن نہیں،اس لئے وہ ہر بات ہر کام میں مغرب کی تقلید لازم سمجھتا ہے،ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ مغربی ممالک میں یہ دن کس واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے،جب اسپین پر عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں ، قتل وغارت سے تھک کر بادشاہ فرڈیننڈ نے اعلان کروایا کہ یہاں مسلمانوں کی جان محفوظ نہیں ہم انہیں ایک اسلامی ملک میں بسانے کا فیصلہ کیا ہے ،جو مسلمان وہاں جانا چاہتے ہیں حکومت انہیں بذریعہ بحری جہاز بھجوادے گی،لاتعداد مسلمان اسلامی ملک بسانے کے شوق میں جہاز پر سوار ہو گئے ،سمندر کے بیچ جا کر فرڈیننڈ کے گماشتوں نے جہاز میں بارود سے سوراخ کیا،خود حفاظتی کشتیوں کے زریعے بچ نکلے ، چشم زون میں پورا جہاز مسافروں سمیت غرق ہو گیا،اس پر عیسائی دنیا بڑی خوش ہوئی اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے پر بادشاہ کی شرارت کی داد دی،اس روز یکم اپریل تھا،فرڈیننڈ کی شرارت اور مسلمانوں کو ڈبونے کی یاد میں مغربی دنیا میں یکم اپریل کو "اپریل فول" منانا جاتا ہے،لوگوں کو جھوتی خبریں سنا کر پریشان کیا

جاتا ہے، یکم اپریل کا دن ’ بیوقوفوں کے دن ‘ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ غیر ملکوں میں کئی مقامات پر ’ فولزڈے ‘ منایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی طرف سے یکم اپریل کے دن ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کا کام ہوتا ہے۔ دراصل انسان اپنے تناؤ اور مصروفیات کے درمیان کچھ لمحات کھلے ہنسی، مذاق اور تفریح کے لئے نکالنا چاہتا ہے۔ ’ بیوقوفوں کا دن منانے کی روایت کے پس منظر میں انسانی ذہنیت کی یہی قدرتی فطرت دکھائی دیتی ہے۔ یکم اپریل کے دن بیوقوف بنانے اور ہنسی مذاق کرنے کی رسم بہت پرانی ہے لیکن اس کی شروعات کب، کیسے اور کہاں ہوئی، اس سلسلے میں الگ الگ خیالات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ’ اپریل ‘ فولزڈے منانے کی رسم جاپان سے شروع ہوئی۔ وہاں کی ایک رائج کہانی کے مطابق قدیم زمانے میں فرانس میں ہر سال پہلی اپریل کو وہاں کے بادشاہ کی طرف سے شہریوں اور پادریوں کی ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس جلسہ میں راج دربار کے نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس میں حصہ لینے والے لوگ اوٹ پٹانگ حرکتوں اور کاموں سے لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔ اس موقع پر سب سے زیادہ بیوقوفانہ حرکتیں کرنے والے شخص کو تقریب کا صدر چنا جاتا تھا اور اسے ماسٹر آف فولز کے اعزاز سے نوازا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک دوسری روایت کی شروعات اٹلی سے ہوئی، وہاں یکم اپریل کو کارنیوال کے طور پر ایک تفریح کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس دن مرد اور عورتیں جم کر شراب پیتے ہیں اور ناچ گا کر مستی کرتے ہیں۔ رات کے وقت دعوتوں

کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ایک یونانی قصے میں بتایا گیا ہے کہ یونان میں ایک شخص خود کو فنے خاں سمجھتا تھا۔ اسے بھرم تھا کہ پوری دنیا میں اس سے بڑا اور ہوشیار شخص کوئی نہیں ہے۔ اس کے غرور کو دور کرنے اور اسے نصیحت دینے کے لئے کچھ دوستوں نے اس سے کہا کہ آج آدھی رات کو پہاڑ کی چوٹی پر خدا اتریں گے اور وہاں موجود لوگوں کی ہر مراد پوری کریں گے۔ اس شخص نے دوستوں کی اس بات پر یقین کر لیا اور پہاڑ کی چوٹی پر جا کر صبح ہونے تک خدا کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹا تو اس کے دوستوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ اسی وقت سے یونان میں ' فرسٹ اپریل' لوگوں کو بیوقوف بنانے کی روایت شروع ہو گئی کیونکہ اس دن اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔ اس طرح الگ الگ ممالک میں پہلی اپریل یعنی بیوقوفوں کے دن والے مختلف قصے اور واقعات سننے کو ملتے ہیں۔ غیر ملکوں میں کئی جگہوں پر اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو اس دن بیوقوف بنادیا جاتا ہے۔ ان کی باتوں پر لوگ بڑی آسانی سے یقین کر لیتے ہیں۔یکم اپریل کو ہوشیار سے ہوشیار لوگ بھی کسی نہ کسی طرح بیوقوف بن ہی جاتے ہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا بھی بچانے کی کوشش کر لیں۔ کسی کا اپریل فول بنانے کے کئی طریقے ہیں جیسے کسی کو میٹھی چیز میں مرچ ڈال کر کھلانا سڑک کے بیچوں بیچ سو پچاس یا پانچ سو کا جعلی نوٹ چپکانا اور اٹھانے والے کو اپریل، فول کہہ کر اس کا بینڈ بجانا وغیرہ۔ اپریل فول خالصتا کافروں کا تہوار ہے جسے منانا گناہ کبیرہ ہے، اپنی

عارضی خوشی کے لئے دوسروں کو حادثات اور ناگہانی واقعات کی جھوٹی اطلاعات دینے سے ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، موبائل فون کے دور میں اس فضول تہوار سے ہونے والے جانی ومالی نقصانات 800 فیصد سے زیادہ ہو چکے ہیں، اپریل فول ہماری نہیں یہود و نصاریٰ کی قبیح رسم ہے جسے ہمیں ترک کرنا چاہیئے اگر ملک میں غیر مذہبی تہوار اور رسومات منانے کی رفتار پر فوری کنٹرول نہ کیا گیا، تو عنقریب ملک میں بے حیائی کا ناسور پھیلتا ہوا نظر آئے گا، ملک میں بڑے بڑے بحرانوں کی وجہ اسلام سے دوری اور غیر شائستہ رسومات سے عقیدت ہے، پاکستان میں اپریل فول ایک رواج سا بن گیا ہے، جس سے معصوم اور بے خبر لوگوں کو اچانک حادثاتی خبر دے کر انتہائی بھیانک اور مذموم حرکت کا ارتکاب کیا جاتا ہے، فارغ اور گنوار قسم کے لوگ ہی اس تہوار کے پیروکار بنتے ہیں، اپریل فول مسلمانوں کے ساتھ ایک بدترین مذاق ہے، اور اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ دن تھا، جب عیسائی شہنشاہ نے سینکڑوں مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیلا اور بعد ازاں اس نے اس دن کو بطور یادگار مذاق کے طور پر منایا تھا، لہٰذا اس دن کو منانا زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے، اپریل فول ایک ایسی بیہودہ اور غلط رسم ہے جو امریکہ اور یورپ میں بھی تقریبا ختم ہو چکی ہے، اور ہم اسے منا کر اس کے احیاء کا احترام کرتے ہیں، ایسی رسمیں وہ قومیں مناتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی طور پر پستی میں گری ہوئی ہوں، اللہ تعالیٰ نے قاتل، زانی اور

شرابی کے لئے بھی لعنت کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن جھوٹے پر لعنت کی ہے۔ایسی جاہلانہ رسمیں منا کر نہ صرف ہم دنیاوی طور پر خسارے کا سودا کرتے ہیں بلکہ عذاب الٰہی کو بھی دعوت دیتے ہیں، ہم کو مسلمان ہونے کے ناطے ایسی قبیح لغویات سے اجتناب کرنا چاہئے، یہ دن صرف یورپ اور کافرلابی کو ہی زیب دیتا ہے،اس سے کسی انسان کی جان بھی جا سکتی ہے، جبکہ مذہب اسلام ایسے کسی بھی تہوار کے منانے یا سنگین نوعیت کے بیہودہ فعل کی ہر گزاجازت نہیں دیتا،ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''من تشبہ بقوم فہو منہم ''جس شخص نے کسی قوم کی مشابہت کی، وہ انہیں میں سے ہوتا ہے، جولوگ اپریل فول مناتے ہیں اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن وہ یہود و نصاریٰ کی صف میں اٹھائے جائینگے۔حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ یکم اپریل منانے پر پابندی لگاتے ہوئے حکومت کواس پر قانون سازی کرکے باقاعدہ اسے آئین کا حصہ بنانا چاہیئے تاکہ پاکستانی عوام امن وسکون سے رہ سکیں۔

فرصت کے اوقات

مسلسل جدوجہد سے فرد بہت جلد چڑچڑا ہو جاتا ہے اور اس کی صحت بھی بگڑنا شروع ہو جاتی ہے اور زندگی اسکے لیے وبال جان بن جاتی ہے اور فرد اپنے آپ سے ہی بیزار نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے میں فرصت اور آرام کے لمحات میسر آنا بہت ضروری ہیں ۔کیونکہ فرصت کے میسر آنے سے انسان کی ذہنی اور جسمانی طاقت بحال ہو جاتی ہے اور وہ کام کو احسن طریقے سے سرانجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے،اور اس سے طبیعت میں بھی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔اصل میں ہمارے ہاں فرصت ایسے لوگوں کو میسر آتی ہے جو سرمایہ دار ہوں۔انکے پاس کافی دولت ہوتی ہے اور وہ بیکار رہ کر بھی اپنی زندگی عیش وعشرت سے گزار سکتے ہیں جبکہ مزدور طبقے کے لیے فرصت کے اوقات کا دائرہ کار بہت ہی محدود ہے کیونکہ یہ زیادہ روپیہ کمانے اور اپنا معیار زندگی بلند کرنے کی کوشش میں دن رات کوشاں رہتے ہیں۔اور انکی زندگی میں کوئی لطف اور دلچسپی بھی باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ کام کی ہوس ان لوگوں کو روزی کمانے والی مشین بنا دیتی ہے اور یہ دوسری سرگرمیوں میں بھی کوئی حصہ نہیں لیتے۔ لیکن اس دور میں مشینری اور نئی ایجادات کے باعث لوگوں کو اپنا سارا وقت کام میں صرف کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ مشنری کی وجہ سے تھوڑے عرصے میں بہ آسانی کافی سامان تیار کیا جاسکتا ہے اور اس طرح کارکنوں کو

بھی فراغت یا فرصت کے لمحات میسر آجاتے ہیں اور یہ اس وقت کو اپنی مرضی کے مطابق گزار سکتے ہیں۔فرصت کے لمحات گزارنے میں انسان کے مزاج اور ماحول کا بڑا دخل حاصل ہے۔دنیا میں ہر شخص اپنی زندگی کو بہتر طور پر بسر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ مسلسل کام انسانی اعضاء کو تھکا دیتا ہے ان تھکے ہوئے اعضاء کو آرام دینے کے لیے انسان کو راحت اور تفریح کی ضرورت ہوتی ہے ۔لیکن فرصت کے بغیر آرام کا میسر آنا ممکن نہیں۔فرصت وہ وقت ہے جو انسان کو کسب معاش اور دیگر فرائض ادا کرنے کے بعد میسر آتا ہے۔اس وقت کو وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو آرام پہنچانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ فرصت کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔موجودہ دور میں جب کہ زندگی کے مسائل بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں اور انسان کو ہر وقت رزق کے حصول کی خاطر سرگرم عمل رہنا پڑتا ہے اور اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔جوان اور معمر امیر اور غریب ہر ایک کے نزدیک فراغت کا جداگانہ مصرف ہے اور وہ اپنے رجحان کے مطابق اسے استعمال میں لاتے ہیں ۔جیسے آج کل ریڈیو اور ٹیلی ویژن فرصت کا وقت بسر کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں اور انکے بغیر زندگی بے کیف نظر آتی ہے۔بعض لوگ ذہنی بوجھ ہلکا کرنے اور تھکاوٹ دور کرنے کے لیے سینما چلے جاتے ہیں ۔ہمارے معاشرے میں آج کل فلم بینی کا شوق بہت بڑھ گیا ہے خاص طور پر نوجوانوں میں اور وہ اپنے فرصت کے لمحات میں فلم دیکھنا پسند کرتے ہیں

۔اسکے ساتھ ساتھ اخبار بینی اور کتب کا مطالعہ بھی بعض افراد اپنے فراغت کے وقت میں کرتے ہیں۔اسکے علاوہ بچے اپنے فرصت کے لمحات مختلف قسم کی کھیلوں میں حصہ لیکر یا سیر و تفریح کرکے گزارتے ہیں۔نوجون زیادہ تر فرصت کے لمحے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیوں میں صرف کرتے ہیں یا مختلف قسم کے مشاغل مثلاً باغبانی، مصوری، فوٹوگرافی اور موسیقی وغیرہ میں گزارتے ہیں۔ہمارے یہاں عیاش طبقہ ریسٹورنٹ، کلبوں اور ہوٹلوں میں اپنا فرصت کا وقت بسر کرتا ہے جہاں ان کی وابستگی کے تمام لوازمات میسر ہوتے ہیں۔اگرچہ آج کل انسان بہت مصروف نظر آتا ہے لیکن اسے قدیم زمانے کی نسبت کہیں زیادہ فرصت کے اوقات میسر آتے ہیں ۔ہمارے ہاں ابھی لوگوں کا معیار زندگی اتنا بلند نہیں ہو، جس کی وجہ سے انہیں وہ سہولیات میسر نہیں آتیں جو ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں کو میسر ہیں اور بعض اوقات فرصت کے لمحات فائدے کے بجائے نقصان کا موجب بنتے ہیں۔جیسے اکثر نوجوان سگریٹ نوشی، جوا کھیلنے اور شراب نوشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ہمیں فرصت کے لمحات کامناسب اور صحیح استعمال کرنا چاہیے اور فرصت کے وقت کو ایسے امور میں صرف کرنا چاہیے جن سے ذاتی طور پر آرام وسکون اور مسرت نصیب ہو اور اجتماعی طور پر معاشرے کو بھی نقصان نہ پہنچے مثلاً سیر و تفریح ،ورزش اور مطالعہ وغیرہ۔اس لیے ہم سب کو چاہیے کے اپنے فرصت کے لمحات کو اپنے لیے اور اپنے معاشرے کے لیے بہتر بنائیں اور زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

جانوروں سے حسن سلوک

اسلام دین رحمت ہے، اس کی رحمت انسان کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر ذی روح پر محیط ہے۔ اس کے ابر کرم نے جہاں عالم انسانیت کو سیراب کیا ہے، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال فرمایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جانوروں کے ساتھ حسن سلوک پر اجر وثواب کی خوشخبری بھی سنائی گئی۔ ایک صحابی رسول اکرم ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ میں نے بطور خاص اپنے اونٹوں کے لیے ایک حوض بنا رکھا ہے، اس پر بسا اوقات بھولے بھٹکے جانور بھی آجاتے ہیں، اگر میں انہیں بھی سیراب کردوں تو کیا اس پر بھی مجھے ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ہاں) ہر پیاسے یا ذی روح کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے ثواب ملتا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث: 3686) اسلام نے جانوروں کو بھی چین سے جینے کا حق دیاہے۔اس کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ نہ خود تکلیف اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو تکلیف پہنچاؤ: ''لا ضرر ولا ضرار'' (ابن ماجہ: 340) دوسروں کو تکلیف دینا چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ ہو اسلام کے نزدیک درست نہیں ہے۔ حضرت ربیع بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ اپنی حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئے۔ ہم نے ایک سرخ پرندہ دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا، تو وہ فرط غم سے ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے میں نبی کریم ﷺ

تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: اس پرندے سے اس کے بچوں کو چھین کر کس نے اسے رنج پہنچایا؟ اس کے بچوں کو لوٹادو، اس کے بچوں کو لوٹادو''۔ (ابوداؤد: 2675)

۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور انسانوں کے لیے فائدہ پہنچاتا ہے اس کی قدر کی جانی چاہیے۔ جانوروں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف پسندی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالی نے جس جانور کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اس سے وہی کام لیا جائے، اس سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اس سے دوسرا کام لیتا ہے تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ مثلاً: اللہ نے بیل کو کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے گدھے کی طرح بوجھ ڈھونے کا کام لیتا ہے تو اسلام کے نزدیک یہ ظلم ہے۔ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ (یعنی جانور سے اسٹیج کا کام نہ لو)، اللہ نے انہیں تمہارا فرماں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات پر آسانی سے پہنچادیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے۔ تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اس سے پوری کرو''۔ (ابوداؤد: 2567)

۔ جن جانوروں سے خدمت لی جاتی ہے، یا جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان کے تعلق سے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان کے آرام وراحت کا پورا پورا خیال رکھا جائے، انہیں بر وقت کھلایا پلایا جائے۔ اگر وہ بیمار ہوں تو ان کا علاج معالجہ کرایا جائے، ان سے تکلیف کی حالت میں کام نہ لیا جائے، ان کے رہنے سہنے کا مناسب بندوبست کیا جائے اور ان سے اتنا ہی

کام لیا جائے جس کے وہ متحمل ہوں، ان سے اس وقت تک کام لینا جب تک کہ وہ بری طرح تھک کر آگے کام کرنے کے لائق نہ رہ جائیں، یا ان کی حالت قابل رحم ہونے کے باوجود مار مار کر ان سے کام لینا، یا انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر کام لینا یہ سراسر ظلم ہے۔ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ایک اونٹ کو دیکھا جس کی پیٹھ اس کے پیٹ سے لگی ہوئی تھی۔آپ نے فرمایا ''ان بے زبان جانوروں کے معاملے میں اللہ سے خوف کھاؤ ان پر ایسی حالت میں سواری کرو جب کہ یہ اس کے قابل اور صحت مند ہوں اور انہیں اچھی حالت ہی میں (تھک کر چور ہونے سے پہلے) چھوڑو''۔جس طرح اپنے ماتحت انسانوں کو بھوکا پیاسا رکھنا گناہ ہے، اسی طریقے سے جانوروں کو بھوکا پیاسا رکھنا گناہ ہے اور یہ سنگ دلی اسے جہنم تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں ڈالی گئی، اس نے اسے باندھ رکھا تھا۔ نہ تو اس نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے آزاد کیا کہ وہ (چل پھر کر) حشرات الارض میں سے کچھ کھالیتی''۔چہرہ جسم کا نہایت لطیف اور حساس مقام ہے۔ اس عضو کو پہنچنے والی معمولی اذیت بھی بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اہل عرب چوپایوں کے چہروں پر داغ لگاتے تھے اور بسا اوقات چہروں پر مار بھی دیا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سنگ دلی کو دیکھا تو سختی سے روکا۔ (ابوداؤد: 2564) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چہرے پر مارنے اور اسے داغ دینے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ (مسلم: 5551)۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے

روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر ایک دفعہ ایک گدھی کے پاس سے ہوا، جس کے چہرے کو داغا گیا تھا۔آپ نے دیکھا تو فرمایا :اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اسے داغا ہے''۔ (مسلم:5552)۔ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں چیونٹیوں کا بل تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے پوچھا' یہ چولہا یہاں کس نے جلایا ہے'۔ان صاحب نے کہا: یا رسول اللہ ! میں نے !آپ نے فرمایا'اسے بجھاؤ، اسے بجھاؤ' (ابوداؤد:2675) (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو اور کہیں وہ جل نہ جائیں۔ عربوں کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا کہ وہ جانوروں کو آپس میں لڑاتے اور اس تماشے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔اس میں جانور گھائل اور زخمی ہو کر بے حد تکلیف اٹھاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس درندگی کو دیکھا تو سختی کے ساتھ اس سے روکا ہے۔ (ابوداؤد:2562)اسلام میں جانوروں کے حقوق کے سلسلے میں یہ واضح تعلیمات تھیں، جن سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام نے جانوروں کو کس قدر ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ: ان تعلیمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم اور'' کس قدر رحم وکرم سے بھرا ہوا ہے''۔دنیا کو سب سے پہلے ''حقوق حیوان'' سے آشنا کرنے والا ''اسلام'' ہی تھا، ورنہ اس سے پہلے ''حقوق حیواں'' کا تصور دنیا میں نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ جس دنیا میں ''حقوق انسان'' ہی کے لالے پڑے

ہوں وہاں ''حقوق حیوان''کا تصور نا ممکن ہی تو تھا۔ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے نام لیوا اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو دنیا کے رو برو پیش کریں اور اس کا بے داغ اور صاف وشفاف آئینہ دنیا کے سامنے رکھ دیں، کہ دنیا اس کی امن پسند تعلیمات کا مشاہدہ کرسکے۔

حجاب عورت کا حسن..... !

لفظ حجاب (عربی) اور لفظ پردہ (فارسی) زبان سے تعلق رکھتے ہیں اور تقریبا ہم معنی ہیں ان جیسے کئی اور الفاظ بھی مثلاََ برقع ،گھونگٹ ،پردہ،آڑ،حیا،شرم ،نقاب اور حجاب لغت میں ملتے ہیں۔خواتین کے لئے لفظ پردہ غیر محرم مردوں سے اپنے جسم کو چھپانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تا کہ وہ مرد شیطانی اوہام سے محفوظ رہیں اور ان عورتوں کی عزت و عصمت محفوظ رہے۔حجاب ایک وسیع المعنٰی لفظ ہے اور اس کی ضِد کشف ہے۔لفظ حجاب قرآنِ کریم میں سات بار استعمال ہوا اور (سورۃ احزاب،59)کا مفہوم ہے کہ اے نبی ﷺ !اپنی بیویوں ،صاحب زادی اور مسلمان عورتوں سے فرمادو کہ اپنی چادر کا ایک حصہ اپنے چہروں پر ڈالے رہیں۔یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ عورت کے لئے اپنے سر اور چہرہ کو چادر میں چھپانا لازم ہے۔آج کے جدید دور میں پردہ کی بہت سی اقسام مثلاََ برقع، اسکارف، موزے ،دستانے اور دیگر لباس پہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ ان تمام صورتوں میں عورت کی سہولت مقصود ہے۔شرم آتی ہے کہ زمانہ جاہلیت کی عورتیں بھی بے پردہ رہتی تھی لیکن وہ ایسا لباس پہنتی تھیں کہ اُن کی پشت ڈھکی اور سینہ کھلا رہتا تھا اور آج جدّت پسندی کی لعنت نے خواتین کو پشت چھپانے سے بھی قاصر کر دیا ہے اور وہ نیم برہنہ حالت میں بازاروں میں ایسے پھرتی ہیں کہ جیسے پردہ

اُنکی ضرورت نہیں اور پھر عصمت زنی کا ذمہ دار مردوں کو قرار دیتی ہیں۔ جبکہ معاشرہ میں عام ہونے والا گناہ کبیرہ (زِنا) ایک عام سی بات بن چکا ہے اور اسکی وجہ بے پردگی ہے ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ مرد کے شہوانی جذبات عورت کی عریانیت کو دیکھنے سے مشتعل ہوتے ہیں یعنی مرد کے جنسی جذبات عورت کو دیکھ کر مشتعل ہوتے ہیں جبکہ عورتیں عموما بذریعہ بصارت مشتعل نہیں ہوتیں۔ اسی لئے اسلام میں عورتوں کو پردہ کا حکم ملا ہے نہ کہ مردوں کو، ویسے مردوں کو نظریں جھکانے کا حکم ہے۔ کوئی مانے نہ مانے اسلام میں پردہ فرض ہے۔ دراصل بے پردگی کی وجہ سے مرد و خواتین کے ملنے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں اور پردہ دار خاتون سے کوئی زیادہ ملنے اور بات کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ معاشرہ میں موجود کو ایجوکیشن سسٹم بھی اس گناہ کا بہت بڑا سبب ثابت ہوا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں عشق و محبت کے جذبات میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ یہ لڑکیاں کب عصمت باختہ ہو جاتی ہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ دنیا کے وہ علاقے جہاں مرد و خواتین کے ملنے کے مواقع زیادہ ہیں اُن علاقوں میں جنسی بے راہ روی کی شرح بہت زیادہ ہے جیسے امریکہ کے علاقے کیلیفورنیا کی مثال لے لی جائے وہاں زِنا اور طلاق کی شرح باقی ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ اور پھر آج کے اس جدّت پسند دور میں بے پردگی کو بہت سی حمائتیں حاصل ہیں ایک میل کزن اپنی فی میل کزن سے گھنٹوں بیٹھ کر گپ شپ کرتا ہے اور اُسے کوئی نہیں پوچھتا کہ کزن بیٹھے ہیں جبکہ اسلام تو جواں بہن کو جوان بھائی کے پاس

بھی تنہائی میں بیٹھنے سے منع کرتا ہے نہ جانے کیوں ہم ایڈوانس سوچ اور ترقی کی آڑ میں اپنے بچوں کو نشاط و سرور کی انجمنوں سے نکال نہیں پاتے اور فرینکنس کی آڑ میں جب بچیاں اپنی قیمتی متاع گنوا بیٹھتی ہیں تو غیرت کے نام پر اُنہیں قتل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کبھی میری اِن ماؤں بہنوں نے سوچا کہ زمانہ قدیم کی عورت کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے جاتے رہے ہیں۔ کیا اُن کو زندہ درگور نہیں کیا جاتا رہا۔ اُنکی عصمت کو بازاروں میں نیلام نہیں کیا جاتا رہا یہ اسلام ہی ہے جس نے عورت کو اس کے مقام سے روشناس کروایا اور معاشرہ میں عزت دی اب یہ اِس کی اپنی مرضی ہے کہ گھر کی ملکہ بن کر زندگی بسر کرے یا پھر رونقِ بازار بن کر۔ اس حقیقت سے بھی منہ نہیں پھیرا جا سکتا کہ معاشرہ کا حُسن بھی عورت سے ہی قائم ہے اور تمام کی تمام رعنائیاں عورت کی پُر خلوص قربانیوں اور لازوال جدوجہد میں پوشیدہ ہے۔ وہ عورت ہی تو تھی جس نے ہمیں جابر بن حیان، محمد بن قاسم ،بو علی سینا جیسی ہستیاں پرورش کر کے دیں۔ اس حقیقت کو اسلام سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے اور اسلام نے ہی تو علم کے ساتھ عمل کرنے کا حکم دے کر تکمیلِ معاشرہ کی ہے۔ اب جب فرنگی نسل کو پتہ چلا کے مسلمان قوم میں موجود جذبہ کو ہم شکست نہیں دے سکتے تو انہوں نے اور محاز کھولا اور ہمارے ایمانوں کو کمزور کرنے کا پلان مکمل کر لیا کیونکہ انکو پتہ چل چکا تھا کہ یہ قوم اِس عقیدہ پر قائم ہے کہ میدان جنگ میں مارے گئے تو شہید اور بچ گئے تو غازی کا مقام حاصل ہو گا.........! تو با

بالآخر فرنگی ذہن اس سوچ تک پہنچا کہ مسلمانوں کو شکست خوردہ اور محکوم بنانے کا واحد حل انہیں میدانِ جنگ سے نکال کر عیاشی، بے حیائی، عریانیت، سستی اور کاہلی کی راہ پر ڈال دیا جائے۔ اب اس ٹارگٹ کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے عورت کو اس کے اصل مقام سے ہٹانا ضروری ہے اور اس طرح عورت اس میدان کی مرکزی کردار قرار پائی۔ اگر آج کے اس معاشرہ کو میں کچھوا اور خرگوش کی اس کہانی کے مترادف کہوں تو کچھ غلط نہ ہو گا آج کا مسلمان اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کارناموں کی میٹھی لوریاں سُن کر ایسے خواب خرگوش میں گم ہے کہ جیسے اِسے خبر تک نہ ہو کہ فرنگی کچھوا کتنی دوری طے کر چکا ہے اب جب اس سوئی ہوئی قوم کو جھنجوڑ کر اٹھایا تو یہ ہڑبڑا کر ایسے کودنے لگی اور ترقی کی دوڑ میں فرنگی کچھوؤں سے آگے نکلنے کے چکر میں اُنہیں کی پیروی کرتے ہوئے اونچی اونچی چھلانگیں لگانا شروع کر دیں اور ان چھلانگوں کی آڑ میں ہر وہ چیز خود سے الگ کرتے چلے گئے جس کو اس دوڑ میں ہم نے رکاوٹ محسوس کیا یہاں تک کہ شرم وحیاء اور لباس کو بھی۔۔حیاء اس قلبی کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان ناپسندیدہ کاموں اور باتوں سے اجتناب کرتا ہے۔ جس شخص میں حیاء ہوتی ہے وہ نہ تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور نہ ایسا کوئی کام کرتا ہے جس سے اللہ اور اسکا رسول ﷺ ناراض ہو۔ جنسیت ایک مضبوط ترین جبلت ہے اس کو اگر کنٹرول میں رکھا جائے تو ایک مضبوط معاشرہ کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اگر یہی بے لگام ہو جائے تو معاشرہ طرح طرح کی برائیوں سے بھر جاتا ہے۔ اسی

لئے تو معاشرتی زندگی کو اسلام کے تابع کر دیا گیا ہے آپؐنے فرمایا کہ ہر دین کا کوئی نہ کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور دین اسلام کا امتیازی وصف شرم و حیاء ہے۔ شرم وحیاء ایمان کا خاصہ ہے، ایمان کا مقام جنت ہے اور بے حیائی اور بدکاری دوزخ میں لے کر جانے والے ہیں۔ فحاشی عیب ہے اور شرم وحیاء زینت ہے۔ جس میں فحاشی ہو گی اُس کے عیب ظاہر ہونگے، اللہ تعالیٰ سے جب کوئی بندہ ہاتھ پھیلا کر بھلائی مانگتا ہے تو وہ اُسے نامراد نہیں لوٹاتا۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ حیاء ایمان سے ہے اور ایمان جنت میں ہے اور فحش گوئی جفا سے ہے اور جفا دوزخ میں ہے۔ شرم وحیاء کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنے اجسام اور خیالات کو اُن ضروری پردوں میں پاک وطاہر رکھیں جن کا حکم ہمیں ملا تبھی ہم ایسے معاشرہ کی تکمیل کر پائیں گے جو معاشرہ مثالی اور مکمل ہوگا۔

قلم دوست ادبی ترویج کی مظہر

ادب سے انسان کا رشتہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ وہ چاہ کر بھی اس سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ پھر یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک صحتمند معاشرے کی تشکیل کا ضامن ایک ادیب ہی ہوتا ہے۔ ادب انسان کے اندر تہذیب و شائستگی کا وہ تلاطم برپا کرتا ہے، جو انسان کو خوش اخلاق و خوش کرداری کا پیکر بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ میں یہاں آپ کو ایک بات یہ بھی بتادوں کہ ادب کسی کے پروفیشن میں قطعاً آڑے نہیں آتا۔ بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ ایک ادیب صرف ادیب ہوتا ہے اور کچھ نہیں، ادب کے علاوہ کسی دیگر پروفیشن سے تعلق رکھنے والے افراد معیاری ادب تخلیق نہیں کر سکتے، کیونکہ معیاری ادب تخلیق کرنے کے لیے اپنے آپ کو ادب میں کھپا دینا ہوتا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے فلسفہء عشق، خودی، شاہین اور ابن عربی کے صوفیانہ نظریئے کی تشریح و تعبیر شاعری کی زبان میں کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شاعری چیز دیگر است۔ اہل علم کا خیال ہے کہ تمام ذرائع ابلاغ میں شاعری موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کے دل سے نکلی ہوئی بات قاری یا سامع کے دل تک براہ راست پہنچتی ہے اور دیر تک اپنا اثر قائم رکھتی ہے۔ شاید اسی لئے پیغمبر اسلام محمد ﷺ نے اپنے دور کے شاعروں کو Erotic شاعری اور خرافات کو ترک کرکے شاعری کے ذریعہ دین کو پھیلانے اور عوام اور معاشرے

کی اصلاح کرنے کا مشورہ دیا تھا۔آپ ﷺ اگر چاہتے تو شاعری کو لعنت قرار دے دیتے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ شاعری ایک ایسا Atom ہے جس سے تخریبی اور تعمیری دونوں کام لیے جا سکتے ہیں۔اس لئے آپ ﷺ نے سوچا کہ کیوں نہ اس سے تعمیری کام لیا جائے اس لئے آپ ﷺ نے شاعری کی تعریف کی اور اس سے تعمیری کاموں کو انجام دینے کی ترغیب دی۔ مولانا حالیؔ نے بھی شاعری کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کی بات کی اور مناجات بیوہ اور مدوجزر اسلام جیسی نظمیں لکھ کر معاشرے کی اصلاح کی تحریک چلائی۔فارسی اور اردو کے بیشتر شعراء نے صوفیوں کے نظریہء وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مشکل ترین مسائل کو شاعری کی زبان میں آسان اور موثر طریقہ سے پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے اس سے بہتر اور موثر ذریعہ کوئی دوسرا نہیں ہے، مشاعرے اور ادبی و شعری محفلیں جہاں عوامی تفریح کے ذرائع تھیں وہیں تہذیب سیکھنے ،ذہنی سکون حاصل کرنے اور تصوف کی پہلے زینہ سے آخری زینہ تک کا سفر طے کرنے کے لئے شاعری کی مدد لی جاتی تھی۔ گزشتہ دنوں علمی وادبی تنظیم ''قلم دوست''کے زیر اہتمام فیصل آباد کے نواح کھڑیانوالہ میں ایک خوبصورت عالمی مشاعرے کا انعقاد ہوا،جس کی صدارت معروف شاعر، نقاد باقی احمد پوری نے کی، مہمان خصوصی طارق اقبال اور مہمان اعزاز خالد سجاد احمد تھے ، نظامت کے فرائض عصر حاضر کے ابھرتے ہوئے شاعر عطاء الحسن نے ادا کئے، عالمی مشاعرے کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت رسول مقبول ﷺ سے کیا گیا،اس کے بعد باقاعدہ

عالمی مشاعرے کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے کلام پڑھنے کے لئے اسلام آباد سے ہوئے معروف شاعر فیصل اظفر علوی کو بلایا گیا، جنہوں نے اپنے کلام سے محفل مشاعرہ کے سامعین کو خوب محظوظ کیا،اس کے بعد بہت سے نئے و معروف شعراء کرام نے بھی اپنا اپنا کلام سنا کر خوب داد تحسین وصول کی، رحمان فارس کی شاعری سے ہال کا موسم کافی گرم ہوگیا،اور ہر طرف سے داد تحسین کی آوازیں آنے لگیں، سامعین رحمان فارس سے ان کی شاعری کو بار بار سنانے کے لئے کہتے رہے،ایسا لگا جیسے رحمان فارس نے عالمی مشاعرہ ہی لوٹ لیا ہو، معروف شاعرہ، صحافی پروین سجل نے خصوصی طور پر لاہور سے مشاعرے میں شرکت کی،پروین سجل خوبصورت شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا کلام بھی خوبصورت تھا، مہمان خصوصی اقبال طارق کو جب دعوت کلام دی گئی تو انہوں نے اپنی شاعری سے سوئے ہوئے حاضرین محفل کو اپنے اشعار سے داد تحسین دینے پر مجبور کردیا، مہمان اعزاز خالد سجاد احمد نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو گویا فضا میں ایک نغمگی چھا گئی،اور شاعری کی رموزواوقاف سے واقفیت رکھنے والے گویا جھومنے لگے، خالد سجاد احمد باکمال شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ سیرت واخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں،ان کی شاعری حقیقت آشنائی سے بھری نظر آتی ہے،ان کے بعد صدر محفل باقی احمد پوری کو دعوت کلام دی گئی، جن کی شاعری سن کے ایسا لگتا ہے جیسے اپنے عہد کی تاریخ لکھ دی گئی ہو،ان کی شاعری میں مشاہدات و تجربات کی حقیقتیں نظر آتی ہیں، نظامت کے فرائض عطاء الحسن نے باخوبی ادا کئے، خوبصورت

انداز، دلکش لب و لہجے والے عطاء الحسن ساتھ ساتھ شعراء کرام کے کلام سے بھی سننے والوں کو محظوط کرتے رہے، عطاء الحسن کا اپنا کلام انتہائی جاندار اور صاحب عقل ودانش کے لئے ایک پیغام تھا، عطاء الحسن شاعری کی دنیا میں بہت ہی خوبصورت اضافہ ہیں،کالمسٹ کونسل آف پاکستان (سی سی پی) کے مرکزی صدر ایم اے تبسم ، فنانس سیکرٹری (سی سی پی) ساحر قریشی کے ہمراہ خصوصی طور پر لاہور سے تشریف لائے، محفل مشاعرہ میں طاہرہ سراء ، سعدیہ صفدر سعدی (شیخوپورہ)، کائنات احمد فیصل آباد)، اسحاق وردگ (پشاور)، ریاض شاہد،اے ایچ عاطف، صفیہ) حیات،ڈاکٹر رفیق شاہد، محمد شعیب الطاف ودیگر نے شرکت کی ،آخر میں ادبی و علمی تنظیم قلم دوست" نے ادبی شخصیات کو شیلڈز سے نوازا ،کالمسٹ کونسل آف پاکستان (سی" سی پی) نے مہمان شعراء کرام میں انکی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو سند امتیاز سے نوازا گیا، کہا جاتا ہے کہ "ادب" تہذیب کا چہرہ ہوتا ہے اور شاعری چہرے کی لطافت و نزاکت ہوتی ہے کیوں کہ شاعری ادب کے تمام اصناف اور تمام فنونِ لطیفہ میں لطیف ترین صنف ہے۔ چہرہ اور خاص کر چہرے کی لطافت ونزاکت کے بغیر دنیا کی کسی بھی خوبصورت شے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ ادب اپنے آپ میں سب سے بڑا عجوبہ ہے اور شاعری اس سے بھی بڑا عجوبہ ہے۔ لہٰذا اس کی قدر و قیمت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کی حفاظت کرنا ہماری اوّلین فرض ہے۔ایسی علمی وادبی محفلوں کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے عوام اپنے اسلاف سے واقفیت حاصل کر سکیں،اور کوشش کی

جائے کہ آئندہ بھی ایسی ہی محفلیں سجتی رہیں، کیونکہ اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے
تو یہ محفلیں ہمارے کردار کی درستگی اور اعلیٰ ظرفی کی تربیت گاہیں ہیں،

قومی خدمت کا صلہ

متعدد مستند ذرائع محکمہ داخلہ پنجاب کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ جوزف فرانسس کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ محکمہ داخلہ ریاست و معاشرے میں امن و عامہ برقرار رکھنے اور کسی بھی ملکی قانونی خلاف ورزی پر ان ایکشن ہوتا ہے اور یہ اس کے فرائض منصبی کی بنیاد ہے اور یقیناً ایسی کارروائیاں کرنا اس کا حق ہے مگر جس شخص نے ہمیشہ دوسروں کے درد بانٹے ہوں اور دوسروں کے درد کو اپنے سینے میں محسوس کرتا ہو ایسے شخص کے خلاف کارروائی کا فیصلہ شائد درست نہیں۔ جوزف فرانسس پر سانحہ یوحنا آباد پر کسی کو اکسانے بھڑکانے کا الزام اس لئے بھی درست نہیں کہ جس وقت مظاہرین مشتعل تھے، توڑ پھوڑ کر رہے تھے اس وقت جوزف فرانسس خود زخمی ہو کر جنرل ہسپتال میں نہ صرف زیر علاج تھے بلکہ ہسپتال میں داخل دیگر مریضوں کی عیادت و معاونت کرنے میں مشغول تھے۔ ویسے بھی جوزف فرانسس کے بارے میں ایک عام آدمی بھی یہ رائے رکھتا ہے کہ جوزف فرانسس نے کبھی ایسا نہیں کیا کیونکہ جوزف فرانسس نے ہمیشہ پر امن بھائی چارے اور معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے بے شمار خدمات انجام دیں۔ 14 اگست، 23 مارچ کو وہ باقاعدہ تقریب منعقد کرتے ہیں، اپنے گھر پر پاکستان کے قومی پرچم کو سربلند کرتے ہیں، جس کو قومی میڈیا شائع بھی کرتا ہے۔

میثاق جمہوریت پر شہید جمہوریت

محترمہ بے نظیر بھٹو، میاں محمد نواز شریف، مخدوم امین فہیم، میاں شہباز شریف کے ساتھ مل کر آمریت کے خلاف جدوجہد کی اور میثاق جمہوریت پر دستخط بھی کئے۔ انہیں پاکستان کی پہلی اقلیتی سیاسی جماعت پاکستان کرسچن نیشنل پارٹی (پی سی این پی) کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اکلوتے مسیحی رہنماء کے طور پر اس لندن کانفرنس میں شریک ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ پھر کون نہیں جانتا کہ تحریک پاکستان کے دوران مسیحی رہنماؤں نے بانی پاکستان قائداعظمؒ کے شانہ بشانہ قیام پاکستان کے لئے کام کیا۔ قیام پاکستان سے تکمیل پاکستان کے سفر میں مسیحی برادری کی تعلیم، صحت، دفاع، عدلیہ ودیگر شعبوں میں جو لازوال خدمات ہیں وہ کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ بابائے قوم قائداعظمؒ مسیحی برادری کی خدمات کو سراہتے تھے اسی وجہ سے دیوان بہادر ایس پی سنگھا کے سیاسی اصولوں کی قدر کرتے تھے۔ سماجی حلقے جوزف فرانسس کی زلزلہ زدگان وسیلاب متاثرین کی بحالی میں کردار سے ناواقف نہیں۔ سانحہ یوحنا آباد کے حوالے سے میری جوزف فرانسس سے جب بات ہوئی تو انہوں نے واضح کیا کہ حکومت میں موجود کچھ سازشی عناصر میری عوامی، سیاسی وسماجی مقبولیت سے پریشان ہیں اور جب لوگ دکھی ہوکر میرے پاس آئے تو ان کے پیاروں کو غیر قانونی طریقے سے گرفتار کرنے سے روکنے کے لئے میں نے ہائی کورٹ لاہور میں رٹ پٹیشن دائر کی تھی جس سے کچھ لوگ ناخوش تھے۔ اب وہ میرے خلاف محاذ بنا رہے ہیں اور مجھے گرفتار کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ میں نے کبھی کوئی ایسا غیر قانونی یا غیر اخلاقی اقدام

نہیں کیا بلکہ سماجی و سیاسی طویل جدوجہد سے بلا تفریق رنگ و نسل و مذہب محروم طبقات کے لئے عملی خدمات انجام دیں۔ سیاسی لوگ اختلاف رائے رکھتے اور حکومت کے غیر آئینی اقدامات پر تنقید کرتے ہیں مگر جمہوریت کے دور میں بھی اگر سچائی کی آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی تو یہ آئین پاکستان کے منافی ہوگا۔ آمریت کے خلاف تحریکوں میں جوزف فرانسس کا کردار ریکارڈ پر موجود ہے۔ سانحہ یوحنا آباد پر کسی کو بھڑکانے، اکسانے کا کوئی بھی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ سارا میڈیا موجود تھا مگر یہ صرف ذاتی انا اور پسند و ناپسند کا معاملہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ زخمیوں کی بحالی اور شہداء کے ورثاء کی دادرسی سمیت حالات کو معمول پر لانے کے لئے جوزف فرانسس نے مثبت کام کیا ہے۔ کسی بھی ناانصافی و ظلم و جبر کے متاثرین کی نگاہیں اس ادارے کی طرف اٹھتی ہیں جو ان کے بھروسے اور امید کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔۔ پسے طبقات، محرومیوں کے شکار خاندان، مشکلات و مسائل میں افراد، معاشرے کے ستائے لوگوں کی بلا تفریق بلا امتیاز اور بلا رنگ و نسل و مذہب اخلاقی، مالی و سماجی مدد کرنے کی کوشش کی، ہے۔ دکھی انسانیت کی خدمت اور بے سہارا لوگوں کی مدد نیک اعمال میں شمار ہوتا ہے۔ متعدد ممالک کی اہم شخصیات نے بھی کسی بھی ایسی کسی کارروائی کو غیر آئینی قرار دیا ہے۔ تمام معاملات کو افہام و تفہیم اور حقائق کی روشنی میں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ بیرون ملک پاکستان کا اصل چہرہ پیش کرنے کی بجائے منفی تاثر نہ دیا جائے۔

تمباکو نوشی کی روک تھام ضروری ہے

(تمباکو نوشی کے عالمی دن کے موقع پر خصوصی تحریر)

ایک نئی تحقیق کے مطابق کسی بھی انسان کے جسم میں پہلی مرتبہ پیے جانے والے سگریٹ کے چند اولین کش ہی لمحوں میں ایسے جینیاتی نقصانات کی وجہ بن سکتے ہیں، جن کا تعلق سرطان سے ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق یہی جینیاتی نقصانات زندگی میں پہلی مرتبہ کی جانے والی تمباکو نوشی کے دوران شروع کے چند کشوں کے بعد بھی دیکھنے میں آ سکتے ہیں۔ سگریٹ نوشی کے انسانی جسم پر اثرات اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں کہ انہیں دوران خون میں انجیکشن کے ذریعے ایک دم داخل کیے گئے کسی بھی مضر صحت مادے کی منتقلی کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ دنیا بھر میں ہر روز قریب تین ہزار انسان پھیپھڑوں کے سرطان کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور ان میں سے 90 فیصد اموات کی براہ راست وجہ تمباکو نوشی ہوتی ہے۔ محققین کے مطابق سگریٹ کا دھواں بڑھتی ہوئی عمر اور غیر معمولی شور سے بھی کہیں زیادہ انسانوں کی قوت سماعت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ماہرین نے پہلے سے ہی اس بارے میں انتباہ کر رکھا تھا کہ تمباکو نوشوں کے بہرہ پن میں مبتلا ہونے کے خطرات کافی زیادہ ہوتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ تمباکو کا

دھواں دوران خون میں انتشار پھیلاتے ہوئے کانوں کے اندر خون کی باریک اور چھوٹی چھوٹی شریانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سے کانوں میں آکسیجن ٹھیک طرح سے نہیں پہنچ پاتی۔ ہر 100 اموات میں سے ایک کی وجہ 'پیسیو اسموکنگ' بنتی ہے۔ تمباکو نوشی نہ کرنے والے ایسے افراد تک بھی تمباکو کا دھواں موت کا سبب بن کر پہنچتا ہے، جو سگریٹ پینے والوں کے نزدیک رہتے ہیں اور جنھیں سیکنڈ ہینڈ یا پیسئیو اسموکر یا غیر فعال تمباکو نوش بھی کہا جاتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے پیش کردہ تازہ ترین اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ دنیا بھر میں ہر سال چھ لاکھ غیر فعال تمباکو نوشوں کی اموات واقع ہوتی ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے تمباکو نوشی کے عالمی اثرات پر کروائی جانے والی پہلی تحقیق کے نتائج سے یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ تمباکو کے دھوئیں سے سب سے زیادہ متاثر بچے ہو رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ہر سال دنیا بھر میں غیر فعال تمباکو نوشی کے مضر اثرات کے سبب ایک لاکھ 65 ہزار بچے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ غیر فعال تمباکو نوشی کے سبب دنیا بھر میں ہلاک ہونے والے بچوں کی کُل تعداد کے دو تہائی حصے کا تعلق افریقہ اور ایشیا سے ہے۔ دنیا بھر میں سالانہ 51 لاکھ افراد تمباکو نوشی سے ہلاک ہوتے ہیں جب کہ 603000 افراد سیکنڈ ہینڈ اسموکنگ کا شکار ہوتے ہیں۔ چین اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ بنانے اور استعمال کرنے والا ملک ہے اور سب سے زیادہ تمباکو نوشی سے اموات بھی چین میں ہو رہی ہیں۔ چین میں تمباکو نوشی سے ہلاکتوں کی تعداد 2030 تک سالانہ تین گنا ہو جانے

کا اندیشہ ہے۔ چین میں تین سو ملین افراد سگریٹ نوشی کی لت میں مبتلا ہیں۔کیا سگریٹ نوشی صحت کے لئے فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا کوئی ملک ایسا بھی ہے جہاں لوگوں کو تمباکو نوشی کی ترغیب دی جاتی ہے؟ جی ہاں، بنگلہ دیش میں جگہ جگہ ایسے اشتہارات دکھائی دیتے ہیں، جو خاص طور پر خواتین کو سگریٹ نوشی کی دعوت دیتے ہیں۔ 'تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے' ویسے تو شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ یہی اشتہار دیکھنے اور سننے میں آتا ہے۔ سینما ہو، ٹی وی یا پھر سگریٹ کے پیکٹوں پر وزارت صحت کے حکم پر لکھی گئی عبارت، ہر جگہ سگریٹ نوشی کے نقصانات کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے۔تاہم بنگلہ دیش میں سگریٹ کے بہت سے اشتہارات گمراہ کرنے والے نظر آتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں جگہ جگہ ایسے اشتہارات نظر آتے ہیں، جن میں تمباکو نوشی کرنے والوں سے یہ کہا جارہا ہوتا ہے کہ وہ سگریٹ نہ پینے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اسمارٹ، طاقتور اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور ' سگریٹ بچے کی پیدائش کے عمل کو سہل تر بنا دیتا ہے یا حاملہ خواتین کے لئے سگریٹ نوشی نہایت فائدہ مند ہے کیونکہ جب ایک عورت سگریٹ پیتی ہے تو اس کے شکم میں موجود بچے کا سائز زیادہ نہیں بڑھتا اور اس طرح بچے کی ولادت کا عمل کم تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا دوسرے معاشروں میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ یہی رجحان بہت سے دیگر ترقی پذیر معاشروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے ایک تازہ ترین سروے کے مطابق بنگلہ

دیش میں بالغ خواتین کا 28 فیصد حصہ تمباکو کا استعمال کر رہا ہے جبکہ تمباکو نوشی کرنے والے مردوں اور خواتین دونوں کی شرح 43 فیصد ہے۔پڑوسی ملک بھارت میں بھی، جہاں بہت بڑی تعداد میں مرد شہری تمباکو نوشی کرتے ہیں، وہیں خواتین میں بھی سگریٹ نوشی کا رجحان حیران کن حد تک زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ سگریٹ نوشی کرنے والی خواتین کے معاملے میں امریکہ اور چین کے بعد آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک بھارت اب تیسرے نمبر پر آتا ہے۔بھارتی اداکار شاہ رخ خان کو برلن میں خاص طور پر سگریٹ نوشی کی اجازت دی گئی تھی لیکن بس ان کے کمرے کی حد تک۔شاہ رخ خان نے جرمنی ، برلن میں اپنی فلم ڈان ٹو کی شوٹنگ کی تھی اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ وہ کسی چمنی کی طرح ہر وقت سگریٹ کا دھواں اڑاتے رہتے ہیں اور جرمنی میں 2008 سے پبلک مقامات خاص طور پر ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس میں تمباکو نوشی پر پابندی عائد ہے لیکن ہوٹل کی انتظامیہ نے شاہ رخ کی عادت کے پیش نظر انہیں ان کے کمرے سے متصل ٹیرس پر سگریٹ پینے کی اجازت دے دی تھی۔ جرمنی میں شاہ رخ کے مداح بڑی تعداد میں ہیں اور برلن کے مئیر خاص طور پر ان سے ملنے بھی آئے تھے۔ بل گیٹس کا شمار دنیا کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔ ان کے اثاثوں کی مالیت کا اندازاً 75 ارب ڈالر سے زیادہ لگایا گیا ہے۔ کچھ سالوں قبل تک بل گیٹس کی مقبولیت، شہرت اور شناخت محض ان کی دولت تھی لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی مزید عنایت کی۔ انہیں مالی اثاثوں اور مادی دولت کے ساتھ ساتھ دل

کی دولت سے بھی نواز دیا۔ بل گیٹس نے اپنی دولت کا بیشتر حصہ فلاحی کاموں کے لئے وقف کر دیا۔ بل گیٹس کی فلاحی تنظیم سماجی کاموں کے لئے اب تک 29 ارب ڈالر سے زائد کے عطیات دے چکی ہے۔ بل گیٹس نے دنیا بھر کے ارب پتی افراد سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ آگے بڑھیں اور ان کے ساتھ فلاحی کاموں میں شریک ہو جائیں۔ ان کی اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا اور امریکہ اور دیگر ممالک کے امیر ترین افراد اپنی دولت بل گیٹس کے فلاحی ادارے کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ اس مہم میں اب تک دنیا بھر کے 57 ارب پتی افراد شمولیت اختیار کر چکے ہیں جن میں پاکستان اور بھارت کے بھی کچھ ارب پتی شامل ہیں۔ بھوٹان دُنیا کا پہلا ملک ہے، جہاں تمباکو کی مصنوعات کی فروخت پر پابندی لگائی گئی۔ اس حوالے سے قانون سازی 2004 میں کی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بلیک مارکیٹنگ کی وجہ سے حکام کو اس قانون کے نفاذ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ رواں برس کے آغاز سے بھوٹان حکام نے اس قانون کے نفاذ کے لیے زیادہ سخت رویہ اپنایا، جس کے تحت سگریٹ نوشی کرنے والوں اور تمباکو کی مصنوعات کی فروخت میں ملوث افراد کو بھاری جرمانے بھی عائد کیے جا رہے ہیں۔۔ برطانیہ کے نیشنل ہیلتھ سروسز نے نئے سال کے موقع پر سگریٹ نوشی ترک کرنے کے خواہش مند افراد کو اس توقع کے ساتھ کہ اس سے لوگوں کو یہ عادت چھوڑنے میں مدد ملے گی، ایک ہفتہ کے لئے نکوٹین پیچز مفت تقسیم کئے تھے۔ سگریٹ نوشی ترک کرنے کے خواہاں افراد کو ایک کیوٹ کٹ'' دی گئی جس میں ایک ہفتہ کے لئے نکوٹین پیچز کے کوپن بھی تھے''

جنہیں کسی بھی فارمیسی سے حاصل کیا جا سکتا تھا اور اس میں ایسا آڈیو مواد بھی تھا جس کے ذریعے لوگوں کو سگریٹ نوشی کے نقصان اور اسے چھوڑنے کے فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ان نکوٹین پیچز کے استعمال سے سگریٹ چھوڑنے کے امکانات دوگنا ہو جاتے ہیں۔پاکستان میں حکومت کو ان ہی طرز پر فلاحی اداروں کے ساتھ مل کر تمباکو نوشی کے خلاف موثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

شب برات بخشش کی رات

اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی مصلحت اور حکمت کے تحت بعض اوقات میں تقدس اور عظمت کا پہلو رکھ کر بندوں کے دلوں میں ان اوقات کی طرف رغبت اور محبت پیدا کر دی ہے۔ جیسے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک کا مہینہ ہے کہ اپنے کلام کے نزول اور روزوں وتراویح کے لئے مخصوص کرکے بندوں کے دلوں میں اس مہینے کی اس قدر محبت پیدا کر دی کہ حتی المقدور وہ اس مقدس مہینہ کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں اور اس کے تقدس و عظمت کو یوں رائیگاں نہ جانے دیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ عبادت کرکے اللہ کے نیک بندوں میں اپنے کو شامل کریں۔ ہفتے کے ساتوں دن اللہ کے یہاں برابر ہیں لیکن ان میں ایک دن جمعہ کے لئے مخصوص کر دیا اور اس نماز جمعہ کی وجہ سے اس دن کو باقی دنوں سے افضل بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس دن کا آغاز بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ضروری سے ضروری دنیاوی مشاغل چھوڑ کر نہادھو کر اچھا لباس پہن کر اللہ کے گھر (مسجد) پہنچ کر باجماعت جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ یہی حال شب برات کا ہے۔ جو شعبان المعظم کی پندرھویں شب کہلاتی ہے اور جو بے شمار فضیلت و عظمت کی حامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماہ شعبان المعظم کی آمد سے ہی اہل ایمان کے دلوں میں ہلچل پیدا ہونے لگتی ہے۔ اہل اسلام کے مرجھائے دل کھلنے لگتے ہیں۔ انکے دلوں میں خوف خدا پیدا اور آنکھوں سے ندامت کے

آنسو بہنے لگتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس کے بعد نزول قرآن والا مہینہ ' خیر و برکت اور عظمت و رفعت والا مہینہ رمضان المبارک پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ فگن ہونے والا ہوتا ہے۔ گویا کہ ماہ رمضان کے قریب ہونے کی وجہ سے شعبان کا مہینہ پورے طور پر نہایت ہی عظمت کا حامل ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شعبان المعظم میں ہی رمضان المبارک کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ کا مہینہ ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان میں آپ کی عبادات میں اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ رمضان کے بعد سب سے زیادہ شعبان میں ہی آپ ﷺ روزے رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان سے زیادہ کسی اور مہینہ میں روزے نہیں رکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ماہ میں زیادہ روزے رکھنے کی چند وجوہات بتائی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس مہینے میں مرنے والوں کی موت لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اگرچہ ہر روز رات کے اعمال نماز فجر کے بعد اور دن کے اعمال نماز عصر کے بعد اور ہفتہ کے اعمال دو شنبہ یعنی سوموار کو اور جمعرات کو بارگاہ خداوندی میں پیش ہوتے ہیں لیکن پورے سال کے اعمال شب برات میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آنحضور ﷺ ہر مہینہ میں تین روزے رکھا کرتے تھے۔ بسا اوقات کسی وجہ سے وہ روزے چھوٹ جاتے تو سب کو اکٹھا کرکے شعبان میں رکھ لیتے تھے۔ حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ شعبان کا مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان ہے۔ لوگ اس ماہ کی فضیلت سے غافل ہیں جب کہ اس ماہ میں بندوں کے اعمال بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال پیش ہوں اس حال میں کہ میں روزہ دار رہوں۔ اسی ماہ شعبان المعظم کی پندرہویں شب۔ شب برات کہلاتی ہے۔ (یعنی چھٹکارہ کی رات) شب برات کی حقیقت کیا ہے، شب برات صرف اور صرف عبادت کی رات ہے۔ اللہ کے حضور اپنے گناہوں پر نادم ہو کر سچے دل سے توبہ واستغفار کرنے کی رات ہے۔ شب برات سے متعلق احادیث مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں جن سے شب برات کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنے بستر پر) نہ پایا تو میں تلاش میں نکلی۔ آپ ﷺ جنت البقیع (قبرستان) میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میرے پاس حضرت جبرئیل تشریف لائے اور فرمایا کہ آج نصف شعبان کی رات ہے اس رات میں اللہ تعالیٰ لوگوں کی مغفرت کرے گا مگر چند لوگ اس مغفرت سے محروم رہیں گے۔ مشرک، کنبہ پرور، قطع رحمی کرنے والا اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ شراب پینے والا، روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ چار راتوں میں ہر قسم کے احسانات کے دروازے کھول دیتا ہے اور یہ دروازے اذان فجر تک کھلے رہتے ہیں۔ وہ چار راتیں ہیں۔ (1) عید کی رات۔ (2) بقر عید کی رات۔ (3) شب برات۔ جس میں سب کی عمر یں اور سب کے رزق نیز جن کو حج نصیب ہوگا ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ (4) شب عرفہ یعنی نویں ذوالحجہ کی رات۔ شب برات

بہت ہی بابرکت رات ہے۔ اس رات میں خوشنودی الٰہی حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عبادات۔ خوب خوب توبہ واستغفار کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس رات میں باری تعالیٰ کے انعامات اور اس کی رحمتوں کی بے پناہ بارش ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی رحمتوں سے فیضیاب ہونے کے لئے پوری مستعدی، حضور قلب اور اخلاص کی سخت ضرورت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کی پندرھویں شب میں قیام کرو یعنی عبادت میں مصروف رہو اس کے دن میں روزہ رکھو۔ اس رات میں جس سے جو ہوسکے وہ کرے۔ ذکر واذکار کرے۔ قرآن شریف کی تلاوت کرے۔ یا نوافل وغیرہ پڑھے۔ فتاویٰ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ شب برات میں جاگنا اور عبادت میں یہ رات گزارنا مستحب ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی نہیں جاگتا ہے بلکہ سو جاتا ہے تو اس کو برا نہیں کہنا چاہئے اور اس کی عظمت وشان کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ مستحب ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی حالت ایسی ہو کہ رات کو جاگ کر مستحب پر عمل کرنے کی صورت میں فرض چھوٹنے کا اندیشہ ہو یا خشوع وخضوع جانے کا ڈر ہو تو واقعی ایسے شخص کے لئے جاگنے سے بہتر سونا ہے۔ اس رات کا حق تو یہ ہے کہ جس سے جتنا ہوسکے مسجد میں گھر پر یا جہاں بھی مناسب سمجھے تنہا ذکر و نوافل میں مشغول ہو۔ جتنا ہوسکے نیک اعمال کرے۔ اگر پوری رات نہیں جاگ سکتا تو جتنا ہوسکے اتنا ہی جاگے۔ ایسا نہ ہو کہ پوری رات تو جاگ کر نوافل و مستحبات میں گزار لیا اور نماز فجر جو کہ فرض

ہے وہ سونے کی نذر ہو گئی۔ بلکہ یہ راتیں اس لئے ہیں کہ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر تم
اللہ کے ساتھ تعلقات استوار کر لو اور تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی حائل نہ ہو۔

برما میں مسلمانوں کے قتل عام پر مسلم حکمرانوں کی معنی خیز خاموشی

برما کے مسلمانوں کی کل آبادی 22 لاکھ ہے جن میں سے 7 لاکھ افراد بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور ملیشیا میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔2 لاکھ مہاجرین بنگلہ دیش میں جائے پناہ کی تلاش میں ہیں جبکہ ایک سے دو لاکھ افراد پاکستان اور ملیشیا میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔بھارت میں بھی چند ہزار خاندان خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، گزشتہ برسوں سے عالمی پیمانے پر مسلمانوں پر مختلف ملکوں میں عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا رہا ہے۔بوسنیا، ہرزی گووینیا میں بے دریغ مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی۔۔چیچنیا میں بھی مسلمانوں کی زندگی دوبھر ہو چکی ہے۔ مسلم بستیوں کو اسرائیلی فوجوں نے گولوں اور بارودوں سے تاراج کر دیا ہے۔ یہ وہی چیچنیا ہے جہاں کوہِ قاف ہے جس کی پریوں کی کہانیاں نانیاں اور دادیاں سنایا کرتی ہیں۔آج میانمار میں وہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں جو کسی زمانے میں ہٹلر نے ڈھائے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ جمہوریت پسند لیڈر آن سان سوکی جنھیں مسلمانوں نے ہمیشہ ووٹ دیا ہے وہ بھی مسلمانوں کی ہمدرد نہیں ہیں بلکہ وہ یہ غیر ذمے دارانہ بیان دے رہی ہیں کہ انھیں یہ معلوم نہیں کہ روہنگیا مسلمان میانمار کے شہری ہیں یا نہیں جبکہ 1978ء میں انھیں مسلمانوں نے ہی اقتدار کے قریب کیا تھا جس کی سزا وہ

بھگت رہے ہیں۔ یہ بات صرف میانمار تک ہی محدود نہیں ہے۔ امریکہ جو ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اس خالص انسانی مسئلے پر خاموش ہے۔ یہی نہیں عالم اسلام کے بیشتر ممالک کے حکمراں بھی خاموش ہیں۔ مسلم عوام تو میانمار کے مسلمانوں کے درد کو دل میں محسوس کرتے ہیں لیکن حکمرانوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ حد تو یہ ہے کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے بھی ان مظلوموں کے آنسو پونچھنے کی کوشش نہیں کی۔ حقوق انسانی کے نام پر قائم ادارے جو مسلمانوں کے بیشتر مسائل پر تشویش کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس معاملے پر مہر بہ لب ہیں۔ مسلمانوں کی فلاح کے نام پر اربوں روپے خرد برد کرنے والے لوگ بھی اپنے کانوں میں روئی ڈالے سو رہے ہیں۔ برما میں مسلمانوں کے قتل عام کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اب تک ہزاروں نہتے مسلمان شہید کیے جا چکے ہیں اور نہ معلوم کتنے اور مسلمان شہادت نوش فرمائیں گے کیوں کہ یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ اور بودھی قبائل کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو گئے اور انھوں نے مسلمانوں کا قتل عام اور مسلم خواتین کی اجتماعی آبرو ریزی شروع کر دی۔ اس جاں سوز المیے پر برما کے ہمسایہ مسلم ملک بنگلہ دیش کا رویہ تو نہایت تشویشناک اور قابل مذمت ہے جس نے ان مہاجرین کو اپنے یہاں رہنے دینے اور ان کے قیام و طعام کا بندوبست کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا اور کہا کہ ہم خود غریب ملک ہیں آپ کے اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ واضح رہے کہ میانمار اور

بنگلہ دیش کی سرحد کے قریب واقع شہر اراکان میں میانمار کے بوذی قبائل کی جانب سے وہاں کی مسلم آبادی کو گزشتہ کئی ماہ سے سنگین نوعیت کی دہشت گردی کا سامنا ہے۔بوذی قبائل کے دہشت گرد مسلمانوں کی نسل کشی کر رہے ہیں جبکہ وہاں کی حکومت بھی مظلوم مسلمانوں کا ساتھ دینے کے بجائے انھیں اپنا شہری تک تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔میانمار میں مسلمانوں کے خلاف جاری دہشت گردی کے خلاف پورے عالم اسلام کی جانب سے سخت رد عمل سامنے آرہا ہے۔مصر کی سب سے بڑی علمی درسگاہ جامعہ الازہر نے بوذی قبائل کے ہاتھوں نہتے مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف دنیا بھر میں موجود میانمار کے سفارتخانوں کے گھیراؤ کا مطالبہ کیا ہے۔قبل ازیں اسلامی تعاون تنظیم کے سکریٹری جنرل اکمل الدین احسان اوغلو نے مسلمانوں کے قتل عام کی شدید مذمت کرتے ہوئے تشدد کا سلسلہ بند کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور کہا کہ مسلم اکثریتی صوبہ اراکان میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ نہایت شرمناک اور انسانیت سوز ہے۔عالمی برادری اس کا سختی سے نوٹس لے۔جامعہ الازہر کی علما کونسل کی جانب سے جاری بیان میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی قتل عام جاری ہے۔گھروں اور مسجدوں کو آگ لگا کر خاکستر کیا جا رہا ہے لیکن عالمی اور اسلامی سطح پر مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کوئی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔حد تو یہ ہے کہ میانمار کے صدر نے جلتے پر تیل ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمان ہمارے شہری نہیں ہیں۔اس لیے ان کے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ عام

شہروں سے نکل کر مہاجر بستیوں میں چلے جائیں یا ملک چھوڑ دیں۔انہوں نے اقوام متحدہ کے مندوب برائے پناہ گزین سے ملاقات کے دوران کہا کہ روہنگیا شہر میں موجود مسلمان ہمارے شہری نہیں ہیں اور نہ ہی ہم ان کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں۔اگر انھیں حملوں کا سامنا ہے تو وہ ملک چھوڑ دیں۔ ہم انھیں اپنا شہری نہیں مانتے۔ظالمانہ اور مفسدانہ بیان کے نتیجے میں 90 ہزار مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ میانمار کا پرانا نام برما ہے اور دارالحکومت ینگون ہے جو پہلے رنگون کہلاتا تھاجہاں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر مدفون ہیں جو جنگ آزادیٔ ہند کے ہیرو اور سرخیل تھے۔دنیا بھر کے قومی لیڈران جب بھی میانمار جاتے ہیں ان کے مزار پر چادر چڑھاتے اور گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں۔آج بہادر شاہ ظفر کی روح مسلم شہیدوں کی لاشوں کی بے حرمتی پر تڑپ رہی ہوگی۔یہ وہی میانمار ہے جہاں کی جمہوریت پسند لیڈر آن سان سوکی فوجی حکومت کے دوران قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتی رہیں۔ اس کے صدر کا رویہ اور روش تاناشاہی سے کم نہیں ہے۔ وہ مظلوم مسلمانوں کے قاتلوں کا حامی اور ان کا پشت پناہ ہے۔ وہ بڑی بے شرمی،ڈھٹائی اور بے غیرتی کے ساتھ مسلمانوں کو ہی ملک سے نکالنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔افسوس اس کے خلاف سیاسی یا سفارتی دباؤ بنانے کے لیے کوئی تیار نظر نہیں آ رہا ہے۔ عالمی برادری خاموشی کے ساتھ صرف تماشا دیکھ رہی ہے۔ مسلم کش حملوں کے خلاف حکومت پاکستان نے بھی اب تک کوئی لب کشائی

نہیں کی ہے جبکہ قریبی پڑوسی ہونے کے ناطے یہ اس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ حکومت میانمار کے اس ظالمانہ رویے کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی۔پاکستان کی چند مسلم تنظیموں اور جماعتوں کے علاوہ سیاسی جماعتیں اپنا احتجاج درج کرانے میں ناکام رہی ہیں۔کیا یہ مسلم تنظیموں کی ذمے داری نہیں ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے دفتر اور میانمار کے سفارت خانے یا ہائی کمیشن میں جا کر اپنا احتجاج درج کرائیں۔اپنے ذاتی مفاد کی خاطر یہ مسلم تنظیمیں جتنی بیتاب رہتی ہیں اس معاملہ پر اس قدر خاموش کیوں ہیں اس کا جواب بھی پاکستان کے مسلمانوں کو ملنا چاہیے۔ذرا سی بات پر کروڑوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں جبکہ ملت کے مفاد کے معاملے میں یہ تنظیمیں چپ ہیں۔اپنے اقتدار اور مفاد کے لیے یہ تنظیمیں قوم کا کروڑوں روپیہ برباد کر دیتی ہیں مگر ہائے افسوس ان روپیوں کا کوئی حساب نہیں دیا جاتا کہ کہاں اور کس مد میں یہ روپیہ خرچ ہوا۔صرف اور صرف یہ تنظیمیں اپنے خاندان اور ذاتی مفاد کے لئے مذہب اور سیاست کا استعمال کرتی ہیں جس کا جواب عوام کو ملنا چاہیے۔

بھارتی ٹی وی ڈرامے، نوجوان نسل کی تباہی

عام طور پر ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ جو مغربی تہذیب کو بہت ساری برائیوں کی جڑ سمجھتا ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ صنف نازک نے جب سے گھر کی دہلیز کے باہر بازار میں قدم رکھا ہے، صنعت و تجارت کو زینت بخشی ہے، یہ اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں رہا کہ وہ برائیاں جو کبھی کبھار دیکھنے اور سننے کو ملتی تھیں، اب اس نے سیلاب کی صورت اختیار کرلی ہے۔پہلا سوال یہ ہے کہ عورت کیوں پردے میں رہے اور کیا واقعی اس کے باہر آنے سے اس کی عزت و آبرو خطرے میں رہتی ہے۔دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ خود اپنی مرضی سے باہر آنا چاہتی ہے۔پہلے سوال کا جواب ہمیں ہر منٹ اور ہر گھنٹے اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے ذریعے مل رہا ہے، دوسرے سوال کا جواب یہ کہ اس کائنات کے مالک نے عورت اور مرد دونوں کی فطرت میں شرم و حیا داخل کردی ہے اور وہ خود بے حیائی اختیار نہیں کرنا چاہتے۔مثال کے طور پر آدم اور حوا کو اگر یہ پتہ ہوتا کہ شجر ممنوعہ کے پھل کو استعمال کرنے کے بعد اپنے لباس سے محروم ہو جائیں گے، تو وہ کبھی یہ غلطی نہیں کرتے، مگر جب ابلیس کے بہکاوے میں آکر ایسا کر بیٹھے، تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔چونکہ جو غلطی آدم سے جنت میں ہوئی ،وہی غلطی بنی آدم سے زمین پر بھی ہونا لازمی تھی۔ اسی لئے اللہ تعالی رسولوں اور الہامی کتابوں کے ذریعے آدمی

کو آگاہ کرتا رہا کہ اے بنی آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ایک بار پھر تمہاری شرمگاہوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔انسان کی اسی بشری کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطانی طاقتوں نے دنیا میں شجر ممنوعہ کے پھل بودیے ہیں جسکی وجہ سے امریکہ اور بھارت ہمارے گھروں تک گناہوں کے باغات خوب بو رہے ہیں اور اپنے زہریلے اثرات سے دنیا میں بے سکونی افراتفری پھیلارہے ہیں۔فرق یہ ہے کہ آدم کے لئے جنت میں گناہ کے جواز تھے، مگر گناہ کے ذرائع نہیں تھے۔اس لئے آدم اور حوااس تباہی اور گناہ سے بھی بچ گئے اور معاف بھی کر دیے گئے۔اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں شجر ممنوعہ ہے کیا؟ یہ آزادی کا خوبصورت تصور ہے، جس کا نشہ ہر آدمی اور عورت کے ذہن پر طاری کردیا گیا ہے اور پھر اپنی اس آزادی کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس نشے اور گناہ کی طرف راغب کئے جاتے ہیں، جسے عام مفہوم میں سیکس یا جنسی تسکین کا نام دیا جاسکتا ہے، جو آسانی کے ساتھ ہر قیمت پر بازار میں دستیاب ہے۔اور اس منافع بخش تجارت میں دنیا کی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنا بہت بڑا سرمایہ لگایا ہوا ہے۔مگر دنیا کی ایک بہت بڑی اکثریت بین الاقوامی ثقافتی اداروں کی اس سازش کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہے، جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ انسانی حقوق کی بازیابی، جمہوریت کی بحالی، سماجی عدل وانصاف اور آزادی نسواں کے قیام جیسے پر فریب نعروں کے ذریعے دنیا کی تمام دیگر مذہبی تنظیموں اور تہذیبوں کو فرسودہ قرار دیکر انہیں صرف اپنے بارے میں سوچنے

کیلئے مجبور کردیں اور وہ خود اپنے قدیم روایتی مذہبی اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔کتاب ''گلوبلائیزیشن اور دنیا کی تشکیل نو'' میں لکھا ہے کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں منظور کی جانے والی تجاویز کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ ہو گا کہ ان کا مقصد معاشرے کو ہر طرح کے اخلاقی و خاندانی بندھنوں سے آزاد کرکے عریانیت، فحاشی، جنسی بے راہ روی ،اسقاط حمل کا قانونی جواز ، تعیش پسندی، شادی کے بغیر جنسی خواہشات کی تکمیل جیسی انسانیت سوز عادات کو معاشرے میں عام کرنا ہے، جس کے بعد انسانوں اور جانوروں کی اجتماعی زندگی میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ جائے گا۔امریکہ جو اس پوری تہذیب کا معمار اور موجد ہے، وہاں کی ہالی ووڈ فلم انڈسٹری پوری دنیا کیلئے ہر سال 12 لاکھ گھنٹوں پر مشتمل مختلف قسم کے لٹریچر اور ٹی وی پروگرام تیار کرتا ہے، جس میں بلیو فلم سے لیکر موسیقی جیسے پروگرام شامل ہوتے ہیں اور پھر یہاں سے ایک اچھی قیمت کے عوض دنیا کے دیگر ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں۔امریکہ کی یہ فلمی صنعت پوری دنیا کی فلمی صنعت کی آمدنی کے پچاسی فیصد حصے پر قابض ہے اور 1994 کے دوران امریکہ نے اپنے تفریحی پروگراموں کی فروخت سے چالیس اعشاریہ دو ملین ڈالر حاصل کئے، جو کہ امریکہ میں تیار کی گئی دیگر مصنوعات کی فروخت سے بھی زیادہ ہے۔امریکی طرز آزادی اور ثقافت کے حامی بورہوس فرڈریک کا کہنا ہے کہ آزادی اور شرافت ایک قسم کا فریب اور دھوکہ ہے ،اقوام عالم کو چاہئے کہ وہ امریکی ثقافت کو قبول

کرلے ،مگر جو ملک اور حکومت اس کی مخالفت کریں ان کے معاشرے میں جوا، شراب موسیقی اور رقص کی شکل میں تفریح کے ایسے جدید ترین وسائل کو عام کردیا جائے، کہ بالآخر مخالف طبقات بھی اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہو جائیں یا خاموشی اختیار کرلیں۔ہم دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک طبقہ جو اس برائی سے کسی طرح الگ ہے تو بھی اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس کے خلاف آواز بھی اٹھا سکے۔میڈیا جو کہ شوق و سنگار کے سامان بنانے والی کمپنیوں اور فلم انڈسٹری سے کروڑوں اربوں روپے کی منافع بخش تجارت کر رہا ہے، وہ پوری طرح عورت مرد کے اختلاط اور جنسی بے راہ روی کو ترقی کی علامت بنا کر پیش کر رہا ہے اور اپنے اسی مقصد کے فروغ کیلئے یہ کمپنیاں حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے عنوان سے ایسی مختلف تنظیموں کو سرمایہ فراہم کر رہی ہیں جو عالمی اور ملکی پیمانے پر فحاشی بے حیائی اور بدکاری کے رجحانات کو عام کرنے کیلئے ہر ماہ کہیں نہ کہیں کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔اس کا اثر بھی دیکھا جاسکتا ہے آج سے قبل جہاں معاشرے میں شرابی،زانی اور بد کردار افراد کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی، انہیں اب عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس فعل کے معترف سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین ،ارشاد مانجی ،اسریٰ نعمانی اور وی ایس نائیپال جیسے بد کردار مصنفوں کو نوبل انعام سے نوازا جانا۔جب ہم کتاب گلوبلائزیشن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کس طرح مغربی طرز کے قائل تعلیم یافتہ افراد برائیوں کی ایجاد کرتے ہیں اور اس

برائی کے پھیلاؤ سے شہر دیہات اور معاشرے کے پسماندہ جاہل اور مزدور قسم کے طبقات بھی برابر سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں جو فحش لٹریچر بازار میں دستیاب ہے، اس نے عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کے وہ تمام راز فاش کردئے ہیں، جسے حقیقت میں اسی طرح پہرے میں رہنا چاہئے تھا۔مادیت کے پرستار نام نہاد مہذب دنیا کے بااثر ممالک ان جوہری اسلحوں کے تباہ کن نتائج سے تو واقف ہیں، مگر جو دھماکہ انسان کے شہوانی جذبات اور جنسی خواہشات کو آگ لگا کر کیا جارہا ہے، اس نے زندہ انسانوں کو جانور ہی نہیں درندہ بنادیا ہے اور اس کی اس یلغار سے پانچ سال کی معصوم سے لیکر اسی سال کی بوڑھی عورت کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مرد خود اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے جواز پیدا کررہا ہے، عورتیں بھی فائیو اسٹار ہوٹلوں اور بیئر بار کا رخ کررہی ہیں۔ فحش تہذیبی یلغار سے یکساں طور پر معاشرے کا ہر ذہن متاثر ہوا ہے فرق اتنا ہے کہ جو تعلیم یافتہ اور دولت مند ہے جو نہ صرف اس برائی کا خاکہ تیار کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی اس خواہش کو آپس کی رضامندی یا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پورا کرلیتا ہے یا جو سیدھا سادھا ایک مزدور قسم کا طبقہ ہے، شہر کے قحبہ خانوں میں اپنے آپ کو مطمئن کرلیتا ہے۔مگر اسی معاشرے میں ایک شریر اور بدمعاش قسم کا طبقہ بھی تو رہ رہا ہے جو عام طور پر کسی اچھی تعلیم و تربیت سے گذرا ہی نہیں اور جو کسی قانون اور پولیس کی زیادتی سے بھی خوف زدہ نہیں

ہے۔ اس کی نظر میں ماں، بیٹی، بہن، بھتیجی اور معصوم بچی کے مقدس رشتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو، مگر جنسی خواہشات کی آگ سے وہ بھی سلگ رہا ہے۔ وہ ایسے مواقع کو کیسے ضائع ہونے دے گا، جہاں اسے کسی بھی پولیس اور قانون کا کوئی خوف نہیں رہتا۔

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

1965ء کی جنگ 1948ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی دوسری بڑی جنگ تھی۔1948ء کی جنگ کا پس منظر بھی مسئلہ کشمیر تھا۔اور 6 ستمبر 1965ء کولڑی جانے والی جنگ کے آغاز کا مقصد بھی مسئلہ کشمیر سے پاکستان کی توجہ ہٹانا تھا۔رات تین بجے کے قریب ہندوستانی فوج نے پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لاہور کی طرف پیش قدمی کرنا شروع کردی۔اس اچانک حملے کے لئے افواج پاکستان بالکل بھی تیار نہ تھی۔اس لئے شروع میں ہندوستانی افواج کوزیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑااور وہ بدمست ہاتھی کی طرح آگے بڑھتے رہے۔ان کا خیال تھا کہ اس اچانک حملے سے لاہور پریقینا قبضہ کرنے میں کامیاب ہوجائینگے۔ہندوستانی فوج کے جنرل شرمانے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ صبح کا ناشتہ ہم لاہور میں کرینگے۔لیکن شائد دشمن کواس بات کی خبر نہ تھی کہ غیور اور بہادر فوج پاکستانی سرحدپر چوکس وچکنا رہتی ہے۔انہیں دشمن کامنہ توڑجواب دینے کے لئے صرف چند منٹ تیاری کے لئے درکار ہونگے۔اور پھر یہی ہوااس وقت ہندوستانی افواج کا خواب اچانک ٹوٹ گیاجب بی آر بی نہر سے آگے دشمن کوایک انچ بھی بڑھنے کے لئے اپنے سینکڑوں فوجی موت کے گھاٹ اتارنے پڑے۔اور وہ لاہور شہر کے اندراخل ہونے میں کامیاب نہ ہوسکے۔نہ صرف سرحدوں پرپاک فوج دشمن کا مقابلہ کررہی

تھی بلکہ ہمارے دیہاتی اور لاہور کے مضافات میں رہنے والے لوگوں کا فوری ردعمل اس قدر دیدنی تھا۔ کہ وہ ڈنڈے اور کلہاڑے لے کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے سرحد کی طرف جانے لگے۔ پاک فوج نے ان جوشیلے نوجوانوں اور بزرگوں کو یہ سمجھا کر واپس بھیج دیا کہ ابھی پاک فوج کے شیر جوان آپ کی حفاظت کے لئے سرحدوں پر موجود ہیں۔ ابھی تم لوگ اپنے گھروں میں جا کر آرام کرو ہم ہیں دشمن کے ناپاک عزائم خاک میں ملانے کے لئے اس کے باوجود زندہ دلان لاہور کے لوگ سرحد پر پاک افواج کے لئے کھانا پہنچاتے اور زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنے میں ان کی مدد کرتے رہے۔ دشمن تو شائد یہ بھول بیٹھا تھا کہ جنگ تو مسلمان کی سرشت میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہنستے مسکراتے لڑتے ہوئے شہید ہونا یہ اپنے لئے اعزاز اور اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ لاہور کی عوام کی ایک اور دیدہ دلیری عجیب و غریب تھی۔ وہ یہ کہ جب ان کی چھتوں کے اوپر سے دشمن کے جہاز گزرتے تو وہ اپنی چھت سے ان کی طرف پتھر پھینکتے ۔اور اگر کوئی پاک فوج کا جہاز دشمن کے جہاز کا پیچھا کر رہا ہوتا تو تالیاں بجاتے اور شور مچاتے ۔ یہ عجیب قسم کا ماحول تھا اور لگتا تھا جیسے لاہور کا بچہ بچہ اس جنگ میں از خود شامل ہے۔ نا صرف عام شہری بلکہ سول سوسائٹی کے لوگ ،فلاحی و رفاعی تنظمیں سول ڈیفنس اور میڈیا سے وابستہ عوام نے بھی پاک فوج کا بھرپور ساتھ دیا۔ میڈم نورجہاں کا یہ گیت آج بھی جب کانوں میں گونجتا ہے تو 1965ء کی جنگ کے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔۔،اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

دے،،اس جنگ کے بعد اس وقت کے صدر اور آرمی چیف ایوب خان نے میڈم نورجہاں کو ملکہ ترنم کا خطاب دیا۔اور میڈم نورجہاں ملکہ ترنم نورجہاں ہوگئیں۔یہ جنگ پاکستان کی مشرقی سرحد پر بڑی شدت سے لڑی جارہی تھی۔اس سرحد پر واقع علامہ محمد اقبالؒ کا شہر سیالکوٹ بھی ہے۔اور دنیا میں لڑی جانے والی جنگوں کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں۔کہ سب سے بڑی جنگ جو ٹینکوں سے لڑی گئی وہ چونڈہ،،کے محاذ پر لڑی گئی تھی۔جب دشمن نے سیالکوٹ کی طرف نظر بد ڈالی تو اس،، نے اپنے سینکڑوں ٹینک چونڈہ کے محاذ پر پاکستانی سرحد کے اندر داخل کردیئے۔شائد اس وقت تک پاکستانی عوام خودکش دھماکوں سے بے خبر تھی۔مگر اس دور میں آسمان پر چمکتے سورج نے وہ نظارہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا نہ سنا گیا تھا۔پاک فوج کے جوان اپنے جسموں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے اور پھر یوں ہوا کہ دشمن کے ٹینک ہواؤں میں اڑتے ہوئے دیکھے گئے دشمن اپنے ٹینک چھوڑ کر واپس بھاگ گیا اور بہت سے ٹینکوں پر پاک فوج نے قبضہ کرلیا۔جو آج بھی ہمیں لاہور اور سیالکوٹ کے چوراہوں پر کھڑے نظر آئیں گے۔یہ جنگ سات روز تک جاری رہی مگر ہندوستانی افواج بی آر بی نہر سے اس طرف نہ آسکی۔پاک فوج کے بہت سے جوان اور آفیسرز شہید ہوگئے۔نہر کنارے لاہور کے ایک گاؤں برکی کے مقام پر میجر عزیز بھٹی شہید بڑی بہادری سے 6 دنوں تک لڑتے رہے اور دشمن کے ناپاک قدموں کو روکے رکھا اور لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔جنہیں بعد میں نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔سات دن بعد یو این او کی

مداخلت سے جنگ روک دی گئی اور ہندوستانی، پاکستانی افواج ایل او سی پر واپس چلی گئیں۔یہ بے نتیجہ جنگ جو ہندوستان نے پاکستان پر اچانک مسلط کی تھی۔اس نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے اور اسے دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ جسے وہ کمزور سمجھتا ہے اور نہتا سمجھ رہا تھا وہ کس قدر جری اور بہادر فوج ہے اور نہ صرف فوج اور عوام کے جذبہء شہادت اور لازوال قربانیوں کی مثال بھی اسے ہمیشہ یاد رہے گی۔کہ افواج پاکستان تنہا نہیں ہے بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے اس کے سچے مخلص اور وطن سے محبت کرنے والے عوام کی طاقت بھی موجود ہے۔

مغربی تہذیب تباہی کا سامان

عام طور پر ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ جو مغربی تہذیب کو بہت ساری برائیوں کی جڑ سمجھتا ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ صنف نازک نے جب سے گھر کی دہلیز کے باہر بازار میں قدم رکھا ہے، صنعت و تجارت کو زینت بخشی ہے، یہ اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں رہا کہ وہ برائیاں جو کبھی کبھار دیکھنے اور سننے کو ملتی تھیں، اب اس نے سیلاب کی صورت اختیار کرلی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ عورت کیوں پردے میں رہے اور کیا واقعی اس کے باہر آنے سے اس کی عزت وآبرو خطرے میں رہتی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ خود اپنی مرضی سے باہر آنا چاہتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب ہمیں ہر منٹ اور ہر گھنٹے اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے ذریعے مل رہا ہے، دوسرے سوال کا جواب یہ کہ اس کائنات کے مالک نے عورت اور مرد دونوں کی فطرت میں شرم وحیا داخل کردی ہے اور وہ خود بے حیائی اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ مثال کے طور پر آدم اور حوا کو اگر یہ پتہ ہوتا کہ شجر ممنوعہ کے پھل کو استعمال کرنے کے بعد اپنے لباس سے محروم ہو جائیں گے، تو وہ کبھی یہ غلطی نہیں کرتے، مگر جب ابلیس کے بہکاوے میں آکر ایسا کر بیٹھے، تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چونکہ جو غلطی آدم سے جنت میں ہوئی وہی غلطی بنی آدم سے زمین پر بھی ہونا لازمی تھی۔ اسی لئے اللہ تعالی رسولوں اور، الہامی کتابوں کے ذریعے آدمی

کو آگاہ کرتا رہا کہ اے بنی آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ایک بار پھر تمہاری شرمگاہوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔انسان کی اسی بشری کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطانی طاقتوں نے دنیا میں شجر ممنوعہ کے پھل بو دیے ہیں جسکی وجہ سے امریکہ اور بھارت ہمارے گھروں تک گناہوں کے باغات خوب بو رہے ہیں اور اپنے زہریلے اثرات سے دنیا میں بے سکونی افرا تفری پھیلا رہے ہیں۔فرق یہ ہے کہ آدم کے لئے جنت میں گناہ کے جواز تھے، مگر گناہ کے ذرائع نہیں تھے۔اس لئے آدم اور حوا اس تباہی اور گناہ سے بھی بچ گئے اور معاف بھی کر دیے گئے۔اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں شجر ممنوعہ ہے کیا؟ یہ آزادی کا خوبصورت تصور ہے، جس کا نشہ ہر آدمی اور عورت کے ذہن پر طاری کر دیا گیا ہے اور پھر اپنی اس آزادی کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس نشے اور گناہ کی طرف راغب کئے جاتے ہیں، جسے عام مفہوم میں سیکس یا جنسی تسکین کا نام دیا جاسکتا ہے، جو آسانی کے ساتھ ہر قیمت پر بازار میں دستیاب ہے۔اور اس منافع بخش تجارت میں دنیا کی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنا بہت بڑا سرمایہ لگایا ہوا ہے۔مگر دنیا کی ایک بہت بڑی اکثریت بین الاقوامی ثقافتی اداروں کی اس سازش کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہے، جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ انسانی حقوق کی بازیابی، جمہوریت کی بحالی، سماجی عدل وانصاف اور آزادی نسواں کے قیام جیسے پر فریب نعروں کے ذریعے دنیا کی تمام دیگر مذہبی تنظیموں اور تہذیبوں کو فرسودہ قرار دیکر انہیں صرف اپنے بارے میں سوچنے

کیلئے مجبور کردیں اور وہ خود اپنے قدیم روایتی مذہبی اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔کتاب ''گلوبلائیزیشن اور دنیا کی تشکیل نو'' میں لکھا ہے کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں منظور کی جانے والی تجاویز کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ ہوگا کہ ان کا مقصد معاشرے کو ہر طرح کے اخلاقی و خاندانی بندھنوں سے آزاد کرکے عریانیت، فحاشی، جنسی بے راہ روی،اسقاط حمل کا قانونی جواز، تعیش پسندی، شادی کے بغیر جنسی خواہشات کی تکمیل جیسی انسانیت سوز عادات کو معاشرے میں عام کرنا ہے، جس کے بعد انسانوں اور جانوروں کی اجتماعی زندگی میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ جائے گا۔امریکہ جو اس پوری تہذیب کا معمار اور موجد ہے، وہاں کی ہالی ووڈ فلم انڈسٹری پوری دنیا کیلئے ہر سال 12 لاکھ گھنٹوں پر مشتمل مختلف قسم کے لٹریچر اور ٹی وی پروگرام تیار کرتا ہے، جس میں بلیو فلم سے لیکر موسیقی جیسے پروگرام شامل ہوتے ہیں اور پھر یہاں سے ایک اچھی قیمت کے عوض دنیا کے دیگر ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں۔امریکہ کی یہ فلمی صنعت پوری دنیا کی فلمی صنعت کی آمدنی کے پچاسی فیصد حصے پر قابض ہے اور 1994 کے دوران امریکہ نے اپنے تفریحی پروگراموں کی فروخت سے چالیس اعشاریہ دو ملین ڈالر حاصل کئے، جو کہ امریکہ میں تیار کی گئی دیگر مصنوعات کی فروخت سے بھی زیادہ ہے۔امریکی طرز آزادی اور ثقافت کے حامی بورہوس فرڈریک کا کہنا ہے کہ آزادی اور شرافت ایک قسم کا فریب اور دھوکہ ہے،اقوام عالم کو چاہئے کہ وہ امریکی ثقافت کو قبول

کرلے ،مگر جو ملک اور حکومت اس کی مخالفت کریں ان کے معاشرے میں جوا، شراب موسیقی اور رقص کی شکل میں تفریح کے ایسے جدید ترین وسائل کو عام کر دیا جائے، کہ بالآخر مخالف طبقات بھی اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہو جائیں یا خاموشی اختیار کرلیں۔ہم دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک طبقہ جو اس برائی سے کسی طرح الگ ہے تو بھی اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس کے خلاف آواز بھی اٹھاسکے۔میڈیا جو کہ شوق و سنگار کے سامان بنانے والی کمپنیوں اور فلم انڈسٹری سے کروڑوں اربوں روپے کی منافع بخش تجارت کر رہا ہے، وہ پوری طرح عورت مرد کے اختلاط اور جنسی بے راہ روی کو ترقی کی علامت بنا کر پیش کر رہا ہے اور اپنے اسی مقصد کے فروغ کیلئے ان کمپنیوں نے حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے عنوان سے ایسی مختلف تنظیموں کو سرمایہ فراہم کر رہی ہیں جو عالمی اور ملکی پیمانے پر فحاشی بے حیائی اور بدکاری کے رجحانات کو عام کرنے کیلئے ہر ماہ کہیں نہ کہیں کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔اس کا اثر بھی دیکھا جاسکتا ہے آج سے قبل جہاں معاشرے میں شرابی،زانی اور بد کردار افراد کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی، انہیں اب عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس فعل کے معترف سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین ،ارشاد مانجی ،اسریٰ نعمانی اور وی ایس نائیپال جیسے بد کردار مصنفوں کو نوبل انعام سے نوازا جانا۔جب ہم کتاب گلوبلائزیشن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کس طرح مغربی طرز کے قائل تعلیم یافتہ افراد برائیوں کی ایجاد کرتے ہیں اور اس

برائی کے پھیلاؤ سے شہر دیہات اور معاشرے کے پسماندہ جاہل اور مزدور قسم کے طبقات بھی برابر سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں جو فحش لٹریچر بازار میں دستیاب ہے، اس نے عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کے وہ تمام راز فاش کردئے ہیں، جسے حقیقت میں اسی طرح پہرے میں رہنا چاہئے تھا۔مادیت کے پرستار نام نہاد مہذب دنیا کے با اثر ممالک ان جوہری اسلحوں کے تباہ کن نتائج سے تو واقف ہیں، مگر جو دھماکہ انسان کے شہوانی جذبات اور جنسی خواہشات کو آگ لگا کر کیا جارہا ہے، اس نے زندہ انسانوں کو جانور ہی نہیں درندہ بنادیا ہے اور اس کی اس یلغار سے پانچ سال کی معصوم سے لیکر اسی سال کی بوڑھی عورت کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مرد خود اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے جواز پیدا کر رہا ہے، عورتیں بھی فائیو اسٹار ہوٹلوں اور بیئر بار کا رخ کر رہی ہیں۔ فحش تہذیبی یلغار سے یکساں طور پر معاشرے کا ہر ذہن متاثر ہوا ہے فرق اتنا ہے کہ جو تعلیم یافتہ اور دولت مند ہے جو نہ صرف اس برائی کا خاکہ تیار کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی اس خواہش کو آپس کی رضامندی یا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پورا کرلیتا ہے یا جو سیدھا سادھا ایک مزدور قسم کا طبقہ ہے، شہر کے قحبہ خانوں میں اپنے آپ کو مطمئن کرلیتا ہے۔مگر اسی معاشرے میں ایک شریر اور بدمعاش قسم کا طبقہ بھی تو رہا ہے جو عام طور پر کسی اچھی تعلیم وتربیت سے گذرا ہی نہیں اور جو کسی قانون اور پولیس کی زیادتی سے بھی خوف زدہ نہیں

ہے۔ اس کی نظر میں ماں ، بیٹی ، بہن ، بھتیجی اور معصوم بچی کے مقدس رشتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو، مگر جنسی خواہشات کی آگ سے وہ بھی سلگ رہا ہے۔ وہ ایسے مواقع کو کیسے ضائع ہونے دے گا، جہاں اسے کسی بھی پولیس اور قانون کا کوئی خوف نہیں رہتا۔

اپریل فولز ڈے

اکیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں پر مغربی اقوام کا سیاسی اور نظریاتی تسلط اتنا بڑھ چکا ہے کہ کم علم مسلمان جو کہ مغربی افکار سے اتنا مرعوب ہو چکا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں بغیر مغرب کی تقلید کے ترقی ممکن نہیں، اس لئے وہ ہر بات ہر کام میں مغرب کی تقلید لازم سمجھتا ہے، ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ مغربی ممالک میں یہ دن کس واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے، جب اسپین پر عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں ، قتل وغارت سے تھک کر بادشاہ فرڈینڈ نے اعلان کروایا کہ یہاں مسلمانوں کی جان محفوظ نہیں ہم انہیں ایک اسلامی ملک میں بسانے کا فیصلہ کیا ہے ، جو مسلمان وہاں جانا چاہتے ہیں حکومت انہیں بذریعہ بحری جہاز بھجوادے گی، لاتعداد مسلمان اسلامی ملک بسانے کے شوق میں جہاز پر سوار ہو گئے سمندر کے بیچ جا کر فرڈینڈ کے گماشتوں نے جہاز میں بارود سے سوراخ کیا، خود حفاظتی، کشتیوں کے زریعے بچ نکلے ، چشم زون میں پورا جہاز مسافروں سمیت غرق ہو گیا، اس پر عیسائی دنیا بڑی خوش ہوئی اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے پر بادشاہ کی شرارت کی داد دی، اس روز یکم اپریل تھا، فرڈینڈ کی شرارت اور مسلمانوں کو ڈبونے کی یاد میں مغربی دنیا میں یکم اپریل کو "اپریل فول" منانا جاتا ہے، لوگوں کو جھوتی خبریں سنا کر پریشان کیا جاتا ہے، یکم

اپریل کا دن ' بیوقوفوں کے دن ' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ غیر ملکوں میں کئی مقامات پر فولزڈے' منایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی طرف ' سے یکم اپریل کے دن ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کا کام ہوتا ہے۔ دراصل انسان اپنے تناؤ اور مصروفیات کے درمیان کچھ لمحات کھلے ہنسی ، مذاق اور تفریح کے لئے نکالنا چاہتا ہے۔ ' بیوقوفوں کا دن منانے کی روایت کے پس منظر میں انسانی ذہنیت کی یہی قدرتی فطرت دکھائی دیتی ہے۔ یکم اپریل کے دن بیوقوف بنانے اور ہنسی مذاق کرنے کی رسم بہت پرانی ہے لیکن اس کی شروعات کب ، کیسے اور کہاں ہوئی، اس سلسلے میں الگ الگ خیالات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ' اپریل' فولزڈے منانے کی رسم جاپان سے شروع ہوئی۔ وہاں کی ایک رائج کہانی کے مطابق قدیم زمانے میں فرانس میں ہر سال پہلی اپریل کو وہاں کے بادشاہ کی طرف سے شہریوں اور پادریوں کی ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس جلسہ میں راج دربار کے نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس میں حصہ لینے والے لوگ اوٹ پٹانگ حرکتوں اور کاموں سے لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔ اس موقع پر سب سے زیادہ بیوقوفانہ حرکتیں کرنے والے شخص کو تقریب کا صدر چنا جاتا تھا اور اسے ماسٹر آف فولز کے اعزاز سے نوازا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک دوسری روایت کی شروعات اٹلی سے ہوئی، وہاں یکم اپریل کو کارنیوال کے طور پر ایک تفریح کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس دن مرد اور عورتیں جم کر شراب پیتے ہیں اور ناچ گا کر مستی کرتے ہیں۔ رات کے وقت دعوتوں کا بھی اہتمام کیا جاتا

ہے۔ایک یونانی قصے میں بتایا گیا ہے کہ یونان میں ایک شخص خود کو فنے خاں سمجھتا تھا۔ اسے بھرم تھا کہ پوری دنیا میں اس سے بڑا اور ہوشیار شخص کوئی نہیں ہے۔ اس کے غرور کو دور کرنے اور اسے نصیحت دینے کے لئے کچھ دوستوں نے اس سے کہا کہ آج آدھی رات کو پہاڑ کی چوٹی پر خدا اتریں گے اور وہاں موجود لوگوں کی ہر مراد پوری کریں گے۔ اس شخص نے دوستوں کی اس بات پر یقین کر لیا اور پہاڑ کی چوٹی پر جا کر صبح ہونے تک خدا کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹا تو اس کے دوستوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ اسی وقت سے یونان میں 'فرسٹ اپریل' لوگوں کو بیوقوف بنانے کی روایت شروع ہو گئی کیونکہ اس دن اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔اس طرح الگ الگ ممالک میں پہلی اپریل یعنی بیوقوفوں کے دن والے مختلف قصے اور واقعات سننے کو ملتے ہیں۔ غیر ملکوں میں کئی جگہوں پر اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو اس دن بیوقوف بنادیا جاتا ہے۔ ان کی باتوں پر لوگ بڑی آسانی سے یقین کر لیتے ہیں۔یکم اپریل کو ہوشیار سے ہوشیار لوگ بھی کسی نہ کسی طرح بیوقوف بن ہی جاتے ہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا بھی بچانے کی کوشش کر لیں۔ کسی کا اپریل فول بنانے کے کئی طریقے ہیں جیسے کسی کو میٹھی چیز میں مرچ ڈال کر کھلانا، سڑک کے بیچوں بیچ سو پچاس یا پانچ سو کا جعلی نوٹ چپکانا اور اٹھانے والے کو اپریل فول کہہ کر اس کا بینڈ بجانا وغیرہ۔اپریل فول خالصتاً کافروں کا تہوار ہے جسے منانا گناہ کبیرہ ہے،اپنی عارضی خوشی کے لئے دوسروں کو حادثات اور

ناگہانی واقعات کی جھوٹی اطلاعات دینے سے ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، موبائل فون کے دور میں اس فضول تہوار سے ہونے والے جانی ومالی نقصانات 800 فیصد سے زیادہ ہو چکے ہیں، اپریل فول ہماری نہیں یہود ونصاریٰ کی قبیح رسم ہے جسے ہمیں ترک کرنا چاہیئے ،اگر ملک میں غیر مذہبی تہوار اور رسومات منانے کی رفتار پر فوری کنٹرول نہ کیا گیا تو عنقریب ملک میں بے حیائی کا ناسور پھیلتا ہوا نظر آئے گا، ملک میں بڑے بڑے بحرانوں کی وجہ اسلام سے دوری اور غیر شائستہ رسومات سے عقیدت ہے، پاکستان میں اپریل فول ایک رواج سا بن گیا ہے، جس سے معصوم اور بے خبر لوگوں کو اچانک حادثاتی خبر دے کر انتہائی بھیانک اور مذموم حرکت کا ارتکاب کیا جاتا ہے، فارغ اور گنوار قسم کے لوگ ہی اس تہوار کے پیروکار بنتے ہیں ،اپریل فول مسلمانوں کے ساتھ ایک بدترین مذاق ہے،اور اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ دن تھا،جب عیسائی شہنشاہ نے سینکڑوں مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیلا اور بعد ازاں اس نے اس دن کو بطور یادگار مذاق کے طور پر منایا تھا، لہٰذا اس دن کو منانا زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے، اپریل فول ایک ایسی بیہودہ اور غلط رسم ہے جو امریکہ اور یورپ میں بھی تقریبا ختم ہو چکی ہے ،اور ہم اسے منا کر اس کے احیاء کا احترام کرتے ہیں ،ایسی رسمیں وہ قومیں مناتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی طور پر پستی میں گری ہوئی ہوں، اللہ تعالیٰ نے قاتل ،زانی اور شرابی کے لئے بھی لعنت کا لفظ استعمال

نہیں کیا لیکن جھوٹے پر لعنت کی ہے،ایسی جاہلانہ رسمیں منا کر نہ صرف ہم دنیاوی طور پر خسارے کا سودا کرتے ہیں بلکہ عذاب الٰہی کو بھی دعوت دیتے ہیں،ہم کو مسلمان ہونے کے ناطے ایسی قبیح لغویات سے اجتناب کرنا چاہیئے،یہ دن صرف یورپ اور کافرلابی کو ہی زیب دیتا ہے،اس سے کسی انسان کی جان بھی جا سکتی ہے، جبکہ مذہب اسلام ایسے کسی بھی تہوار کے منانے یا سنگین نوعیت کے بیہودہ فعل کی ہرگزاجازت نہیں دیتا،ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''من تشبہ بقوم فھو منھم''جس شخص نے کسی قوم کی مشابہت کی، وہ انہیں میں سے ہوتا ہے،جولوگ اپریل فول مناتے ہیں اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن وہ یہودونصاریٰ کی صف میں اٹھائے جائینگے۔حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ یکم اپریل منانے پر پابندی لگاتے ہوئے حکومت کواس پر قانون سازی کرکے باقاعدہ اسے آئین کا حصہ بنانا چاہیئے تاکہ پاکستانی عوام امن وسکون سے رہ سکیں۔